نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ

(النور ۳۵)

انوار القرآن

یعنی

قرآن کریم پارہ عم

کے

نکات و معارف

از تالیف ڈاکٹر بشارت احمد

جس کو

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے

تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوایا

سنہ ۱۳۷۵ھ

یار دوم | تعداد طبع ایک ہزار | ۱۹۵۶ء

www.aaiil.org

تمہید

ہزار ہزار حمد اور تعریف اللہ عزّ وجل کیلئے ہے جس کے فیض ربوبیت و رحمانیت نے قرآن کریم جیسی بینظیر نعمت نوع انسان کو بخشی۔ اور ہزار ہزار درود اور سلام اللہ تعالیٰ کے نبی برحق حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن جیسی کامل و مکمل کتاب انسان کی ہدایت کیلئے لیکر آئے قرآن کریم علم الٰہی کا ایک بحر ذخار ہے جسکے معارف و حقائق کا احاطہ بشر کی طاقت و امکان سے خارج ہے۔ پھر میرے جیسا ہیچمدان اُمّی شخص جو نہ عالم ہو نہ مفسر اس مخزن علم و حکمت کتاب کے معارف کیا بیان کر سکتا ہے۔ اس کتاب کی تالیف کی وجہ صرف اسقدر ہے کہ قرآن کریم کے آخری پارہ عمّ کا بعض مرتبہ مجھے درس کرنیکا اتفاق ہوا اکثر احباب نے یہی اصرار کیا کہ چونکہ یہ پارہ بہت مشکل ہے اور عام طور پر نمازوں میں پڑھا جاتا ہے اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب الٰہی نے اس پارہ میں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور قرآن کریم کا جو بجائے خود آب حیات سے بھی بڑھ کر ہے عطر کھینچکر رکھ دیا ہے اسلئے جو معارف و حقائق آپ درس کے دوران میں بیان کرتے ہیں انہیں تحریر کر کے طبع کرا دیا جائے۔ سو ان بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل میں یہ چند سطور احباب کی خدمت میں پیش کرنے لگا ہوں اور صاف صاف یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ تالیف محض وہ چند معارف و حقائق ہیں جو پارہ عمّ کے درس کے موقعوں پر میں بیان کرتا تھا انہیں کو کسی قدر ترمیم و اصلاح کے ساتھ قلمبند کر لیا گیا ہے۔ اللہ کرے کسی کو اس سے نفع پہنچے اور اگر کوئی غلطی ہو تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے اور احباب چشم پوشی سے کام لیں اور میرے لئے استغفار کریں۔ جو کچھ بھی مَیں نے اس میں عرض کیا ہے وہ صرف چند وہ تفہیمات ہیں جو قرآن کریم پر تدبر کرنے سے اللہ تعالیٰ کے محض فضل سے مجھ ہیچمدان پر کھلیں۔ لیکن یہ پرلے درجہ کی ناشکری اور احسان فراموشی ہوگی۔ اگر مَیں اس بات کا اعتراف نہ کروں کہ ان تفہیمات کی بنیادیں اُن فیوض علمی ظاہری و باطنی پر اُٹھی ہیں جو مجدّد اعظم مرزا غلام احمد قادیانی علیہ الرحمۃ اور حضرت حافظ حاجی مولانا مولوی نور الدین صاحب مرحوم اور حضرت مولانا مولوی محمد علی صاحب امیر جماعت احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور سے بالخصوص اور اُمّت مسلمہ کے بعض علمائے ربانی سے بالعموم مجھے حاصل ہوا۔ سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۔

خاکسار۔ بشارت احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے نہ صرف سورۃ النبا شروع ہوتی ہے بلکہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے قرآن کریم شروع ہوتا ہے۔ اس کی ہر سورت سوائے سورۂ توبہ کے شروع ہوتی ہے۔ یہ قرآن کریم کی آیت ہے جو ہر سورت کے شروع میں بذریعہ وحی آنحضرت صلعم پر نازل ہوئی تھی۔ اور اسی سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک سورت سے دوسری سورت کی علیحدگی کو پہچانتے تھے غرضکہ یہ ایک مستقل آیت ہے اور اسقدر جامع ہے کہ کہا گیا ہے کہ جس طرح سورۂ فاتحہ خلاصہ ہے کل قرآن کریم کا اسی طرح یہ آیت خلاصہ ہے کل سورۂ فاتحہ کا۔ دوسرے لفظوں میں گویا یہ آیت کل قرآن کریم کا خلاصہ در خلاصہ ٹھیر گئی۔ اس لئے اس آیت پر سب سورتوں سے علیحدہ کچھ عرض کئے دیتا ہوں تاکہ ہر سورت کے آغاز میں بار بار کچھ کہنے کی ضرورت نہ رہے۔ گو ہر سورت کے شروع میں اس آیت کی تجلی آفتاب کی روزانہ تجلی کی طرح نئی شان اور نیا اثر رکھتی ہے۔

اس آیت کا ترجمہ ہے "ساتھ نام اللہ کے جو رحمٰن ہے اور رحیم ہے"۔ یہاں بسم میں با بائے استعانت ہے پس مطلب اس کا یہ ہوا کہ اللہ کے نام کی مدد کے ساتھ۔ اب ظاہر ہے کہ بسم سے قبل کوئی فعل محذوف ہے اور قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہے اقرأ جس کے معنے ہیں "تو پڑھ"۔ جیسا کہ حدیث شریف میں بھی لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم غار حرا میں حسب معمول عبادت الٰہی میں مصروف تھے تو فرشتہ آیا اور کہا اقرأ یعنی "پڑھ" آپ نے فرمایا میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ فرشتہ نے پھر وہی لفظ دہرائے اور آپ نے بھی اسی جواب کا اعادہ کیا۔ اور اس طرح تین مرتبہ ہوا۔ چوتھی مرتبہ فرشتہ نے کہا۔ اقرأ باسم ربك الذی خلق یعنی تو پڑھ ساتھ نام اپنے رب کے جس نے پیدا کیا۔ تب آپ پڑھنے لگے۔ پس ظاہر ہے کہ بسم اللہ سے قبل جو فعل محذوف ہو سکتا ہے وہ اقرأ کا حکم ہے کہ تو پڑھ ساتھ نام اللہ کے۔ یہاں فعل کو محذوف اس لئے کیا کہ بندہ کے پڑھنے کے وقت اقرأ کا لفظ امر کے صیغہ میں دہرانا فصاحت کے خلاف ٹھیرتا ہے کیونکہ بندہ تو اس وقت حکم کی تعمیل کر رہا ہے۔ اس لئے اس وقت جو فعل محذوف ہونا چاہئے وہ ہوگا اَقْرَأُ یعنی "میں پڑھتا ہوں"۔ پس اس میں لطیفہ یہ ہے کہ جب

وحی کا نزول جناب الٰہی کی طرف سے ہوا تو بوجہ امر الٰہی ہونے کے جو فعل محذوف تھا وہ تھا اِقْرَأْ یعنی تو پڑھ۔ اور جب بندہ قرآن کریم کو پڑھتا ہے تو چونکہ وہ اس وقت امر الٰہی کی تعمیل کر رہا ہے اس لئے جو فعل اس وقت محذوف سمجھا جائیگا وہ ہوگا اَقْرَأُ یعنی میں پڑھتا ہوں ساتھ مدد نام اللہ کے۔ اور پھر اس فعل کے محذوف کرنے میں یہ خوبی بھی ہے کہ جو بھی کام انسان شروع کرتا ہے اُس کے شروع میں جب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتا ہے تو وہی فعل جو وہ کرنے لگا ہے اس سے قبل محذوف سمجھا جائے گا۔ گویا یہ استمداد جناب الٰہی سے ہے نہ صرف قرآن کے پڑھنے کے وقت بلکہ ہر کام کے شروع کرنے کے وقت تاکہ اللہ تعالیٰ اس کام میں مدد کرے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کل امر لا یبدء فیہ ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم فھو اجذم۔ یعنی ہر ایک کام جسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے اور یقیناً جو شخص اپنے کاموں میں اللہ تعالیٰ سے استعانت طلب کرے گا اس کا کام بابرکت ہوگا۔

یہاں الرحمٰن اور الرحیم دو صفات جو خاص طور پر لی ہیں ان کا مقصد سمجھنے کیلئے ان کے معنوں پر غور کرنا ضروری ہے اللہ باری تعالیٰ کا اسم ذات ہے اور یہی اسم اعظم ہے اور کل اسمائے الٰہیہ کے لئے یہ اسم جامع ہے۔ یہ اللہ سے ہرگز مشتق نہیں کیونکہ اللہ غیر اللہ معبود پر بھی بولا جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ کا لفظ نہ اسلام میں آنہ اسلام سے پہلے کبھی دوسرے معبود پر بولا گیا۔ اور نہ یہ اَلٰہ کا مخفف ہے۔ کیونکہ اگر یہ اَلٰہ کا مخفف ہوتا تو یا کا لفظ ساتھ لگنے سے ال گر جانا چاہیئے تھا مثلاً الرحمٰن خدا کا اسم ہے۔ اس کے ساتھ جب یا کا لفظ لگے گا تو ال گر جائے گا۔ ہم یا رحمٰن کہیں گے یا الرحمٰن نہیں کہیں گے۔ اسی طرح اگر اللہ میں ال کا لفظ اللہ پر زائد ہوتا تو یا کا لفظ لگنے سے ال گر جانا چاہیئے تھا اور یا اللہ کہنا چاہیئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا بلکہ یا اللہ ہی کہتے ہیں۔ پس ظاہر ہوا کہ ال اللہ پر زائد نہیں ہے بلکہ اللہ کے لفظ کا مستقل طور پر حصہ ہے۔ پس اللہ علیحدہ ایک لفظ ہے جو جناب الٰہی کا اسم ذات ہے اور یہ عربی سے مخصوص ہے اور کسی دوسری زبان میں خدا کا اسم ذات موجود نہیں اللہ کے معنے کی تشریح خود قرآن کریم فرماتا ہے کہ لہ الاسماء الحسنیٰ یعنی اللہ کے معنے ہیں ایسی ذات جو مستجمع جمیع صفات کاملہ ہو۔ اور کوئی صفت کامل نہیں ہوتی جب تک وہ حسن اور احسان دونوں میں کامل نہ ہو یعنی ایک طرف جہاں وہ صفت اپنے اندر کوئی نقص اور عیب اور احتیاج نہ رکھتی ہو اور اپنے حسن میں کامل ہو۔ وہاں دوسری طرف اس کا احسان یعنی اس صفت کا فیضان بھی مخلوق کو پہنچ رہا ہو۔ مثلاً سخاوت و فیاضی ایک حسن ہے لیکن وہ کسی ہستی میں کتنا ہی کامل طور پر کیوں نہ موجود ہو جب تک اس کے احسان یعنی اس حسن کے فیضان سے کوئی دوسرا مستفیض نہیں اس وقت تک اس حسن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اس لئے جناب الٰہی کی صفات کاملہ نہ صرف اپنے حسن میں کامل ہیں بلکہ اپنے احسان یعنی فیضان میں بھی کامل ہیں اور یہ انہی صفت کا فیضان ہے جو تمام مخلوق کی پیدائش اور ربوبیت کا موجب ہے۔ الرحمٰن وہ ذات ہے جس کا رحم اسقدر بڑا ہے کہ انسان کی پیدائش سے قبل اور اس کی کسی سعی و محنت کے بغیر وہ تمام سامان ربوبیت اس کیلئے مہیا کرتا ہے اور الرحیم وہ ذات ہے جس کا رحم بار بار عود کرتا ہے اور یہ صفت ہر شخص کے اعمال پر اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر نتائج مترتب کرتی ہے اور بار بار ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کا رحمان اور آخرت کا رحیم ہے۔ کیونکہ رحمان نے انسان کی پیدائش سے بھی پہلے محض اپنے رحم سے انسان کی ربوبیت اور ترقی کیلئے تمام سامان مہیا کر دیئے

گویا یہ ساری دنیا صفت رحمان کا مظہر ہے اور رحیم صفت انسان کے اعمال صالحہ پر جزا دیتی ہے جس کا تعلق کامل طور پر آخرت سے ہے۔ گویا ابتدا میں جو سامان انسان کے لئے مہیا کرتا ہے وہ رحمان ہے۔ اور ان سامانوں سے فائدہ اُٹھانے کے لئے جب انسان سعی کرتا ہے اور اعمال اس سے سرزد ہوتے ہیں تو ان کے نتائج مترتب کرنیوالا رحیم ہے۔ زمین، پانی آگ، سورج، چاند، بارش وغیرہ کا وجود صفت رحمانیت کا تقاضہ ہے۔ زمین میں ہل چلا کر پانی دیکر انسان کے ایک دانہ بونے پر سات سو دانے بطور پھل عطا کرنا یہ تقاضائے رحیمیت ہے۔ اسی طرح آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں، عقل علم سب اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا نمونہ ہے۔ اُن سے جب انسان کام لیتا ہے اور اس سے عمدہ نتائج اسے ملتے ہیں تو یہ صفت رحیمیت کا تقاضہ ہے۔ پس ایک انسان جب کسی کام کو شروع کرتے ہوئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا اعتراف اور شکریہ ادا کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے محض رحمانیت کے تقاضہ سے اُسے عطا فرمائی ہیں۔ ایک طرف تو اس کی صفت رحمانیت سے علمی رنگ میں یہ استمداد چاہتا ہے کہ وہ اسے صراط مستقیم کا صحیح علم عطا کرے جس پر عمل کر کے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاوے۔ اور دوسری طرف وہ صفت رحیمیت سے یہ استمداد چاہتا ہے کہ اسکے اعمال کو اعلیٰ درجہ کے نتائج پیدا کرنیوالا بنا دے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر اگر کسی مریض پر ایک اپریشن یعنی عمل جراحی کرتا ہے تو اس وقت اس کا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا جناب الٰہی سے مدد کی دعا ہے۔ وہ اقرار کرتا ہے کہ جناب الٰہی کی صفت رحمان نے اُسے آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں، عقل، اوزار۔ ادویات سب چیزیں عطا فرمائی ہیں اور انہیں وہ استعمال کرنے لگا ہے۔ لیکن صفت رحمان سے وہ یہ مدد چاہتا ہے کہ اسے ایسا صحیح علم عطا فرمائے اور ایسے صحیح رستہ پر لیکر چلے کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرے اور صفت رحیمیت سے وہ یہ مدد چاہتا ہے کہ اس کے عمل جراحی کے جو نتائج ہوں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر ہوں۔ اس طرح قرآن کریم کے پڑھنے کے وقت ایک انسان جب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا اقرار کرتے ہوئے کہ یہ محض جناب الٰہی کی صفت رحمانیت تھی جس نے قرآن کریم جیسی نعمت نازل فرمائی جیسا کہ خود قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ الرحمٰن علّم القرآن اب اس نعمت سے استفادہ کے وقت صفت الرحمٰن سے قرآن کا وہ صحیح علم چاہتا ہے جس پر عمل کر کے وہ اپنے منزل مقصود کو پانے میں کامیاب ہو اور صفت الرحیم سے وہ مدد چاہتا ہے کہ اس کے اعمال اعلیٰ سے اعلیٰ نتائج پیدا کرنیوالے ہوں۔ گویا رحمان صفت سے وہ علم کا کمال چاہتا ہے اور رحیم صفت سے وہ عمل کا کمال چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس استمداد میں دنیا و آخرت دونوں آگئے۔ دنیا میں کامیاب ہونے کے لئے علم میں کمال کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر صحیح اور کامل علم کے کوئی عمل ہو خواہ وہ دنیا کے لئے ہو یا آخرت کیلئے ظاہر خواہ صحیح نتیجہ مترتب نہیں کرتا۔ اور جب تک اعمال کے نتائج صحیح اور کامل نہ ہوں آخرت میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ چونکہ قرآن جامع ہے ان تمام اصولوں اور ان ہدایات کا جن پر چل کر انسان دنیا اور آخرت کی حسنات کا وارث ٹھیرتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے پڑھنے کے وقت جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے رنگ میں انسان جناب الٰہی سے دعا اور استمداد کرتا ہے اس کے یہی معنے ہیں کہ رحمان صفت سے وہ خدا کی اس کامل کتاب کا ایسا کامل علم چاہتا ہے جس کے مطابق عمل کر کے وہ دنیا و آخرت کے حسنات کا وارث ٹھیرے۔ اور رحیم صفت سے وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے اعمال اس کمال کے ہوں کہ ان سے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر

سے بہتر نتائج پیدا ہوں اور یہی خلاصہ ہے سورۂ فاتحہ کا بسم اللہ کی باء استعانت درحقیقت ایاک نعبد و ایاک نستعین کی قائم مقام ہے جس کے معنے ہیں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ اور صفت الرحمٰن اپنے اندر اھدنا الصراط المستقیم کی دعا پنہاں رکھتی ہے جس کے معنے ہیں کہ ہمیں سیدھا رستہ دکھا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ رستہ صحیح اور کامل علم کے ذریعہ ملتا ہے جو صفت رحمانیت کا تقاضہ ہے۔ اور صفت الرحیم اپنے اندر صراط الذین انعمت علیہم کے انعامات کی دعا کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے یعنی ہمارے اعمال ایسے کامل ہوں کہ ان کے نتائج میں ہم منعم علیہ گروہ میں شامل ہو جائیں۔ پس جب کسی انسان نے قرآن پڑھتے وقت بلکہ ہر کام کے شروع کرتے وقت صراط مستقیم کا صحیح و کامل علم جناب الٰہی سے طلب کیا اور کمال عمل کی توفیق اور اس پر اعلیٰ سے اعلیٰ نتائج کی درخواست کی تو ظاہر ہے کہ اس نے سارے قرآن کے مقصد کو پالیا۔ اسکی دنیا بھی سنور گئی اور آخرت بھی بن گئی۔ کیونکہ قرآن کا نزول انسان کے علم اور عمل کے کمال کے لئے ہی ہوا تھا اور اسی علم و عمل کے کمال پر ہی دنیا و آخرت کی کامیابی منحصر ہے۔ پس اس طرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ایک طرح نہ صرف سورۂ فاتحہ کا بلکہ سارے قرآن کا خلاصہ آجاتا ہے۔ جس نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی اس نے علم بھی صحیح اور کامل مانگا۔ اور عمل بھی کامل اور اعلیٰ سے اعلیٰ نتائج مترتب کرنیوالا مانگا۔ گویا قرآن کا علم بھی مانگا اور عمل بھی مانگا۔ اور انہیں کمال کی درخواست بھی کی۔ اور جسے قرآن کا صحیح اور کامل علم مل گیا اور عمل میں بھی کمال کی توفیق مل گئی وہ دنیا میں بھی کامیابی اور فلاح پاگیا اور آخرت میں بھی۔

حضرت مرزا غلام احمد علیہ الرحمۃ مجدد زمان نے ان کامیابیوں کی ایک لطیف تشریح تصوف کے رنگ میں اپنی کتاب اعجاز المسیح میں فرمائی ہے جس کا خلاصہ چند فقروں میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو حسن اور احسان میں کامل ہے اس کی رحمان صفت جب بندہ پر بغیر اس کے کسی عمل کے بے انتہا رحم اور عنایتیں فرماتی ہے اور اس طرح اپنے حسن اور احسان کا اس پر اظہار کرتی ہے تو بندہ کو اس ذات سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جس جس طرح ان عنایات اور حسن و احسان کے فیض کا بندہ پر پیش از پیش نزول ہوتا ہے ویسے ویسے بندہ کی محبت ذات باری سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ جس چیز کی محبت جس قدر زیادہ بڑھتی ہے اسی قدر اسکی تعریف اور حمد میں بندہ رطب اللسان ہوتا ہے۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ کی محبت اور حمد کے اس مقام پر بدرجۂ کمال پہنچا وہ احمد کہلایا جس کے معنے ہیں بار بار اور بہت حمد کرنے والا۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص جناب الٰہی کی جس قدر زیادہ حمد کریگا اور اسکی حمد کی تبلیغ دنیا میں کریگا اتنا ہی رحیم صفت کے ماتحت وہ جناب الٰہی کی نگاہ میں محبوب ہوتا چلا جائیگا۔ اور جو جناب الٰہی کی نگاہ میں جس قدر زیادہ محبوب ہوگا اتنا ہی وہ قابل تعریف اور قابل حمد ہوگا۔ پس جس شخص نے اپنی حمد کی وجہ سے جناب الٰہی کی محبوبیت کے مقام کو اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ تک حاصل کیا وہ اتنا ہی زیادہ قابل حمد ٹھیرا اور محمد کہلایا جسکے معنے ہیں بہت حمد کیا گیا پس ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو دو نام احمد اور محمد ہیں وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی صفات الرحمٰن اور الرحیم کے مظہر ہیں اور ان نتائج عالیہ کو ظاہر کرتے ہیں جو انسان کو ان صفات سے استمداد کرنے پر حاصل ہوتے ہیں اور جنہیں سے زیادہ کمال حاصل کرنیوالے کے لئے احمد اور محمد سے بڑھ کر پُرمعنی نام اور متصور نہیں ہو سکتے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ بَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

سُوْرَةُ النَّبَاِ مَكِّيَّةٌ	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	وَهِيَ اَرْبَعُوْنَ اٰيَةً

سورۃ النبأ کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ ابتدائی زمانہ کی سورت ہے۔ اس سورت میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے کہ انسان دنیا میں عمل کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اعمال کی جزا و سزا یقینی ہے۔ آج دنیا میں تمام شر اور فساد مادہ پرستی اور غفلت کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں کو یقین نہیں ہوتا کہ ان کے اعمال ایک دن ضرور پھل لائیں گے۔ ورنہ اگر یہ یقین ہو کہ ہمارے اعمال و اقوال حرکات و سکنات کا کوئی نتیجہ اور اثر ضرور پیدا ہو کر رہے گا تو اپنے ہر قول و فعل میں انسان احتیاط سے کام لے۔ مثلاً اگر کسی کو کھانے کے متعلق یہ شبہ بھی پیدا ہو جائے کہ اسمیں زہر ہے جس کا نتیجہ ہلاکت یا تکلیف ہے تو وہ اس سے فوراً ہاتھ کھینچ لیتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ انسان اعمال بد کے زہر سے بچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ اسکی وجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اعمال کے نتائج پر یقین نہیں۔ اگر نتائج اعمال پر یقین پیدا ہو جائے تو اعمال بد سے وہ ضرور پرہیز کریگا۔ اس لئے نبی کا جہاں ایک بڑا بھاری کام یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کی ترقی اور کمال اور رضائے الٰہی کے حصول کیلئے تعلیم اور ہدایات دے وہاں یہ بھی اس کا کام ہوتا ہے کہ وہ اہل دنیا کو یہ یقین دلائے کہ ان کے اعمال کے نتائج یقینی ہیں اور وہ خدا کے سامنے اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں اور اگلے عالم کی جو دائمی ہے راحت اور تکلیف انکے اعمال پر ہی منحصر ہیں۔ پس یہی وہ عظیم الشان خبر ہے جو نبی دنیا کو دیتا ہے اور اسی لئے وہ نبی کہلاتا ہے۔ نبأ اس خبر کو کہتے ہیں جس سے عظیم الشان فائدہ حاصل ہو۔ ال اس لئے آیا کہ یہاں مراد وہ خاص خبر ہے جس کو اہل دنیا کو پہنچانے کے لئے نبی آتا ہے۔ اور وہ وہی خبر ہے کہ ایک دن ضرور آئیگا کہ انسان اپنے اعمال کے نتائج کو دیکھے گا۔ اور عظیم ساتھ لگا کر یہاں بتایا کہ یہ معمولی خبر نہیں بہت بڑی خبر ہے جس پر گویا انسان کی آئندہ راحت اور تکلیف کا سارا انحصار ہے۔ اس امر سے انسان کے اعمال کی اہمیت کو ذہن نشین کرنا مد نظر ہے۔ اسی النبأ العظیم کو قرآن کریم نے بار بار الساعۃ بھی کہا ہے۔ یعنی وہ خاص گھڑی جس میں انسان کے اعمال کے نتائج ظہور پذیر ہوں گے۔ اور وہ دراصل وہ گھڑی ہے جسے مرنے کے بعد انسان دیکھے گا۔ اور جس میں انسان کے نتائج اعمال پورے طور پر ظہور پکڑیں گے لیکن چونکہ یہ خبر بہت عظیم الشان اور خاص اہمیت رکھنے والی ہے اور اسی کے ذریعہ انسان کو اعمال صالحہ کی تحریک اور اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اس خبر پر یقین دلانے کے لئے اس دنیا میں بھی ہر ایک عظیم الشان نبی کے زمانہ میں الساعۃ یعنی اس گھڑی کا نقشہ چھوٹے پیمانے پر قائم کر کے دکھاتا ہے اور نیکوں کو نیک اور بدوں کو بد بدلہ دیکر ان کو یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ اعمال اپنے نتائج ضرور رکھتے ہیں چنانچہ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے دنیا میں بھی اس کے نتائج دکھا دیتا ہے تاکہ وہ آخرت پر بطور دلیل کے ہو۔ پس نبیوں کے زمانہ میں نتائج اعمال کا نقشہ جو اہل دنیا کے پیش نظر کیا جاتا ہے وہ آخرت کے نتائج اعمال پر بطور نشان کے ہوتا ہے۔ اور اگر اسے معجزہ نبوت کہا جائے تو بجا ہے کیونکہ نبی کے آنے کی اصل غرض و غایت ہی یہی ہے کہ انسان کو آخرت پر یقین پیدا ہو۔ اور وہ اپنے اعمال کی ذمہ داری محسوس کر کے تقویٰ کی زندگی بسر کرے۔ اسی امر کو ذہن نشین کرنے کیلئے قرآن کریم نے بہت سے نبیوں کے حالات کا جن میں اعمال کے نتائج کا نظارہ صفائی سے نظر آتا ہے۔ بار بار ذکر

فرمایا ہے۔ قرآن کریم کوئی قصہ کہانی کی کتاب نہیں۔ اس کے قصص اکثر اسی امر کو ذہن نشین کرنے کیلئے ہیں کہ جس طرح چھوٹے پیمانہ پر اس دنیا میں ایک نبی کی زندگی میں ساعت قائم ہوتی ہے اور بدوں کو اپنے اعمال بد کا اور نیکوں کو اپنے اعمال نیک کا نتیجہ ایک حد تک اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ اسی طرح ایک دن آنیوالا ہے جس میں بہت بڑے پیمانہ پر اور مکمل طور پر اعمال کا محاسبہ ہوگا اور انسان کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ عام طور پر دنیا میں اعمال کے نتائج چونکہ نظروں سے مخفی ہوتے ہیں اور بعض دفعہ انسانی عقل اس کے ہر پہلو پر احاطہ نہیں کر سکتی اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ نتائج اعمال کے متعلق صحیح علم پیدا کرنے کے لئے نبی کے زمانہ میں کچھ پردے ہٹا دیئے جائیں بس یہی وہ معجزۂ نبوت ہے جس پر ایک نبی کی نبوت پر بھی دلیل واضح قائم ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے وقت میں فرعون کا اپنے ظلم و بداعمالیوں کی وجہ سے ہلاک ہوتا اور حضرت موسیٰؑ کی جماعت کا نجات پا جانا اسی معجزۂ نبوت کا پر ہیبت نظارہ ہے۔ مگر یہ معجزہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں معرض ظہور میں آیا جس میں نیکی اور بدی کے نتائج اس قدر کھلے طور پر ظاہر ہوئے کہ ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس الساعۃ کے متعلق کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا جس میں اعمال کے نتائج کا پورا پورا ظہور ہوگا اور جس کے متعلق قبل از وقت خبر دار کر دینے اور صحیح علم بہم پہنچانے کا نام نبأ عظیم رکھا۔ یہ نبأ عظیم جب اہل دنیا کو سنائی گئی تو بوجہ اپنی غفلت اور بداعمالیوں کے ان کا دل نہ چاہتا تھا کہ وہ اس خبر کو صحیح تسلیم کریں وہ بجھیئے کو دیکھ کر ایک بندہ کی طرح اصل حقیقت سے آنکھ بند کرلینا چاہتے تھے لگے طرح طرح کی باتیں بنانے سوالات کرنے اختلاف کرنے اس لئے اس سورت کو انہی کے سوالات کو سامنے رکھ کر شروع کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ۝ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ ۝ کس (بات) کے متعلق ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں۔ بڑی عظیم الشان اور اہم خبر کے متعلق؟

الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ ۝ جس کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔

كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۝ سنو جی یہ عنقریب جان لیں گے۔ پھر سن رکھو یہ عنقریب جان لیں گے۔

فرماتے ہیں یہ کس امر کے متعلق سوال کر رہے ہیں کیا اُس اہم اور عظیم الشان خبر کے متعلق جو ایک نبی دنیا کو سنایا کرتا ہے؟ اس کلام میں جناب الٰہی کی طرف سے ایک حقارت آمیز تعجب مضمر ہے۔ وجہ یہ کہ یہ خبر ایسی نہ تھی کہ سن کر اس کے متعلق باتیں بنائی جاتیں۔ اور اختلاف کیا جاتا۔ بلکہ چاہیئے تھا کہ چوکنے ہو کر اپنے اعمال کی اصلاح کی جاتی لیکن بایں ہمہ یہ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں تو پھر سن رکھو کہ عنقریب وقت آتا ہے کہ یہ جان لیں گے اور انہیں اس خبر کے سچ ہونے کا کامل طور پر علم ہو جائے گا یعنی اعمال کے نتائج سامنے آکر عین الیقین پیدا کر دیں گے۔ یہاں دو دفعہ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ارشاد فرمایا ہے جس سے اس خبر کے متعلق تاکید پیدا کرنا اور زور دینا مقصود ہے۔ مگر دو دفعہ فرمانے میں یہ بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ تو عنقریب اسی دنیا میں نتائج اعمال دیکھ لیں گے اور دوسری دفعہ آگے چل کر آخرت میں اپنے

اعمال کے نتائج کو پوری طرح دیکھیں گے۔ جس سے اختلاف کی پھر کوئی صورت باقی نہ رہ جائے گی۔ علم آجائے گا اور اختلاف مٹ جائے گا۔ یہ بڑے زور اور تحدی کی پیشگوئی ہے۔ صاف فرما رہے ہیں کہ آج تو تم اختلاف کر رہے ہو۔ مگر وہ دن آیا جاتا ہے۔ کہ اس دُنیا میں بھی اعمال کے نتائج دیکھ لو گے اور آخرت میں تو دیکھو گے ہی۔ اس کے بعد اس طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ تمہارا اس خبر سے اختلاف کرنا غلطی ہے۔ جب دنیا کی ایک ایک چیز کے پیدا کرنے کا ایک مقصد ہے جو ہمیں کائنات میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ تو انسان کی پیدائش میں کوئی خاص مقصد کیوں نہ مدنظر ہو۔ انسان کوئی اتفاقی چیز نہیں۔ اس ساری کائنات کا خلاصہ اور مقصد جب انسان ہمیں نظر آتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان بجائے خود اپنی پیدائش کا کوئی خاص مقصد نہ رکھتا ہو۔ پس انسان بھی کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ مقصد اعمال اور اُن کی نتیجہ دہی ہے۔ چنانچہ علیحدہ علیحدہ ہر ایک چیز کو سامنے لا کر توجہ دلاتے ہیں کہ جب زمین و آسمان اور کل ذرائع جن سے انسان کی پیدائش اور زندگی وابستہ ہے۔ سب اپنے اندر ایک مقصد رکھتے ہیں۔ تو پھر انسان کی پیدائش کا کوئی مقصد کیوں نہ ہو؟ فرماتے ہیں

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ کیا ہم نے زمین کو فرش یا قرارگاہ یا گہوارہ نہیں بنایا۔

(مہاد تیار کی ہوئی جگہ۔ یا وہ جگہ جس پر چلا پھرا جائے) (رض متحرک چیز کو کہتے ہیں۔ مادہ رض اسی سے ہے جو رعشہ والے بیمار پر بولا جاتا ہے۔ حضرت مولانا نورالدین مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ارض ایسی متحرک چیز کو کہتے ہیں جس کی حرکت بوجہ تیزی کے نظر نہ آتی ہو۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ کسی گول گھومنے والی چیز مثلاً لٹو پر جب وہ گھوم رہا ہو کوئی دوسری چیز رکھیں تو وہ اس پر ایک سیکنڈ نہیں ٹھہر سکتی۔ گھومنے والی چیز کی تیز حرکت اُسے چشم زدن میں اپنے سے دور پھینک دیتی ہے مگر کس طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کو باوجود اس کی اتنی تیز گھومنے والی حرکت کے ہمارے لئے قرارگاہ بنایا ہؤا ہے کہ ہم بجائے دُور پھینکے جانے کے نہایت آرام و سکون سے اس پر بستے ہیں۔ اور وہ ہمیں اس عظیم الشان خلاء میں ایک گہوارہ کی طرح اپنے اندر لئے ہوئے سورج کے چاروں طرف گھوم رہی ہے۔ زمین کے فرش ہونے کا نظارہ دیکھنا ہو تو سمندر میں دیکھو۔ جہاں تک نگاہ ڈالو باوجود زمین کے گول ہونے کے وہ ہتھیلی کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس کی گولائی ہماری کسی حرکت و سکون میں روک نہیں۔ پس جائے غور ہے کہ یہ زمین گول یعنی کرہ بھی ہے۔ فرش بھی ہے۔ متحرک بھی ہے۔ گہوارہ کی طرح گھوم بھی رہی ہے۔ مگر جہاں بھی جاؤ۔ وہ انسان کے لئے جائے قرار و سکونت ہے جس سے صاف نظر آتا ہے کہ اس زمین کے پیدا کرنے کا کوئی مقصد خاص ہے۔

وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝ اور پہاڑوں کو میخیں بنایا۔

اوتاد یعنی میخوں کا لفظ یہاں بطور استعارہ استعمال ہؤا ہے منشا یہ ہے کہ جو کام میخ کا ہوتا ہے کہ ایک چیز کو گاڑ کر اُسے اپنی جگہ پر قائم کر دیا جائے وہی کام پہاڑوں نے زمین کے متعلق کیا ہے۔ سائنس کی تحقیقات سے یہ ایک مسلّم امر ہے کہ ابتدا میں جب زمین گرم جلتے جلتے رقیق سیال سے ٹھنڈی ہوئی تو اس کی اوپر کی سطح جم کر ٹھوس ہو گئی۔ مگر وہ زمین کے حجم کے مقابلہ

میں نسبتاً بہت پتلی تھی۔ اس لئے وہ اندر کے رقیق مادہ پر اس طرح ہلتی تھی جس طرح پانی پر کشتی ہلتی ہے۔ اور متواتر زلازل آتے رہتے تھے۔ اور اس حرکت کی وجہ سے زمین ناقابلِ رہائش تھی۔ پھر اس رقیق مادہ کی امواج کی وجہ سے بڑے بڑے پہاڑ معرضِ وجود میں آئے اور وہ بوجھ بن گئے جن کی وجہ سے زمین کا متحرک ہونا بند ہو گیا۔ اور وہ رہائش کے قابل ہو گئی۔ الغرض پہاڑوں کو پیدا کر کے ان کو زمین کی حرکت کے لئے بطور میخ بنا کر زمین کو ساکن اور قابلِ رہائش بنانا صاف بتلاتا ہے کہ بنانے والے کو ان پہاڑوں کی پیدائش میں کوئی خاص مقصد پیشِ نظر ہے۔ وہ یونہی بیکار نہیں پیدا ہوئے بلکہ کسی عظیم الشان مقصد کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ اور ہم نے تمہیں جوڑا جوڑا پیدا کیا۔

زمین ایک خاص مقصد کے لئے بن چکی۔ پہاڑ ایک خاص مقصد کے لئے پیدا ہو چکے۔ اب انسان پیدا ہوتا ہے۔ انسان کا جوڑے جوڑے ہونا اس کی بقائے نوع کے لئے ہے لیکن ہر ایک عقلمند غور کر سکتا ہے کہ یہ جوڑے جوڑے بنانا کس قدر ایک تیسری صاحبِ شعور اور صاحبِ ارادہ ہستی کو چاہتا ہے۔ دو ہستیاں الگ الگ پیدا ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں ایسے بالمقابل جذبات رکھے جاتے ہیں جو ٹھیک ایک دوسرے کے فطرتی تقاضوں اور مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔ اور پھر اس میں ایک بڑا مقصد انسانی پیدائش اور بقائے نسل کا رکھنا بتاتا ہے کہ ان کی پیدا کرنے والی ہستی ایک صاحبِ ارادہ ہستی ہے۔ جو نہایت عقل و حکمت کے ساتھ ایک کو دوسرے کے لئے پیدا کرتی ہے۔ اور اس تمام پیدائش میں اسے ایک خاص مقصد مدِ نظر ہے۔

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ اور ہم نے تمہاری نیند کو آرام (کا موجب) بنایا۔

انسان کی پیدائش اور اس کی بقائے نوع کے ذکر کے بعد اس کے بقائے شخصی کی طرف توجہ دلائی۔ بظاہر نیند ایک فضول سی چیز معلوم ہوتی ہے جس سے تضیعِ اوقات کے سوا بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا لیکن بتاتے ہیں کہ اس میں بھی بڑی عظیم الشان غرض مدِ نظر ہے۔ اگر نیند نہ ہو تو نہ انسان زندہ رہ سکتا ہے نہ کوئی دنیا میں کام کر سکتا ہے انسان کی زندگی کے لئے کام کے بعد آرام کی ضرورت ہے نیند سے بڑھ کر آرام کا ذریعہ اور کوئی نہیں۔ طب میں مریض کو نیند کا آجانا نصف صحت سمجھا جاتا ہے اگر انسان رات کو آرام نہ کرے، تو اگلے دن کام کرنے کے ناقابل ہو گا۔ دن بھر کام کرنے سے جو تکان پیدا ہوتی ہے اور انسان کا دماغ اور دوسرے قویٰ تھک کر مضمحل ہو جاتے ہیں۔ نیند سے جو ان کو آرام ملتا ہے اس سے اس سب تکان اور نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے۔ دنیا میں ہر زندہ چیز جو کوئی کام کرتی ہے۔ وہ کام کے ساتھ آرام کرتی ہے درخت، پودے، چرند، پرند، سب اپنی اپنی جگہ آرام کرتے ہیں۔ اور سوتے ہیں۔ تب وہ دوسرے وقت میں کام کے قابل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کا دل جو ہر وقت کام کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے کام اور آرام کے اوقات کا اندازہ لگایا گیا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ چوبیس ۲۴ گھنٹوں میں وہ نو ۹ گھنٹے کام کرتا ہے۔ اور پندرہ ۱۵ گھنٹے آرام کرتا ہے۔ نیند کیا ہے دماغ کے آرام کا نام ہے جس کے ساتھ جسم کے تمام قویٰ جو اس کے احکام کے ماتحت کام کرتے رہتے ہیں جن سے انسان دوسرے دن کے لئے کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے پس نیند کا وجود بجائے خود انسان کے پیدا کرنے والے کو ایک ایسی ہستی ثابت کرتا ہے جس کا مقصد نہ صرف انسان کو پیدا کرنا ہے

بلکہ اُس کی زندگی کو قائم رکھنا بھی ہے کیونکہ اس نے نیند کو ایک خاص غرض کے لئے پیدا کیا۔ اور وہ انسان کی زندگی کا قیام ہے

وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝ اور بنایا ہم نے رات کو پردہ۔

رات کا پیدا کرنا بھی ایک خاص غرض کے لئے ہے۔ اندھیرا ہر چیز پر ایک پردہ ڈال دیتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ کے مرکزوں کو جو مختلف چیزوں کی طرف سے آنکھ کے ذریعہ برابر تحریک ہوتی رہتی ہے جس سے اس کو آرام کرنا مشکل ہو جاتا ہے وہ سب تحریکیں بند ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے اندھیرے میں جو دماغ کو آرام ملتا ہے اور نیند جس قدر مکمل اور تسکین بخش ہوتی ہے وہ روشنی میں نہیں ہوتی۔ پس رات اور اس کا اندھیرا انسان کے دماغ اور اعصاب کے سکون کے لئے ایک بڑی ضروری چیز ہے۔ کبھی رات کو جاگنا پڑتا ہے تو دن کو لاکھ سوؤ وہ آرام ہی نہیں آتا جو رات کو سونے میں آتا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹروں کا فتویٰ یہ ہے کہ جہاں سوؤ وہاں اندھیرا ہونا چاہئے کیونکہ روشنی میں آنکھ کی پتلیاں نہیں پھیلتیں اور دماغ پوری طرح آرام نہیں کر سکتا۔ پس اندھیرے کا پیدا ہونا بغیر مقصد اور فائدہ کے غرض کے نہیں۔ اگر رات کا اندھیرا نہ ہوتا تو انسان نہ تو مکمل طور پر آرام کر سکتا نہ دوسرے دن کام کر سکتا۔ اور پھر زندہ بھی نہ رہ سکتا۔ غرضکہ رات کو پردہ بنانے میں بڑے بڑے مقاصد ہیں۔ اسی پردہ کے نیچے حیوان و نباتات سب آرام کرتے ہیں جن کی زندگی انسان کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ انسان کے سینکڑوں کام رات کے پردہ کو چاہتے ہیں بہت سی جائز باتیں جن کا افشا حیا یا شرافت اور تہذیب کے منافی ہے۔ رات کے پردہ کے مقتضی ہیں۔ نواب آصف الدولہ مرحوم والئے اودھ کے زمانہ میں ایک دفعہ قحط پڑا۔ تو انہوں نے امامباڑہ تعمیر کرنے کا حکم دیدیا۔ اور مہتمم تعمیرات کو ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ عمارت کے لئے مٹی ڈھونے کا کام رات کو ہو۔ اور جو مرد یا عورت رات کو ایک ٹوکری مٹی پھینک جائے اسے بغیر اس کا نام پوچھے چار آنے دیدو۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ بہت سے شرفا سفید پوش جو قحط کی وجہ سے تنگ حال تھے اور علانیہ نہ بھیک مانگ سکتے تھے نہ مزدوری کر سکتے تھے رات کے پردہ میں مٹی ڈھو کر اپنا پیٹ پالنے لگے۔ "فیمن ریلیف ورکس" تو آج بھی ہوتے ہیں مگر نواب موصوف کی رات کے پردہ میں مٹی ڈھونے کی تجویز نے غریب شرفا کو نفع بھی پہنچایا اور پردہ داری بھی کی۔ غرضکہ رات بظاہر تو دن کی سعی اور کاموں کو بند کر کے غفلت اور نیند کا پردہ ڈالتی ہے۔ مگر غور سے دیکھو تو اس کے فوائد پر نظر ڈال کر انسان حیران رہ جاتا ہے پس رات اپنے پیدا کرنے والے کے ایک بڑے اہم مقصد کو اپنے اندر مخفی رکھتی ہے جس کا نفع بھی انسان کو پہنچتا ہے

وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ اور دن کو ہم نے معاش کے لئے بنایا۔

رات کے آرام اور سکون کے بعد دن کام کے لئے بنایا گیا تاکہ انسان اپنی زندگی کے لئے روزی کا سامان مہیا کر سکے روشنی کے کتنے ہی سامان کرو۔ مگر جو بات دن کی روشنی میں ہے اور جیسا اس کا فیضان عام ہے وہ اور کہاں مل سکتا ہے بڑے سے بڑا آدمی اور غریب سے غریب انسان یکساں طور پر دن کی روشنی سے مستفیض ہوتا اور اپنی روزی کی تلاش میں محنت اور سعی کرتا ہے۔ کس قدر اس دن کی روشنی میں خالق کا مقصد نظر آتا ہے دن کی روشنی کا منبع چونکہ آفتاب ہے اسلئے

اب آسمان کے انعامات کی طرف توجہ دلاتے ہیں

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ اور تمہارے اُوپر سات مضبوط بنائے۔

کیا چیز سات مضبوط بنائے؟ بتاتے ہیں کہ وہ سات مضبوط تمہارے اُوپر ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ آسمان ہی ہو سکتے ہیں لیکن یہاں آسمان کے لفظ کو محذوف کر کے صرف فوقکم کا لفظ جو فرمایا اس میں بتانا یہ منظور ہے کہ آسمان کی تعریف معلوم کرنی ہو تو فوقکم سے سمجھ لو یعنی جو تمہارے سر کے اُوپر ہے وہ آسمان ہے۔ اس سے بڑھ کر صحیح اور علمی تعریف آسمان کی نہیں ہو سکتی سائنس کی رو سے زمین پر کھڑے ہوئے ہمارے قدم تو ہمیشہ زمین کے مرکز کی طرف ہوتے ہیں۔ اور وہ طرف تحت کہلاتی ہے یعنی ہمیں وہ طرف ہمیشہ نیچے کی طرف محسوس ہوتی ہے۔ اور ہمارا سر اس کے بالمقابل جس طرف ہوتا ہے وہ طرف ہمیں ہمیشہ فوق یعنی اُوپر کی طرف محسوس ہوتی ہے۔ پس قرآن نے یہاں آسمان کو فوق فرمایا یعنی زمین پر کھڑے ہوئے جد مصر تمہارا سر ہو اُس کے اُوپر کی طرف آسمان ہے۔ پس آسمان کی علمی تعریف یہ ہوئی کہ تمہارے اُوپر کی طرف شدادًا اس لئے کہا کہ جو کچھ کائنات انسان کے اُوپر کی طرف ہے وہ بڑی مضبوط ہے۔ جس کے نظام کو کوئی توڑ نہیں سکتا۔ شدادًا شدید سے مطلب ہمیشہ یہ نہیں ہوا کرتا کہ وہ ٹھوس اور سخت بھی ہو ہر دی شدید ہے۔ تپ شدید ہے۔ ان کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوئی ٹھوس چیز ہیں۔ اس کا مادہ شدت ہے۔ شدت محض ٹھوس چیز کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتا۔ اپنے اپنے موقع و محل پر مختلف معانی میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ یہاں آسمان کی جس شدت کی طرف اشارہ ہے۔ وہ ہے اس کے نظام کی پختگی اور شدت کہ اُسے کوئی درہم برہم نہیں کر سکتا۔ سبعًا سات آسمان ہیں۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو دیا گیا ہے۔ ہماری سائنس تو ایک محدود علم رکھتی ہے اس نے جو کچھ آسمان کے متعلق دریافت کیا ہے۔ وہ اگرچہ اس کی اپنی بساط کے مطابق ہے اور ابھی رات دن ترقی پذیر ہے۔ اور روز نئی سے نئی اور زیادہ سے زیادہ طاقت کی دوربینیں نکلتی آتی ہیں۔ اور اُن کے ذریعہ نئے سے نئے ستارے اور نظام دریافت ہوتے رہتے ہیں لیکن سب اس بات پر متفق ہیں کہ ستاروں کی روشنی اور نظام کے اعتبار سے آسمان کو سات حصوں میں ہی تقسیم کیا جا سکتا ہے گویا وہی بات کہی جو قرآن کریم نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل فرمائی تھی۔ لیکن قرآن کریم نے ایک اور بات بھی فرمائی ہے کہ انا زینا السماء الدنیا بزینۃ الکواکب۔ کہ بیشک ہم نے سماء الدنیا کو یعنی ورلے آسمان کو ستاروں کے نظام سے ترتیب دی ہے۔ . . . . . .

. . . . . جس سے معلوم ہوا کہ یہ آسمان جو ستاروں کے نظام سے منظم ہمیں نظر آتا ہے۔ اور ہماری دنیا کے ساتھ تعلقات رکھنے کی وجہ سے سماء الدنیا کہلاتا ہے۔ یا اس لئے سماء الدنیا کہلاتا ہے۔ کہ روحانی آسمانوں کے مقابل میں یہ ایک ادنیٰ درجہ کا مادی آسمان ہے۔ یہ ایک جدا چیز ہے۔ اور اس کی تقسیم سات آسمانوں میں الگ امر ہے۔ اور ان آسمانوں کے علاوہ اور ان کے بالمقابل اور بھی سات آسمان ہیں۔ جو روحانی ہونے کی وجہ سے ارواح اور ملائکہ کا مرکز ہیں۔ اور جن کے مقابلہ میں یہ ستاروں سے منظم سات آسمان سماء الدنیا کے لقب سے ملقب ہیں۔ چونکہ یہاں ہماری زمین سے متعلق آسمان کا ذکر ہے اس لئے یہاں سماء الدنیا کا ہی ذکر ہے۔ اور اسی کے سات حصوں یعنی سات آسمانوں کا ذکر ہے۔

یہ آسمان اور اس کے نظام نہ ہوتے تو آفتاب کہاں سے ہوتا۔ جو منبع ہے تمام روشنی اور مادی زندگی کا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝ اور ہم نے سورج کو روشنی اور گرمی دینے والا بنایا۔

وھاج کہتے ہیں جو روشنی بھی دے اور حرارت بھی دے۔ سورج کو اس لئے بنایا گیا تاکہ انسان کو روشنی اور گرمی ملے جس پر انسان کی اور ہر جاندار کی زندگی موقوف ہے۔ اور اس کی روشنی سے دن ہوتا ہے جس میں انسان اپنا سب کام کاج کرتا ہے لیکن سب کام کاج کے بعد اگر انسان کے لئے غلہ اور پھل وغیرہ نہ ہوتے تو وہ کھاتا کہاں سے اور زندہ کس طرح رہتا غلہ اور پھل کے لئے ضرورت تھی بارش کی اس لئے فرمایا:۔

وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝ اور ہم نازل کرتے ہیں بادلوں سے زور سے برستا ہوا پانی

معصرات۔ وہ بادل جو برسانے والے ہوتے ہیں ثجاج۔ بہت پانی بہانے والا۔

سورج کی حرارت سے سمندروں پر اثر پڑتا ہے اور وہاں سے بخارات اٹھ کر بادلوں کی صورت میں زمین پر پانی برساتے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ:۔

لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝ تاکہ ہم اس کے ساتھ دانہ (غلہ) اور سبزی نکالیں اور گھنے باغ۔

آسمان اور زمین مل کر انسان کی خدمت کرتے ہیں۔ سورج کی روشنی سے بخارات اٹھتے ہواؤں کے رُخ پلٹتے، بارشیں ہوتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلہ پیدا ہوتا ہے سبزی ترکاری پیدا ہوتی ہے۔ پھل پیدا ہوتے ہیں۔ جو گھنے باغوں کی پیداوار ہوتے ہیں یہی چیزیں ہیں جن پر انسان کی غذا اور زندگی منحصر ہے۔ پس آسمانوں کا پیدا کرنا، سورج کا پیدا کرنا، بادلوں کا آنا، بارشوں کا ہونا، غلہ سبزی پھلوں کا پیدا ہونا سب اپنے وجود میں ایک نہ ایک مقصد رکھتے ہیں جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اُن کے بنانے والے کا ان کے پیدا کرنے میں کوئی مقصد ضرور ہے اور وہ مقصد ہے انسان کی پیدائش اور اس کی زندگی اور نسل کا قیام۔ دیکھو لو متحرک زمین کو اگر گہوارہ اور جائے قیام بنایا تو ایک مقصد کے لئے جھکولے کھانے والی زمین کی سطح کو پہاڑوں سے قائم کیا تو وہ بھی ایک مقصد رکھتا تھا۔ نیند کو آرام کے لئے بنایا۔ رات کو پردہ بنایا۔ دن کو معاش کے لئے بنایا تو ان سب میں مقصد صاف نظر آتا ہے۔ آسمانوں کو بنا کر اس کے نظام کو ہر ایک دستبرد سے محفوظ بنایا۔ سورج کو روشنی اور حرارت دینے والا بنایا۔ بادلوں سے مینہ برسایا۔ غلہ۔ ترکاری پھل پیدا کئے تو سب کا ایک نہ ایک مقصد ہے۔ اور وہ کی مقصد ہے جو ان تمام مذکورہ بالا چیزوں میں نظر آتا ہے۔ وہ ہے انسان کی پیدائش۔ اس کی زندگی۔ اس کی بقا اور قیام۔ تو پھر ظاہر ہے کہ انسان کی پیدائش کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ ناممکن ہے کہ دنیا کی ہر ایک مخلوق تو اپنی پیدائش میں کوئی نہ کوئی مقصد رکھے۔ اور خود انسان جو خلاصۂ موجودات ہے اپنی پیدائش میں کوئی مقصد نہ رکھے۔ اگر انسان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں تو پھر یہ تمام چیزیں جن کا ذکر ہوا ان کا بھی کوئی مقصد نہ ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ تو غلط ہے۔ دنیا کی

تمام چیزوں ہر ایک اپنی اپنی جگہ اپنی پیدائش کا کوئی مقصد رکھتی ہے۔ اور ان پر غور کرنے سے صاف نظر آتا ہے کہ ان سب کا مقصد مشترک طور پر انسان کی خدمت کرنا ہے۔ تو پھر انسان کی پیدائش کا مقصد کوئی ایسا اعلیٰ ہونا چاہیئے جو اس دنیا کی چیزوں سے بہت بلند و برتر ہو۔ انسان دنیا کے لئے نہیں بلکہ دنیا انسان کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ انسان کی زندگی کا مقصد وہ ہو جو دوسری مخلوق سے اُسے امتیاز بخشتا ہو اور وہ ہیں اس کے اعمال۔ انسان بوجہ اپنی عقل اور تمیز کے دوسری تمام مخلوقات سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اور اپنے قول اور فعل کا ذمہ دار ہے پس یہی وہ اعمال ہیں جن کے نتائج پر ادتقا کے ماتحت اس کی آئندہ ہستی کی ترقی اور کمال منحصر ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ اگر یہ باتیں جو ہم نے بیان کی ہیں اور دکھایا ہے کہ دنیا کی ایک ایک چیز ایک مقصد رکھتی ہے۔ اور ان سب کا مشترکہ مقصد انسان کی زندگی اور بقا کے لئے اس کی خدمت کرنا ہے تو پھر انسان بھی اپنی پیدائش کا ایک مقصد رکھتا ہے اور وہ اس کی ذمہ داری اعمال ہے جس کے نتائج کا ظہور اس دن صفائی سے ہوگا۔ جو خدائی فیصلہ کا دن ہوگا۔

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝ بیشک فیصلہ کا دن وقت مقرر ہے۔

یعنی انسان کی پیدائش کا مقصد کھلے طور پر اس دن نظر آئے گا جس دن اعمال کا محاسبہ ہوگا۔ اور خدائی فیصلہ صادر ہوگا۔ ہاں نتائج اعمال نکلنے اور خدائی فیصلہ صادر ہونے کے لئے ہمیشہ ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور اسی وقت کی اطلاع دینے کے لئے یہ نباء عظیم دی گئی ہے۔ تاکہ انسان اس گھڑی سے پہلے ہوشیار ہو جائے۔ اور اپنے اعمال کی اصلاح کرے وہ فیصلہ کا دن ایک تو وہ قیامت کا روز ہے جس دن سب اوّلین و آخرین جمع ہوں گے۔ اور جس دن اعمال کے نتائج کھلے طور پر نظر آئیں گے اور انسان کی پیدائش کا مقصد صاف طور پر پتہ لگ جائے گا لیکن چھوٹے پیمانہ پر ہر نبی کی زندگی میں بھی وہ فیصلہ کا دن ظہور پکڑتا ہے۔ اور وہ اعمال کے نتائج پر بطور ایک نشان کے ہوتا ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ یوم الفصل جس شان سے ظاہر ہوا وہ سب نبیوں کے زمانہ سے بڑھ کر صاف اور فیصلہ کن ہے جس سے نتائج اعمال میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ۝ جس دن صور میں پھونکا جائے گا۔ تو تم فوج فوج ہو کر آؤ گے۔

یہاں یوم کے معنے عام طور پر "جس دن" کئے جاتے ہیں لیکن عربی کے اس لفظ کے مفہوم کو اُردو کے یہ الفاظ ٹھیک ٹھیک ظاہر نہیں کرتے میرے خیال میں جو الفاظ مفہوم سے زیادہ قریب تر ہیں وہ ہیں "ایک دن ہوگا"۔ یوم ینفخ فی الصور کے معنے ہوئے ایک دن ہوگا کہ بگل پھونکا جائے گا یا بگل بجایا جائے گا۔ بگل بجانے سے استعارہ کے رنگ میں مراد ہے حکم الٰہی کے ماتحت انقلاب عظیم کا پیدا ہونا جس طرح جب میدان جنگ کا نقشہ بدلنا ہو اور فوج کی نقل و حرکت اور جگہ میں تبدیلی کرنی ہو تو بگل بجایا جاتا ہے جس سے ایک طرف کی فوج دوسری طرف چلی جاتی ہے یا حملہ کر دیتی ہے یا واپس چلی آتی ہے۔ غرضکہ جو حکم بھی بگل کے ذریعہ دیا جائے اس کے مطابق میدان جنگ کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بگل بجے گا تو موجودہ کائنات عالم کا نقشہ بدل جائیگا

اور قیامت قائم ہو جائے گی۔ پس بگل کا بجنا عالم ظاہر کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک استعارہ ہے مطلب ہے حکم الٰہی سے انقلاب عظیم کا برپا ہونا۔ بگل کے استعارہ سے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ بگل کے ذریعہ منشا یہ ہوتا ہے کہ حکم ہر ایک شخص کے کانوں تک پہنچ جائے۔ پس جو انقلاب جناب الٰہی کے حکم سے وقوع پذیر ہو گا وہ ایک ایک ذرہ پر حاوی ہو گا۔ اور کوئی چیز اس حکم کے اثر سے خالی نہ رہے گی۔ پس قیامت کے موقعہ پر جب حکم الٰہی کا نفاذ ہو گا وہ ایک بگل کی آواز کی طرح ہو گا جس کی آواز کے اثر سے کوئی کائنات کا ذرہ خالی نہ رہے گا۔ اور کائنات کا ایک ایک ذرہ اس حکم کی فرمانبرداری کرے گا۔ اور اس حکم کے ماتحت وہ انقلاب عظیم برپا ہو گا جس سے اس کائنات کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔ اور وہ یوم الفصل ہو گا جس میں لوگ فوج در فوج اپنے اپنے اعمال کے محاسبہ کے لئے حاضر ہوں گے۔ اور نیکوں کو نیک اور بدوں کو بد بدلہ ملے گا۔ بدقسمتی سے ہمارے آجکل کے مولوی جو ہر ایک بات کو نہایت بھونڈے طریق پر لیتے ہیں۔ وہ اسرافیل فرشتہ کے ہاتھ میں تانبے یا پیتل کا بگل پکڑا دیتے ہیں۔ اور پھر بگل کی ٹوں ٹوں کی آواز کا لوگوں کو منتظر رکھتے ہیں یہ غلطی ہے۔ اسرافیل فرشتہ ہے جو عالم ارواح میں سے ہے۔ وہ کوئی مادی وجود نہیں کہ اس کے ہاتھ میں کوئی مادی بگل ہو۔ ظاہر ہے کہ جس عالم سے فرشتہ ہو گا اُسی عالم کی مناسبت سے اُس کا بگل ہو گا۔ عالم ارواح یا عالم مثال میں بگل کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جب مشیت الٰہی کوئی انقلاب پیدا کرنا چاہتی ہے۔ تو وہ امر اسرافیل فرشتہ کے ذریعہ سے مخلوق تک پہنچتا ہے۔ اور اس کا اثر ایسا مکمل اور فوری ہوتا ہے جس طرح بگل کی آواز کے اثر سے کسی میدان جنگ میں تغیر اور انقلاب رُونما ہو جاتا ہے۔ فرشتہ کا بگل بھی ہُوا کرتا ہے وہ کوئی مادی بگل نہیں ہوتا۔ بلکہ جو بگل کا مقصد ہے وہ اس فرشتہ کے توسط اور اثر سے کائنات میں رُونما ہوتا ہے۔ اسی قسم کی غلطیاں بعض دفعہ ہمارے علما ایسی کر جاتے ہیں جس سے نئی روشنی کے تعلیم یافتہ لوگوں کو ٹھوکر لگ جاتی ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے حیات جاوید (سرسید احمد کی سوانحعمری) میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ کہ ایک دفعہ علی گڑھ میں عید کی نماز کے خطبہ میں عیدگاہ کے امام صاحب نے فرمایا کہ عید کے دن علی الصباح فرشتے منادی کرتے ہیں کہ "بھائیو مسلمانو! عید کی نماز کے لئے چلو" نماز سے واپسی پر مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ میں نے کالج کے لڑکوں کو مذاق کرتے سنا۔ کہ فرشتوں کی خوب منادی ہے جس کی آواز کسی کو بھی نہیں آتی۔ پس امام صاحب کی حماقت نے کالج کے لڑکوں کو دین پر استہزا کرنے کا موقعہ دیدیا یعنی انہوں نے اسے اس رنگ میں سُنایا کہ خود مسلمانوں کو یہ بات مضحکہ انگیز معلوم ہوئی۔ علیگڑھ کالج کے ایک پروفیسر صاحب سے میری ملاقات ہوئی اُن سے اسی واقعہ کا تذکرہ آیا۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ بات تو بالکل صاف ہے فرشتہ کوئی مادی مخلوق تو نہیں کہ وہ انسان، خاکروب کی طرح ڈھنڈورا پیٹا کرتا ہے۔ اور محلہ محلہ صدا لگاتا پھرتا ہے کہ "بھائی مسلمانو! عید کی نماز کے لئے چلو" فرشتہ عالم روحانی کی مخلوق ہے۔ اُس نے کوئی مادی ڈھول تو پیٹنا نہیں۔ اُس کی تحریک تو قلب پر اثر ڈالے گی۔ اُس کی آواز کا احساس انسان کے جسمانی کانوں کو نہیں ہو گا۔ بلکہ دل کے کان اُسے محسوس کریں گے۔ اور یہ سچ ہے کہ عید کے دن صبح کو بدمعاش سے بدمعاش انسان، بے نماز سے بے نماز آدمی بھی سب سے پہلے نماز کی تیاری کرتا ہے۔ عید کی نماز فرض نہیں بلکہ سنت ہے۔ لیکن اس اہتمام سے مسلمان اس نماز کی تیاری کرتے ہیں کہ فرض نماز کی بھی نہیں کرتے۔ آخر یہ تحریک نماز کی جو ہر نیک و بد کے دل میں عید کے دن صبح پیدا ہوتی ہے۔ وہ فرشتہ کی تحریک نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اور اس قدر عالمگیر تحریک کو کہ مسلمانوں کا

کوئی گھر اور کوئی فرد بشر اس سے خالی نہیں رہتا فرشتہ کی منادی نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟ اس پر وہ پروفیسر صاحب بہت متاثر ہوئے۔ غرضکہ اسی قسم کی غلطی نفخ صور میں لگی ہوئی ہے۔ فرشتہ کا بگل کوئی مادی بگل نہیں۔ کہ وہ فوں فوں کر کے بجے اور مخلوق میں اس سے گڑبڑی پڑے۔ بلکہ وہ ایک امر الٰہی ہے جس کی حکومت سے بھری آواز ہر ایک ذرہ تک پہنچتی ہے۔ اور اس میں جس قسم کا تغیر اور انقلاب مدّنظر ہوتا ہے پیدا کر دیتی ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ نبی کے زمانہ میں بھی چھوٹے پیمانہ پر قیامت قائم ہوتی ہے پس اسی مناسبت سے نبی کے زمانہ میں بھی نفخ فی الصور ہوتا ہے جس سے دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا ہوتا ہے جس شان و شوکت اور قوت روحانی کا مالک نبی آتا ہے۔ اُسی شان کا نفخ فی الصور بھی ہوتا ہے چنانچہ یہاں ینفخ فی الصور میں اگرچہ اصل مقصد تو وہی نفخ صور ہے جو قیامت کبریٰ کے موقعہ پر ہوگا۔ مگر اپنی مناسبت سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جو قیامت قائم ہوئی اس کے لئے بھی اس میں اشارہ ہے۔ یعنی یہ کہ آسمانی بگل بجے گا۔ اور ایسا حیرت انگیز انقلاب رونما ہوگا کہ فتاتون افواجًا کا نظارہ نظر آجائے گا۔ تم فوج در فوج آؤ گے۔ چنانچہ وہ وقت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آگیا۔ کہ اذا جاء نصر اللہ والفتح ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجًا کا نظارہ دنیا نے دیکھا۔ ایسا خدائی بگل عرب کے ملک میں پھونکا گیا کہ لوگ فوج در فوج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اور اسلام میں داخل ہوئے۔ ایسا انقلاب روحانی وقوع پذیر ہوا کہ وہی لوگ جو آپ سے منحرف تھے۔ آپ کی اطاعت کا جُوا اپنے کندھوں پر رکھنے کے لئے خوشی سے تیار ہو گئے۔

وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝ اور آسمان کھول دیا جائیگا سو دروازے ہو جائیں گے

(یہاں آسمان سے وہ آسمان مراد ہے جو عالم روحانی کا مرکز ہے)

آسمان کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے کہ اس کو کھول کر دروازے بن جائیں گے یہ ایک استعارہ ہے جس طرح کسی چیز کو کھول دیا جاتا ہے تو اُس میں جو مخفی چیزیں ہوتی ہیں اور اندر کی چیزوں کو باہر آنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔ اسی طرح فرمایا کہ آسمان کے دروازے کھل جائیں گے یعنی ملائکہ کا نزول ہوگا۔ خدا کی نصرتوں اور آسمانی نشانوں کی بارش ہوگی۔ خدا کی معرفت اور آسمانی علوم کے جو مخفی تھے لوگوں پر دروازے کھل جائیں گے اور خدا کے قرب کی راہیں ظاہر ہو جائینگی۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝ اور پہاڑ اڑائے جائیں گے سو وہ غبار ہو کر رہ جائیں گے یا بے حقیقت ہو جائیں گے۔

جبال پہاڑ کو بھی کہتے ہیں اور قوم کے بڑے اور طاقتور آدمیوں کو بھی کہتے ہیں۔ جبال استعارہ میں مشکلات کے پہاڑوں کو بھی کہہ دیتے ہیں۔ فرمایا وقت آتا ہے کہ یہ مشکلات کے پہاڑ اڑا دیئے جائیں گے۔ اور قوم کے بڑے بڑے طاقتور لوگ جو آج حق کی اشاعت میں روک بنے ہوئے ہیں یہ سب آخر کار اُڑ جائیں گے۔ اور بے حقیقت ہو جائیں گے اور حق غالب آئے گا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ قیامت میں بھی یہ نظارہ ہوگا۔ کہ لوگ خدا کے حضور فوج در فوج ڈرتے ہوئے خدائی فیصلہ کے لئے حاضر ہوں گے۔ اور آسمانی دروازے کھل جائیں گے اور ملائکہ کا نزول ہوگا اور تمام امور سماوی ظاہر ہو جاویں گے

اور تمام مشکلات کے پہاڑ اُس دن اُڑ جائیں گے اور طاقتوروں کی طاقت بے حقیقت نظر آنے لگے گی لیکن آنحضرت صلعم کی زندگی میں اسی دنیا میں جس خوبی سے یہ نظارہ نظر آیا کہ کس طرح تمام ملک فوج در فوج حضورؐ کی خدمت میں اطاعت اور اسلام کے لئے حاضر ہوا۔ اور آسمانی نشانوں اور نصرتوں کا کس طرح ظہور ہوا۔ اور سماوی علوم کے دروازے کھلے اور مشکلات کے پہاڑ اُڑے۔ اور طاقتوروں کی طاقتیں بے حقیقت ثابت ہوئیں۔ وہ قیامت کے یعنی اعمال کی جزا وسزا کے وجود پر دلیل قطعی ہے اسی لئے فرمایا کہ اگر یہ سب باتیں پوری ہو جائیں جو اعمال کی جزا وسزا کے لئے بطور آئینہ کے ہوں گی تو پھر اعمال کے جزا وسزا کے متعلق دوسری بات بھی یاد رکھو جس کی خبر دینے نبی آیا کرتا ہے۔ اور اُس کی زندگی میں جو کچھ اعمال کی جزا وسزا کا نظارہ نظر آتا ہے وہ اسی اصل حقیقت پر دلیل قائم کرنے کے لئے ہوتا ہے اور وہ یہ ہے۔

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۙ بے شک جہنم گھات میں ہے یا انتظار میں ہے۔

لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ۙ وہی سرکشوں کا ٹھکانا ہے۔

یعنی جو لوگ حق کی مخالفت کرتے اور محمد رسول اللہ صلعم کی لائی ہوئی خبر اور آپ کی ربانی ہدایتوں کی پروا نہیں کرتے بلکہ اُس سے سرکشی کرتے ہیں۔ اُن کے لئے جہنم بھی انتظار کر رہی ہے کہ ان بداعمالیوں کا وہی انجام ہے

لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۚ اس میں کئی حقب رہیں گے۔

حقب۔ حقبہ۔ مدت کو کہتے ہیں۔ ایک سال سے لیکر اسّی سال تک کی مدت پر بولا جاتا ہے۔ احقاب حقب کی جمع قلۃ ہے جو نو کے عدد تک محدود ہوتی ہے۔ تو اگر حقب ۸۰ سال کا بھی یہاں فرض کر لیا جائے اور احقاب سے نو حقب بھی مراد لئے جائیں تب بھی ۹×۸۰ یعنی ۷۲۰ سال سے زیادہ مدت نہیں بڑھتی لیکن یہ ممکن ہے اُس عالم کے سال ہماری دُنیا کے سالوں سے مختلف ہوں۔ اسی عالم میں ہماری زمین کے سال کی مدت اور ہے اور مشتری اور زحل کے سالوں کی مدت اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ہماری زمین کے سالوں سے بہت بڑے سال ہوتے ہیں اسی طرح ممکن ہے کہ عالم آخرت کے سال اس دُنیا کے سالوں سے بہت بڑے ہوں لیکن خواہ کچھ بھی ہو اور کتنا بھی لمبا عرصہ جہنم میں رہنے کا ہو لیکن اس سے ایک بات کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جہنم کے عذاب کی میعاد محدود ہے۔ اور بات بھی سچ ہے کہ جب اعمال محدود ہیں تو ان کی سزا بھی محدود ہونی چاہیئے۔ جب خود قرآن کریم فرما رہا ہے من عمل سیئۃ فلا یجزیٰ الا مثلھا۔ کہ جو بدعمل کرتا ہے وہ بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ مگر اسی کے مثل۔ پس جب بدلہ بالمثل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ محدود اعمال کا بدلہ غیر محدود ہو۔ ورنہ وہ پھر انصاف نہیں سہے گا۔ اس پر ایک دفعہ ایک مولوی صاحب بگڑ کر فرمانے لگے کہ پھر نیک اعمال کا بدلہ بھی محدود ہونا چاہیئے کیونکہ نیک اعمال بھی آخر محدود ہی ہیں۔ میں نے کہا یقیناً۔ نیک اعمال کے بدلہ کو غیر محدود بنانا عطاء الٰہی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں

نیک اعمال کے بدلہ پر ارشاد ہوتا ہے۔ عطاءً غیر مجذوذ۔ مذکورہ خدا کی بخشش ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگی۔ کسی بدعمل کی سزا کو اس

کے مثل سے بڑھانا ظلم کہلاتا ہے۔ اور کسی نیک اعمال کی جزا کو اس کے مثل سے بڑھانا بخشش اور عطا ہُوا کرتی ہے پس اعمال بد کا بدلہ محدود ملنا عین انصاف ہے۔ اور اعمال نیک کا بدلہ غیر محدود ملنا عطا و بخشش ہے۔ اس پر مولانا فرمانے لگے۔ کہ جب آخر کار کافر بھی جہنم سے نکل گئے۔ تو ہمارے مسلمان ہونے کا کیا فائدہ ہے؟ میں نے کہا کہ مولانا آپ کیمبل کے ڈپٹی کمشنر ہوں اور کوئی قیدی ۱۰ سال کی قید بھگت کر جیلخانہ سے نکلے تو کیا اس وقت آپ سر پیٹتے پھریں گے کہ یہ قیدی جو چھوٹ کر آگیا ہے اس میں اور مجھ میں اب کیا فرق رہ گیا۔ کجا ایک شخص خدا کے حضور میں مقرب اور برگزیدہ اور کجا ایک جہنم کا سزا یافتہ۔ نہ معلوم بعض ملاؤں کی ذہنیت کس قسم کی ہوتی ہے۔ کہ ایک گنہگار جہنم سے سزا پا کر اگر نکل آئے تو انہیں ناحق تکلیف ہونے لگتی ہے کہ ہائے اس کی سزا کیوں ختم ہوگئی مطلب یہ کہ فقط مولانا جنت میں مزے اڑایا کریں۔ اور ان کے سارے مخالف ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں جلا کریں۔ یہ تنگدلی کا نشان ہے۔

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ۝ نہ اس میں راحت پائیں گے اور نہ پینے کی چیز۔

برد اصل میں ٹھنڈک کو کہتے ہیں۔ اس سے راحت کی زندگی بھی مراد ہوتی ہے۔ شراب کے معنے ہیں پینے کی چیز۔

شراب کے متعلق ایک دفعہ ایک عجیب لطیفہ ہُوا ایک شہر کے ریلوے اسٹیشن پر میں بیٹھا ہُوا تھا۔ اس شہر کے ڈاکٹر صاحب جو مسلمان تھے تبدیل ہو کر جا رہے تھے شہر کے بڑے بڑے مسلمان عمائد اور شرفا انہیں ریل پر چڑھانے آئے وہاں کسی طرح جنت کا ذکر چل پڑا۔ بعض مسخروں نے یہ کہنا شروع کیا۔ کہ جو لُطف جہنم میں ہوگا۔ وہ جنت میں کہاں نصیب ہو سکتا ہے سارے جہان کے بھانڈ میراثی اور ارباب نشاط اور تمار خانے اور میخانے اور تھیٹر جن سے لطفِ زندگی حاصل ہوتا ہے سب جہنم میں ہوں گے۔ غرضکہ بڑی رونق ہوگی۔ اور جنت میں کیا خاک دھرا ہوگا۔ کبھی کوئی لمبی ڈاڑھی والا سر منڈا نیلے تہبند والا ملا ہاتھ میں وضو کا کوزہ اور نماز کا مصلےٰ لئے نظر پڑ گیا تو اور طبیعت کو بے مزہ کر گیا۔ اس پر ایک صاحب بولے کہ جنت میں بھی تو شراباً طہوراً ہوگی۔ جواب میں کسی نے کہا کہ اس میں نشہ نہ ہوگا۔ جیسے پورٹ وائن۔ دوسرا بولا جیسے بیئر۔ تیسرا بولا جیسے اولڈ ٹام۔ غرضکہ بڑا مذاق اڑا۔ میں دور بیٹھا سُن رہا تھا۔ آخر نہ رہا گیا۔ میں نے آکر کہا کہ افسوس ہے آپ لوگ مسلمان ہو کر اس قسم کا مذاق اڑا رہے ہیں شراب جسے اردو میں کہتے ہیں اسے عربی میں خمر کہتے ہیں۔ شراباً طہوراً میں جو شراب کا لفظ ہے وہ عربی ہے جو شرب سے ہے اس کے معنے ہیں پینے کی چیز۔ قرآن کریم میں حضرت عزیر نبی کو حکم ہوتا ہے۔ فانظر الی طعامک و شرابک کہ تُو اپنے کھانے اور پینے کی چیز کی طرف دیکھ۔ تو کیا یہ مطلب ہے۔ کہ نعوذ باللہ وہ نبی کوئی برانڈی کی بوتل بغل میں رکھتا تھا۔ پس شراباً طہوراً کے یہ معنے کرنا کہ وہ کوئی پورٹ وائن یا برانڈی کی قسم کی کوئی چیز ہوگی۔ قطعاً غلط ہے۔ شراباً طہوراً کے معنے ہیں پاکیزہ پینے کی چیز۔ طہوراً کا لفظ معلوم ہوتا ہے اسی لئے لگایا تاکہ تمام قسم کی لغو پینے کی چیزوں کا امکان خارج ہو جاوے۔ اس پر وہ لوگ حیران ہو گئے کہنے لگے ہمیں یہ معلوم نہ تھا۔ ہم تو جو ملاؤں سے سنتے آئے تھے اسی پر مذاق کر رہے تھے

إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ۝ سوائے ابلتے ہوئے گرم پانی اور شدت کے ٹھنڈا پانی کے۔

یعنی جہنم میں کوئی راحت کی زندگی نہ ہوگی۔ ٹھنڈک اور پانی راحت کا نشان ہوا کرتے ہیں۔ ان چیزوں کا نہ ملنا بڑے دُکھ اور تکلیف کی علامت ہے پانی جو انسان کی زندگی کے لئے نہایت ضروری چیز ہے اگر ملے گا بھی تو یا تو حد درجہ کا اُبلتا ہوا گرم جسے انسان پی نہیں سکتا۔ یا پیئے تو اندر جل جائے۔ یا حد درجہ کا سرد پانی کہ وہ بھی پیا نہیں جاتا۔ اگر پیا جائے تو ابلتے ہوئے گرم پانی کی طرح تکلیف دہ ہوتا اور جلاتا ہے۔ ایک شخص قطب شمالی کی تحقیقات کو گیا تھا وہ لکھتا ہے کہ بحر منجمد شمالی میں جب سردیوں میں وہ برفوں میں پھنس گیا۔ تو وہاں اس قدر سخت سردی تھی۔ کہ اگر لوہے پر انگلی پڑ جاتی تھی تو وہ اس سے چمٹ جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک کتا تھا اس نے لوہے کے جنگلے کو چاٹا تو اس کی زبان ایسی چمٹی کہ چھٹ نہ سکتی تھی کتا پیچھے کو ہٹا تو وہ زبان کھینچ کر تار کی طرح پتلی ہو گئی۔ لیکن پھر بھی چھوٹ نہ سکی۔ آخر چاقو سے کاٹنا پڑا۔ غرضکہ پانی کھولتا ہوا گرم ہو یا حد درجہ کا سرد ہو دونو حالت میں نہ انسان کی پیاس کو بجھا کر راحت کا موجب ہوتا ہے۔ اور نہ انسان کا جزو بدن بن کر اس کی زندگی کا موجب ہوتا ہے۔ اور یہ سزا انہی اعمال کے مطابق ہے جو اس نے افراط اور تفریط کے رنگ میں دنیا میں سرزد ہوئے۔ اسی لئے انہیں جزاءً وفاقا فرمایا۔

جَزَآءً وِّفَاقًا ۝ بدلہ موافق اعمال ہے۔

یعنی یہ سارا دکھ اور سزا کا رنگ اُن کے اعمال کے موافق ہے جس طرح ایک بداعمال شخص نے دنیا میں اپنی زندگی افراط و تفریط میں کاٹی اسی طرح بدلہ کے وقت زندگی کا پانی افراط و تفریط کے رنگ میں ملے گا۔ یا بہت کھولتا ہوا یا بہت سرد جو دونو صورتوں میں انسان کے لئے مفید نہیں۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگلی زندگی انسان خود اپنے ہاتھوں سے تیار کرتا ہے خدا کی بتائی ہوئی صراط مستقیم سے الگ ہو کر اعمال میں افراط و تفریط کرنے سے اگلی زندگی میں بھی افراط و تفریط کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے

اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۝ بے شک وہ حساب کی اُمید نہ رکھتے تھے۔

تمام گناہوں اور تمام غفلتوں کی بڑی یہی امر ہے کہ لوگوں کو حساب کی امید نہیں ہوتی۔ لوگوں کا عام طور پر اصول یہ ہوتا ہے کہ میاں ایہہ جگ مٹھا تے اگلا کن ڈٹھا۔ یعنی اس جہان میں سکھ اور آرام حاصل کر لو۔ اگلا جہان کس نے دیکھا ہے۔

وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۝ اور ہماری آیتوں کو جھوٹ قرار دیتے ہوئے جھٹلاتے تھے۔

جب عملوں کے حساب کی طرف سے بے پرواہی ہو تو خدا کی آیات کی طرف کس نے توجہ کرنی تھی اور تحقیق حق کس نے کرنا تھا بلکہ اس طرف متوجہ کرنے کیلئے جو نبی و رسول آتے ہیں اور خدا کی آیات لاتے ہیں وہ بُرے لگتے ہیں اور اُن کی باتیں تکلیف دیتی ہیں ضمیر کی ملامت سے بچنے کیلئے ان کی باتوں کو جھوٹ قرار دیدیا جاتا ہے اور دل کو سمجھا لیا جاتا ہے کہ یہ سب یونہی جھوٹ ہے اور ناحق کا ڈھونگ رچایا ہوا ہے

وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۝ اور ہر چیز کو ہم نے کتاب میں محفوظ کر لیا ہے۔

یہ ریکارڈ کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے جو بات زبان سے نکلتی ہے اور جو عمل انسان کرتا ہے سب ریکارڈ ہوتا چلا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید جو لفظ بھی انسان بولتا ہے اس پر نگہبان مقرر ہے۔ اور وہ ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے یومئذ یصدر الناس اشتاتاً لیروا اعمالھم اس دن بھانت بھانت کے لوگ جمع ہوں گے تاکہ اُن کو اُن کے اعمال دکھائے جائیں یعنی جس طرح سینما میں انسان کے اعمال جو ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں دکھائے جاتے ہیں اسی طرح حساب کے دن انسان کے اعمال اس کو دکھائے جائینگے اور جس طرح کہ گراموفون میں وہ باتیں جو ریکارڈ کر لی جاتی ہیں پھر سُنائی جاتی ہیں اسی طرح حساب کے دن انسان کی اپنی باتیں خود سے سنائی جائیں گی۔ اور یہ ایک ایسی صداقت ہے جس کے آگے آج سائنس نے بھی سر جھکا دیا ہے۔ اہل سائنس و حکمت نے مانا ہے کہ انسان کا کوئی قول و فعل ایسا نہیں جو فضائے قدرت میں ریکارڈ نہ ہو جاتا ہو۔ صرف اس ریکارڈ کو پڑھنے کے ذرائع ہمارے پاس ابھی مہیا نہیں ہو سکے جس دن اس میں کامیابی ہو گئی۔ اس دن دنیا کی تاریخ میں ایک انقلاب عظیم آ جائے گا۔ ہم ایک مکان یا مقام کو دیکھ کر اس کی تاریخ خود اس میں ہی پڑھ لیں گے کہ اس مکان میں کون کون لوگ رہے۔ اور وہ کیا کیا باتیں اور کیا کیا کام کرتے رہے۔ بہر حال اہل دنیا کو اس خدائی ریکارڈ کے پڑھنے کے ذرائع حاصل ہوں یا نہ ہوں لیکن اگلے جہان میں یہ ریکارڈ سب کے سامنے ہو گا۔ اور ہر ایک اپنا اعمال نامہ خود ہی پڑھ لے گا اور دیکھ لے گا۔

ع ۳۰ ۱ فَذُوقُوا فَلَنْ نَّزِيدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۝ پس چکھو ہم تم پر نہیں بڑھائیں گے مگر عذاب۔

یہ بھی جزاءً وفاقاً ہے یعنی اعمال کے مطابق بدلہ جس طرح دنیا میں اعمال بد سے انسان جب تائب نہیں ہوتا بلکہ اپنے اس بد عمل پر اصرار کرتا ہے تو پھر اس میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اسی طرح سزا کے وقت بھی اسی کے مطابق دکھ بڑھتا جائے گا اس کا یہ مطلب نہیں کہ عذاب ہمیشہ بڑھتا ہی جائے گا۔ اور کبھی ختم نہیں ہو گا میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ جہنم کا عذاب محدود ہے۔ جیسا کہ لٰبثین فیھا احقاباً اور جزآءً وفاقاً اور متعدد آیات قرآنی سے ظاہر ہے آیت کا مطلب فقط یہ ہے کہ جتنی مدت کا بھی عذاب ملے گا۔ وہ انسان کے اعمال کے مطابق ہو گا۔ اور جس طرح انسان دنیا میں بد اعمالیوں میں بڑھتا گیا تھا۔ اپنی میعاد کے اندر جہنم کا عذاب بھی اسی طرح بالمقابل بڑھتا جائے گا۔ وہاں وجاہت یا چالاکی کی وجہ سے انسان اس عذاب میں کمی نہیں کروا سکے گا۔ کہ دنیا میں تو بدیوں پہ بدیاں کماتے گئے اور قیامت میں چالاکیوں سے عذاب کم کروا لیا یا بچ کر نکل گئے۔ وہاں دنیا کے جیلخانوں کی طرح اے کلاس اور بی کلاس اور سی کلاس تو نہیں کہ ذرا موٹی اسامی ہوئی تو کلاس اے میں چلے گئے اور مزے سے دودھ ملائیاں اڑاتے رہے۔ اور غریب آدمی ہوا تو کلاس سی میں رہا۔ اور چنے کی روٹی اور تیل کا ساگ کھاتا رہا۔ حالانکہ جرم دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے گذشتہ تحریک کانگرس میں لوگوں نے دنیوی حیثیت کی وجہ سے جیل خانہ میں بھی بڑے بڑے مزے اڑائے ایک طرف ڈاکٹر سے شکایت کہ پیٹ میں درد ہے دوسری طرف ڈیڑھ سیر پختہ حلوا نوش جان کرنے کو موجود۔ اور اگر ڈاکٹر روکے تو ستیہ گرہ، بھوک ہڑتال، نعرے لگانے کو تیار۔ غرضیکہ کانگرسیوں نے بہت مزے اُڑائے لیکن جہنم کے جیلخانے میں یہ تدبیریں کارگر نہ ہوں گی۔ وہاں تو غریب امیر سب کے لئے یکساں سزا اور

بداعمالیوں کے عین مطابق ہوگی۔ اور جس طرح انسان اپنے بدعملوں میں بڑھتا رہا ہے۔ اسی طرح سزا بھی بڑھتی رہے گی پس جو کچھ ہوگا جزاءً وفاقاً ہوگا۔ یعنی ادلے کا بدلہ اور کچھ نہیں۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ۝ بے شک متقیوں کے لئے کامیابی ہے۔

تقویٰ کہتے ہیں حقوق کی نگہداشت کرنے کو۔ جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں اور نبیوں کی دی ہوئی خبر کو اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اعمال کی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے خدا کی ہدایتوں پر ایمان لاتے اور اُس کے مطابق عمل کرتے ہیں اُن کے لئے ارشاد ہوتا ہے کہ کامیابی مقدر ہے۔ آخرت کی کامیابی پر بطور دلیل کے خود نے آنحضرت صلعم کے زمانہ میں متقیوں کو بے نظیر کامیابی الطافرمائی جس سے نتائج اعمال کی صداقت آئینہ کی طرح نظر آگئی۔ آنحضرت صلعم اور آپ کی جماعت کی باوجود تمام بے سروسامانی اور عرب اور کل اردگرد کی سلطنتوں کی مخالفت کے کامیابی ظاہر اور باطن دونو طریق پر تاریخ عالم میں بمثال ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ قرآن کے اصول ہی ایسے ہیں کہ اُن پر عمل کرنے سے دنیا و آخرت دونو میں کامیابی لابد ہے۔

حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ۝ باغ اور انگور۔

متقیوں کے ایمان اور اعمال صالحہ سے اگلے جہان میں ایک باغ بنتا چلا جاتا ہے یعنی راحت کی زندگی پیدا ہوتی ہے۔ باغ ایک پُرفضا مقام رہائش کے لئے ہوتا ہے۔ اس لئے باغ سے مراد فقط باغ ہی نہیں بلکہ مراد اگلی زندگی کا تمام راحت کا سامان ہے۔ ایمان و اعمال صالحہ کے باغ کے پھل تو متقی کا حصہ ہونا ہی ہے لیکن انگور کے پھل کو خاص طور پر ذکر کرنے سے مراد ایک خاص استعارہ ہے اور وجہ یہ کہ انگور کے رس میں ایک خاص قسم کی شکر ہوتی ہے جسے گلیکوز کہتے ہیں جو انسان کے دل اور جذبات کو تحریک دیتی ہے یہی خاصیت انگوری شراب کی شکل میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ پس جس طرح انگور کا رس جذبات انسانی کو قوت تحریک دیتا ہے۔ اسی طرح عشق الٰہی یا خدمت دین کا عشق بھی باطنی طور پر انگور کے رس کا کام دیتا ہے۔ کہ انسان کی رُوح اور قلب کو باطنی طور پر قوت بخشتا اور اُس کی سعی اور جدوجہد میں تحریک اور سرگرمی پیدا کرتا ہے۔ گویا عشق الٰہی اگلے جہان میں رُوحانی انگور پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ کیونکہ درحقیقت اگلا عالم اسی عالم کے اظلال و آثار میں سے ہے۔ اور اسی دُنیا کے ایمان و اعمال کا وہ تمثل ہوگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک عشق الٰہی نہ ہو انسان کے عمل میں وہ سرگرمی اور جدوجہد اور ایثار و قربانی کا رنگ نہیں پیدا ہوتا۔ جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے۔

وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ۝ اور نوجوان ہم عمر عورتیں۔

اگر اگلی زندگی کوئی زندگی ہے۔ تو اس سے بڑھ کر راحت اس زندگی میں اور کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ کہ انسان کو نوجوان ہم عمر بی بی بطور رفیق کے ملے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے۔ اور نیک اور متقی لوگوں کے اگلے جہان میں بیبیاں ملنے کو کیوں خلاف تقدس اور خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ کیا آج کسی کے پاس نیک اور ہم عمر بی بی کا ہونا خلاف

تقدس سمجھا جائے گا۔ آخر یہ عورتیں جو دنیا میں بستی ہیں کہاں جائیں گی؟ کیا انہیں بالکل فنا کر دیا جائے گا یا ان کے لئے کوئی اور عالم رچایا جائے گا۔ کیا عورت ایسی ہی کوئی ناپاک چیز ہے کہ ان کا وجود جنت کے منافی ہے۔ کیوں نہ عورتیں مل کر یہ دعوٰی کرتی پھریں۔ کہ مرد جنت میں گھسنے نہیں پائیں گے۔ کیونکہ شریف عورتوں میں مردوں کا کیا کام۔ یہ سب باتیں جہالت پر مبنی ہیں۔ اگر اس دنیا میں مرد اور عورت کی رفاقت ایک فطری امر ہے اور اس کو نہایت شرافت کا معیار سمجھا جاتا ہے تو اگلے عالم میں اگر یہی رفاقت موجود ہو تو اس میں قباحت کیا لازم آگئی؟ سرسید احمد مرحوم بڑے نیک بزرگ تھے مگر آجکل کے معترضین سے مرعوب ہو کر ایک دفعہ لکھ بیٹھے کہ جنت میں عورتوں کا ملنا اور ان سے تعلقات خدا کے تقدس کے خلاف ہے۔ اس پر ہمارے حضرت مولانا نور الدین مرحوم نے انہیں خط لکھا کہ جب زنا شوئی کے تعلقات اس دنیا میں خدا کے تقدس کے منافی نہیں تو پھر جنت میں کیوں خدا کے تقدس کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ کیا خدا کا تعلق اس دنیا سے نہیں اور صرف اسی دنیا سے ہوگا۔ جس فطرت اور خواہش کو خود خدا نے پیدا کیا۔ وہ خدا کے تقدس کے خلاف نہیں ہو سکتی ہاں خدا کی مرضی کے خلاف کوئی بھی قوت استعمال میں آئے گی۔ وہ اس کے تقدس کے منافی ہوگی۔ مزہ یہ ہے کہ زیادہ اعتراض کرنے والے عیسائی ہیں۔ جن کے ہاں ہم صاحب یعنی عورت کے بغیر کوئی سوسائٹی مکمل نہیں ہوتی۔ انگلستان کی ایک دہریوں کی سوسائٹی میں خواجہ کمال الدین مرحوم لیکچر دے رہے تھے لیکچر کے بعد کسی نے جنت کی حور پر اعتراض کیا۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ کوئی انسانی سوسائٹی بغیر عورت کے نہ مکمل ہوتی ہے نہ پوری طرح مہذب ہوتی ہے تو پھر جنت میں سے عورت کو خارج کرنا کیا معنے؟ آخر اگلا عالم بھی تو انسانی زندگی کی اعلیٰ ترقی یافتہ شکل کا ہی دوسرا نام ہے۔ اس پر تمام لیڈیوں نے بڑے چیرز دیئے اور بہت محظوظ اور متاثر ہوئیں۔ سمجھ نہیں آتا کہ عیسائیوں اور آریوں نے اگلے عالم کو سمجھ کیا رکھا ہے۔ آخر وہ بھی ایک زندگی ہے اگر وہاں آئندہ ہوگا۔ تو اس کے یہی معنے ہو سکتے ہیں۔ کہ وہاں کی زندگی ایک نہایت سکھ اور راحت کی زندگی ہوگی۔ آئندہ کے معنے اگر یہ ہیں کہ وہاں افیونیوں کی طرح آنکھیں بند کئے لوگ اونگھتے ہوں گے یا سوتے ہوں گے۔ تو ایسی حالت کو زندگی نہیں کہہ سکتے۔ یہ غفلت اور نیستی کہلائے گی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوگا بلکہ وہ بھی ایک زندگی ہوگی۔ تو پھر اس زندگی میں ہمارا نفس یا روح انہی حواس سے لذت اندوز ہو سکتی ہے۔ جن حواس اور علم کو وہ اس دنیا سے ساتھ لے کر گئی ہے۔ ہماری روح نے اس دنیا میں انہی حواس کے ذریعہ تربیت پائی ہے۔ جو ہمارے جسم میں پائے جاتے ہیں۔ روح نے لذت اٹھانا انہی حواس سے سیکھا ہے جو اس مادی جسم کو ملے ہیں اچھا کھانا کھاتا جسم ہے اور اس کے ذائقہ کو زبان محسوس کرتی ہے۔ لیکن لطف اٹھاتا انسانی نفس یا روح ہے اسی طرح اچھا منظر دیکھتی آنکھ ہے۔ لیکن لطف اٹھاتا انسانی نفس یا روح ہے اسی طرح ہر ایک حس جو جسم کو ملی ہے اسی کے ذریعہ روح لذت اٹھاتی ہے لہذا جسم اور روح کی حس مشترک ہے پس جب نفس یا روح اس مادی جسم کو چھوڑ دے گی تو اگلی زندگی جو اسے ملے گی اگرچہ وہ اس سے مختلف اور اعلیٰ ہوگی۔ لیکن اس زندگی میں بھی روح یا نفس کو لذت کا اگر احساس ہوگا۔ تو وہ انہی حواس کے ذریعہ ہوگا۔ جو جسم اور روح میں مشترک تھے۔ اور جن سے اس دنیا میں روح لطف اٹھاتی رہی تھی۔ وہ دیکھے گی سنے گی۔ سونگھے گی۔ چکھے گی۔ چھونے کا احساس رکھے گی زنا شوئی کی محبت

کا لُطف اٹھائے گی تو اس کی شکل وہاں اس دنیا کے احساسات سے بہت زیادہ اعلیٰ اور ترقی یافتہ ہوگی لیکن ہوگی انہی لائن پر وجہ یہ کہ وہ انہی طریقوں سے دنیا میں لذت اٹھاتی رہی ہے جس طریق پر نفس یا رُوح انسانی کی جسم انسانی میں تربیت ہوئی ہے اُسی طریق سے وہ دوسرے عالم میں لُطف اُٹھا سکتی ہے اس کے بغیر سے نہیں اُس کی زندگی یا ہستی جو کچھ بھی ہے، انہی احساسات کا مجموعہ ہے، وہ کسی ایسی حس سے لذت نہیں اٹھا سکتی جس حس سے اُس نے لذت اٹھانا سیکھا ہی نہیں۔ اسی لئے عالم رویا یا کشف میں ہم کوئی اگر باطنی یا رُوحانی چیز دیکھتے ہیں تو وہ ہمیشہ کسی شکل میں متمثل نظر آتی ہے اگر ہم کسی رُوحانی پھل کو چکھتے ہیں تو وہ ہمیں مادی پھلوں کی طرح متمثل نظر آتا ہے۔ اور اس کا مزہ حسِ ذائقہ کے ذریعہ ہی ہم تک پہنچتا ہے خواہ اس کا مزہ اس دنیا کے پھلوں سے ہزار گنا پُر لطف ہو لیکن ہمارا نفس یا رُوح اس رُوحانی پھل سے تب ہی لذت اندوز ہو سکتا ہے جب وہ عالم مثال میں دُنیا کے پھلوں کی طرح ہمارے مُنہ میں آتا معلوم ہو۔ اور ہماری ذائقہ کی حس سے اس کا علم ہم تک پہنچے۔ ورنہ ہم اس رُوحانی پھل سے قطعاً لذت اندوز نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ کہو کہ وہاں کوئی حس ہی نہ ہوگی تو پھر اس کے یہ معنے ہیں کہ وہاں کوئی زندگی ہی نہ ہوگی۔ جب حس ہی کوئی نہیں تو نہ کوئی جنت ہوگا نہ جہنم نہ سُکھ ہوگا نہ دکھ۔ الغرض ہمارا نفس یا رُوح اگلی زندگی میں لذت اور کیفیات انہی حواس سے محسوس کر سکتی ہے جن سے اس دنیا میں اُس کی تربیت ہوئی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے۔ کہ اُس عالم میں یہ حواس یہاں کی نسبت بہت تیز اور اعلیٰ پیمانہ پر اور مادی حد بندیوں سے آزاد ہوں گے لیکن ہونگے یہی حواس جن میں نفس یا رُوح انسانی کی تربیت ہوئی ہے۔ آریوں کے نزدیک اگر کسی بے حس و حرکت زندگی کا نام آنند ہے تو ایسے آنند کو سو دفعہ سلام ہے۔ لیکن خدا بھلا کرے ہمارے مولانا عبدالحق صاحب ودیارتھی کا انہوں نے "ویدوں کا بہشت" نام کتاب لکھ کر علمی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے۔ ویدوں میں سے ویدوں کے سورگ یعنی بہشت کا نقشہ ایسا کھینچا ہے کہ یاد و شاید۔ ویدوں کے بہشت میں دہی بھلوں کے تالاب، اور کھیر کے حوض اور استریوں کے جھُنڈ کے جھُنڈ، اور خدا جانے کیا کیا نکال کر دکھا دیا۔ اور بعض تو اُن میں ایسی باتیں بھی ہیں کہ انسان کو شرم آجاتی ہے۔

ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اگلی زندگی اگر کوئی زندگی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس میں حواس اور جذبات بھی اُس کے حسب حال موجود نہ ہوں۔ اور چونکہ وہ زندگی اُسی زندگی سے تولد شدہ بلکہ اسی کا ایک تسلسل ہے گو ارتقا کے ماتحت بہت اعلیٰ پیمانہ پر اور ترقی یافتہ ہے تو پھر اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ اس کے حواس و جذبات بھی موجودہ زندگی کے ہی حواس و جذبات کی اعلیٰ اور ترقی یافتہ شکل ہونی چاہیئے۔ پس اگر ہم عمر بیبیاں اگلی زندگی میں ملیں گی تو کیا یہ سچ نہیں کہ یہ عین تقاضائے فطرت کے مطابق ہوگا۔ اس سے انکار ایک حقیقت کا انکار ہوگا۔

وَّكَاْسًا دِهَاقًا ۝ اور پاک پیالے یا لب لب بھرے ہوئے پیالے۔

دھاقا کے معنے ہیں لبالب بھرے ہوئے اور صاف و پاک بھی اس کے معنے ہیں۔ جن متقیوں نے اپنی زندگی پاکیزگی میں گذاری ان کو جو زندگی کا پانی اگلے عالم میں ملے گا ضرور ہے کہ وہ بھی پاکیزہ اور صاف ہو۔ اور لبالب میں اشارہ یہ ہے کہ اُن کی فطری ضروریات کو کافی و وافی طور پر پورا کیا جاوے گا۔ یعنی انہیں کسی قسم کی کمی نہ ہوگی۔ جو نعمت ملے گی کامل اور مکمل

ملے گی جس طرح پانی ملے گا۔ تو پاک اور لباس بھرا ملے گا۔

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ۝ وہ اس میں لغو نہیں سنیں گے اور ایک دوسرے کو جھٹلانا وہاں ہوگا۔

لغو کیا ہے ایک چیز مفید ہوتی ہے۔ اور ایک نقصان دہ لیکن جو چیز نہ مفید ہو نہ نقصان دہ وہ لغو ہوتی۔ اسلام نے لغو کو بھی اچھا نہیں سمجھا۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ مومن کا جو بھی وقت صرف ہو مفید کام میں صرف ہو۔ یہاں لغو کو تغلیب کے رنگ میں لائے ہیں۔ یعنی جب جنت میں کوئی لغو بات بھی سننے میں نہ آئے گی تو نقصان دہ امر کا ذکر ہی کیا ہے۔ اور پھر یہاں سننے کا لفظ بھی تغلیب کے رنگ میں ہی ہے یعنی جب ایک بات کسی سوسائٹی میں سننے میں بھی نہیں آتی تو کرنے کا کیا ذکر ہے یہ وہ نمونہ ہے جس پر قرآن مسلمانوں کو قائم کرنا چاہتا ہے وہ اگلے جہان میں متقیوں کی سوسائٹی کا نقشہ کھینچتا ہے کہ اُس سوسائٹی میں کوئی مضر امر کا تو ذکر ہی کیا لغو امر بھی کرنا کجا سننے میں بھی نہیں آئے گا۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اگر تم دُنیا میں ہی کوئی جنتی سوسائٹی بنانا چاہتے ہو تو اس کا نمونہ یہ ہے جو پیش کیا جاتا ہے۔ جنت آخر کار انسان کے اعلیٰ اخلاقی حالت کا ہی ایک ظاہر نقشہ ہے۔ پس مومن متقی افراد کی سوسائٹی کے لئے یہ ایک نمونہ پیش کیا ہے کہ کوئی لغو امر وہاں کرنا کجا سُننے میں بھی نہیں آتا۔ یہ وہ بلند تہذیب ہے جس پر دُنیا کی نئی روشنی کی تہذیب بھی انسان کو نہ لا سکی۔ آجکل کی مغربی فیشن کی سوسائٹیوں تک میں تمام لغویات جمع رہتی ہیں تمام لغو کھیل۔ تاش۔ برج۔ فلیش، گانا بجانا، ناچنا، تمسخر سب کچھ تو ہوتا ہے آجکل کی مشرقی سوسائٹیاں بھی اخلاق سے گر چکی ہیں۔ اس قدر بیہودہ مذاق اور فحش گوئی شیوہ بن گیا ہے کہ امارت اور دولت کے پردہ میں سب کچھ وہی ہوتا ہے جو سر بازار بازاری لوگ کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ متقیوں کی سوسائٹی کا جو نقشہ کھینچتا ہے اُسے تمام لغویات سے پاک دکھاتا ہے۔ اور دوسرا امر جو ذہن نشین کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ مومن کو سچائی سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی اُسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اور نہ اس امر کو جائز رکھتا ہے کہ وہ کسی کو جھوٹا کہے یا کوئی اُسے جھوٹا کہے۔ مومن کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس سے بڑھ کر اُس کے لئے کوئی گالی نہیں کہ اُسے کہدیا جائے کہ تو جھوٹا ہے۔ انگریزی سوسائٹی میں بھی آج کسی کو جھوٹا کہہ دینا بڑی سخت بدتہذیبی اور سب سے بڑی گالی ہے لیکن یہ تہذیب درحقیقت اسلام سے آئی ہے۔ آنحضرت صلعم سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ کیا مومن سے فلاں فلاں گناہ ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں ہو سکتا ہے۔ پھر دریافت کیا کہ کیا مومن جھوٹ بول سکتا ہے فرمایا "نہیں" پس مسلمانوں میں قرآن کریم کے رُو سے جو سب سے بڑی بدتہذیبی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو جھوٹا کہنا ہے۔ اور جس سوسائٹی میں ایک شخص دوسرے کو جھٹلائے وہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق والے لوگ نہیں ہو سکتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے متقیوں کی سوسائٹی کی تہذیب کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ یعنی ایک تو وہاں کوئی لغو بات سننے میں بھی نہیں آتی۔ کرنا تو دُور رہا۔ دوسرے وہاں اعلیٰ درجہ کی تہذیب اور اخلاق کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک دوسرے کو نہیں جھٹلاتا اور سچ بھی ہے جس سوسائٹی میں جھوٹ ہی نہ ہو اور اس کے افراد سب راستباز ہوں۔ وہاں ایک دوسرے کو جھٹلانا ہی کیسے ہو سکتا ہے پس یہ وہ نقشہ ہے جو اگلے

جہاں میں متقیوں کی سوسائٹی یا جنت کا ہے۔ اگر اس جہان میں کوئی سوسائٹی یہ صفات اپنے اندر رکھے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک جنتی سوسائٹی کہلانے کی مستحق ہے

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۝ تیرے رب کی طرف سے بدلہ۔ عطائے کافی۔

حساب یہاں حسب سے ہے جس کے معنی ہیں کافی۔ چونکہ انسان کے اعمال محدود ہیں۔ اس لئے عمل کا بدلہ بھی محدود ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اسی لئے بدی کا بدلہ بھی محدود ہوتا ہے۔ لیکن نیکی کے بدلہ کے محدود ہونے کو عطاءً حسابا فرما کر غیر محدود کر دیا۔ یعنی نیکی کا بدلہ محض بدلہ ہونے کی حیثیت سے تو محدود ہی ہونا چاہیئے لیکن اللہ تعالیٰ کی بخشش اور عطا عمل کرنے والے کے اجر کو کافی وافی کر دے گی۔ جو کبھی منقطع نہ ہوگی۔ دونو جگہ کے فرق کو غور سے ملاحظہ کرنا چاہیئے بدی کے بدلہ کا جہاں ذکر آیا تھا ہاں فرمایا تھا جزآءً وفاقا۔ یعنی عمل کے مطابق بدلہ اور یہاں عطاءً حسابا فرمایا یعنی نیکی کے بدلہ میں محض عمل کے مطابق ہی بدلہ نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے ساتھ جناب الٰہی کی عطاء اور بخشش اُسے عمل کرنے والے کے لئے کافی وافی کر دے گی۔ اور بدلہ کے محدود ہونے کی وجہ سے جو کمی ہے اُسے جناب الٰہی کی عطا پورا کر دے گی چنانچہ اسی کو دوسری جگہ قرآن نے عطاء غیر مجذوذ فرمایا ہے۔ یعنی انعام الٰہی کی وجہ سے یہ بدلہ غیر منقطع ہوگا۔ اور بدلہ کی کمی کو انعام الٰہی پورا کر دے گا۔ اور وہ ایسا کافی وافی ہوگا کہ کسی سوال کی ضرورت ہی نہ ہوگی ساری کمی اور نقص جناب الٰہی کی عطا خود پورا کر دیگی

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا آسمانوں اور زمینوں کا رب اور جو اُن دونو کے درمیان ہے

الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ۝ بے انتہا رحم والا۔ وہ اس سے کوئی بات کرنے کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔

یہاں رب السموات والارض وما بینھما بدل ہے ربک سے۔ یعنی تیرا رب وہ ہے جو تمام آسمانوں اور زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے سب کا رب ہے۔ پس کس قدر عظمت و شان کا مالک تیرا رب ہے۔ اور یہ ساری ربوبیت محض رحمانیت ہے کسی کے عمل کے بدلہ میں نہیں۔ اور وہ اس قدر عظمت و شوکت کا مالک ہے۔ کہ اس کے سامنے بولنے کی بھی کسی کو مقدرت نہیں مگر اپنے بندوں پر کس قدر رحم اور غریب نوازی ہے کہ پانچ وقت حاضر ہو کر خطاب کرنے کی اجازت ہے بلکہ بندہ ہر وقت خطاب کر سکتا ہے تاکہ اپنے رب کی ربوبیت سے استعانت اور اس کی رحمانیت سے استفاضہ کرتا ہے لیکن بندوں کی غفلت اور تمرد ملاحظہ ہو کہ ایک ادنیٰ دنیوی حاکم آجائے تو خواہ وہ منہ بھی نہ لگائے اس کی پیشوائی اور سلام کے لئے دن دن بھر خوار ہوتے پھرتے ہیں اور خدا کے بلانے پر توجہ بھی نہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے ڈپٹی کمشنر کے سلام کے انتظار میں افسران ماتحت صبح سے شام تک ڈاک بنگلا میں بیٹھے سوکھتے رہتے ہیں۔ دن دن بھر روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ گویا صاحب کا سلام کرنا ایک مصیبت خرید نے کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن یہ ساری کٹھن منزلیں طے کر لیتے ہیں اور خدا کے حضور میں نہایت آرام سے گھر میں بھی بیٹھ کر حاضر ہونے سے تساہل کرتے ہیں یہ ہے۔ ما قدروا اللہ حق قدرہ۔ کہ خدا کی قدر انسان نہیں پہچانتا۔ ٹکے ٹکے کے حاکم کی جوتیاں سیدھی

کرتے پھرتے ہیں۔ مگر احکم الحاکمین کے بلانے کی کوئی پروا نہیں۔ فرماتے ہیں تیرا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے اُس کے آگے تو زمین و آسمان کی مخلوق کو بات تک کرنے کا اختیار نہیں۔ آج تمہیں اس کی قدر نہیں۔ مگر ایک دن آتا ہے۔ کہ تم اُس کو اپنی پوری شوکت اور عظمت و جلال کے ساتھ دیکھو گے۔ اُس دن ربوبیت کے بجائے مالک یوم الدین کی صفت کا ظہور ہوگا۔ اب اُس دن کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا ۖ دن ہوگا کہ روح اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہونگے

الروح سے مراد روح انسانی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر میری سمجھ کے مطابق الروح وہ فرشتہ ہے جو وحی نازل کرتا ہے جس سے انسان کو روحانی زندگی ملتی ہے۔ اور الملٰئکہ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسان کے دل میں نیکی کی تحریکیں کرتے ہیں۔ گویا اس دن جو فیصلہ کا دن ہے انسان پر حجت تمام کرنے کے لئے وہ تمام سرکاری گواہ موجود ہوں گے جن کے ذریعہ انسان کو ہدایت ملتی رہی تھی۔ اور اُن کے قلوب میں نیکیوں کی تحریکیں کی جاتی رہی تھیں۔ تاکہ ایک ملزم کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے پھر اس کی عدالت کے رُعب اور انصاف کا نقشہ بیان کرتے ہیں۔

لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ وہ کوئی بات نہ کر سکیں گے سوائے اس کے جسے

لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ○ رحمان اجازت دے اور وہ درست بات کہے۔

یہ توحید اور عظمت کا کمال ہے کسی وکیل اور سفارشی کا وہاں کیا ذکر ہے بات تک تو کرنے کی وہاں کسی کو اجازت نہ ہوگی تو کسی نے وکالت اور سفارش کیا کرنی ہے۔ ہاں جو کوئی اجازت کے بعد بات درست اور معقول کہے۔ یہ مالک یوم الدین کی عدالت کی شان ہے۔ وہاں اجازت الٰہی کے سوا بات تک کرنے کی بھی کسی کو مجال نہ ہوگی۔ اس دنیا میں تو ربوبیت کی صفت کا ظہور ہے لہٰذا ہر وقت ہر ایک کو عرض معروض کرنے کی اجازت ہے لیکن قیامت کے دن مالک یوم الدین کی صفت کا ظہور ہوگا اس لئے وہاں بلا اجازت بات تک کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔ اجازت کے ساتھ بات کرنے میں شفاعت بالاذن کا پہلو تو نکل سکتا ہے۔ یعنی اللہ اگر کسی بندہ کو معاف کرنا چاہے۔ اور اپنے کسی نیک بندہ کو اجازت دے۔ کہ وہ جناب الٰہی میں اس کی شفاعت کرے۔ اور وہ بھی وہ معقول بات۔ تو اس وقت وہ الا من اذن لہ الرحمٰن و قال صوابا کے ماتحت آ سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی شفاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کے عفو کا ہی ایک مظاہرہ ہوگی۔ مگر بلا اجازت وہاں شفاعت تو دور رہی بات تک کرنے کی بھی کسی کو اجازت نہ ہوگی۔

ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۖ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ مَآبًا ○ یہ دن حق ہے سو جو کوئی چاہے اپنے رب کی طرف ٹھکانا بنالے۔

یعنی یہ دن برحق ہے اس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ آکر رہے گا پس جو چاہے آج اپنے رب کی ربوبیت سے فائدہ اٹھا لے۔ اور اپنے رب کی طرف لوٹ کا ٹھکانا بنالے۔ قرآن کریم کی ہر سورت کی ابتدا اور انتہا کا مضمون آپس میں اس قدر ملتا ہے کہ غور سے پڑھنے والے کو تو ایسا نظر آتا ہے کہ ایک کی دوسرے سے تفسیر ہو جاتی ہے۔ اور یہ قرآن کریم کی اعلیٰ ترتیب آیات کا نشان ہے۔ کہ جس مضمون سے سورت کو شروع کرتا ہے اسی پر اس طرح ختم کرتا ہے۔ کہ سورت کا آخری حصہ پہلے حصہ کے لئے بطور نتیجہ یا تفسیر نظر آنے لگتا ہے چنانچہ شروع سورت میں جس بناء عظیم کی خبر دی تھی۔ اور لوگ اس سے اختلاف کرتے تھے۔ ساری بحث کر کے اب سورت کے آخری حصہ میں فرماتے ہیں کہ وہ خبر سچی ہے۔ اور وہ دن سچا ہے پس بہتر ہے کہ خبر سے فائدہ اٹھاؤ۔ اور اپنے رب کے حضور میں سرخرو ہونے کا سامان کر لو۔

اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ بے شک ہم تمہیں ایک قریب عذاب سے ڈراتے ہیں۔

یعنی اس دن کی سچائی میں جس کی خبر ہمارا نبی دے رہا ہے کیا شک ہو سکتا ہے جبکہ ہم تمہیں اسی نبی کے ذریعہ ایک قریب عذاب کی بھی خبر دے رہے ہیں۔ جو دور نہیں بلکہ قریب ہے۔ یعنی عنقریب پورا ہو جاتا ہے۔ اور وہ وہی عذاب تھا جو جنگ بدر۔ جنگ احزاب اور فتح مکہ کی شکل میں قرآن کے پہلے مخاطبین اور مخالفین پر پورا ہو کر حقیقی یوم الفصل اور یوم الحق پر نشان قائم کر گیا۔ اور نیکوں کو نیک اور بدوں کو بدبدلہ دے کر نتائج اعمال پر برہان قاطع قائم کر گیا۔ پس عقلمند وہ ہے جو اس سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے۔

يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۔ جس دن انسان دیکھ لیگا جو کچھ اس کے دونوں ہاتھوں نے

وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۔ آگے بھیجا اور کافر کہے گا کہ اے کاش میں مٹی ہوتا۔

ع ۲

اگلی زندگی اسی زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ہر ایک نے اپنے اعمال کے نتائج ہی دیکھنے ہیں لیکن انسان کی بداعمالیاں اور بری کرتوتیں ایسی ہوتی ہیں۔ اور لوگوں کی نظروں سے تقریباً وہ اپنی شرارت یا جہالت کی وجہ سے ایسے ایسے کام کر گذرتا ہے۔ کہ وہ اعمال جب نتائج کے رنگ میں سامنے آتے ہیں۔ تو ندامت اور شرم سے وہ چاہتا ہے کہ کاش میں مٹی ہو جاؤں۔ اور اس طرح اس شرم اور ذلت اور عذاب سے دوچار نہ ہوں۔ قیامت کے دن تو یہ نظارہ لابدی ہے جبکہ تمام اعمال اپنے اپنے نتائج پورے طور پر لائیں گے۔ لیکن اس عذاب قریب میں بھی جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں ہی کفار پر نازل ہوا یہ نظارہ بڑی صفائی سے پیش نظر ہوا۔ فتح مکہ کے دن جو کفار مکہ کی حالت تھی وہ بالکل ایسی ہی تھی کہ ان کا دل چاہتا تھا کہ آج زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں سما جائیں۔ عربوں کی قوم ایک بڑی غیور قوم تھی۔ غیرت کی ایک مثال سناتا ہوں۔ جنگ بدر میں ابوجہل کا سر انصار کے دو لڑکے کاٹنے لگے۔ ابوجہل نے پوچھا تم کس قبیلہ سے ہو کہا انصار میں سے۔ کہنے لگا کہ تم میرا سر نہیں کاٹ سکتے۔ میں شریف ہوں۔ اور ایک اعلیٰ قوم سے ہوں اس لئے کسی قریشی کو بلاؤ جو میرا

سر کاٹے۔ انہوں نے کہا ہم ہی کاٹیں گے۔ کہنے لگا۔ "اچھا پھر گردن کو ذرا نیچے سے کاٹنا تاکہ اگر کٹے ہوئے سروں میں میرا سر رکھا جائے تو بہ وجہ اونچا ہونے کے سردار کا سر معلوم ہو"۔ یہ رعونت تھی جو اس قوم کا طغرائے امتیاز تھا لیکن فتح مکہ کے دن وہی غیور اور متکبر قوم جس نے آنحضرت صلعم اور آپ کے ساتھیوں کو گھر سے نکالا تھا سامنے کھڑی تھی اور اُس سے آنحضرت صلعم پوچھتے ہیں کہ مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہو۔ کہا "تو کریم ابن کریم ہے تجھ سے بھلائی ہی کی توقع ہے"۔ فرمایا۔ "لا تثریب علیکم الیوم۔ جاؤ آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔ میں معاف کرتا ہوں"۔ یہ معافی جو انہیں ملی ان کے لئے کس قدر ذلیل کن تھی۔ کیا وہ شرم اور ندامت سے اس وقت زمین میں نہ گڑ گئے ہوں گے اپنے کرتوت اور اپنے ظلم یاد آتے ہوں گے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ احسان اور معافی دیکھتے ہوں گے۔ تو کس بات کی تمنا کرتے ہوں گے۔ یہی کہ زمین پھٹ جائے اور اس میں سما جائیں۔ جس دن کی خبر حضورؐ نے دی وہ آخر پوری ہو کر رہی یہی نقشہ قیامت میں ہوگا اور بڑے پیمانہ پر ہوگا۔ اور خدا کے نبی کو دی ہوئی خبر سچ ثابت ہو کر منکر کے لئے سوائے زمین میں سما جانے کے اور کوئی تمنا باقی نہیں چھوڑے گی۔

سُوْرَۃُ النّٰزِعٰتِ مَکِّیَّۃٌ | بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ | وَھِیَ سِتٌّ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰیَۃً

سورۃ النازعات مکی ہے۔ ابتدائی مکی زمانہ کی نازل شدہ ہے۔ سورۃ النبا میں بتایا تھا کہ نتائج اعمال یقینی ہیں اب اس سورۃ النازعات میں یہ بتاتے ہیں کہ اعمال کو کیونکر بجالانا چاہیئے کہ اُن کے نتائج کمال تک پہنچ جائیں۔ فرماتے ہیں:۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ○ گواہ ہیں ڈوب کر نکال لینے والی (جماعتیں) یا (نفوس)

وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ○ اور خوشی سے آگے چلنے والی (جماعتیں) یا (نفوس)

وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ○ اور تیزی سے آگے چلنے والی یا تیزی سے شغل میں لگ جانے والی (جماعتیں) یا (نفوس)

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ○ پھر سبقت کرتی ہوئی آگے بڑھ جانیوالی (جماعتیں) یا (نفوس)

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ○ پھر معاملہ کی تدبیر کرنے والی (جماعتیں) یا (نفوس)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ قسم کھائی ہے۔ یہاں بھی پانچ باتوں کی قسم کھائی ہے۔ میں نے قسم کی جگہ معنے کئے ہیں "گواہ" کے۔ اس لئے میں تھوڑا سا اس کے متعلق عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

قسم کے معنی شہادت کے ہیں۔ قرآن حکیم نے جس چیز کو حروف قسم کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ ایک شاہد ہے جو اپنے مابعد دعویٰ کے لئے دلیل پیش کرتا ہے قسم کا مقصد استشہاد ہوتا ہے ہم جب خدا کی قسم کھاتے ہیں۔ تو اس کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ خدا گواہ ہے۔ البتہ کچھ شک نہیں کہ خدا گواہ ہے اور "خدا کی قسم" میں اتنا فرق ضرور ہوتا ہے۔ کہ خدا کی قسم میں خدا کی گواہی کے ساتھ "تاکید" بھی شامل ہوتی ہے۔ اور وہ تاکید اس طرح پیدا ہوتی ہے۔ کہ خدا کی قسم کھانے والا علاوہ خدا کی گواہی کے اوپر وہ اس امر کا بھی اقرار کرتا ہے۔ کہ اگر وہ جھوٹ بول رہا ہے تو خدا اس کو سزا دے لیکن قاعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جب کوئی فعل منسوب ہوتا ہے۔ تو اگرچہ لفظ تو وہی بولا جاتا ہے۔ جو انسان کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مگر یہ فرق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ کہ انسان تو چونکہ اپنے ہر فعل میں آلوں اور ذریعوں کا محتاج ہوتا ہے۔ اور خدا ان امور کا محتاج نہیں۔ اس لئے اس فعل میں جو آلہ یا ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔ صرف فعل کی آخری غرض جو مقصود ہوتی ہے وہی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ مثلاً دیکھنا۔ انسان کا دیکھنا تو آنکھ اور روشنی کا محتاج ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا دیکھنا آنکھ اور روشنی کا محتاج نہیں۔ اس لئے دیکھنے کا فعل جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا۔ تو آنکھ اور روشنی جو ذرائع دیکھنے کے ہیں وہ مراد نہیں ہوں گے۔ بلکہ صرف وہ غرض مراد ہوگی۔ جو دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ایسا ہی انسان سننے کے لئے کان اور ہوا کا محتاج ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے سننے میں یہ ذرائع مفقود ہوں گے۔ اور اصل غرض جو سننے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی۔ ایسا ہی انسان کا رحم یا غضب اس کے قلب پر خاص حالت کے وارد ہونے کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر خدا کا رحم اور غضب صرف نتیجہ کا نام ہے۔ اسی طرح استہزا کا فعل جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا تو ہنسنا جو ذریعہ تھا وہ مفقود ہوگا۔ اور ذلیل کرنا جو اصل غرض تھی وہ باقی رہے گی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا استہزا کرنا صرف ذلیل کرنے کا نام ہے نہ کہ ہنسنے کا۔ اسی طرح جب قسم کھانے کا فعل اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا تو اس میں فقط گواہی اور تاکید مراد ہوگی جو قسم کھانے کا اصل مقصد ہے۔ اور تاکید پیدا کرنے کا یہ ذریعہ کہ اگر جھوٹ بول رہے ہیں تو خدا ہمیں سزا دے مفقود ہوگا۔ کیونکہ نہ تو جھوٹ خدا کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ اور نہ کوئی طاقت اسے سزا دے سکتی ہے پس جہاں جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے۔ وہ ایک شہادت اور دلیل ہوتی ہے۔ اپنے مابعد کے دعوے پر جو عموماً جواب قسم میں مذکور ہوتا ہے۔ خود قرآن کریم نے بھی اس امر پر روشنی ڈالی ہے۔ سورۃ الفجر میں چند امور کی قسم کھا کر فرماتے ہیں:۔ ھل فی ذالک قسم لذی حجر یعنی ان چیزوں میں صاحب عقل کے لئے بڑی شہادت ہے۔ یہاں قسم کے معنے سوائے شہادت کے اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ ورنہ فقرہ بے معنی ہو جائے گا۔ سورۃ المنافقون میں فرماتے ہیں: اذا جاءک المنافقون قالوا نشھد انک لرسول اللہ واللہ یعلم انک لرسولہ۔ واللہ یشھد ان المنفقین لکذبون اتخذوا ایمانھم جنۃ۔ جب منافقین تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں۔ بیشک تو اللہ کا رسول ہے اور اللہ جانتا ہے۔ کہ بیشک تو اللہ کا رسول ہے۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے۔ کہ بیشک منافقین جھوٹ بولتے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے" اب یہ ظاہر ہے کہ منافقین نے شہادت دی تھی قسم نہیں کھائی تھی پس خدا نے خود ہی شہادت کو قسم سے تعبیر کر کے حقیقت کھول دی۔ حاصل کلام یہ کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے اس سے مراد شہادت یعنی گواہی بمعنی تاکید ہے اور یہ گواہی ہمیشہ

دلیل کے رنگ میں ہوتی ہے لیے مابعد کے جملے پر جو یا تو جواب قسم میں مذکور ہوتا ہے یا اگر جواب قسم مقدر ہو تو وہ بھی اسی قسم میں محذوف ہوتا ہے۔

یہاں جن پانچ امور کی قسم کھائی ہے۔ وہ سب کے سب اعمال کو اپنے کمال تک پہنچانے کے لئے مختلف مدارج ہیں لغت اغرق فی النزع کے معنے ہوتے ہیں۔ ایک امر کو کمال پر پہنچایا اور اس کے انجام کو پہنچایا پس والنزعت غرقًا کے معنے ہوئے ایسے نفوس جو ایک کام کو جب کرنے لگتے ہیں۔ تو اپنے آپ کو ہر طرف سے کھینچ کر اسی کام میں غرق کر لیتے ہیں۔ اور پوری توجہ سے اس کام میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ اور اس امر یا علم میں ڈوب کر اور اس میں استغراق کامل حاصل کر کے اس علم یا اس امر کو کمال تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس راز کو یورپ نے خوب سمجھا۔ چنانچہ ہر ایک علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے اسپیشلسٹ ہوتے ہیں جو تمام دوسرے علوم کو چھوڑ کر صرف ایک ہی علم کی تحصیل میں منہمک ہو جاتے ہیں اور اسے کمال تک پہنچاتے ہیں۔ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن نے سب سے پہلے یہ انسان کو سکھایا تھا کہ تم جس کام کو لو اور اس کا علم حاصل کرنے لگو یا اس پر عمل کرنے لگو۔ تو اس میں مستغرق ہو کر اسے کمال تک پہنچاؤ جب تک توجہ پوری طرح کسی امر پر نہ ہو۔ اور طبیعت ادھر ادھر ڈانواڈول رہے تب تک اس کام میں کمال نہیں حاصل ہو سکتا اشاعت اسلام کے کام ہی کو لو۔ اگر ہم پوری توجہ اور انہماک سے اُسے نہ کریں۔ اور پولیٹکل اور سیاسی تحریکوں یا ہجرت یا بائیکاٹ کی مختلف تحریکوں کے پیچھے دوڑتے پھریں تو ہم اشاعت اسلام کے کام کو کمال تک نہیں پہنچا سکتے۔

والنشطت نشطًا۔ اور خوشی سے آگے چلنے والے نفوس گواہ ہیں۔ ہر کام کے شروع میں جب ابھی اس میں پورا انہماک اور مہارت نہ ہو وہ کام ایک بوجھ معلوم ہوتا ہے۔ اور انسان اسے کسی قدر تکلف اور طبیعت پر جبر کر کے کرتا ہے لیکن جب اس میں استغراق کامل ہو جاتا ہے اور توجہ ہر طرف سے ہٹ کر اسی کی طرف لگ جاتی ہے تو پھر اس کام یا علم کے ساتھ انسان کو ایک عشق سا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے کرنے میں بجائے بوجھ محسوس ہونے کے فرحت اور خوشی محسوس ہوتی ہے پس یہاں بھی فرمایا ہے کہ جب کوئی جماعت یا نفوس ایک کام میں مستغرق ہو کر پورے انہماک اور تن دہی سے اسے کرنے لگ جاتے ہیں۔ تو گو شروع شروع میں اس میں کسی قدر بوجھ محسوس ہو لیکن بعد میں ایسا انشراح صدر ہوتا ہے کہ اس کام سے ایک عشق ہو جاتا ہے۔ اور اُس کے کرنے میں انسان خوشی اور لذت محسوس کرتا ہے۔

والسّٰبحٰت سبحًا اور گواہ ہیں تیرنے والے یا تیزی سے آگے چلنے والے۔ اب اُن کی اس حالت کا ذکر کرتے ہیں کہ اپنے کام میں مستغرق ہو کر خوشی خوشی کام کرنے والے نفوس پھر اپنے کام میں ایسی مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ کہ اس کام میں نہایت آسانی سے تیرتے چلے جاتے ہیں اور اس کام کو سرانجام دینے میں کوئی مشکل محسوس نہیں کرتے۔ اور ایسی تیزی سے اور آسانی سے سرانجام دیتے چلے جاتے ہیں گویا وہ پانی میں تیرتے چلے جا رہے ہیں اب وہ اس امر یا علم کے دریا کے شناور ہوتے ہیں

فالسّٰبقٰت سبقًا۔ پس گواہ ہیں سبقت کرتے ہوئے آگے بڑھ جانے والے۔

ف نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ پچھلی دو قسموں میں ف کو استعمال کر کے یہ بتانا منظور ہے کہ پہلی تین حالتوں کے لئے یہ پچھلی دو حالتیں بطور نتیجے کے ہیں۔ پہلی تین حالتیں تو ہر امر کی ضروریات میں سے ہیں پہلی حالت اس امر میں کمال استغراق اور محویت و انہماک کی۔ دوسری حالت اس امر میں نشاط خاطر کے حاصل ہونے کی تیسری حالت اس امر میں تیزی سے اور بغیر کسی

رکاوٹ کے تیرتے چلے جانے کی۔ اور باقی دو حالتیں نتائج ہیں۔ اور وہ یہ کہ ایسے نفوس تمام دوسرے نفوس سے یا ایسی جماعتیں تمام دوسری جماعتوں سے اس علم یا اس کام میں آگے بڑھ جاتی اور سبقت لے جاتی ہیں۔

فالمدبرات امرًا۔ اور گروہ ہیں معاملہ کی تدبیر کرنے والے نفوس یا جماعتیں۔ یعنی ایسے نفوس یا جماعتیں پھر اس قابل ہو جاتی ہیں۔ کہ اس امر کو ہاتھ میں لے کر اس کا انتظام کریں وہ اس بات کے اہل ہوتے ہیں کہ جہاں کوئی تدبیر امر کرنی ہو ان کو تمام دوسری جماعتوں اور نفوس پر مقدم اور منتخب کیا جائے کیونکہ وہ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کی پاک اور مقدس جماعت کو ۲۳ برس کے عرصہ میں مدبرات امر بنا دیا۔ کیونکہ اس پاک جماعت نے عمل کی ان تمام منازل کو تھوڑے ہی عرصہ میں بوجہ احسن طے کر لیا۔ اور وہ اس بات کے اہل ہو گئے تھے۔ کہ دنیا کی اصلاح تہذیب و تعلیم کے علمبردار بنیں اور سیاست اور حکومت اُن کے قدموں سے آ لگے۔ آج بھی مسلمان سوراج مانگتے ہیں لیکن یہ جب تک ان تمام مراحل کو طے نہ کریں کس طرح اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں۔ حضرت مرزا غلام احمد علیہ الرحمۃ مجدد وقت کو الہام ہوا تھا۔ ع چو دور خسروی آغاز کردند مسلمان را مسلمان باز کردند۔ یعنی جب تک مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہ بنیں دور خسروی کیونکر شروع ہو سکتا ہے۔ اور حقیقی مسلمان تبھی بن سکتا ہے جب یہ تمام مدارج عمل کے طے کرے۔ آج مسلمانوں کا جو کام بھی ہے وہ عدم توجہی اور سہل انگاری کا شکار ہے۔ توجہ اور انہماک کی عادت ہی اٹھ گئی ہے جو کام کریں گے ادھورا دنیا کا کام ہو یا دین کا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں بھی سب قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور خدا کیساتھ بھی تعلق نہ رہا۔ نماز پڑھیں گے تو اس میں بھی کوئی توجہ اور انہماک نہیں ہوتا۔ ورنہ اگر نماز میں پوری توجہ اور انہماک ہو تو یہی نماز الصلوٰۃ معراج المؤمنین ہے۔ یعنی نماز مومنوں کی معراج ہے ہمارے صوفیا نے تو تعلق باللہ کے لئے بھی یہی پانچ مدارج روحانی طور پر لئے ہیں۔ یعنی پہلا درجہ استغراق و انہماک کا جس میں سلوک کی منزل طے کرنے والے اپنے آپ کو تمام شہوات اور ماسوی اللہ سے کھینچ کر اللہ تعالیٰ کی محبت میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ دوسرا درجہ پھر وہ ان تمام منازل سلوک کو خوشی خوشی طے کرتے ہیں۔ اور اس میں ایک لذت اور سرور پاتے ہیں۔ تیسرا درجہ پھر وہ ترقی روحانی اور حصول کمالات میں بغیر کسی رکاوٹ کے تیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ پھر وہ چوتھے اور پانچویں مدارج کو پا لیتے ہیں۔ یعنی دوسروں پر سبقت لے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دوسروں کی تکمیل کرنے کے اہل ہو جاتے ہیں الغرض یہ پانچ درجے ہیں۔ پہلے انہماک۔ پھر شوق و نشاط۔ پھر تیزروی اس کا نتیجہ یہ کہ دوسروں پر سبقت لے جانا۔ اور ان کے امور کے انتظام اور تدبیر کرنے کا اہل بن جانا۔ کوئی امر ہو دین کا یا دنیا کا وہ اپنے کمال کو حاصل نہیں کرتا جب تک اس امر کے کرنے والے ان پانچ مدارج کو طے نہیں کرتے۔ خدمت دین کے کام میں بھی یہی پانچ مدارج جب تک طے نہ ہوں وہ بھی اپنے کمال کو نہیں پہنچتا۔ صحابہ کرام رضی کی عدیم المثال کامیابی انہیں پانچ مدارج کے طے کرنے کا نتیجہ تھی۔

ان پانچ قسموں یعنی شہادتوں اور دلائل کے بعد جواب قسم جو دعویٰ ہوا کرتا ہے وہ محذوف ہے۔ اور وہ دراصل پچھلی دو قسموں میں جو بطور نتیجہ کے بیان ہوئی ہیں مضمر ہے یعنی اگر چاہتے ہو کہ دوسری تمام قوموں پر سبقت لے جاؤ اور دنیا کے امور مہمہ کے انتظام اور تدبیر کرنے کے اہل بن جاؤ تو عمل کے حصول کمال کے ان پانچ مدارج کو سامنے رکھو اور اپنے

آپ کو ان کمالات کا وارث بنالو۔ اب وقت آگیا ہے کہ موعودہ انقلاب عظیم آئے۔ اور عمل میں کمال حاصل کرنے والوں کو اپنے عمل کا پھل ملے اور وہ دوسروں پر سبقت لے جانے والے اور آئندہ مملکت کے مدبر اور حاکم بنیں۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ جس دن کانپنے والی کانپے گی۔

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ پیچھے آنے والی اس کے پیچھے آئے گی۔

عام طور پر الراجفہ سے مراد نفخۂ اولیٰ لیا گیا ہے جس سے قیامت کے دن یہ تمام نظام عالم ہلاک اور فنا ہو جائے گا۔ اور الرادفۃ سے مراد نفخۂ ثانیہ لیا گیا ہے جس میں نشاۃ ثانیہ ہو کر تمام اوّلین و آخرین جناب الٰہی کے حضور میں حاضر اور جمع ہو جائیں گے۔ اور اُس دن عمل میں کمال حاصل کرنے والے آخرت کی کامیابی اور فلاح کے وارث ہوں گے مجھے اس معنے سے انکار نہیں اغلب ہے کہ مقصود اصلی یہی معنی ہوں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ عمل کے کمالات اور اس کے نتائج کا مظاہرہ آنحضرت صلعم کی زندگی میں بھی ایسا بے نظیر ہوا کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ پس اس سورت میں الراجفہ سے مراد وہ تمام زلازل ہوں گے۔ جو جنگوں کی صورت میں ملک عرب پر آئے۔ پس ان آیات کے یہ معنے ہوئے کہ دن آنا ہے کہ کانپنے والی کانپے گی۔ یہ ایک لطیف استعارہ ہے۔ یعنی اس ملک میں بڑا زلزلہ آئے گا۔ اسلام کے ظہور کے بعد جو بڑی زبردست جنگیں ہوئیں۔ اور فتنے اٹھے اور بڑے بڑے جھونکے آئے جس سے سارا ملک ہل گیا۔ اور عرب تھرا اٹھا۔ انہیں ایک زبردست زلزلہ سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا اس زلزلہ کے بعد انقلاب ایک لازمی امر ہے تتبعها الرادفة۔ پیچھے آنے والی اس کے پیچھے آئے گی۔ یہ کیا چیز تھی جو پیچھے آئے گی۔ ظاہر ہے کہ وہی انقلاب عظیم جو ملک میں ایجی ٹیشن اور زلازل کے بعد ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کسی انقلاب آنے سے قبل ملک میں سخت زلازل آتے ہیں۔ اور ایجی ٹیشن ظہور پذیر ہوتا ہے اسکے بعد امن اور فتوحات کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہی وہ انقلاب ہوتا ہے جو راجفہ کے بعد بطور رادفۃ ساتھ لگا ہوا آتا ہے۔ پس فرمایا اس انقلاب عظیم سے وہی جماعت فائدہ اٹھائے گی۔ جو اعمال کے مختلف مدارج طے کر کے سبقت لے جائے گی۔ اور تدبر امر یعنی ملک کی حکومت اور انتظام کی اہل ثابت ہوگی۔ اگر چاہتے ہو کہ کامیابی اور فتوحات تمہارے حصہ میں آئیں اور تم اس زمین پر غالب آجاؤ۔ تو پھر جس کام کو اٹھایا ہے۔ اسے پورے انہماک پورے انشراح اور خوشی اور پوری تیزدہی سے کرو تاکہ قوموں سے مقابلہ میں آگے بڑھ جاؤ۔ اور تدبیر اور حکومت کے اہل ثابت ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب پیچھے آنے والی آئی تو مسلمانوں کی فتح اور کامیابی کو ساتھ لیتی آئی۔ کیونکہ وہ عمل کے تمام مراتب طے کر کے اس کے اہل ٹھہر چکے تھے۔ اس انقلاب کے ذریعہ بالمقابل جو جماعتیں مسلمانوں کی مخالفت میں سر توڑ لگی ہوئی تھیں ان کا انجام کیا ہونا تھا۔ جسے پیچھے آنے والی نے ساتھ لانا تھا وہ بھی سن لو۔ فرماتے ہیں:۔

قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ ۝ دل ہونگے جو اس دن پریشانی کی حالت میں ہوں گے۔

أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝ (یعنی ندامت اور شرمندگی کی وجہ سے) ان کی نظریں جھکی ہوئی ہوں گی۔

اس میں اُن کی پریشانی اور شرمندگی دونوں کا ذکر ہے۔ صرف پریشانی ہی اگر انسان کو ہو تو پھر قابلِ برداشت ہوتی ہے لیکن اگر اس کے ساتھ شرمندگی اور ندامت بھی ہو تو تکلیف ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے یہ معاملہ قیامت میں تو ہو دیگا ہی۔ مگر رادفہ یعنی پیچھے آنے والی جو آئی تو یہی نظارہ دُنیا کی اسٹیج پر بھی نظر آگیا۔ فتح مکہ کے وقت یہی حالت کفار مکہ کی ہوئی اُس دن کی پریشانی اور شرمندگی جو انہیں ہوئی وہ حیطۂ بیان سے خارج ہے

يَقُولُونَ أَإِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ ۝ کہتے ہیں کیا ہم اُلٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے۔

أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ کیا ہم جب کھوکھلی ہڈیاں ہو جائیں گے۔

(حافرہ کہتے ہیں کسی چیز میں عود کرنے کو یہاں تک کہ اُس کا آخر اس کے اوّل پر لوٹایا جائے۔ اور یہاں مراد زندگی کی طرف لوٹایا جانا ہے) آنے والے انقلابِ عظیم اور اس میں کافروں کی ندامت کے ذکر کے بعد یقولون سے نیا کلام شروع ہوتا ہے یقولون میں جس قول کا ذکر ہے وہ کافروں کا وہ اعتراض ہے جو وہ اعمال کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے اور اپنی ضمیر کی خلش اور نبی کی تنبیہ کے اثر سے بچنے کے لئے عام طور پر کیا کرتے ہیں اور اسی قسم کے ضمیر کُش اعتراضوں کا نتیجہ یہ ہُوا کرتا ہے۔ کہ جب خدا کی طرف سے انقلابِ عظیم کی گھڑی آتی ہے اور نتائج اعمال نکلتے ہیں۔ تو سوائے پریشانی اور شرمندگی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ایسے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اعمال کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے طرح طرح کی باتیں بناتے رہتے ہیں۔ اور اپنی ضمیر کی آواز کو مارنے کے لئے کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب مر کر ہڈیاں کھوکھلی ہو جائیں گی تو کیا ہم پھر واپس لوٹائے جائیں گے۔ چونکہ یہ اُن کی طاقت سے باہر ہوتا ہے۔ اس لئے دل کو یہ طفل تسلی دے لیا کرتے ہیں۔ کہ ایسا کس طرح ممکن ہے۔ لیکن ساتھ ہی ضمیر کی ایک عجیب آواز اندر سے اُٹھتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اعمال کے ذمہ دار بننا نہیں چاہتے وہ مرنے کے بعد کی زندگی پر اعتراض نہ کریں تو اور کیا کریں کیونکہ اس میں انہیں اپنا نقصان نظر آتا ہے کہتے ہیں

قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ کہتے ہیں تب یہ لوٹنا نقصان والا ہے۔

یہ کہنا دل میں کہنا ہے۔ یہ ضمیر کی آواز ہے یعنی یہ اُن کا ضمیر کہتا ہے کہ اگر مسلمانوں کا عقیدہ بعث بعد الموت سچا ہے تو پھر تو ہم بڑے گھاٹے میں رہیں گے۔ حضرت علی نے بھی ایک مرتبہ دہریوں کو اسی امر کی طرف توجہ دلائی تھی۔ فرمایا کہ "اگر مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں تب ہمیں تو کوئی نقصان نہیں اور اگر زندگی ہے تو پھر تمہارا نقصان تو ظاہر ہے" یہی خود ایک منکر دہریہ کی فطرت کے اندر سے آواز اٹھتی ہے کہ اگر مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے تو پھر ہم تو بڑے نقصان میں ہیں مطلب یہ ہے کہ آخرت کے انکار کی اصل وجہ کوئی محالِ عقلی نہیں بلکہ محض اپنے اعمال کی ذمہ داری سے بچنے کیلئے ایک قسم کی طفل تسلی ہے ورنہ اندر سے تو اُن کا ضمیر بھی ملزم کرتا رہتا ہے بھلا جس خدا نے ساری کائنات پیدا کی اور بچا

چیزوں سے جاندار پیدا کر دیئے اُس کے آگے یہ کونسی بڑی بات ہے فرماتے ہیں:-

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ وہ تو صرف ایک ہٹی انٹ ہوگی (ڈانٹ سے مراد ہی الٰہی حکم معہ اپنی قدرت و جلال کے)

فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝ اور وہ لوگ زمین کے اُوپر ہوں گے۔

اس میں اپنی قدرت کاملہ کا اظہار فرمایا ہے۔ کہ خدا جب ایک کام کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کا ایک حکم یا ڈانٹ کافی ہوتی ہے اور وہ چیز موجود ہو جاتی ہے گویا جس طرح کافروں نے کہا تھا کہ مرنے کے بعد کی زندگی تو بڑی مشکل بلکہ ناممکن بات ہے۔ تو ٹھیک اس کے مقابلہ میں فرمایا کہ نہیں بڑی آسان بات ہے۔ ایک ڈانٹ سے سب کچھ ہو جائے گا۔ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں دنیا میں بھی اس قدرت کاملہ کی ایک جھلک دکھلادی اس طرح کہ ایک الٰہی ڈانٹ میں سارا عرب مسخر ہو گیا۔ اور آخر وہ دن آ گیا جب بڑے بڑے مغرور اور صاحب قوت کفار خدائی فیصلہ سننے کے لئے مکہ کے میدان میں موجود نظر آئے۔ تو ایسے صاحب قدرت کاملہ خدا کے لئے کیا مشکل اور عجیب بات ہے کہ آخرت میں بھی بہت بڑے اور مکمل پیمانہ پر خدائی حکم اور ڈانٹ کے نیچے لوگ اس کے حضور میں خدائی فیصلہ سُننے اور اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے کے لئے موجود نظر آئیں۔ دُنیا میں قدرت کاملہ کا ظہور اسی لئے ہوا کہ تا وہ قیامت میں خدائی فیصلہ کے دن کیلئے بطور دلیل کے ہو۔ جب خدا ایک چیز کو موجود کرنے لگتا ہے تو اُس کے اسباب بھی جمع کر لیتا ہے آخر مسلمانوں اور کفار عرب کا مقابلہ چیونٹی اور ہاتھی کا مقابلہ تھا اور ان پر غالب آنا بالکل بعید از قیاس امر تھا۔ لیکن خدا نے جب یہ کرنا چاہا تو وہ اسباب بھی جمع ہو گئے۔ اور اس سرعت سے جمع ہوئے کہ دیکھتے دیکھتے مسلمان غالب ہو گئے۔ اور فتح مکہ کے بعد کفار اپنے اعمال کے بدلہ میں خائب و خاسر ہو کر معافی مانگتے نظر آئے پس اسی طرح انسان مر جائے مٹ جائے جو کچھ بھی ہو جائے جب خدا یہ چاہے گا۔ کہ انسان کے اعمال کا بدلہ پورا پورا دیا جائے تو اُس کے حکم کے ساتھ وہ اسباب بھی جمع ہو جائیں گے۔ کہ انسان خدا کے سامنے ایک نئی زندگی کی حالت میں اپنا نتیجہ اعمال پانے کے لئے آن حاضر ہو

یہ جو فرمایا کہ ہمارا ایک حکم یا ایک ڈانٹ ہی کافی ہے اور سب کے سب میدان میں آجاویں گے۔ یہ قدرت و جلال کی آواز ہے کہ اے غافل انسان جسے تو مشکل اور ناممکن سمجھ رہا ہے وہ میرے لئے آسان ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دعوی کو بے دلیل نہیں چھوڑا۔ اور سارے قرآن کی طرز یہی ہے۔ کہ جب ایک دعوی کرتا ہے تو ساتھ دلیل بھی دیتا ہے وہ اپنے دعوی کو ثابت کرنے کے لئے اپنے ماننے والوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہاں جو دعوی کیا گیا تھا کہ ایک آواز اور ایک حکم میں یہ انقلاب رونما ہو جائے گا۔ اور سب لوگ خدائی فیصلہ کے لئے میدان میں آحاضر ہوں گے اس کے لئے دو قسم کے ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں ایک نبوت سے اور دوسرا فلسفہ سے۔

نبی اور فلاسفر کے استدلال میں یہ فرق ہوتا ہے کہ نبی باطن سے ظاہر کی طرف آتا ہے اور فلسفی ظاہر سے باطن کی طرف جاتا ہے۔ ایک فلسفی ظاہر حالات و واقعات سے استدلال کر کے صرف اس قدر حکم لگاتا ہے۔ کہ فلاں بات یوں ہونی چاہیئے اور نبی

براہ راست خدا سے علم پاکر پیش کرتا ہے کہ فلاں بات یوں ہے فلسفی اور نبی کی مثال اندھے اور آنکھوں والے کی ہے جس طرح اندھا کسی چیز مثلاً ایک میز کو ٹٹول ٹٹول کر اور جو کچھ اُسے محسوس ہوتا ہے اُس سے قیاس کر کر کے نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ میز ہونا چاہیئے لیکن آنکھوں والا صاف دیکھ رہا ہے کہ یہ میز ہے اسی طرح ایک فلسفی بھی باطنی عالم کے متعلق ظاہر حالات سے قیاس کر کر کے نتیجہ نکالتا ہے کہ فلاں بات یوں ہونی چاہیئے لیکن نبی قیاس سے نہیں بلکہ براہ راست خدا سے علم پاکر دنیا کے سامنے اعلان کرتا ہے کہ فلاں بات یوں ہے۔ اسی لئے نبی کا علم یقینی ہوتا ہے ظنی نہیں ہوتا۔

کفار کا یہ اعتراض کہ اگر ہڈیاں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ تو پھر ہم کیسے لوٹائے جائیں گے۔ دراصل بعث بعد الموت پر اعتراض تھا وہ اس سے اپنے نفس کو اور خلق کو اس مغالطہ میں ڈالنا چاہتے تھے کہ جب اعمال کے نتائج ہی مشتبہ ہیں۔ تو اعمال کی ذمہ داریاں کیسی؟ غرضکہ یہ ساری نفس امارہ کی غفلتوں اور سرکشیوں کی پردہ پوشی کا سامان تھا۔ قرآن نے اس اعتراض کو دو قسم کے دلائل سے رفع کیا ہے اس رکوع میں تو جواب کو نبوت سے مدلل کیا ہے اور اگلے رکوع میں فلسفہ سے۔

نبوت سے اس طرح مدلل کیا ہے کہ آنحضرت صلعم سے قبل دنیا کی ہر قوم میں اور ہر گوشہ میں خدا کے راستباز نبیوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جو سب کے سب خدا سے علم پاکر دنیا کو متفقہ طور پر ایک ہی سبق پڑھاتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد ایک اور زندگی ہے۔ جہاں اعمال کے نتائج کا ظہور ہوگا۔ ان میں سے ایک کے حالات کو بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش کرتے ہیں۔

اس انتخاب میں حضرت موسیٰ کو اس لئے خاص طور پر لیا گیا۔ کہ انہیں آنحضرت صلعم سے خاص طور پر مماثلت ہے کتاب استثناء باب ۱۸ میں حضرت موسیٰ اپنے مثیل کی پیشگوئی کرتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کی رسالت کو پیش کرتے ہوئے قرآن نے اس پیشگوئی کی طرف صاف طور پر اشارہ کیا ہے۔ کہ انا ارسلنا الیکم رسولاً شاھداً علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولاً۔ کہ ہم نے بیشک تمہاری طرف رسول بھیجا ہے جو تم پر گواہ ہے۔ جیسے ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ پس نبیوں میں سے حضرت موسیٰ کے حالات اور ارشادات کو مثال کے طور پر لینے میں یہ خاص مماثلت بھی مد نظر ہے۔ فرماتے ہیں:۔

هَلْ أَتٰىكَ حَدِيثُ مُوسٰى ○ کیا تیرے پاس موسیٰ کی خبر پہنچی ہے۔

نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں حضرت موسیٰ کے واقعات اور ارشادات کو اس رکوع میں بیان کرتے ہیں۔

إِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ○ جب اس کے رب نے اسے وادی مقدس طویٰ میں پکارا۔

طویٰ طی سے ہے جس کے معنے ہیں لپیٹنا پس طویٰ کے معنے ہیں قرب کے۔ یعنی جس پر مسافت لپیٹ لی گئی۔ مراد ہے قرب الٰہی سے جو حضرت موسیٰ کو طریق اجتباء پر حاصل ہوا۔ اس لئے اس وادی کا نام بھی طویٰ ہوا ورنہ اس وادی کا نام اہل دنیا میں طویٰ مشہور نہ تھا۔ اسے طویٰ اسی لحاظ سے کہا گیا۔ کہ وہاں حضرت موسیٰ کو مقام فنا فی اللہ اور قرب الی اللہ حاصل ہوا حضرت موسیٰ فرعون مصر سے بھاگ کر مدین چلے گئے تھے۔ کیونکہ آپ کے ہاتھ سے ایک قبطی مارا گیا تھا مصر کی حکومت آپ کے خون کی پیاسی تھی۔ کئی سال کے بعد مدین سے حاملہ بیوی کو ساتھ لئے ہوئے کسی اشارہ الٰہی کے ماتحت قوم کے پاس مخفی طور پر

جانا چاہتے تھے جو رستہ میں جنگل بیابان میں سردی کی اندھیری رات میں بیوی کو دردِ زہ شروع ہوا۔ کس قدر نازک وقت ہے ایسی پریشانی کی حالت میں کشفی نظر میں دور ایک چمک نظر آتی ہے مگر ایسی نمایاں اور واضح کہ حضرت موسیٰ کو اس پر آگ کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ آگ لینے جاتے ہیں تو نقشہ کچھ اور نظر آتا ہے۔ وحی الٰہی شروع ہو جاتی ہے رسالت کے منصب پر کھڑا کیا جاتا ہے اور اُسی فرعون کی طرف جانے کا حکم ہوتا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے خون کا پیاسا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ زمے فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ حد سے زیادہ نکل گیا ہے۔

اس فرعون کی سرکشی اور حد سے گذر جانے کا علم ہوتے ہوئے پھر حضرت موسیٰ کو حکم ہوتا ہے کہ اس فرعون کی طرف جاؤ اور ہمارا پیغام پہنچاؤ۔ وہ پیغام کیا تھا۔ یہاں اس کا خلاصہ نہایت مختصر لفظوں میں جناب باری ارشاد فرماتے ہیں:۔

فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ پھر کہہ کہ تو کیا چاہتا ہے کہ تو پاک ہو جائے۔

وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝ اور میں تجھے تیرے رب کی طرف رستہ دکھاؤں۔ سو تو ڈرے۔

ذرا دیکھنا فرعون جیسا متکبر شاہنشاہ سامنے ہے دشمن ہے اور خون کا پیاسا ہے۔ کیا خدائی جلال ہے۔ اور کیا شانِ استغنا ہے۔ ایسے متکبر انسان کو یہ سنانا کیا معنے رکھتا ہے کہ کیا تو چاہتا ہے کہ تو پاک ہو جائے اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ تجھے پاکیزگی سے کوئی حصہ نہیں۔ پھر اتنا ہی نہیں اُسے یہ بھی کہا کہ تیرا خدا ہونے کا دعویٰ گمراہی اور ضلالت ہے۔ آ میں تجھے تیرے رب کی طرف رستہ دکھاؤں تو پھر تجھے پتہ لگے گا۔ کہ خدا کون ہوتا ہے۔ اور اُس کی کیسی شان ہوتی ہے۔ خدا کی معرفت کچھ پیدا ہوگی تو تُو اُس سے ڈرے گا۔ اور یہ سرکشیاں چھوڑ دے گا۔ خشیت تزکیہ اور ہدایت کا نشان ہے۔ جب تک خدا پر کامل ایمان نہ ہو۔ اور اس کی تائید اور نصرت شاملِ حال نہ ہو۔ ایسی تحدی اور ایسی نڈر تبلیغ ایک جابر حاکم کو کرنا بڑا مشکل ہے۔ صحابہ کرام اور سلف صالحین نے بڑے بڑے شاہنشاہوں کے دربار میں بڑی بڑی جرأت سے حق کی آواز بلند کی ہے۔ مگر آج مسلمانوں کو کسی کو تبلیغ کرنا اس قدر مشکل نظر آتا ہے کہ ایک کلمۂ حق منہ سے نہیں نکال سکتے۔ ڈرتے ہیں کہ کہیں مخاطب ناراض نہ ہو جائے۔ یوں نہ کہہ دے" کہ تمہیں میرے مذہبی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟ تبلیغ حق میں یہ کمزوریاں ایک مومن میں نہ ہونی چاہئیں مسلمانوں کی قوم تو خدا نے محض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی تبلیغ حق کے لئے کھڑی کی ہے۔ لیکن سچی بات یہی ہے کہ جس قدر خدا سے شدید تعلق ہوتا ہے اتنا ہی تبلیغ حق میں دل مضبوط ہوتا ہے۔ تزکید کا لفظ زکی سے ہے جس کے معنے ہیں نشوونما دینا۔ جیسے جیسے انسان پاک ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اُس کے روحانی قویٰ کا نشوونما ہوتا جاتا ہے۔

فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝ زمے پھر اُس نے اس کو بڑا نشان دکھایا۔

فرعون نے جب معقول اور پُرحکمت باتوں کو نہ مانا تو ضرورت پڑی کہ موسیٰ کی تائید میں نشانات آسمانی ظاہر ہوں جس سے

آپ کے منجانب اللہ ہونے کی تائید ہو۔

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝ مگر اُس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔

سرکش انسان نہ کوئی معقول بات مانتا ہے نہ خدا کے نشانوں کی پروا کرتا ہے۔ اس نے خدا کے نشانوں کی بھی تکذیب کی اور خدا کے پیغام کی نافرمانی کی۔

ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝ پھر وہ کوشش کرتا ہوا پھر گیا۔

یعنی صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ خدا کے پیغام کی نافرمانی کی بلکہ موسیٰ کی مخالفت اور تکذیب کیلئے کوشش اور تدابیر شروع کر دیں

فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ پھر لوگوں کو جمع کیا۔ پھر پکارا۔

فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ اور کہا میں تمہارا رب ہوں بلند و برتر۔

لوگوں کو کیوں جمع کیا؟ حضرت موسیٰ کے عصا والے نشان کے مقابلہ کے علاوہ لوگوں پر سیاسی اثر ڈالنا بھی منظور تھا امرا نے اُسے کہا تھا کہ موسیٰ کی اپنی قوم کی آزادی کے لئے درخواست محض ایک دھوکا ہے اس کا حقیقی مقصد تیری سلطنت کا پانسہ پلٹنا ہے لہذا ضروری تھا کہ وہ لوگوں کو جمع کر کے اُن کے سامنے اپنی فوقیت اور برتری کا اعلان کرتا اور اُن سے وفاداری کا اقرار لے کر اپنے دل کی تسلی کر لیتا۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۝ پھر اللہ نے اُسے آخرت اور دنیا کی عبرتناک سزا میں پکڑا۔

کتنی بڑی طاقت فرعون کی تھی۔ کہ تمام لوگوں کو جمع کر کے اپنی خدائی کا اعلان کرتا ہے اور کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں اس سے بڑھ کر استبدادیت کی مثال دنیا میں اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن باوجود اتنی بڑی طاقت کے اس کے اعمال کیا نتیجہ دکھاتے ہیں۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے آخرت اور دنیا کی عبرتناک سزا میں پکڑا۔ دنیا کی سزا پہلے ملی اور آخرت کی بعد میں۔ لیکن آخرت کی سزا کو پہلے ذکر کیا۔ اس لئے کہ اصلی سزا تو وہیں ملتی ہے دُنیا کی سزا تو محض عبرت کے واسطے اور آخرت کی سزا کے لئے بطور دلیل اور تمہید کے ہوا کرتی ہے دنیا کی سزا پر غور کرو کہ جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کو فرعون کی غلامی اور تشدد سے چھڑانے کے لئے راتوں رات پوشیدہ طور پر نکال لے جاتے ہیں۔ تو یہ متکبر بادشاہ بڑے غرور اور گھمنڈ سے اس غریب اور عاجز قوم کو پکڑنے اور کچل ڈالنے کے لئے اپنے لاؤ لشکر سمیت تعاقب کرتا ہے۔ اور اس مظلوم قوم کی آنکھوں کے سامنے سمندر میں غرق کر دیا جاتا ہے اور اس کی لاش آج بھی مصر کے عجائب خانہ میں زبانِ حال سے پکار پکار کر اعمال کے نتائج کی صداقت کو ہر ایک آنے جانے والے کے سامنے بیان کر رہی ہے۔

ع ۲۶ ۳ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی ۝ بیشک اسمیں اس شخص کیلئے عبرت ہے جو ڈرتا ہے۔

عبرت کا لفظ عبور سے ہے جس کے معنے ہیں پار ہونا۔ عبرت کے معنے ہیں باطنی طور پر ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف عبور کر جانا۔ اس واقعہ میں کیا عبرت ہے یہی کہ اعمال اپنے نتائج رکھتے ہیں۔ اور نبی جو تعلیم لاتے ہیں کہ ایک دن مرنے کے بعد خدا کے حضور حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے بالکل برحق ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسی امر سے فرعون کو ڈرایا تھا۔ اور بتایا تھا۔ کہ اعمال ضرور پھل لائیں گے۔ اپنے عملوں کی طرف سے غافل نہ ہو۔ اور آخرت کے عذاب پر دنیا کے عذاب کو بطور دلیل کے پیش کیا تھا۔ کہ اگر تو باز نہ آیا تو اسی دنیا میں ہلاکت کا منہ دیکھے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور خدا کے منہ کی باتیں جو حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو سنائی تھیں پوری ہوئیں۔ پس جیسا کہ موسیٰؑ نے کہا تھا فرعون کے اعمال نے دنیا میں عذاب کا منہ دکھایا اور موسیٰؑ کی بات سچی ہوئی اور یہ اس پر دلیل ٹھہر گئی کہ موسیٰؑ صادق تھا۔ اور جو کچھ اس نے خدا سے خبر پا کر اعمال کے نتائج کے متعلق اور آخرت کے متعلق باتیں کہی تھیں۔ سب سچ تھیں اور حضرت موسیٰؑ کا ذکر تو محض نمونہ کے طور پر ہے۔ ورنہ دنیا کے ہر حصہ میں جو بھی خدا کا راستباز نبی آیا ہے۔ اس نے یہی تعلیم دی ہے کہ اعمال کے نتائج آخرت میں ضرور ضرور ظاہر ہوں گے اور اُن کی زندگی میں جب کوئی جابر اور سرکش انسان یا جماعت مخالفت کے لئے قدم اٹھاتی ہے اور اُن کی تکذیب میں حد سے بڑھ جاتی ہے تو خدا اپنے نبی کی تصدیق کے لئے اسی دنیا میں اعمال کے نتائج کا ایک مظاہرہ کرتا ہے جس میں بدوں کو بد اور نیکوں کو نیک بدلہ دے کر آخرت پر ایک دلیل قائم کر کے دکھا دیتا ہے۔ اور چونکہ ایک طرف نبی اور اس کی جماعت نہایت کمزور اور بیکس و بے بس ہوتی ہے اور مخالفین کی جماعت اپنی پوری طاقت اور دولت و حکومت کے ساتھ مخالفت کرتی ہے اور حالات ایسے ہوتے ہیں کہ نبی کی بات کے پورا ہونے کا کہ "حق غالب ہوگا اور نیکوں کو کامیابی اور بدوں کو رسوائی اور ذلت نصیب ہوگی"۔ بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کے ساتھ وہ سب اسباب جمع ہو جاتے ہیں جو نیکوں کو اُن کے نیک اعمال اور بدوں کو ان کے بد اعمال کے پھل اسی دنیا میں دے کر علم ریاضی کے اربعہ متناسبہ کی طرح اس بات کو ثابت کر دیتے ہیں کہ آخرت میں نتائج اعمال برحق ہیں۔ کیونکہ جب ایک مخبر صادق کی نتائج اعمال کے متعلق کہی ہوئی بات دُنیا کے متعلق بالوجہ احسن پوری ہوئی۔ تو آخرت کے متعلق اس کی کہی ہوئی باتیں کیوں نہ سچی ہوں کیونکہ دونوں باتوں کا منبع علم ایک ہی ہے اور ایک ہی سرچشمہ سے دونوں امور کا علم نبی کو ملتا ہے اور درحقیقت وہ ایک ہی بات ہے جس پر سے مشیت الٰہی کے ماتحت اس دُنیا میں بھی کسی قدر پردہ اٹھا دیا جاتا ہے تا وہ آخرت کے لئے بطور دلیل کے ہو۔

آئندہ زمانہ کے متعلق نبی کا علم تو چونکہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ یقینی ہوتا ہے چنانچہ نبی بغیر کسی شک و شبہ کے بتلاتا ہے کہ ایسا ہوگا لیکن آئندہ زمانہ کے متعلق فلسفہ کی دوڑ محض استدلال تک محدود ہوتی ہے جس سے وہ ایک بات کا امکان غالب ثابت کرتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ مثلاً اسی امر کے بارے میں کہ اعمال اپنے نتائج رکھتے ہیں اور انسان کی موت کے بعد کوئی زندگی ہے جس میں انسان اپنے اعمال کے لئے جوابدہ ہے۔ اور وہاں کی راحت اور تکلیف نتائج اعمال پر منحصر ہے۔ نبوت، تو صاف طور پر خدا سے خبر پا کر علم دیتی ہے کہ ایسا ہوگا لیکن فلسفہ کوئی آئندہ کا علم

نہیں دے سکتا۔ سوائے اس امر کے کہ وہ امکان عقلی یا استبعاد عقلی ثابت کرے یعنی اس مسئلہ میں فلسفہ صرف دو باتوں پر بحث کر سکتا ہے۔ (۱) ایک تو یہ کہ جس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اس کو دوسری بار پیدا کرنے کی طاقت بھی ہے یا نہیں؟ (۲) دوسرے یہ کہ دوسری بار پیدا کرنے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ خدا کا کوئی کام بلا ضرورت نہیں ہو سکتا۔ اگلی آیات میں انہی دو باتوں پر بحث ہے فرماتے ہیں:۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا ۝ کیا پیدائش میں تم زیادہ سخت (مشکل) ہو یا آسمان۔ خدا نے اُسے بنایا۔

انسان چیز ہی کیا ہے ذرا سی ہستی، ساری زمین و آسمان اور کائنات کے سامنے اس کی حقیقت ہی کیا ہے آسمان کی عظمت و شان کا اندازہ لگانا بھی ناممکن ہے۔ ایک ہمارا ہی نظام شمسی کس قدر عظیم الشان ہے لیکن اندازہ کرو کہ تین ارب سورج اور ان کے نظام تو اب تک دریافت ہو چکے ہیں۔ اور ابھی دریافت کا سلسلہ جاری ہے۔ ان کے اندر کیا کیا ہوگا اس کا حال اللہ کو ہی معلوم ہے۔ انسان کی اس تمام مخلوق کے مقابلہ میں ہستی ہی کیا ہے۔ پس جس نے اس ساری کائنات کو بنایا اس کو انسان کے دوبارہ پیدا کرنے میں کیا دقت ہو سکتی ہے؟

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝ اس کی بلندی کو اونچا کیا پھر اُسے ٹھیک ٹھاک بنایا۔

آسمان کی بلندی کا کیا ٹھکانا ہے؟ خیال کرکے بھی دل بیٹھ جاتا ہے۔ ایک قطب تارے کی اونچائی کا اندازہ اس طرح کرو۔ کہ روشنی ایک سیکنڈ میں تقریباً سوا لاکھ میل سے بھی زیادہ چلتی ہے۔ میں نے ایک دفعہ پڑھا تھا۔ کہ قطب تارے کی روشنی ۵۷ برس میں ہم تک پہنچتی ہے گویا یہ روشنی جو قطب تارے کی آج ہم کو پہنچ رہی ہے یہ ۵۷ سال پہلے کی چلی ہوئی ہے۔ اور اگر آج قطب تارا فنا ہو کر مٹ جائے تو ۵۷ سال تک وہ ہم کو برابر نظر آتا رہے گا۔ اور ۵۷ سال کے بعد اس کی روشنی اس دنیا سے نابود ہوگی۔ بعض ستاروں کی روشنی کئی کئی سو سال میں ہم تک پہنچتی ہے۔ پھر باوجود اس قدر بلندی و وسعت کے سارا نظام سماوی کس خوبی اور ضوابط و قواعد کے ساتھ قائم ہے۔ کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں اور جو چیز جہاں بنی ہے اور جس کام کے لئے بنی ہے۔ اس سے بہتر ممکن نہیں۔

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝ اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اسکی روشنی نکالی۔

آج سائنس کی تحقیق اس بات پر متفق ہے۔ کہ سب سے پہلے اس عالم مادی میں ایتھر بنا جو انتہا درجہ کی ظلمت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اندھیرے کے بعد روشنی پیدا ہوئی کیونکہ آفتاب بعد میں پیدا ہوا لیکن یہاں الشمس نہیں فرمایا بلکہ ضحٰھا فرمایا یعنی آسمان کی روشنی کیونکہ آسمان کی روشنی بیشمار آفتابوں پر مشتمل ہے۔ ایک آفتاب پر نہیں۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ اور زمین کو اس کے بعد پھیلا۔

دحیٰ کے معنے ہیں۔ الگ کر کے ایک پتھر کی طرح پھینک دینا۔ اس لفظ کے اختیار کرنے میں کس قدر علمی تحقیق مضمر ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے آج علم ہیئت بڑی تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ ابتدا میں سورج کا کرہ جو زور سے گھوم رہا تھا۔ اس میں سے کسی بڑے جرم سماوی کے اثر سے مختلف ٹکڑے چنگاریوں کی طرح الگ ہو کر زور سے فضا میں پھینکے گئے۔ جو پھر سورج کی کشش سے اس کے گرد گھومنے لگے۔ انہی میں سے ہماری ایک زمین بھی ہے۔ جو سرد ہو کر رفتہ رفتہ کئی مرحلوں میں سے گذر کر قابل رہائش بنی۔ قرآن نے یہ آج سے تیرہ سو سال قبل بتایا تھا اور بعد ذالک میں بتایا کہ آسمان پہلے بنا اور زمین بعد میں بنی۔ کیونکہ زمین تو فقط سورج کا ایک ٹکڑا ہے جو الگ ہو کر اور فضا میں سرد ہو کر قابل رہائش بنا۔

ان تمام چیزوں کی پیدائش کا ذکر کرنے سے مطلب یہ تھا۔ کہ کیا ان عظیم الشان چیزوں سے بھی بڑھ کر تمہاری پیدائش مشکل ہے۔ انہی چیزوں سے تو پہلی مرتبہ تمہاری پیدائش ہوئی اور زندگی وجود میں آئی۔ تو پھر جب ہم یہ تمام چیزیں پیدا کر سکتے ہیں تو تمہاری دوبارہ زندگی اور تمہیں دوبارہ پیدا کر لینا کیا مشکل ہو سکتا ہے۔

اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا زمین سے اس کا پانی اور اس کا چارہ نکالا

سب سے پہلے جب زمین الگ ہوئی تو پانی پیدا ہوا۔ اور تمام زندگیاں اسی پانی سے پیدا ہوئیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ وجعلنا من الماء کل شئ حی پانی سے پھر سبزی پیدا ہوئی جو جانداروں کے لئے چارہ ہے جن سے اُن کی زندگی قائم رہتی ہے۔ ابھی انسان پیدا بھی نہ ہوا تھا۔ جو اس کی زندگی قائم رکھنے کا سامان پانی اور چارہ پیدا کر دیا۔

وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا اور پہاڑوں کو مضبوط بنایا۔

زمین پر پانی تو بن چکا تھا۔ مگر وہ سخت کھاری تھا۔ اس لئے وہ نہ چارہ پیدا کر سکتا تھا۔ نہ انسان کی زندگی کو قائم رکھنے کے کام آ سکتا تھا۔ کیونکہ انسان اسے پی نہ سکتا تھا۔ اس لئے سمندر سے پانی بخارات بن کر اٹھتا ہے۔ ماسنون کی ہوائیں چلتی ہیں۔ وہ ان بخارات کو لے اڑتی ہیں۔ یہ پہاڑ ہیں جو انہیں روک کر بلند کرتے اور بادلوں کی شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں پھر وہ برستے ہیں جن سے زمین میں چارہ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان و حیوان کی زندگی قائم ہے۔ لیکن ہر وقت تو برسات کی ہوائیں نہیں چلتیں۔ نہ ہر وقت بارشوں کا سلسلہ قائم رہ سکتا ہے۔ اس لئے جو پانی برستا ہے کچھ تو پہاڑ جذب کر لیتے ہیں جن سے چشمے پھوٹتے اور دریا بنتے ہیں اور جس طرح دریا ظاہر میں زمین پر بہتا ہے اسی طرح اس کے ساتھ ساتھ زمین کے نیچے پانی چلتا ہے جس سے کنوئیں وغیرہ بنتے ہیں اور کچھ پانی برفوں کی شکل میں پہاڑ ذخیرہ کر لیتے ہیں جو گرمیوں اور خشک موسم میں پگھل پگھل کر دریاؤں کو بھرتا اور زمینوں کو سیراب کرتا رہتا ہے غرضکہ پہاڑ انسان کی زندگی کو قائم رکھنے میں بیحد ممد ہیں۔ اور علاوہ ازیں زمین پر انسان کا قیام بھی انہی پہاڑوں کے توازن قائم رکھنے سے ہے ورنہ زلزلوں سے زمین ناقابل رہائش ہو جاتی۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ تمہارے لئے اور تمہارے چارپایوں کے لئے سامان زندگی۔

یعنی یہ تمام چیزیں حیوانوں اور انسان کی حیوانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ انسان کی حیوانی زندگی میں نے اس لئے کہا کہ کھانا پینا صرف انسان کی حیوانی زندگی کے قیام کے لئے ہے جس میں حیوان اور انسان دونو شریک ہیں پس اگر انسان کی پیدائش کا مقصد بھی فقط کھانا پینا ہی ہے۔ تو پھر انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز کچھ نہیں رہتا۔ دونو میں مابہ الامتیاز اگر کچھ ہے۔ تو وہ اعمال اور نیکی و بدی کا امتیاز ہے کہ اسی کو انسانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان کو عقل و ادراک کانشنس سب کچھ عطا کیا گیا ہے۔ تاکہ خود شناسی اور خود اختیاری کے ساتھ دنیا میں عمل کرے اور ان عملوں کا ذمہ دار ٹھیرے۔ پس انسان کی انسانیت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس عالم کے سوا کوئی اور عالم ہو جو موجودہ عالم کے لئے بطور نتیجہ کے ہو۔ جہاں انسان اپنے عملوں کے لئے جوابدہ ہو۔ کیونکہ یہ ساری موجودہ کائنات اور اس کی تمام قوتیں جو کام کر رہی ہیں۔ انسانی اعمال پر کامل طور پر حاوی نہیں۔ ان کا پنجوڑا اور خلاصہ انسانی پیدائش اور فقط اس کی حیوانی زندگی کا قیام ہے۔ اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اگر انسان کی انسانیت کے لئے اس کے اعمال ہی مابہ الامتیاز ہیں۔ تو پھر انسان کے اعمال کے یا دوسرے لفظوں میں انسان کی انسانیت کے لئے یہ عالم فقط آغاز اور تمہید کے طور پر ہو سکتا ہے۔ اور اس کا انجام اور اس کی تکمیل کسی اور عالم کو چاہتا ہے۔ ورنہ پھر انسان کی حیثیت ایک چوپایہ سے بڑھ کر کچھ نہیں رہتی۔ کھانے پینے نر و مادہ کے تزویج میں چوپایہ اور انسان برابر ہیں۔ یہی اشارہ متاعا لکم ولانعامکم میں فرمایا ہے۔ کہ یہ ساری مادی کائنات اور اس کا مقصد تو یہاں آکر ختم ہو جاتا ہے۔ کہ انسان کھائے پیئے اور اپنی حیوانی زندگی قائم رکھے۔ اگر انسانی زندگی اتنی ہی ہے تو اس میں اور ایک حیوان میں کوئی فرق نہ رہا۔ پس اگر انسان میں اور حیوان میں کوئی فرق ہے۔ اور وہ اس کے اعمال اور اس کا فہم و ادراک ہے جس کے ماتحت وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ تو پھر اعمال کے نشوونما اور ان کے نتائج کی تکمیل کے لئے کوئی اور عالم ضرور ہونا چاہیئے۔ گویا اس میں اس ضرورت کو بتلایا جو اگلے عالم کے پیدا ہونے کی متقاضی ہے۔ بتایا اگر وہ عالم پیدا نہ ہو تو انسان کا پیدا ہونا بیکار گیا۔ کیونکہ اس کی انسانیت کی نشوونما اور تکمیل اس عالم میں تو نہیں ہو سکتی۔ یہ عالم تو اس کی حیوانیت کی نشوونما اور تکمیل پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ ضرور ہے کہ کوئی اور عالم ہو جس میں اس کی انسانیت کی تکمیل ہو۔

الغرض فلسفہ جن دو امور پر بحث کر سکتا تھا وہ کلی طور پر کر دی۔ (۱) پہلے تو یہ کہ وہ خدا جو آسمان اور زمین کو پیدا کر سکتا ہے وہ انسان کو دوبارہ کیوں نہیں پیدا کر سکتا۔ انسان کی پیدائش کچھ ان چیزوں سے زیادہ مشکل تو نہیں بلکہ انہی چیزوں سے وہ پیدا ہوا ہے۔ (۲) دوسرے دوبارہ پیدائش کی ضرورت بھی بتلا دی کہ انسان کے اعمال کا اگر کچھ نتیجہ نہ نکلے تو پھر انسان کی انسانیت بے معنی ٹھیر جاتی ہے۔ اس کی حیثیت پھر ایک چوپائے سے بڑھ کر نہیں رہتی۔ موجودہ عالم تو اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو انسان کے لئے صرف اس کی پیدائش اور اس کے قیام زندگی کا اس قدر سامان مہیا کرتا ہے جو اس کی حیوانیت کے تقاضہ کو پورا کرتا ہے۔ اور انسان کی انسانیت کے لئے وہ فقط بطور تمہید کے ہے لہذا اعمال کے نتائج کے ظہور کے لئے جس پر انسانیت کی تکمیل منحصر ہے کسی اور عالم کا ہونا ضروری ہے تا انسان

کی پیدائش کا مقصد پورا ہو۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کیا خوب فرمایا ہے ؎

خوردن برائے زیستن وذکر کردن است ۔ تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

انسان حیوانوں کی طرح محض کھانے پینے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ عمل کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اگر ان اعمال کا نتیجہ کچھ نہیں تو یہ امتیاز جو اُسے حیوانات پر دیا گیا ہے بے معنی ہو جاتا ہے۔

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرَىٰ ۝ پھر جب سب پر غالب آنیوالی مصیبت آجائے گی۔

آخرت پر دلائل دینے کے بعد اب اس کا نقشہ کھینچتے ہیں طامہ کے معنے ہیں سب پر غالب آنے والی۔ طم الماء۔ پانی چڑھ گیا اور سب پر غالب آگیا۔ طامہ یہاں قیامت کو فرمایا ہے۔ قرآن کی بعض اصطلاحات عجب فصاحت و بلاغت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ وہ بعض دفعہ ایک ہی چیز کو اس کے مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے مختلف نام دیتا ہے۔ مثلاً قیامت کو اس نے الحشر بھی کہا ہے القیامہ بھی کہا ہے۔ الساعہ بھی کہا ہے۔ الطامہ بھی کہا ہے الصاخہ بھی کہا ہے القارعہ بھی کہا ہے۔ الحاقۃ بھی کہا ہے۔ غرضکہ جس قسم کا موقع و محل ہو اسی کے مطابق نام دیتا ہے۔ اور وہ اس موقع کے مناسب حال بہتر سے بہتر موزوں نام ہوتا ہے۔ الطامہ کے معنے ہیں جو ہر درجہ پر غالب آجائے مطلب یہ کہ جب اعمال کا نتیجہ نکلتا ہے تو وہ ایسا غلبہ کا رنگ اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی طرح اس سے انسان بچ نہیں سکتا۔ اور نہ وہ ٹالے سے ٹلتا ہے۔ الطامۃ الکبریٰ فرما کر یہ بتلانا چاہا ہے کہ اعمال کے نتائج بعض دفعہ کسی قدر یہاں بھی ملتے ہیں۔ لیکن ایک الطامۃ الکبریٰ ہوگی جہاں پوری روشنی کے ساتھ اعمال کے نتائج ظاہر ہوں گے وہاں سے پھر کوئی راہ مفر نہ ہوگی کیونکہ وہ سب پر غالب ہوں گے اور کسی کی گردن اس سے باہر نہ ہوگی۔ دنیا میں مثال کے طور پر دیکھ لو جس روز یونیورسٹی کے امتحان کا نتیجہ نکلتا ہے وہ سب طلباء پر غالب ہوتا ہے اس دن نالائقوں کی ناکامی اور محنت کرنیوالوں کی کامیابی ایسی ہوتی ہے کہ اس سے اب کوئی مفر کی راہ نظر نہیں آتی۔ یہ دنیا کے امتحانوں کے نتائج ہیں جو ابھی اپنے اندر سینکڑوں قسم کے نقص رکھتے ہیں تو اس دن کا اندازہ کرو جو الطامۃ الکبریٰ کا دن ہوگا اس دن جو خدا کے قانون کے نیچے عملوں کے نتائج نکلیں گے اس کے غلبہ سے کون نکل سکتا ہے۔

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ ۝ جس دن انسان کو یاد آجائیگا جو اُس نے کوشش کی۔

اعمال کے ان نتائج کے ظہور سے انسان کو سب اپنی مساعی اور اعمال یاد آجاوینگے۔ اور اپنی کرتوت کا سارا نقشہ نظروں میں پھر جائیگا

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ ۝ اور دوزخ اس کیلئے ظاہر ہو جائیگا جو دیکھتا ہے۔

انسان کے دل کی آنکھیں کھلی ہوں تو وہ جہنم جو انسان اپنے اعمال سے تیار کرتا ہے اس دنیا میں بھی نظر آتا رہتا ہے لیکن جہنم بصیرت نہ ہو اور انسان جان بوجھ کر اپنی بداعمالیوں کے نتائج بد سے آنکھیں بند کرے تو وہ امر دیگر ہے۔ جس کی ضمیر مردہ نہ ہو۔ اُسے تو بدی کے نتیجہ میں دوزخ کی آگ اسی دنیا میں محسوس ہونے لگتی ہے لیکن قیامت میں نتائج کا غلبہ اس قوت اور شان سے ظاہر ہوگا۔ کہ جہنم سب دیکھنے والوں کی نظروں کے سامنے آجائے گا۔ وہ جن کے دل کی آنکھیں دنیا میں بند تھیں اور ضمیر

مُردہ تھے۔ وہ بھی اس روز اپنے جہنم کو سامنے دیکھیں گے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ۙ وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ۙ سو جو کوئی حد سے نکل گیا اور اُس نے دنیا کی زندگی کو مقدم کیا۔

فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی ؕ تو بیشک دوزخ ہی ٹھکانا ہے۔

دنیا کی زندگی کو مقدم کرنا یہی ہے کہ نفس کی خواہشات اور جذبات کو خدا کے احکام پر مقدم کرنا اور خدا کی باندھی ہوئی حدوں کو توڑ کر صراطِ مستقیم سے ہٹ جانا۔ اس کا نتیجہ جہنم ہے۔ آج چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھو دنیا کی زندگی کو مقدم کرنا لوگوں کی زندگی کا دستور العمل بنا ہوا ہے خدا اور اس کا دین بھول چکا ہوا ہے اسی لئے مجدد وقت حضرت مرزا غلام احمد صاحب جو اس زمانہ کے مُردہ دلوں کیلئے مسیح موعود بنکر تشریف لائے تھے۔ اس روحانی وبا کو شناخت کر کے اپنی بیعت میں یہی عہد لیا کرتے تھے کہ میں دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا۔ زمانہ کی نبض شناسی اس سے بہتر ہو نہیں سکتی۔ اس زمانہ کی رُوحانی بیماری کا علاج یہی عہد تھا۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ اور جو کوئی اپنے رب کے مقام سے یعنی اسکے حضور میں کھڑا ہونے سے ڈرتا ہو اور نفس کو خواہشات سے روکتا ہے

عَنِ الْھَوٰی ؕ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی ؕ تو بیشک جنت ہی ٹھکانا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اعمال کی ذمہ داری اور خدا کے حضور میں جوابدہی کی ذمہ داری کو محسوس کرنا اور اس سے ڈرنا اور نفس کی خواہشات پر خدا کی رضا کو مقدم رکھنا یہی جنت کو پیدا کر دیتا ہے۔ صحابہ کرام کی قوم بھی عجوبہ جنتی قوم تھی۔ خدا کا خوف ایسا ان کی خواہشات پر غالب تھا کہ کیسا ہی امتحان ہو وہ اس میں پورے اُتر جاتے تھے اُن کے ہیچو قسم حالات سے سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں جس کا دل چاہے پڑھ دے مثال کے طور پر ایک دو واقعے بیان کر دیتا ہوں حضرت عثمانؓ خلیفہ تھے عرب عراق روم و شام مصر و افریقہ ترکستان و افغانستان کے شہنشاہ تھے۔ ایک دفعہ غصہ سے ایک غلام کا کان کھینچا جب کھینچ چکے تو خدا کے حضور جوابدہی سے ڈرے غلام کو فرمایا کہ اس کے بدلہ میں تم میرا کان کھینچ لو۔ اوّل تو اس نے انکار کیا آخر ان کے اصرار سے کھینچا تو ہلکے سے کھینچا حضرت عثمانؓ نے فرمایا نہیں اتنے زور سے کھینچو جتنی زور سے میں نے کھینچا تھا میں خدا کے حضور میں جوابدہی سے ڈرتا ہوں۔ غلام نے کہا کہ اگر آپ کا کان اس مقدار سے زیادہ کھینچا گیا جتنا کہ آپ نے کھینچا تھا تو میں بھی خدا کے حضور جوابدہی سے ڈرتا ہوں۔ یہ تھی وہ پاک جماعت جس میں بادشاہ ہو یا غلام سب یکساں طور پر خدا کے حضور جوابدہی سے ڈرتے تھے۔ آج کون ہے جو نہیں چاہتا کہ میں سستا سودا خریدوں بلکہ تمنا یہ ہوتی ہے کہ دوکاندار کی آنکھ میں خاک جھونک کر کوڑیوں کے مول چیز خرید لاؤں دوکاندار کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ خریدار کو الٹے استرے سے مونڈ لوں ایک صحابی کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔ ایک صحابی کے پاس ایک شخص گھوڑا بیچنے لایا اس نے اس کی کچھ قیمت بتائی آپ نے گھوڑے کو دیکھ کر فرمایا یہ گھوڑا تو زیادہ قیمت کا ہے چنانچہ پیش کردہ قیمت میں سو درہم بڑھا دیئے۔ پھر فرمایا گھوڑے کو قدم چلاؤ۔ قدم چلانے پر فرمایا یہ زیادہ قیمت کا ہے سو درہم اور بڑھا دیئے پھر فرمایا دولکی چلاؤ دولکی دیکھ کر فرمایا یہ اور بھی زیادہ

قیمت کا ہے سو درہم اور بڑھا دیئے۔ پھر فرمایا پویہ چلاؤ۔ پویہ دیکھ کر فرمایا یہ اور بھی زیادہ قیمت کا ہے۔ اور سو درہم بڑھا دیئے چنانچہ اصل پیش کردہ قیمت سے تگنے چوگنے دام پر وہ گھوڑا خرید لیا۔ اور فروخت کرنیوالے کو کہا۔ کہ تمہیں اس گھوڑے کی خوبیوں کا علم نہ تھا اسلئے تم کم قیمت پر بیچ رہے تھے میں نہیں چاہتا کہ تمہاری ناواقفیت سے فائدہ اٹھا کر تمہاری بیش قیمت چیز کو کم قیمت پر خرید لوں میں خدا کے سامنے جوابدہی سے ڈرتا ہوں۔ اس کا نام ہے تقویٰ۔ اور خدا کا خوف یہی لوگ ہوتے ہیں جو فردوس کے وارث ہوتے ہیں آج کوئی ناواقف شخص ہیرا بیچنے آدے تو کانچ کا ٹکڑا بتا کر اسکی قیمت چند آنے بتا دیں گے۔ بعد کے مسلمانوں میں بھی ایسے بادشاہ گذرے ہیں جو خدا کے خوف کو اپنی خواہشات پر مقدم رکھتے تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید کی نہایت چہیتی بیوی ملکہ زبیدہ نے ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید کو کسی جھگڑے کے اثنا میں کہدیا کہ تو تو جہنمی ہے۔ بادشاہ نے بھی غصہ میں کہہ دیا کہ اگر میں جہنمی ہوں تو تو مجھ پر حرام ہے جب بادشاہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو بہت پچھتایا۔ زبیدہ کے بغیر کسی طرح چین نہ پڑتا تھا علماء سے استصواب کیا تو انہوں نے کہا کہ حضور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ جہنمی نہیں ہیں اور جنتی ہیں یہ تو خدا ہی کو علم ہے اسلئے زبیدہ آپ پر حرام ہے۔ اسکے حلال ہونیکی ہمیں تو کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ بڑی مصیبت پڑی۔ حضرت امام شافعیؒ ان دنوں بچہ تھے استاد کے ساتھ دربار میں گئے تو یہ چرچا سنا کہنے لگے کہ میں اس مشکل کا حل جانتا ہوں آپ مجھ سے فتویٰ طلب کریں مگر اس شرط سے کہ میں تخت پر بیٹھا ہوں اور آپ سائل کی حیثیت سے میرے سامنے کھڑے ہوں خلیفہ نے منظور کر لیا۔ اس ہونہار بچہ کو تخت پر بٹھا دیا اور خود کھڑے ہو کر سارا واقعہ دہرایا۔ اس بچہ نے سوال کیا کہ آپ کو ملکہ کے پاس جانیکی بڑی زبردست تڑپ اور خواہش ہے پھر کونسی چیز ہے جو آپ کو ملکہ کے پاس جانے سے روک رہی ہے۔ خلیفہ نے کہا کہ خدا کا خوف بچہ نے کہا۔ تو پھر آپ جنتی ہیں اور زبیدہ آپ پر حلال ہے۔ کیونکہ قرآن کریم آپ کو جنتی ٹھیراتا ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی۔ واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی کہ جو شخص خدا کے حضور میں کھڑے ہونے سے ڈرتا ہے اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکتا ہے پس اس کا ٹھکانا جنت ہے خلیفہ اور تمام دربار کے لوگ اس قرآنی استدلال کو سنکر پھڑک اٹھے اور علماء اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۝ وہ تجھ سے اس گھڑی کے متعلق سوال کرتے ہیں کب اس کا قائم ہونا ہے۔

جب اس طامۃ الکبریٰ کا ذکر کیا جس میں اعمال کے نتائج کا غلبہ ہر چیز پر ہوگا۔ اور بدوں کا بدلہ جہنم اور نیکوں کا بدلہ جنت کا اعلان کیا جا چکا تو اب بجائے اس کے کہ اس معاملہ میں غور کیا جاتا اور غور و تحقیق کے بعد اپنے اعمال کی اصلاح کی جاتی کج بحثوں نے الٹی حجت بازی شروع کر دی کہ ہمیں ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ وہ گھڑی کب آئے گی وقت سال مہینہ گھڑی بتاؤ کج بحثوں کا یہی طریق ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خبر دیجاتی ہے اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ناحق کی کج بحثی اور حجت بازی شروع کر دیتے ہیں اور اس سے مقصد تحقیق حق نہیں ہوتا بلکہ محض تکذیب اور استہزا ہوتا ہے حضرت مجدد وقت مرزا غلام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے پیشگوئی کی تھی کہ ریاست کابل میں قریب پچاسی ہزار کے مریں گے"۔ بچہ سقہ نے جب کابل پر حملہ کیا اور امان اللہ خاں بھاگنے لگا۔ تو میں نے بعض لوگوں سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت آگیا۔ اس پر وہ لوگ بجائے اسکے کہ ایسی صاف پیشگوئی سے متاثر ہوتے کہنے لگے کہ وقت تاریخ گھڑی پل بتاؤ کہ کب یہ پورا ہوگا میں نے کہا خدا سے ڈرو یہ پیشگوئی جس وقت کیگئی ہے اسوقت افغانستان محض ایک ریاست تھا اسکے بعد وہ سلطنت میں مبدل ہو گیا پھر افغانستان آزاد ہو گیا۔ امان اللہ خاں نے ترقیات مغربی سے اسے مالا مال کر دیا گویا جو

تمام حالت ترقی تھا مگر یہ خدا کا کلام یہ کہتا تھا کہ باوجود ان تمام ترقیات اور طاقتوں کے خدا کا کلام پورا ہو کر رہیگا۔ اور ریاست کابل میں خونریزیاں ہو کر رہیں گی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اور معتبر لوگوں کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ جو لوگ مارے گئے ان کی تعداد تو کسی انسان نے گنی نہیں مگر پون لاکھ اور لاکھ کے درمیان ہی ہوگی غرضیکہ آئندہ کی خبروں کے متعلق مکذبین و منکرین ہمیشہ کج بحثی کیا کرتے ہیں اور بجائے فائدہ اٹھانے کے وقت گھنٹہ گھڑی پل ہی پوچھا کرتے ہیں یہی یہاں مذکور ہے کہ بجائے اسکے کہ اعمال کی جوابدہی سے ڈرتے اور اپنی اصلاح کرتے۔ کج بحثی کے رنگ میں لگے پوچھنے کہ اس گھڑی کا وقت اور تاریخ بتاؤ کب وہ آئے گی فرماتے ہیں:۔

فِيمَ أَنتَ مِن ذِكْرَاهَا ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ مُنتَهَاهَا ۝ کس لئے یہ سوال ہو تو تو صرف اس کا یاد دلانیوالا ہے؟ تیرے رب کی طرف اس کا منتہیٰ ہے۔

فیم مخفف ہے فی ما۔ ھذا السوال کا یعنی یہ سوال کسلئے ہے تو کوئی ان پر داروغہ نہیں تو تو صرف یہ خبر دیکر انہیں قبل از وقت اس گھڑی سے خبردار کرنا مانگتا ہے جو ان پر اور سب آنیوالی ہے مانیں گے تو ان کا فائدہ ہے نہیں مانیں گے تو ان کا اپنا نقصان ہے مان کر کچھ تجھ پر احسان نہیں کرینگے جو تجھ پر فضول سوال شروع کردیئے تیرا کام اس گھڑی کی خبر دینا تھا سو دیدی ان لغو سوالوں اور انکے جواب دینے کی تجھے کوئی ضرورت نہیں انت من ذکراھا کے یہ بھی معنے ہیں کہ خود تیرا بھیجا جانا ہی قیامت کی علامت میں سے ہے کیونکہ آپکے وجود کے ذریعہ اس دنیا میں خدا نے نتائج اعمال کو ایسا صاف طور پر کھول کھول کر بیان کیا بلکہ مشاہدہ کروا دیا کہ قیامت کا نقشہ اہل دنیا کی آنکھوں کے سامنے قائم کر کے دکھا دیا اور نیکوں کو نیک بدلہ اور بدوں کو بد بدلہ ملتے ہوئے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ الغرض بتانا یہ منظور ہے۔ کہ تیرا کام فقط اس گھڑی کی خبر قبل از وقت لوگوں کو دینا ہے تا وہ ہوشیار ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر سکیں باقی رہا اس گھڑی کا صحیح صحیح علم۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منتہی ہوتا ہے اس کے سوا کسی کو اس گھڑی کا علم نہیں۔

إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرُ مَن يَخْشَاهَا ۝ بیشک تو صرف اُسے ڈرانیوالا ہے جو اس گھڑی سے ڈرتا ہے۔

جو کج بحثی کرتے ہیں وہ نفع نہیں اٹھاتے البتہ جو اس گھڑی سے ڈرتے ہیں وہ نبی کے ڈرانے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔ اور اعمال کی جوابدہی کو مدنظر رکھتے ہیں۔ انہی کے لئے نبی کا ڈرانا مفید ہوتا ہے۔

كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا جس دن اس گھڑی کو دیکھیں گے (تو ایسا معلوم ہوگا)

ع ۲ إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا ۝ کہ گویا وہ صرف ایک شام یا صبح ہی ٹھہرے تھے۔

جب عذاب آجاتا ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ سکھ کا زمانہ چشم زدن میں گذر گیا عمر گذر جاتی ہے اور پتہ نہیں لگتا یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ٹھہرے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہے پس فرمایا کہ آج اس وقت کی قدر کرلو اور قرآن کی ہدایات سے اور نبی کی دی ہوئی خبر سے فائدہ اٹھالو اور اپنی اصلاح کرلو جب وہ گھڑی آگئی جس کے متعلق آج کج بحثیاں کر کر کے بات کو ٹالنا چاہتے ہو تو اس وقت پچھتاؤ گے پھر گیا وقت ہاتھ نہیں آنے لگا عمر گذری ہوئی اور وقت ہاتھ سے گیا ہوا واپس نہیں آتا۔ مبارک ہے وہ جو ان کی قدر کرتا ہے۔

سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ | وَهِيَ اثْنَتَانِ وَاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً

اس سورت کا نزول مکّہ معظمہ میں ابتدائی زمانہ میں ہُوا۔ سورۃ النّبا میں بتایا تھا کہ اعمال اپنے نتائج ضرور رکھتے ہیں سورۃ النازعات میں بتایا تھا کہ اعمال کی تکمیل اور اس کیلئے جدّ جہد کا کیا رنگ ہونا چاہیئے اس سورۃ عبس میں بتایا کہ اعمال سے جو کمالات روحانی حاصل ہوتے ہیں اُن کے حصول میں کوئی خلقت کا نقص یا غربت و افلاس روک نہیں ہُوا کرتی بلکہ اعمال کے بجالانے اور ان میں ترقی و تکمیل کیواسطے سب کیلئے یکساں راہ کھلی ہوئی ہے۔ امیر ہو یا غریب بادشاہ ہو یا رعایا۔ اندھا ہو یا بینا۔ بہرا ہو یا سننے والا۔ سب کیلئے جنابِ الٰہی کے حضور میں ترقی و کمالِ رُوحانی کیلئے جو عمل سے حاصل ہوتی ہے یکساں راہ کھلی ہوئی ہے۔ اور سب کے اعمال اپنی اپنی جگہ یکساں نتائج پیدا کرینگے اس میں کسی امیر یا حاکم یا نبی یا ولی کی اولاد یا کسی معزز قوم یا اعلیٰ خاندان کی کوئی تخصیص نہیں کہ وہ اگر بدعمل کریں گے تو اُن کے نتائج سے بچ جائینگے یا غریبوں کو اپنے اعمال صالحہ پر اتنے اعلیٰ نتائج نہیں ملیں گے جو امیروں یا اعلیٰ قوم کے لوگوں کو ملیں گے۔ خدا کی نظروں میں سب لوگ یکساں ہیں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ غریب اپنے اخلاص و ایمان اعمال صالحہ و اخلاق فاضلہ کی وجہ سے امیروں سے آگے نکل جائیں خدا کو ایمان و اخلاص اعمال صالحہ و اخلاق فاضلہ پسند ہیں خواہ اس کا کرنے والا کتنا ہی غریب اور دنیوی لحاظ سے حقیر شخص ہو پس تبلیغ میں امیر یا غریب کا کوئی لحاظ نہیں ہونا چاہیئے۔ عام طور پر لوگوں کو خواہش ہوتی ہے کہ کسی بڑے آدمی کو تبلیغ کر کے اسلام میں یا اپنی جماعت میں داخل کریں حالانکہ یہ اصول غلط ہے کیونکہ کسی کو کیا پتہ ہے کہ کس کے دل میں تحقیق حق کا شوق اور خشیت و اخلاص ہے اور وہ تبلیغ سے نفع اٹھائے گا جو آدمی بھی نیک نیتی سے تلاش حق کے لئے آتا ہے خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا وہ حق رکھتا ہے کہ اسکی طرف تم زیادہ توجہ کرو۔ اور خدا کا پیغام اسے پہنچاؤ۔ چنانچہ اس سورت میں اسی امر کے متعلق جنابِ الٰہی ہدایات دیتے ہیں۔

ابنِ مکتوم ایک صحابی تھے جو آنکھوں سے اندھے تھے رسول اللہ صلعم کے پاس مکہ کے بعض بڑے بڑے اکابر آئے ہوئے تھے اُن کو آپ تبلیغ فرما رہے تھے ابنِ مکتوم بھی اسی وقت آگئے وہ اندھے تو تھے ہی انہیں کچھ پتہ نہ لگا گفتگو کے بیچ میں اپنے سوالات شروع کر دیئے آپ تبلیغ میں مشغول تھے یہ دخل در معقولات کچھ ناگوار خاطر ہُوا اور اس کی طرف توجہ نہ کی اسی واقعہ کو جنابِ الٰہی یوں بیان فرماتے ہیں

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ○ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ○ بُرا منایا اور منہ پھیر لیا اسلئے کہ اسکے پاس اندھا آیا۔

(عبس کے معنے ہیں چین بجبین ہونا یا بُرا منانا) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پر بھی اللہ تعالیٰ کی کتنی نظر تھی۔ آپ اتنے بلند اور اعلیٰ اخلاق پر تھے کہ خود قرآن میں آپ کے اخلاق کی اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے کہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کہ بیشک آپ اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق پر قائم ہیں ایسے بلند اخلاق کے صاحب سے اللہ تعالیٰ کو اتنی معمولی سی بات بھی گوارا نہ ہوئی جس کا یہاں ذکر فرمایا ہے حالانکہ آج موجودہ زمانہ کی تہذیب بھی یہی ہے کہ دوسروں کی باتوں میں دخل دینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اور جو شخص ایسا کرے اُسے بد تہذیب سمجھا جاتا ہے تو آنحضرت صلعم کو اگر یہ دخل در معقولات ناگوار ہُوا تو یہ تہذیب کے عین مطابق تھا۔ لیکن چونکہ وہ ایک اندھا اور غریب آدمی تھا۔ اس لئے محمد رسول اللہ صلعم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو یہ گوارا نہ ہُوا کہ ایک اندھے غریب کی طرف آپ توجہ نہ فرمائیں اور بڑے آدمیوں سے باتوں میں لگے رہیں غربا کی دلداری اور حوصلہ افزائی کے لئے ضروری تھا کہ نبی کے دربار میں ایسا کوئی

فرق نظر نہ آئے بلکہ غربا کو امرا پر ترجیح دی جائے اس لئے کہ قرآن کریم انسانیت کے وہ اعلیٰ اصول سکھانے آیا تھا جس سے یہی غریب اور چھوٹے چھوٹے لوگ اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات پر پہنچنے والے تھے۔ دو چار مرتبہ ابن مکتوم نے بات کی۔ جب حضرت نبی کریم صلعم کو تبلیغ میں مشغول دیکھا تو اٹھ کر اپنے گھر چلے گئے۔ اس پر یہ وحی نازل ہوئی جس سے آپ کانپ اُٹھے اور اسی وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ابن مکتوم کے گھر پہنچے۔ اور اُسے بلا کر لائے اور اس کے بیٹھنے کے لئے اپنی چادر بچھا دی۔ وہ ادب کی وجہ سے چادر پر بیٹھتا نہ تھا۔ لیکن اصرار کر کے بٹھایا۔ اور فرمایا کہ اب پوچھو کیا پوچھتے ہو۔ کیا اس سے یہ صاف نظر نہیں آتا کہ آپ کو اپنی وحی پر کس قدر ایمان تھا سرسید احمد مرحوم کا یہ خیال کہ وحی دل سے اٹھتی ہے اور دل پر پڑتی ہے کس قدر غلط ہے اگر ایسا ہی ہوتا تو کم سے کم یہ آیتیں تو قرآن میں نہ ہوتیں اول تو دل نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اس دخل اندازی کا ابن مکتوم کو کوئی جواب نہ دیا جائے اس لئے اس خلاف دل سے وحی اُٹھ نہ سکتی تھی اپنے ہی فتوے اور فیصلہ کے خلاف دل وحی نہ کر سکتا تھا دوم کبھی کوئی انسان یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کے متعلق کوئی ایسی بات لوگوں کی زبان پر چڑھی رہے جو اس کے کسی فعل پر تنبیہ کے رنگ میں ہو لیکن باوجود اس کے قرآن میں یہ تنبیہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موجود ہے اور رہے گی۔ اور ہر وقت لوگوں کی تلاوت میں آتی رہتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آنحضرت صلعم کے دل سے نہیں اٹھی تھی۔ بلکہ خارج سے آئی تھی یہ خدا کی وحی تھی۔ جو تنبیہ کے رنگ میں نازل ہوئی تھی۔ اور ایک نبی خدا کی وحی کو مخفی نہ رکھ سکتا تھا۔ اس لئے قرآن میں درج کرنی پڑی۔ اور امت محمدیہ کی ہدایت کے لئے ہمیشہ کے لئے قرآن میں وہ موجود ہے اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کوئی ایسا فعل نہ تھا جس کو اتنی اہمیت دی جاتی اس قدر اس پر زور دینے سے مقصد دراصل امت کو ہدایت دینا تھا ورنہ بذریعۂ وحی خفی بھی آپ کو سمجھایا جا سکتا تھا لیکن وحی متلو میں اس واقع کو لے آنے کا منشا درحقیقت امت کو سمجھانے کے لئے تھا کہ ہم تبلیغ میں بڑوں کو چھوٹوں پر نہ ترجیح دیا کریں۔ بلکہ متلاشیانِ حق کی یکساں قدر کریں۔ اور غربا کو حقیر نہ سمجھیں کہ خدا کے ہاں دل کی قدر ہے چنانچہ فرماتے ہیں

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ ۝ اور تجھے کیا خبر ہے کہ شائد وہی پاکیزگی اختیار کرے۔

تمہاری بعثت اور قرآن کے نزول کی غرض تو یہ ہے کہ لوگوں کا تزکیہ ہو یعنی اُن کے باطنی قویٰ نشوونما پاویں اور قلب میں پاکیزگی اور طہارت پیدا ہو تو کیا پتہ ہے کہ وہی اندھا شخص تزکیہ پا جاتا۔

أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ ۝ یا نصیحت قبول کرے تو نصیحت اُسے فائدہ دے۔

تبلیغ سے دو ہی قسم کے فائدے ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ انسان وہ اعلیٰ راہیں ترقی و کمال کی نبی سے سیکھے جن پر چل کر وہ تزکیہ اور قرب الٰہی کے مقام کو حاصل کر سکے۔ یہ تو بہت اعلیٰ مقام ہے۔ دوسرے اس طرح کہ انسان نبی کی پاک نصائح سے نفع اٹھا کر غلط راہوں کو چھوڑ دے یہ پہلے مقام سے تو کم ہے مگر ہے یہ بھی انسان کیلئے بیحد نفع بخش پس ارشاد ہوا کہ بالکل ممکن ہے کہ یہ اندھا آپکی تعلیم سے اعلیٰ مقام تزکیہ کا حاصل کرے یا اگر اتنا نفع نہ اٹھا سکے تو کم سے کم اتنا نفع اٹھائے کہ وہ غلط راہوں سے بچ جائے اور صراط مستقیم کو پالے لیکن یہاں ایک وہم پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ بڑے آدمی بھی اس قسم کا نفع آپ کی تبلیغ سے اٹھا لیتے اسلئے ارشاد ہوتا ہے:-

أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّىٰ ۝ جو پرواہ نہیں کرتا تو اسکی طرف تو متوجہ ہوتا ہے۔

بتایا کہ وہ بڑے آدمی جنکی طرف آپ اسوقت متوجہ تھے وہ تو اپنی بڑائی کی وجہ سے آپکے پیغام کی پروا بھی نہیں کرتے اور آپ انہی کو سنانا چاہتے ہیں

وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ ۝ اور تجھ پر کیا الزام ہے اگر وہ پاکیزگی نہ اختیار کرے۔

یعنی باوجود اسکے کہ وہ آپ کے پیغام ہدایت کی پروا بھی نہیں کرتے تھے پھر بھی آپ جو اُن کو برابر تبلیغ کئے جاتے تھے تو اس کا مطلب صاف طور پر یہی تھا کہ آپ کو یہ تڑپ تھی کہ کسی طرح وہ اس پیغام کو مان کر پاکیزگی اختیار کریں فرمایا آپ کو اس قدر دوسرے کی کیا ضرورت ہے اگر وہ نہیں مانتے اور پاکیزگی نہیں اختیار کرتے تو آپ تو کسی الزام کے نیچے نہیں ہیں۔ انہیں چھوڑ دو۔

وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَىٰ وَهُوَ يَخْشَىٰ ۝ اور جو تیرے پاس دوڑتا ہوا آیا اور وہ (خدا سے) ڈرتا ہے

فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ ۝ تو اُس سے بے رخی کرتا ہے۔

غور کا مقام ہے تبلیغ کا کیسا زریں اصول سکھایا ہے فرماتے ہیں ان پر توجہ دیتے ہو جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پروا بھی نہیں کرتے شاید یہ کہو کہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ کسی طرح اُن کا تزکیہ ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان کا تزکیہ نہ ہو تو تم پر کوئی الزام تو نہیں پس ان کیلئے اس قدر توجہ اور انہماک ٹھیک نہیں کہ دوسرے لوگوں کی طرف جو خدا سے ڈر کر تمہارے پاس آتے ہیں تم پوری توجہ نہ دے سکو۔

اس میں ایک نکتہ اور بھی قابل توجہ ہے آریہ لوگ جو اختلاف عالم سے تناسخ نکالتے ہیں اور اختلاف کو گذشتہ جنم کے اعمال کا نتیجہ بتلاتے ہیں اس عقیدہ کی یہاں تردید کر دی ہے کیونکہ قرآن نے اس جگہ صاف طور پر اعلان کیا ہے کہ کوئی پیدائشی نقص یا غربت و افلاس انسان کی ترقی روحانی میں روک نہیں ہے۔ سب کے لئے عمل کے واسطے یکساں راہ کھلی ہوئی ہے اور اعمال کے نتائج سب کو یکساں ملیں گے۔ اس دنیا کا اختلاف اسلئے ہے کہ بغیر اس کے اعمال کا وجود ہی نہ ہو سکتا تھا اس دنیا کے لئے اختلاف ضروری ہے۔ ورنہ دنیا چل نہیں سکتی۔ ہاں ہر ایک شخص جس حالت میں رکھا گیا ہے اسی دائرہ کے اندر اس کے اعمال کا موازنہ کیا جائیگا گویا دنیا ایک اسٹیج ہے جس پر ہر ایک شخص الگ الگ مختلف پارٹ ادا کر رہا ہے۔ جو اپنا مقررہ کردہ پارٹ خوبی سے اپنے مالک کے حسب منشا ادا کر جائیگا۔ وہی اگلے عالم میں جو حقیقی زندگی ہے سکھ اور ترقی کا وارث ہوگا۔ اس میں نہ امیر و غریب کی تخصیص ہے نہ اندھے اور سوجھے کی بلکہ دیکھو ایک اندھے کے اخلاص اور ایمان کی یہاں کس قدر تعریف کی ہے اور اس کے مقابلہ میں اکابر کو کس طرح رد کیا ہے پس بالکل ممکن ہے کہ غربا اور اندھے امرا اور اکابر سے اگلے جہان میں بڑھ جائیں اور جنت کے وارث بنیں اور اکابر جہنم کا ایندھن بنیں۔ الغرض یہ اختلافات جو اس دنیا میں نظر آتے ہیں عارضی اور فانی اور محض بطور تمہید کے ہیں تاکہ اختلاف حالات سے دنیا کا کام چلے اور انسان کو عمل کا موقعہ ملے گویا اختلاف حالات اس عالم کے لئے بطور بنیاد کے ہے پس اعمال اختلاف عالم کا نتیجہ ہیں نہ کہ اختلاف عالم اعمال کا نتیجہ ہے۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ خبردار۔ یہ قرآن تو تذکرہ ہے (بڑائی کا موجب ہے)

تذکرہ۔ ذکر سے ہے۔ ذکر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان شرف اور بزرگی حاصل کرے۔ فرمایا یہ قرآن تو بڑائی کا موجب ہے جو اپنے ماننے والوں کو بڑا بنا دے گا۔ خواہ وہ اندھا ہو یا سوجا کھا۔ بڑا ہو یا چھوٹا۔ جو کوئی قرآن کریم کو اپنا ہادی بنائیگا اور اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے روک کر قرآن کے احکام کے آگے سر جھکا دے گا۔ وہی دنیا میں بڑا بن جائیگا۔ ان الفاظ میں یہ خوشخبری دی کہ قرآن شریف انہی چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو بلند مقامات تک پہنچا دے گا۔ چنانچہ واقعات عالم گواہ ہیں کہ قرآن کریم کے یہ الفاظ حرف بحرف سچے ہوئے قرآن نے اپنے ماننے والوں کو بڑا بنا کر دکھا دیا۔ جب عرب کے غربا اس پر عمل پیرا ہوئے تو اُن کی شہرت اور بڑائی کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج گیا۔ اور دنیوی و اخروی نعماء کے وہ وارث بن گئے چنانچہ جب اسلام کا پیغام اور مسلمانوں کا سفیر کسرائے ایران کے دربار میں پہنچا۔ تو اس نے کس حقارت سے کہا ؎

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاجِ کیاں را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

فی الواقعہ عرب جیسے لوگوں کا جن پر ایرانیوں کا اس قدر دبدبہ اور رعب تھا کہ اُن کے دو سپاہی جا کر عرب کے بڑے سے بڑے آدمی کو پکڑ لاتے تھے کسرائے ایران کو اسلام کا پیغام اس شان سے دینا کہ تیری سلامتی اب اسلام میں ہی ہے ایران کے لوگوں کو جس قدر بھی حیرت میں ڈالتا کم تھا۔ لیکن آخر کار وہی ہوا جو پیغام دیا تھا کہ کسرائے ایران کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی ایک ایران کیا بڑی بڑی سلطنتیں انہی عرب کے غربا کے قدموں پر آن گریں جنہیں قرآن نے شرف اور بزرگی عطا کی تھی۔ خود عرب کے فخر کرنیوالے قبائل اور امراء و اکابر کو انہی غریب مسلمانوں کے آگے جھکنا پڑا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضہ صدیق خلیفہ ہوئے تو مکہ میں اُن کے والد ابو قحافہ ابھی زندہ تھے بہت بوڑھے تھے مگر ایک زمانہ دیکھے ہوئے تھے بڑے دانا اور تجربہ کار تھے انہوں نے کسی سے پوچھا۔ کہ "محمد (صلعم) تو فوت ہو گئے اب اسلام کا کیا بنا" کہنے والے نے کہا کہ قَامَ رَجُلٌ یعنی ایک شخص کھڑا ہو گیا۔" انہوں نے کہا: "کون کھڑا ہو گیا"۔ کہا "ابن ابی قحافہ" پوچھا "کس ابو قحافہ کا بیٹا؟" کہا: "تمہارا بیٹا" یہ سن کر وہ بڈھا تو اپنے دونوں زانوؤں میں سر دے کر غرق ہو گیا۔ بڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر پوچھا کہ "بنو ہاشم کہاں گئے؟" (یعنی وہ تو رسول اللہ صلعم کے خاندان کے لوگ تھے) کہا کہ "بیعت کر لی"۔ پھر بڈھا حیرت سے غرق ہو گیا پھر سر اٹھا کر پوچھا کہ "بنو اُمیہ کہاں گئے؟" (کیونکہ یہ بڑی پُر زور سیاست دان قوم تھی) کہا کہ "بیعت کر لی"۔ پھر بڈھا استعجاب سے غرق ہو گیا پھر سر اٹھایا اور پوچھا: "انصار کہاں چلے گئے؟" (جن کے پاس آنحضرت صلعم نے پناہ لی تھی) کہا "بیعت کر لی"۔ پھر تو بڈھا دریائے حیرت میں بالکل ہی غرق ہو گیا۔ سر اٹھا کر کہنے لگا۔ کہ "الاسلام حق"۔ یعنی پھر اسلام سچا ہے جو اتنے موانعات کے ہوتے ہوئے میرا بیٹا خلیفہ ہو گیا۔ ملاحظہ فرمایا؟ کس طرح قرآن نے حضرت ابوبکر کو شرف اور بزرگی کے تخت پر بٹھایا۔ کہ خلافت تمام موانعات کو توڑ کر خود اُن کے قدموں پر آن گری۔ حضرت عمر رضہ خلیفہ تھے۔ حج کر کے مدینہ واپس آ رہے تھے مکہ سے باہر ایک ببول کے درخت کو کھڑے ہو کر دیکھنے لگے ساتھ ہزارہا خلقت تھی سب کو کھڑا ہونا پڑا۔ حضرت عمر رضہ دیر تک کھڑے دیکھا کئے۔ ایک صحابی نے عرض کی کہ لوگوں کو دھوپ میں بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ آخر آپ اس درخت میں کیا دیکھ رہے ہیں فرمانے لگے "نو عمری کے

زمانہ میں مَیں اُونٹ چرایا کرتا تھا ایک مرتبہ مجھ سے ایک اُونٹ گم گیا میرے باپ نے اس درخت کے نیچے مجھے بڑا مارا۔ یا آج اسلام کی یہ برکت ہے کہ ہم دُنیا کے شاہنشاہ ہیں"۔ پس یہ قرآن تھا جس نے اُونٹ چرانے والوں کو دنیا و دین کا بادشاہ بنا دیا۔

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ سو جو کوئی چاہے اُسے یاد رکھے۔ اور اس کے ذریعہ شرف و عزت حاصل کرے۔

یعنی سب کے لئے اس قرآن پر عمل کرنے اور اس کے ذریعہ عزت و شرف حاصل کرنے کے لئے یکساں راہ کھلی ہوئی ہے نہ عرب کی تخصیص ہے نہ عجم کی۔ نہ امیر کی تخصیص ہے نہ غریب کی۔ نہ اندھے کی تخصیص ہے نہ سوجاکھے کی۔ قرآن تو ایک تذکرہ ہے جو کوئی چاہے اسے یاد رکھے اور اس پر عمل کرے۔ اور اس کے ذریعہ دین و دنیا کا شرف اور عزت حاصل کرے کیونکہ یہ چیز ہی ایسی ہے کہ انسان اسے یاد رکھے اور اس کے مطابق عمل کر کے بزرگی و شرف حاصل کرے قرآن کو یاد رکھنے کے حکم پر دو طریق سے ہی عمل کیا جاسکتا تھا (۱) ایک تو قرآن کو حفظ رکھنے سے۔ چنانچہ ہر ملک اور ہر زمانہ میں ہزارہا حافظ قرآن پیدا کئے گئے۔ اور یہ صرف قرآن کو ہی خصوصیت حاصل ہے۔ دنیا میں کوئی کتاب نہیں۔ جسے اس کثرت اور اس اہتمام سے اوّل سے لیکر آخر تک کبھی حفظ کیا گیا ہو۔ الہامی کتابیں متعدد ہمارے سامنے ہیں کبھی کوئی بھی قطعاً شروع سے لیکر آخر تک حفظ نہیں کی گئی۔ یہ قرآن کریم کی ہی امتیازی خصوصیت ہے۔ اور ایک ذوقی نکتہ یہ بھی ہے کہ اس سورت میں جس میں ایک اندھے پر اس قدر الٰہی نوازشات کی بارش ہوئی ہے قرآن کو یاد رکھنے کی تاکید کی برکت ہی سمجھنی چاہیئے کہ قرآن کو حفظ کرنے کی سعادت اندھوں کے حصہ میں بکثرت آئی ہو ویسے بھی اندھے آدمی کا حافظہ بلا کا تیز ہوتا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ایک اندھے پر اس کے اخلاص اور ایمان کی وجہ سے اس قدر جناب الٰہی کی طرف سے مراحم خسروانہ ہوئیں کہ اندھوں کے حصہ میں حفظ قرآن کی سعادت بکثرت آئی (۲) دوسرا طریق قرآن کو یاد رکھنے کا یہ تھا کہ اسے کتاب کی شکل میں لکھ لیا جاتا تاکہ وہ آدمی جو حفظ نہیں کر سکتے اس سے فائدہ اٹھا سکیں کیونکہ ہر ایک آدمی حفظ کر کے یاد نہ رکھ سکتا تھا اس لئے یادداشت کی شکل میں اُسے کتاب کی شکل میں خود جناب الٰہی کے حکم سے لکھا گیا۔ اسی امر کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ عزت والے صحیفوں میں۔ (یعنی قرآن جو تذکرہ ہے عزت والے صحیفوں میں مرقوم ہے)

مکرمۃ کے اندر بڑی زبردست پیشگوئی ہے فرماتے ہیں یہ قرآن ہمیشہ عزت پائے گا۔ ایشیا و افریقہ یعنی مشرق میں جس قدر عزت ہوئی وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن اب مغرب یعنی یورپ اور امریکہ کی باری ہے۔ وہاں اس وقت بھی جبکہ اصل کتاب کو پڑھنے والے اور سمجھنے والے ابھی پیدا ابھی نہیں ہوئے صرف قرآن کے ترجمے جن کے مترجم پادری ہیں پڑھ کر اہل مغرب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قرآن دنیا میں سب کتابوں سے افضل کتاب ہے۔ سوائے بائبل کے لیکن جب انشاء اللہ تعالیٰ ہماری جماعت کا ترجمہ پڑھا یا اصل متن کو سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو گئی تو قرآن کا اوّل نمبر پر آجانا یقینی ہے جب دنیا کی تمام مذہبی، اخلاقی اور فلسفی، تمدنی اور معاشرتی کتابوں پر سبقت مسلم ہو چکی ہے۔ تو بائبل پر سبقت لے جانا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ بائبل اور قرآن دونوں کے جاننے والے جانتے ہیں کہ بائبل کو قرآن سے کوئی نسبت نہیں الغرض قرآن کریم کے علم و حکمت کے متعلق یہ بڑی دلیرانہ پیشگوئی ہے کہ دنیا علم و سائنس میں جس قدر بھی چاہے ترقی کرے قرآن کی عزت بڑھے گی کیونکہ وہ اسے سرچشمہ تمام علوم و حکمت کا پائے گی چنانچہ

دیکھ لو جیسے جیسے سائنس اور حکمت نے ترقی کی دنیا کے مذاہب اور مختلف قوموں کی الہامی کتب ماند پڑتی گئیں۔ مگر قرآن کریم کی روشنی کی روز بروز چمک بڑھ رہی ہے۔ اور جو نیا علمی انکشاف بھی ہوتا ہے وہ قرآن کی عزت و مکرمت پر عقیدت کا پھول چڑھاتا ہے۔

مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ جو بلند اور پاک ہیں۔

آجکل مسلمانوں نے مرفوعہ کے معنے بس اتنے ہی سمجھ رکھے ہیں کہ قرآن کو اونچے طاقوں یا تختوں پر رکھ دیا جہاں مٹی اور گرد پڑتی رہے کبھی اٹھا کر اسے پڑھنے کی یا اگر پڑھ لیا تو سمجھنے کی زحمت اٹھانا گوارا نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ اس پر عمل کیا جائے۔ یہ بھی ایک رنگ میں قرآن کو پس پشت پھینکنا ہے کچھ شک نہیں کہ قرآن کریم کی عزت یہ چاہتی ہے کہ اسے بلند مقام پر رکھا جائے لیکن مرفوعہ کے فقط اتنے ہی معنی نہیں بلکہ اس کے حقیقی معنی تو یہ ہیں۔ کہ وہ سب چیزوں پر بلند ہونے کے لئے آیا ہے۔ دنیا بھر کی مذہبی کتابوں اور منطق اور فلسفہ سے اس کی تعلیم بلند، اس کا نقطۂ نظر بلند، اس کا مقام بلند۔ پھر کیوں ناس کا حکم سب رسم و رواج قومی اور خواہشات نفسانی پر بلند اور مقدم ہو۔ مگر افسوس ہے کہ آج اپنے رسم و رواج اور خواہشات نفسانی کی خاطر قرآن کے احکام کو نیچے گرا دیتے ہیں اس آیت کے ماتحت قرآن کا مقام ہر چیز سے بلند اور اس کا حکم سب پر مقدم ہونا چاہیئے۔ یہاں تک کہ قرآن کا مقام حدیث اور فقہ پر بھی بلند اور مقدم ہونا چاہیئے۔ مگر بدقسمتی سے فقہی علما فقہ کو قرآن و حدیث پر بلند اور مقدم کئے ہوئے ہیں۔ اور اہل حدیث علما حدیث کا درجہ قرآن پر بلند کرتے ہیں حالانکہ قرآن کا درجہ سب پر مقدم اور بلند ہے پس اصل مطلب مرفوعہ کا یہی ہے کہ قرآن کا مقام بلند اور اس کے احکام سب امور پر مقدم ہونے چاہئیں

پھر قرآن نرا بلند ہی نہیں وہ پاک بھی ہے۔ جو باتیں اس میں بیان کی گئی ہیں وہ نہایت پاکیزہ اور پاک کرنے والی ہیں۔ بائیبل میں ایسی جگہ بھی آجاتی ہیں جن کا پڑھنا شریف اور باحیا لڑکیوں کے لئے بہت مشکل ہو جاتا ہے بعض جگہ نہایت حیا سے خارج الفاظ اور کلمات استعمال ہوئے ہیں۔ ویدوں میں ایسی ایسی بھی شرتیاں موجود ہیں۔ کہ شرم و حیا کی پیشانی عرق خجالت سے تر ہو جاتی ہے۔ ان کا اردو میں ترجمہ کرنا نہایت حیا سوز ہو جاتا ہے لیکن قرآن نے الفاظ و معانی سب میں نہایت پاکیزہ طریق اختیار کیا ہے اگرچہ مسئلہ کتنا ہی نازک کیوں نہ ہو۔

بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝ لکھنے والوں کے ہاتھوں میں (جو) معزز (اور) نیک (ہیں)

سفرہ کے معنے لکھنے والے اور سفیر (پیغام بر) دونوں کے ہیں۔ فرماتے ہیں اس کے لکھنے والے سب کے سب قابل عزت اور مکرم و معزز اور نیک ہیں بلکہ صحابہ کرام بھی جو آنحضرت صلعم اور امت کے درمیان بطور سفیر اور پیغام بر کے ہیں۔ کہ انہی لوگوں کے ہاتھوں سے قرآن کریم امت تک پہنچا بتایا کہ سب کے سب معزز اور نیک تھے۔ نتیجہ یہ کہ چونکہ قرآن جن بزرگوں کے ہاتھوں سے لکھا گیا اور جن کے ذریعہ ہم تک پہنچا وہ سب کے سب شریف و معزز راستباز اور نیک تھے۔ اس لئے یہ کتاب بالکل محفوظ رہی۔ یہاں اہل تشیع اور خوارج کے لئے ایک سبق ہے کہ اللہ تعالیٰ خود گواہی دیتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں سے یہ قرآن لکھا گیا۔ جن میں خاص طور پر حضرت ابوبکر، حضرت عمر حضرت عثمان، حضرت علی شامل ہیں۔ کیونکہ یہ بزرگ قرآن کریم کے کاتب تھے۔ اور جن لوگوں کے ہاتھوں سے یہ قرآن ہم تک پہنچا

اور وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پاک جماعت تھی۔ سب کے سب معزز اور معتبر اور نیک۔ اور راستباز تھے تو پھر قرآن کی حفاظت اور خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کی راستبازی پر جو کوئی منہ آتا ہے۔ وہ خدا کی صریح شہادت کو رد کرتا ہے اور بات بھی سچ ہے قرآن جو خود مکرم و مطہر چیز ہے اس کے لکھنے والوں اور اس کے امت تک پہنچانے کی خدمت ادا کرنے والوں میں اسی مناسبت سے مکرمت اور طہارت کیوں نہ پیدا ہوتی۔ پس اس کتاب کو اس قدر حفاظت سے لکھوانے اور امت تک پہنچانے کا مقصد سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان اس سے فائدہ اٹھائے اور اس کے حکم کو سب پر مرفوع اور مقدم کرے۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۝ مارا گیا انسان کیسا ناشکرا ہے۔

قرآن جیسی عظیم الشان نعمت پاکر بھی جو اس کے مطابق عمل نہیں کرتا اس کی ناشکری کی بھی کوئی انتہا نہیں جو اتنی بڑی ہدایت کو چھوڑتا ہے جس پر انسانی شرف اور بزرگی کا انحصار ہے وہ پھر ہلاک ہو گیا مارا گیا کیونکر اس نے اپنی انسانیت کے شرف کو گنوا دیا۔ قتل الانسان کے معنے ہیں "وہ آدمی مارا گیا" اور "مارا جائے وہ آدمی" بھی معنے ہو سکتے ہیں مگر میرے ذوق کے خلاف ہے۔ خدا کی طرف اس رنگ میں بددعائیہ فقرہ منسوب کرنا مجھے پسند نہیں۔ اس کے بعد اپنی ناشکری کی وجہ سے کمال اور بزرگی و شرف سے انسان کی محرومی پر اب عالم ظاہر سے استدلال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۝ کس چیز سے اُسے پیدا کیا؟

مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝ نطفہ سے۔ اسے اندازہ کے ساتھ پیدا کیا۔ پھر بڑی قوت والا بنایا

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۝ پھر رستہ اس کے لئے آسان کر دیا۔

یہ قرآن کریم کا طریق ہے۔ کہ عالم ظاہر سے عالم باطن پر استدلال کرتا ہے آج تمام اہل سائنس و علم النفس کے نزدیک یہ بات مسلّم ہے کہ عالم ظاہر اور عالم باطن دونوں ایک دوسرے سے مماثلت شدید رکھتے اور بالکل ایک دوسرے سے متوازی چلتے ہیں۔ اس لئے عالم باطن کے کسی مسئلہ کے اثبات کے لئے اس سے بہتر طریق دلیل کا نہیں ہو سکتا کہ اس کی عالم ظاہر سے مماثلت دکھائی جائے یہاں انسان کو اپنی پیدائش کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ دیکھ تو کس چیز سے پیدا ہے۔ نطفہ سے جس کے معنے ہی ہیں حقیر چیز ایک دن حضرت ابوبکر نے خطبہ میں فرمایا کہ انسان کیا شیخی کرتا ہے۔ ایک دفعہ باپ کے پیشاب گاہ میں سے نکلتا ہے تو دوسری دفعہ ماں کے پیشاب گاہ میں سے خارج ہوتا ہے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو اس روز سے اپنے آپ سے بھی نفرت ہو گئی۔ لیکن باوجود اس کے انسان کی شیخی اور کبر نفس کا کیا ٹھکانا ہے۔ غیر تو جناب الٰہی نے انسان کو توجہ دلائی کہ اس کی پیدائش کس قدر حقیر چیز یعنی نطفہ سے ہے جو جب ماں کے رحم میں قرار پاتا ہے۔ تو اس قدر صغیر اور حقیر ہوتا ہے کہ بغیر خوردبین کے نظر بھی نہیں آ سکتا لیکن اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنے علم اور اندازہ سے ایسے اعلیٰ قویٰ اور استعدادیں مخفی رکھی ہوئی ہیں کہ وہ جب رحم سے تعلق پکڑ کو نشوونما پاتے ہیں۔

توانسان کس قدر قوتِ جسمانی و دماغی کا مالک ہوتا ہے۔ کہ انہیں کام میں لانے سے وہ سمندروں پر، ہواؤں پر، بجلی پر، قصہ کوتاہ یہ کہ اس عالم کی کل مخلوق پر حکومت کرتا ہے پس اگر یہ سچ ہے کہ انسان کے جسم کے نشو و نما کے لئے خدا نے سامان کیا ہے اور اُن سامانوں سے اس کے قویٰ کو نشو و نما دے کر اُسے کس قدر صاحبِ قوت انسان بناتا ہے تو پھر انسان کی روحانی نشو و نما کے لئے بھی اس نے ضرور سامان مہیا کیا ہے۔ اور اس کے لئے رستہ رکھا ہے جس پر چل کر انسان اپنے روحانی قویٰ کو نشو و نما دے سکتا ہے۔ اور وہ رستہ یہی قرآن ہے۔ جس کا ایک ناشکرا انسان انکار کر کے ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس کا ہلاک ہونا یہی ہے۔ کہ اُس کے روحانی قویٰ نشو و نما نہیں پاتے اور وہ اس انسانی شرف و بزرگی سے محروم رہ جاتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ یہاں ایک نکتہ قابلِ توجہ یہ بھی ہے کہ خلقہ کے بعد فقدرہ فرمایا ہے یعنی خلق انسانی کے بعد کی حالت قدرہ سے ظاہر فرمائی ہے جس کے معنے ہیں کہ انسان کو قوت والا بنایا۔ اور خلق اور قدر کے درمیان حرف ف کو رکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خلقہ میں جس چیز کی پیدائش کا ذکر ہے فقدرہ میں اسی کے قوت والا بن جانے کا تذکرہ ہے۔ لیکن آگے جب راستہ آسان کرنے کا ذکر فرمایا تو وہاں بجائے ف کے ثم رکھا ہے یعنی فرمایا ثم السبیل یسرہ۔ اس کی وجہ یہ کہ ثم میں حالت کے بدل جانے کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ پس ثم کے استعمال سے یہاں یہ جتلانا منظور ہے کہ جس سبیل یعنی راستہ کے آسان کرنے کا آگے ذکر آتا ہے۔ وہ اس سے مختلف ہے۔ جس کا ذکر خلقہٗ فقدرہ میں تھا یعنی وہ راستہ روحانی ہے۔ جسمانی نہیں۔ ثم سے پہلے جسمانی پیدائش اور نشو و نما کا ذکر تھا۔ ثم کے بعد دوسرے امر کی طرف توجہ دلانا تھا۔ وہ یہ کہ اگر جسم کو نطفہ جیسی حقیر چیز سے نشو و نما دیکر ایسا قوت والا بنایا کہ انسان اس عالم کی کل مخلوق پر حکومت کرتا ہے۔ تو دوسرا امر یعنی روحانی نشو و نما کا خدا کیوں نہ سامان کرتا اس کے لئے بھی اس نے راستہ رکھا ہے۔ اور اس راستہ کو آسان بھی کیا ہے۔ یعنی نیکی اور بدی کی تمیز کے لئے اگرچہ خدا نے انسان کے اندر قویٰ رکھے ہیں لیکن مجرد عقل اور فہم اور ادراک و تمیز پر ہی اگر چھوڑ دیا جاتا۔ تو انسان کے لئے یہ رستہ بڑا مشکل ہو جاتا۔ کیونکہ مجرد عقل کی رہبری انسان کے لئے کافی اور خطرہ اور غلطیوں سے خالی نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے اس رستہ کو وحی الٰہی کے ذریعہ آسان کر دیا یعنی جناب الٰہی نے اپنے علم کامل سے انسان کی مدد کی۔ اور قرآن نے وحی الٰہی کی اس مدد کو اپنی تکمیل پر پہنچا دیا۔ پس جس طرح خدا کے قوانین کے ماتحت جب نطفہ آتا ہے۔ تو باوجود حقیر ہونے کے اس سے کیسا عظیم الشان اور قوی ہیکل انسان بن جاتا ہے۔ تو اگر نفس انسانی اس راستہ پر چلے جو خدا نے بذریعہ وحی اسے بتایا ہے۔ اور اس کے قوانین و احکام کی فرمانبرداری کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بھی اسی طرح نشو و نما پا کر روحانی قویٰ کی تکمیل نہ کر لے۔ اور ان کمالات کو حاصل نہ کر لے جو انسان کا مقصدِ پیدائش اور منتہائے کمال ہے۔ ہمارے حضرت مجددِ وقت مرزا غلام احمد مسیح موعود اسی مضمون کو کس خوبصورتی سے نظم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

آنکہ از یک قطرہ انسانے کند — وز دو مشتِ تخم بستانے کند
نطفہ را روئے درخشاں مے دہد — سنگ را لعلِ بدخشاں مے دہد
چوں منے را گر مسیحائے کند — یا گدائے را شہنشاہے کند
نیست از فضل و عطائے او بعید — کور باشد ہر کہ از انکار دید

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۝ پھر اُسے مارتا ہے پھر اسے قبر میں ڈالتا ہے۔

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ۝ پھر جب چاہے گا اسے اُٹھا کھڑا کرے گا۔

فرماتے ہیں دنیا کی زندگی میں ایک طرف تو جسم کی نشوونما کا سامان ہے دوسری طرف روحانی نشوونما کے لئے انسان کے سامنے راہ کھلی ہوئی ہے۔ اب خود غور کرو کہ جسم کی نشوونما کے لئے تو ایک وقت مقررہ کے بعد موت مقدر ہے۔ اور یہ جسم جس کی نشوونما کے لئے اس قدر سامان مہیا ہیں۔ اور جس کی پرورش کے لئے انسان دن رات کوشاں رہتا ہے۔ آخر ایک دن مرکر مٹی میں مل جائے گا۔ مگر نفس انسانی کا روحانی نشوونما باقی رہنے والی چیز ہے۔ جو مرنے کے بعد مشیت الٰہی کے نیچے ایک نئی زندگی کی شکل میں نشوونما ہو جائے گا۔ گویا جسم انسانی کی موت تو درحقیقت انسان کے ایک نئی زندگی کی شکل میں اٹھ کھڑے ہونے کے لئے بطور تمہید کے ہے پس عقلمند انسان وہ ہے جو اس بات کو سمجھے کہ جب خدا نے فانی جسم کے نشوونما اور ترقی کے لئے اس قدر سامان مہیا کیا ہے۔ تو باقی رہنے والے نفس انسانی کی روحانی نشوونما اور تکمیل کے لئے کیا کچھ نہ سامان کیا ہوگا۔ اور جب انسان فانی جسم کے نشوونما کے لئے اس قدر سعی اور محنت کرتا ہے تو باقی رہنے والے نفس کی روحانی نشوونما اور تکمیل کے لئے کس قدر سعی کرنے کی ضرورت ہے۔ اور جب ایک فانی جسم کی ترقیات اس قدر ہمیں اعلیٰ نظر آتی ہیں تو نفس انسانی جو باقی رہے گا۔ اس کی ترقیات اور کمالات کس قدر بلند ہوں گے پس چاہیئے کہ انسان قرآن جیسی نعمت کی قدر کرے اور اسکی بتائی ہوئی راہ پر چل کر ان کمالات و ترقیات کا وارث بنے جن پر انسانیت کا شرف اور بزرگی منحصر ہے۔ اور جس کے بغیر وہ ایک ہلاک شدہ مخلوق ہے یعنی اُس کا شرف انسانیت ضائع گیا۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ۝ سنو جی۔ انسان نے پورا ہی نہ کیا جو خدا نے اُسے حکم دیا تھا۔

یعنی قرآن کے باوجود انسان کے روحانی تنزل اور اخلاقی پستی کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس نے خدا کے فرمودہ پر عمل ہی نہ کیا۔ ورنہ قرآن تو انسان کی ترقی اور دائمی نشوونما کے لئے آیا تھا۔ اگر انسان قرآن پر عمل کرے تو اگر وہ نطفہ کی طرح بھی حقیر ہو تو بھی وہ دنیا و آخرت میں اقتدار اور عزت حاصل کریگا۔ اور ظاہری و باطنی ترقیات و کمالات کا وارث ہوگا۔ اس میں آجکل کے مسلمانوں کیلئے سبق ہے ان کے ظاہری و باطنی تنزل کی وجہ یہی ہے کہ وہ قرآن کے احکام کی تابعداری کرتے ہی نہیں۔ وہ لاکھ قرآن ہاتھ میں لئے پھرا کریں جب تک عمل نہ کریں گے وہ نفع کیسے دیگا۔ ایک بیمار نسخہ پیتا ہی نہیں تو وہ اثر کیا کریگا۔ ہاتھ میں نسخہ لئے پھرنے سے تو مرض نہیں شفا پاتا مسلمان اگر دنیا میں نطفہ کی طرح بھی حقیر ہوں تو بھی اگر وہ قرآن پر عمل کرنے لگیں تو جلد ایک مضبوط اور قوی قوم بن سکتے ہیں۔ آخر ابتدا میں مسلمان کس طرح ضعف سے ترقی کر کے قوت کے کمال تک پہنچ گئے تھے لیکن اگر قرآن پر عمل نہ ہوگا تو پھر یاد رہے کہ ایک ضعیف اور حقیر قوم تو دنیا میں مسترد ہو جایا کرتی ہے جس طرح حقیر نطفہ اگر وہ ترقی نہ کرے تو ضائع ہو جاتا ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ پس انسان کو چاہیئے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے۔

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ (پہلے) ہم خوب پانی برساتے ہیں۔

ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ پھر ہم زمین کو شق کرتے ہوئے پھاڑتے ہیں۔

فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ پھر ہم اُس میں دانہ اُگاتے ہیں۔

وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ اور انگور اور ترکاری۔

وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ اور زیتون اور کھجور۔

وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ اور گھنے باغ۔

وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ اور پھل اور چارہ۔

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝ تمہارے لئے اور تمہارے چارپایوں کے لئے زندگی کا سامان۔

طعام انسان کے جسم کے نشوونما کے لئے ایک ضروری چیز ہے اس طعام کے پیدا کرنے کے لئے کس طرح آسمان و زمین کو خدمت میں لگایا جاتا ہے پہلے تو آسمانی و زمینی اسباب جمع کر کے بادلوں سے بارش برسائی جاتی ہے۔ پھر زمین کو پھاڑ کر دانہ کو اُگایا جاتا ہے اور اُسے نشوونما دے کر انسان کی غذا کے لئے مختلف چیزیں پیدا کی جاتی ہیں کہیں غلّہ ہے تو کہیں انگور جس سے شکر نکلتی ہے کہیں سبزی ترکاری ہے۔ تو کہیں زیتون جس کا روغن کھانے کے لئے نہایت مفید ہے۔ کہیں کھجور اور کہیں مختلف پھلوں کے گھنے باغ اور کہیں مویشیوں کے لئے چارہ تاکہ مویشیوں کی زندگی قائم رہے اور ان سے انسان مکھن گھی، دودھ، دہی اور گوشت حاصل کر سکے۔ پھر نہ صرف انسان کے کھانے کا سامان کیا۔ بلکہ کھانے کے لئے مختلف قسم کی اشیاء پیدا کیں تاکہ انسان کے جسم کو نشوونما کے لئے جو مختلف قسم کے اغذیہ کی ضرورت ہے وہ سب مہیا ہو سکیں۔ ان امور کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان کے جسمانی نشوونما کے لئے جو طعام کا سامان خدا نے کر رکھا ہے۔ چاہیئے کہ انسان اس پر غور کرے۔ اور روحانی نشوونما اور اس کے سامان کو بھی اس پر قیاس کرے آسمان سے روحانی بارش جو وحی کی شکل میں آتی ہے۔ وہ نبی کے قلب کی زمین سے مل کر انسان کے لئے وہ روحانی غذا مہیا کرتی ہے۔ جو انسان کے روحانی نشوونما کیلئے ازبس ضروری ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ انسان کی ہر باطنی ضرورت کو جانتا ہے۔ اس لئے جو روحانی طعام یعنی کتاب آسمانی وہ تیار کرتا ہے۔ اُس میں اس کی روحانی نشوونما کی ہر ضرورت اور تقاضے کو پورا کرنے کا سامان مہیا فرما دیتا ہے جس طرح جسم کی ہر قوت کی اور ہر قسم کی نشوونما کے لئے مختلف قسم کے اناجوں اور پھلوں اور سبزی ترکاریوں اور روغن اور شکر وغیرہ وغیرہ کی ضرورت ہے اسی طرح رُوحانی قوتوں کے نشوونما کے لئے مختلف اقسام کی روحانی غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ خدا کا ہی کام ہے

کہ وہ انسان کی فطرتی ضروریات کا کامل علم رکھنے کی وجہ سے ہر ایک قسم کی رُوحانی غذا اس کے لئے اپنی وحی میں مہیا فرماتا ہے جن سے انسان کی مختلف استعدادیں اپنے کمال کو حاصل کرتیں اور انسان کے مختلف باطنی قویٰ کما حقہٗ نشوونما پاتے ہیں۔ آخر میں متاعًا لکم ولانعامکم فرما کر اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ انسان کو اپنے کھانے پر غور کرکے یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے۔ کہ اگر انسان کے جسمانی نشوونما ہی پر معاملہ ختم ہے۔ تو پھر اس معاملہ میں انسان کی ایک چوپایہ سے زیادہ حیثیت نہیں بنتی۔ کیونکہ ظاہری طعام کے اس سارے ساز و سامان میں انسان کے ساتھ چوپائے بھی شریک ہیں۔ پیٹ کا بھرنا اور جسم کا پالنا دونوں میں مشترک ہے۔ تو پھر انسان کے لئے چوپایوں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ پس انسان کی انسانیت اس بات کی مقتضی ہے۔ کہ اس کی زندگی کا اس سے بڑھ کر مقصد ہو اور وہ اس کی روحانی زندگی ہے جو دائمی ہے۔ پس ضرور ہے کہ اس جسمانی طعام کے مقابلہ میں روحانی طعام کا بھی جناب الٰہی کی طرف سے سازوسامان ہو جس سے اس کے نفس کے روحانی قویٰ نشوونما پاکر دائمی زندگی کے کمالات کے حصول کا موجب بنیں۔ پس خوش قسمت ہے وہ جو قرآن کے روحانی مائدہ سے اپنے روحانی قویٰ کو نشوونما دیتا اور انسانیت کے مقصد کو حاصل کرتا ہے اور محروم رہ گیا اور مارا گیا وہ جس نے اس روحانی طعام سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اس محرومی کا سبب لوگوں کا غفلت اور ہوا و ہوس میں انہماک ہے جو نصیحت اور فائدہ کی بات کو سننے نہیں دیتی۔ فرماتے ہیں:۔ آج یہ کان رکھتے ہوئے بہرے بنے ہوئے ہیں مگر ایک وقت آتا ہے کہ یہ سنیں گے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۝ پھر جب چیخنے والی اور کان کو بہرا کر دینے والی مصیبت آئے گی۔

صاخّۃ کے معنے ہیں ایسی مصیبت جو اپنی چیخ سے کانوں کو بہرا کر دے۔ یہاں مراد قیامت ہے میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ قرآن نے قیامت کے مختلف نام رکھے ہیں۔ اور جس جگہ وہ کوئی نیا نام دیتا ہے وہ نفس مضمون کے لحاظ سے نہایت موزوں و مناسب نام ہوتا ہے۔ اور اس کے اندر ایک حقیقت ہوتی ہے۔ یہاں لوگوں کی امر حق سے غفلت اور بے پروائی کا ذکر ہے۔ جو قرآن جیسی نعمت اور روحانی مائدہ کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ ہزار معقول دلائل دو۔ سمجھاؤ۔ نصیحت کرو۔ وہ کان رکھتے ہوئے نہیں سنتے۔ اور عملی طور پر بہرے بنے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں وقت آتا ہے جب ان غفلتوں اور بے پروائیوں کا نتیجہ آگے آئے گا اس دن سنیں گے اور کس طرح نہ سنیں گے۔ وہ مصیبت تو کانوں پر ایک چیخ کی طرح پڑے گی۔ اور ان روحانی بہروں کے دل دماغ تک اتر جائے گی۔ بہروں کو آخر چیخ کر ہی سنایا جاتا ہے۔ اسی طرح قیامت کی مصیبت بھی اُن روحانی بہروں کے کانوں پر چیخ کی طرح پڑے گی۔ اور جس بات کو وہ دنیا میں سننا پسند نہ کرتے تھے۔ اس دن گوشِ دل سے سنیں گے۔ لیکن اس دن کا سننا کس کام کا۔ کیونکہ وہ فیصلہ کا دن ہوگا۔ اس دن تو انسان کی یہ حالت ہوگی کہ:۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ جس دن انسان اپنے بھائی سے بھاگے گا۔

وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے۔

وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے۔

یعنی اس قدر گھبراہٹ اور پریشانی اور نفسی نفسی کا عالم ہوگا کہ انسان کو نہ بھائی کی پروا ہوگی۔ نہ ماں اور باپ کی پروا ہوگی نہ اپنی بیوی اور بیٹوں کی پروا ہوگی۔ بلکہ اُن سے بھاگے گا۔ اور اپنی جان چھڑائے گا۔ جو رشتے یہاں گنوائے ہیں اُن کی ترتیب میں فصاحت و بلاغت کا کمال کر دیا ہے۔ وہ اس طرح کہ جس نسبت سے محبت کے نظریہ تعلقات زیادہ شدید اور گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی نسبت سے ترتیب دار اُن کو بعد میں رکھا ہے۔ پہلے بھائی کا ذکر کیا ہے کہ انسان اپنے بھائی سے بھاگے گا مگر بھائی سے اتنی زیادہ محبت نہیں ہوتی ممکن ہے انسان بھائی سے بھاگے۔ مگر ماں باپ سے نہ بھاگے کیونکہ ان کے ساتھ بھائی کی نسبت زیادہ تعلق محبت کا ہوتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ماں باپ سے بھی بھاگے گا۔ لیکن ممکن ہے کہ ماں باپ سے بھاگے۔ مگر بیوی اور بیٹوں سے نہ بھاگے کیونکہ بیوی سے بعض دفعہ محبت کے تعلقات بہت زبردست ہوتے ہیں۔ اور اولاد سے بڑھ کر تو کوئی اور محبت کا تعلق ہے ہی نہیں۔ لہٰذا فرمایا بیوی اور بیٹوں سے بھی بھاگے گا۔ یعنی وہ کسی کا بھی ساتھ نہ دے گا۔ سب سے بھاگے گا۔ اس کی وجہ اگلی آیت میں بیان فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:-

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝ ہر انسان کیلئے اس دن ایک حالت ہوگی جو اس کے لئے کافی ہوگی۔

یعنی ہر شخص کی حالت اُس دن ایسی ہوگی کہ اُسے دوسرے سے بے پروا کئے ہوئے ہوگی۔ اعمالوں کی جوابدہی کی دہشت کی وجہ سے انسان کو نہ تو کوئی محبت کے تعلقات کی پروا ہوگی اور نہ رشتہ کے تعلقات ہی کچھ کام آئیں گے۔ سب ایک نفسی نفسی کے عالم میں ہوں گے۔ ہر ایک کو اپنی فکر پڑی ہوئی ہوگی۔

ہم تو دنیا میں بھی یہ نظارہ دیکھتے ہیں۔ جب انسان کسی مصیبت یا بیماری یا دکھ میں مُبتلا ہوتا ہے تو نہ کوئی رشتہ دار اچھا لگتا ہے نہ بیوی بچے اچھے لگتے ہیں۔ مَیں نے تو ایک شخص کو بیماری میں دیکھا کہ اس کا بچہ سامنے آجاتا تھا تو پنکھا مار کر ہٹا دیتا تھا۔ کسی آدمی کی موجودگی بھی بُری لگتی تھی۔ دنیا کی مصیبتیں آخرت کی مصیبت کے مقابل میں کیا چیز ہیں۔ ان آیات سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ یہ ایک نہایت غلط خیال لوگوں میں پھیلا ہوا ہے۔ کہ فلاں آلِ رسولؐ ہے سید ہے۔ یا فلاں بزرگ کا بیٹا ہے۔ اس لئے قیامت میں یہ سزا سے بچ جاویں گے۔ ان کے آباؤ اجداد ان کو بخشوا لیں گے۔ ہمارے نبی کریم صلعم نے کتنی سچی بات اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمائی کہ "میرا باپ ہونا تیرے کام نہیں آئے گا تیرے عمل ہی تیرے کام آئیں گے۔"

مگر آج دیکھ لو کہ سیدوں کی کیسی پرستش ہوتی ہے۔ یہاں تک انہیں کہہ دیتے ہیں کہ: "قیامت کے دن جب حضور اپنے نانا کے پاس حوضِ کوثر پر بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ تو ہمیں بھول نہ جانا" اسی طرح کسی مجدد یا امام کے بیٹے کو خدا کی طرح مطاع الکل بنا کر اپنا سب دین و ایمان اس کے ہاتھ پر بیچ دیتے ہیں۔ یہ سب خوش عقیدگیاں ہیں۔ اور خلاف ہدایات خدا و رسول اللہ صلعم ہیں۔ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ اور انہی کے متعلق اس سے پوچھا جائے گا۔ وہ جب اپنے بیوی

بچوں، ماں، باپ بھائی بندوں سے بھاگے گا تو بھوے بھالے مریدوں کی کس نے دستگیری کرنی ہے یہ خدا کا فضل ہی ہوتا ہے جو انسان کا دستگیر ہوتا ہے یا انسان کے اپنے اعمال اس کے کام آتے ہیں۔

وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ کچھ منہ اس دن چمک رہے ہوں گے۔

ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ (اور وہ) ہنستے ہوئے خوش اور خوشخبری کو پالینے والے ہوں گے۔

یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے خدا کی وحی اور ہدایات الٰہیہ سے فائدہ اٹھایا۔ اور اعمال صالحہ بجالائے۔ اور عمل کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔

وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ اور کچھ منہ اس دن ایسے ہونگے کہ اُن پر غبار ہوگا۔

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ سیاہی انہیں ڈھانک رہی ہوگی۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کی وحی اور ہدایات کی پروانہ کی۔ اور بد اعمالیوں میں مُبتلا رہے اور عمل کے امتحان میں ناکام ہوئے دُنیا میں بھی جو امتحان ہوتے ہیں اُن میں یہ نظارہ نہایت صفائی سے نظر آتا ہے۔ ایک وہ طلبا ہوتے ہیں جو کامیاب ہوتے ہیں اُن کے ہنستے ہوئے خوش خوش چہرے اُن کے دل کا آئینہ ہوتے ہیں۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ خوشی اور ہنسی ان کے چہروں سے ٹپکی پڑتی ہے۔ بالمقابل ناکام طلبہ کے چہروں کو دیکھو تو اُن پر اُداسی اور پریشانی اور ذلت کی گرد پڑی ہوئی ہوتی ہے چہرہ سیاہ ہُوا ہُوا ہوتا ہے۔ اسی پر آخرت کے ناکام لوگوں کا اندازہ کر لو۔ اور یہ بھی خیال کرو۔ کہ وہ ناکامی اور ذلت بدرجہا بڑھ کر ہے انہی ناکام لوگوں کے متعلق فرمایا کہ آخر اُن کی ناکامی کی وجہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝ یہی لوگ کافر اور فاجر ہیں یعنی منکر اور بدکار ہیں۔ ع ۴۲ ۵

کافر اس لئے فرمایا کہ حق کا انکار کیا۔ اور خدا کی نعمت کی ناشکری کی کہ قرآن جیسے روحانی مائدہ اور نعمت کو قبول نہ کیا۔ بلکہ حقارت سے رد کر دیا۔ اور فاجر اس لئے فرمایا کہ حق پا کر بھی پھر اس پر عمل نہ کیا۔ یعنی قرآن کے ہوتے ہوئے اُس پر عمل نہ کیا۔ اور بد عملیاں کرتے رہے۔ اُن میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو قرآن کو خدا کا کلام مان کر بھی پھر اس پر عمل نہیں کرتے۔

غرضیکہ خدا کے کلام اور اس کی ہدایتوں کا انکار اور اس پر عمل نہ کرنا ناکامیوں کی جڑ ہے جس سے اللہ تعالیٰ ہر انسان کو محفوظ رکھے۔

سُورَۃُ التَّکْوِیْرِ مَکِّیَّۃٌ | بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ | وَھِیَ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰیَۃً

اس سورت کا نزول مکہ معظمہ میں ہُوا۔ ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ اس میں اعمال کے نتائج پر ایک نئے طریق سے استدلال کیا ہے۔ پہلے بڑی بڑی عظیم الشان پیشگوئیاں کی ہیں۔ جو قیامت کبریٰ کے قائم ہونے سے قبل پوری ہونے والی تھیں اور اُس زمانہ میں اُن کا ظہور مقدر تھا۔ جس زمانہ میں مادیت اور بیدینی کا دور دورہ اور آخرت: نتائج اعمال کا انکار بڑے شدومد کے ساتھ ہونے والا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ زمانہ یہی ہے جس میں سے ہم گذر رہے ہیں۔ ان پیشگوئیوں کے ذریعہ اُس علم غیب کو جو مستقبل کے پردہ میں نہاں تھا آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل نہایت صفائی اور خوبصورتی کے ساتھ بیان فرما کر منکرین پر اتمام حُجّت کیا ہے۔ کہ وہی خدا جو مستقبل کے متعلق اس قدر پُر از صداقت خبریں دے رہا ہے وہی یہ بھی خبر دیتا ہے کہ اعمال کے نتائج لابد ہیں۔ اور آخر کار ایک دن آئے گا۔ جو آخرت کا ہے جس میں اعمال کے نتائج کا ظہور کلّی طور پر ہوگا۔ جس سے کوئی نہ بچے گا۔ اگر یہ پیش گوئیاں جو کی گئی ہیں جن میں مستقبل کی غیب در غیب خبریں دی گئی ہیں سچی ثابت ہوں تو پھر دوسری خبر بھی جو نتائج اعمال کے متعلق ہے سچی اور یقینی ہے۔

پیشگوئیوں کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہئیے۔ کہ پیشگوئیوں میں اکثر ایک پہلو اخفا کا ہوتا ہے۔ اور اخفا کا پردہ اس وقت اُٹھتا ہے۔ جب اس پیشگوئی کا ظہور ہوتا ہے۔ گویا واقعات زمانہ پیشگوئی پر سے اخفا کے پردہ کو اٹھاتے ہیں۔ اور وہ پیشگوئی اس وقت اس طرح چمک اٹھتی ہے گویا دن چڑھ جاتا ہے۔ اور مومنوں کے ازدیاد ایمان کا باعث اور منکرین پر اتمام حجت ہو جاتا ہے۔ یہ پہلو اخفا کا بالعموم استعارہ کے رنگ میں ہوا کرتا ہے۔ استعارہ ایک طرف تو پیشگوئی پر کچھ پردہ ڈال دیتا ہے۔ دوسری طرف کلام میں فصاحت و بلاغت اور زور پیدا کر دیتا ہے مثلاً حضرت یوسف کو رویا میں دکھایا گیا۔ کہ سورج اور چاند اور گیارہ ستارے سجدہ کر رہے ہیں۔ یہ کیسا لطیف استعارہ تھا۔ آسمانی سلطنت کے وارث ہونے کے لئے اس سے بڑھ کر لطیف استعارہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ اجرام سماوی اطاعت کرتے ہوئے دکھائے جائیں۔ اسی طرح اس سورہ التکویر میں پیشگوئیاں بڑے دقیق اور عظیم الشان علم غیب کو اپنے اندر رکھتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ایسے لطیف استعارات سے پُر ہیں۔ کہ جب یہ واقعات ظہور میں آتے ہوئے نظر کے سامنے آتے ہیں تو ان آیات کی عظمت و جامعیت اور دقیق علم غیب پر روح انسانی وجد کر اٹھتی ہے۔

یہاں ایک سوال یہ اُٹھتا ہے کہ پیشگوئی میں ایک پہلو اخفا کا کیوں رکھا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تا کہ ایک تو یہ ثبوت پیدا ہو کہ یہ خدا کی طرف سے علم غیب ہے۔ انسانی دماغ کا نتیجہ نہیں کیونکہ جب خود ملہم یا صاحب وحی بھی نزول وحی و الہام کے وقت اس پیشگوئی کی صحیح حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔ اور جب تک وہ واقعات جن پر وہ پیشگوئی مشتمل ہے ظہور نہ پکڑیں۔ اس پیشگوئی کے اصل مقصد و حقیقت کا علم خود صاحب وحی کو بھی نہ ہو اور ہو وہ پیشگوئی سچی۔ تو پھر صاف نظر آجاتا ہے۔ کہ ان علوم غیبیہ کا سرچشمہ کوئی اور علیم و حکیم ذات ہے۔ صاحب وحی کا اپنا دماغ نہیں۔ مثلاً حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رویا میں دیکھا کہ آپ کی وفات کے بعد سب سے پہلے وہ بیوی فوت ہو کر آپ سے ملے گی جس کے سب سے لمبے ہاتھ ہیں۔ آپ کے سامنے سب بیبیوں نے ہاتھ ناپے اور حضرت سودہؓ کے ہاتھ سب سے لمبے نکلے آپ نے منع نہیں فرمایا۔ چنانچہ اس وقت یہی سمجھا گیا۔ کہ حضرت سودہؓ پہلے فوت ہوں گی۔ لیکن جب حضرت زینب ام المساکین کا انتقال سب سے پہلے ہُوا تو اُس وقت پتہ لگا کہ سب سے لمبے ہاتھ ہونے سے مراد سب سے بڑھ کر جود و سخا کرنا تھا۔ اور حضرت زینب اس کا صحیح مصداق تھیں کیونکہ وہ سب سے بڑھ کر سخاوت کیا کرتی تھیں۔ خبر تو بالکل سچی تھی۔ لیکن استعارہ کے رنگ میں جو اخفا کا پردہ اس پر پڑا ہوا تھا وہ

اپنے وقت پر اُٹھا جب وہ واقعہ ظہور میں آیا۔ خود صاحب وحی سے بھی پیشگوئی کی اصل حقیقت کا مخفی رہنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ علم غیب صاحب وحی کے دماغ سے نکلا نہ تھا۔ بلکہ خارج سے کسی سب سے بڑھ کر علیم و خبیر ذات کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ دوسرا فائدہ اخفا کا یہ ہے کہ تا کوئی جھوٹا مدعی اپنے آپ کو اس پیشگوئی کا مصداق نہ بنا سکے۔ اور ظاہر لفظوں کے مطابق کچھ واقعات اپنی طرف سے بنا کر یا جمع کر کے لوگوں کو دھوکا نہ دے سکے۔ اس لئے وہ علم غیب کچھ ایسا اخفا کا رنگ اپنے اندر رکھتا ہے کہ سوائے مدعی برحق کے صحیح علم اور اصل حقیقت جھوٹے پر کھولی نہیں جاتی۔ یہ ایک لمبی بحث ہے جس کا یہ موقعہ و محل نہیں سمجھنے کے لئے اجمالی طور پر اسی قدر کافی ہے۔

اس سورت میں قیامت کبریٰ کے قبل جو واقعات پیشگوئی کے رنگ میں بیان فرمائے ہیں اُن کے زمانہ کی تعیین کے لئے سب سے پہلے ضروری تھا۔ کہ اس زمانہ کی مادیت اور بیدینی کا نقشہ کھینچا جاتا۔ اس لئے سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے:۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ جب سورج (جو سرچشمہ نور آسمانی کا ہے) لپیٹ لیا جائے گا۔

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝ اور جب تارے (جو آسمانی نور سے منور ہیں) جھڑ جائینگے یا ماند اور مکدر پڑ جائینگے۔

یہ استعارہ قرآن میں اور جگہ بھی موجود ہے جہاں خود حضرت نبی کریم صلعم کو سراجاً منیراً فرمایا ہے۔ یعنی نور دینے والا آفتاب۔ وجہ یہ کہ جس طرح ظاہری آفتاب آسمانی نور کا سرچشمہ ہے اسی طرح انبیاء بالخصوص حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود سرچشمہ نور آسمانی کا ہے۔ جس سے وہ نور جو خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا یعنی نور قرآن نکل کر تمام مستعد طبائع کو منور کر گیا اور کر رہا ہے۔ اور ایسی طبائع اور افراد کاملہ اس آسمانی نور سے منور ہو کر روحانی آسمان کے ستارے بن کر چمکتے ہیں۔ اور وہ بمنزلہ نجوم کے ہوتے ہیں جیسا کہ خود حضرت نبی کریم صلعم فرماتے ہیں کہ اصحابی کالنجوم۔ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں پس جو بھی اس نور آسمانی سے منور ہوتا ہے خواہ وہ صحابہ ہوں یا امت محمدیہ کے صلحا اور اولیا اور علمائے ربانی ہوں سب روحانی آسمان کے ستارے ہیں پس یہاں زمانہ موجودہ کی بیدینی و مادیت کا کیسے خوبصورت استعارہ کے اندر نقشہ کھینچا ہے۔ فرمایا کہ اُس زمانہ میں سرچشمہ نور آسمانی کا لپیٹ لیا جائے گا یعنی قرآن کا علم اور عمل اُٹھ جائیگا۔ اور بیدینی اور ضلالت کی تاریکی پھیل جائیگی۔ اور اس نور آسمانی سے منور افراد صلحا اور علما یا تو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں گے یا اگر ہوں گے بھی تو ان میں وہ نور آسمانی نہ ہوگا یا ہوگا تو بہت مدہم۔ کتنا صحیح نقشہ اس موجودہ زمانہ کی مذہبی حالت کا ہے!

اس کے بعد مذہبی تنزل کے بالمقابل مادی ترقیات کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ تمدن و تہذیب مادی کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ کہ شہروں اور قبیلوں کے درمیانی فاصلے مٹ جائیں یا کم ہو جائیں اور درمیانی روکیں اٹھ جائیں اور ایسے ذرائع پیدا ہو جائیں جن سے آمد و رفت آسان ہو جائے۔ اور وقت بچ جائے۔ اور لوگ ایک دوسرے کے علم اور تبادلہ خیالات سے فائدہ اٹھا کر علمی اور صنعتی اور حرفتی ترقی کو سکیں۔ اور باہمی تجارت سے فائدہ اٹھا کر مالی ترقی سے حصہ لے سکیں۔ اسی لئے سب سے پہلے انہی چیزوں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔ چنانچہ ان چیزوں کو جو باہمی میل جول میں روک ہوتی ہیں اور جن کے دُور ہونے سے ترقی و کمال کا دور دورہ شروع ہوتا ہے جناب الٰہی چار حصوں میں تقسیم فرماتے ہیں ایک تو خشکی میں پہاڑوں کی موجودگی دوم فاصلہ کی طوالت سوم جہالت و وحشت

چہارم سمندر کا درمیان میں حائل ہونا۔ سب سے پہلے پہاڑوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ ۝ اور جب پہاڑ اڑا دیئے جائیں گے یا اُن پر سیر کی جائیگی۔

انسان اکثر خشکی میں آبادی بنا کر رہتا ہے۔ اس لئے باہمی میل جول میں سب سے پہلی روک جو ہوا کرتی ہے وہ پہاڑوں کی ہوتی ہے دُور کیوں جاؤ۔ افغانستان کی علیحدگی اور اس کا بچاؤ بھی بہت کچھ اُس کی پہاڑی دیواروں کی وجہ سے ہی ہے۔ فرمایا پہاڑ اُڑا دیئے جائیں گے۔ دیکھ لو دُنیا بھر کے پہاڑ کس طرح اُڑا دیئے گئے ہیں۔ سڑکیں بن گئیں سرنگیں نکل گئیں۔ کونسی بلندی پہاڑ کی ہے جس پر سے یہ یاجوج ماجوج یعنی یورپین اقوام نہیں پھر گئیں۔ گویا اُن کے لئے کوئی پہاڑ پہاڑ رہا ہی نہیں۔ بلکہ پہاڑ تو اُن کی سیر گاہیں بن گئے۔ اُونچی سے اُونچی چوٹی پر بھی چڑھنے کی تگ و دو جاری ہے۔ اور یہ ہو کر رہے گا کیونکہ خدا فرماتا ہے وَھُم مِّن کُلِّ حَدَبٍ یَّنسِلُونَ اور وہ ہر ایک بلندی پر سے اُترتے چلے آئیں گے۔ بتایا کہ ملکوں میں، شہروں میں، قریوں میں میل جول اور اختلاط و ارتباط کے لئے کوئی روک نہ رہے گی، پہاڑ ہونگے تو وہ بھی اُڑ جائیں گے۔ اور سرنگوں اور سڑکوں کے ذریعہ باہمی میل جول اور آمد و رفت قائم ہو جائے گی اور پہاڑوں کے سبزہ زار سیر گاہیں بن جائیں گی۔

اس کے بعد فاصلہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے فاصلہ کم کرنے کے لئے یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ زمین کو سکیڑ دیا جائے۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ سواریاں اتنی تیز رفتار نکل آئیں کہ زمین کا فاصلہ عملی طور پر کم ہوتا چلا جائے۔ کیونکہ فاصلہ کا اندازہ وقت سے ہے۔ جتنا سفر میں وقت کم خرچ ہوگا اتنا ہی فاصلہ گھٹا ہوا سمجھا جائے گا۔ اس لئے ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ اور جب اونٹنیاں بیکار کر دی جائیں گی۔

عشار کہتے ہیں دس ماہ کی حاملہ اونٹنیوں کو۔ قاعدہ ہوتا ہے کہ مویشی حاملہ اُس وقت زیادہ بیش قیمت ہو جاتا ہے۔ جب وضع حمل کے دن قریب ہوں۔ مثلاً ہمارے ملک میں گائے یا بھینس جب بیا ہنے والی ہو یعنی اس کے وضع حمل کے دن قریب ہوں تو زیادہ قیمتی ہو جاتی ہے۔ اور اس کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ وجہ یہ کہ کسی آنے والے بچہ کی اُمید ہوتی ہے اسی طرح عرب میں اونٹنی بھی جب اُس کا وضع حمل قریب ہوتا تھا۔ تو عرب اُسے عشار کہا کرتے تھے یعنی دس ماہ کی حاملہ۔ اور اس کی قدر اس لئے ہوا کرتی تھی۔ کہ اُس سے اُونٹ پیدا ہونے کی اُمید ہوتی تھی۔ ویسے بھی بچہ کشی کے علاوہ سانڈنی (اونٹنی) فاصلہ طے کرنے اور تیز رفتاری میں نر اونٹ سے بڑھ کر ہوا کرتی ہے۔ اونٹ کی سواری کا ذکر خاص طور پر یہاں اس لئے کیا کہ یہ ایسا جانور ہے جو اُن مقامات میں سواری اور بار برداری کا کام دیتا ہے۔ جہاں اور کوئی سواری یا جانور کام نہیں دے سکتا۔ ریگستانوں میں، خشک پہاڑوں میں جہاں پانی کا نام نشان تک نہیں ہوتا۔ وہاں یہ کئی کئی روز بغیر چارہ اور پانی کے چلا چلتا ہے۔ اور بڑے بڑے بوجھ لے جاتا اور بڑے بڑے فاصلے طے کرنے کا دم خم رکھتا ہے۔ جو اور کوئی جانور نہیں رکھتا۔ عرب کے لوگ بھی اپنے بے آب و گیاہ بیابانوں اور خشک اور جلے ہوئے پہاڑوں کو اسی جانور کے ذریعہ طے کر سکتے تھے اور طے کیا کرتے تھے گھوڑے تو صرف جنگ میں کام آیا کرتے تھے۔ پس اونٹ بڑے قدر و قیمت کی اور بہت مفید اور کار آمد چیز تھی۔ جو دشوار گذار راستوں کے طے کرنے کا واحد ذریعہ تھا۔ پس اگر یہ بتایا جائے کہ ایک زمانہ آئے گا۔ کہ جب اونٹ بیکار ہو جائے گا۔ اور حاملہ اونٹنیوں کو کوئی نہ پوچھیگا

تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس قسم کی سواریاں مثلاً ریل یا موٹریں نکل آئیں گی جو نہ صرف اونٹوں سے زیادہ بہتر طریق پر سواری اور بار برداری کا کام دے سکتی ہوں گی بلکہ وہ اُن دشوار گذار راستوں پر بھی چل سکیں گی جن میں اونٹ چلا کرتے تھے۔ یا راستے اس قدر سہل کر دیئے جائیں گے کہ پھر اونٹوں کی خاص ضرورت نہ رہے گی۔ اور اُن سے بہتر اور تیز رفتار سواریاں ان سڑکوں پر چل کر وقت کو بچا لیں گی۔ اور اس طرح فاصلہ کی مشکلات اور دوری کا سوال اُٹھ جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آج ریل اور موٹروں اور ہوائی جہازوں کے نکلنے سے فاصلہ کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہی۔ اور دشوار گذار سے دشوار راستوں پر سے یہ سواریاں گذرنے لگیں اور دنیا میں سڑکوں کا اس طرح جال بچھ گیا اور ان پر ریلیں اور موٹریں اس کثرت سے چلنے لگی ہیں۔ کہ اونٹوں کی ضرورت نہ رہی۔ تو اب دس سال کی حاملہ اونٹنیوں کو کون پوچھے۔ ہمارے ملک میں لائل پور سرگودھا اور منٹگمری کی بار کو جا کر دیکھو نہ اونٹ ہے نہ اونٹ والے بلوچ ہے۔ جا بجا موٹریں اور ریلیں چل رہی ہیں کونسا بوجھ ہے جو یہ نہ لے جاتے ہوں۔ اور کونسا فاصلہ ہے جو یہ جلد سے جلد نہ طے کر جاتے ہوں جس سے کس قدر وقت کی بچت ہوتی ہے اور کس قدر لوگوں کا باہمی میل جول بڑھتا اور تجارت کو فروغ ہوتا ہے۔ یہی حال حجاز میں ہے۔ آج حاجی موٹر کاروں پر حج کرتے ہیں۔ اور اونٹ بیکار ہو چکے ہیں۔ یہاں میں ایک واقعہ آجکل کے علماء کی ذہنیت کے متعلق عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے حضرت مرزا غلام احمد صاحب مجدد وقت نے اس پیشگوئی کی طرف توجہ دلائی۔ اس وقت حجاز ریلوے بن رہی تھی۔ مگر ٹرکی میں انقلاب آجانے کی وجہ سے مدینہ شریف تک ریل بن کر رہ گئی تو ہمارے پنجاب کے بعض علماء نے خوشی سے بغلیں بجائیں۔ صرف اس لئے کہ اس طرح حضرت مرزا صاحب کو جھوٹا کہنے کا ایک موقعہ ملتا تھا لیکن اتنا نہ سمجھا کہ یہ زد تو خود قرآن پر پڑتی ہے جس کی یہ پیشگوئی ہے کہ ایسی سواریاں نکل آئیں گی کہ اونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی اور خود محمد رسول اللہ صلعم پر بھی زد پڑتی تھی جنہوں نے پیشگوئی فرمائی تھی۔ جو اسی آیت کی تفسیر معلوم ہوتی ہے لیترکن القلاص فلا یسعیٰ علیھا کہ اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی۔ اور ان سے کام نہ لیا جائیگا۔ حضرت مرزا صاحب کا تو فقط اس قدر قصور تھا کہ انہوں نے خدا سے علم پا کر اس پیشگوئی کی اصل حقیقت پر سے پردہ اُٹھا دیا تھا لیکن تعصب اور حسد کا بُرا ہو کہ خدا اور رسولؐ پر زد پڑتے ہوئے بھی علماء نے خوشی سے بغلیں بجائیں کہ کچھ بھی ہو کسی طرح مرزا غلام احمد جھوٹا ٹھیرے لیکن خدا نے ان حق کے دشمنوں کی خوشی کا جلد ہی خاتمہ کر دیا۔ جدہ اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان موٹر کاریں چل گئیں اور اونٹنیاں بیکار ہو گئیں اب اونٹوں کے قافلوں کے بجائے موٹریں چلتی ہیں اور ریل بنانے کی بھی تجویزیں ہو رہی ہیں اور اس طرح قرآن و حدیث کی پیشگوئی کی صداقت اظہر من الشمس ہو رہی ہے۔

الغرض پہاڑوں کے اجڑ جانے اور سڑکیں بن جانے اور ایسی تیز رفتار سواریوں کے نکل آنے سے جن کے ذریعہ بڑے سے بڑا فاصلہ آسانی سے اور بہت جلد طے ہو سکے اور ہر ایک دشوار گذار منزل کو طے کر لینا چشم زدن کا معاملہ رہ جائے ظاہر ہے کہ قوموں کا باہمی ارتباط و اختلاط بڑھے گا۔ تمدن و تہذیب ان ملکوں اور قوموں تک بھی پہنچ جائے گی۔ جو دُور دراز مقامات میں پڑی ہوئی تھیں اور بوجہ اپنی جہالت کے جانوروں کی طرح وحشی اور جنگلی ہونے کا حکم رکھتی تھیں۔ ضرور تھا کہ اس میل جول سے اُن کی وحشت اور جہالت دُور ہوتی اور وہ متمدن اقوام سے مل کر علم و تہذیب حاصل کر کے مہذب و متمدن بنتے اور اس طرح دنیا میں تہذیب و تمدن ترقی کرتا۔ چنانچہ اس وحشت و جہالت کی روک دُور ہونے کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ اور جب وحشی اکٹھے کئے جائیں گے۔

یعنی وحشی اقوام جو جنگلوں اور پہاڑوں میں خانہ بدوش رہا کرتی تھیں۔ وہ متمدن اور مہذب بن جائیں گی۔ اور بستیوں اور شہروں میں آباد ہوں گی۔ اور تمدن و تہذیب کے ہر ایک شعبہ سے فائدہ اٹھائیں گی۔ ذرا افریقہ کے جنگلوں کو دیکھو کہ کس طرح وحشی اقوام متمدن ہو کر شہروں کو بسا رہی ہیں۔ ہمارے ملک میں بار کے لوگوں کو دیکھو۔ چک بن گئے۔ شہر بس گئے۔ وہی جنگلی جو جنگلوں میں ہاتھ پھرتے تھے موٹروں پر چڑھے پھرتے ہیں۔ ذرا چھوتوں پر نظر ڈالو۔ اور اسمبلی اور کونسل کی ممبریوں تک ان کا پہنچنا ملاحظہ ہو۔ یہی حال دوسرے ملکوں کا ہے خود یورپ کیا تھا۔ یہ بھی تو وحشی اقوام کا مجموعہ تھا۔ آج ذرا اس کے تمدن پر نظر ڈالو۔ اور پھر اذا الوحوش حشرت پر غور کرو۔ لذت آجاتی ہے۔ ان جنگلی اقوام کی جس جس طرح جہالت اور وحشت دور ہوتی گئی۔ تمدن و تہذیب کے منازل طے ہوتے گئے۔ لیکن یہ تمدن و تہذیب مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک نہ صرف شہر اور بستیاں بلکہ ملک اور براعظم آپس میں اس طرح نہ مل جائیں کہ تمام دنیا ایک شہر کا حکم رکھے۔ اور ایک ملک کا مال تجارت دوسرے ملک میں جائے۔ اور ایک جگہ کے لوگ دوسری جگہ جائیں اور آپس میں ملیں جلیں اور ایک دوسرے کے علم و حکمت، صنعت و حرفت، تجارت اور تمدن سے فائدہ اٹھا کر ہر ایک رنگ میں ترقی کریں۔ پس ضرور تھا کہ اس کے لئے سمندر کا درمیانی حجاب بھی اٹھا دیا جاتا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ اور جب سمندر پاٹ جائیں گے۔

یعنی دریا اور سمندر جو ان براعظموں اور ملکوں کے درمیان حائل ہیں پاٹ جائیں گے یعنی اُن کا عدم وجود برابر ہو جائے گا۔ دریاؤں پر جا بجا پُل بندھ جائیں گے۔ اور سمندروں میں ایسی سواریاں اور جہاز نکل آئیں گے۔ اور اس کثرت سے اُن کی آمد و رفت ہوگی۔ کہ سمندر عملی طور پر پٹ کر ایک معمولی گذرگاہ اور شاہ راہ کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ دیکھ لو کہ اب ایشیا اور افریقہ، یورپ اور امریکہ آسٹریلیا اور ہزارہا جزائر مختلفہ کس طرح ایک شہر کا حکم رکھتے ہیں۔ اب اُن کے درمیان سمندر کوئی روک نہیں بلکہ وہ ایک گذرگاہ اور شاہ راہ کا کام دے رہا ہے جس کے ذریعہ فاصلے نہایت آرام اور سرعت سے طے ہوتے ہیں اس کثرت سے اور اس قدر عالیشان اور راحت بخش جہازوں کی آمد و رفت ہے کہ آجکل بحری سفر خشکی کے سفر سے زیادہ آرام دہ اور شاندار ہو گیا ہے۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝ اور جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے۔

یہ کس صفائی سے پیشگوئی پوری ہو رہی ہے۔ دنیا کا کونسا خطہ ہے جہاں کے لوگ دنیا میں سفر نہ کرتے ہوں اور آپس میں ملتے جلتے نہ ہوں۔ جب ہر طرح کی روکیں اٹھ گئیں اور فاصلے مٹ گئے تو ایک دنیا ہے کہ آپس میں مل رہی ہے اور ایک دوسرے سے نفع اٹھا رہی ہے اور ایک دوسرے کے علم اور خیالات سے مستفیض اور باہمی تجارت سے نفع اٹھا رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمدن تہذیب معراج پر پہنچ گئی ہے۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ اور جب زندہ درگور کی ہوئی سے پوچھا جائے گا۔

بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ کس گناہ پر وہ قتل کی گئی۔

فرماتے ہیں اس باہمی میل جول اور تہذیب و تمدن اور تعلیم و تعلّم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عقلِ انسانی اس قدر ترقی کر جائے گی کہ عورت کی عزّت اور حقوق کا احساس پیدا ہوگا۔ گویا قوموں کی تہذیب و تمدن کی تکمیل اُس وقت ہوتی ہے جب اس میں عورت کی عزت اور حقوق کا احساس پیدا ہو جائے۔ وحشی اور غیر مہذب اقوام کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ ان میں عورت کی عزت کوئی نہیں ہوتی بلکہ وہ باعثِ ننگ و عار سمجھی جاتی ہے۔ اسی لئے عرب میں زمانۂ جاہلیت میں غیرت و شرافت کا یہ تقاضہ سمجھا جاتا تھا کہ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ ہندوستان میں راجپوتوں کا بھی یہ عام شیوہ تھا۔ اور اب بھی بعض جگہ راجپوتوں میں ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ مگر عرب میں حالت بہت ہی بدتر تھی۔ کہ لڑکی کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ ایک عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اُس نے اپنے اس قسم کے ظلم کی ایک سرگذشت سنائی۔ کہ میری ایک چھوٹی سی لڑکی تھی جو شفقتِ مادری کی وجہ سے پیدا ہوتے ہی قتل نہ کی جا سکی وہ مجھ سے بڑی محبت کرتی تھی اور خاصی بڑی ہو گئی تو ایک دن میں اُسے زندہ درگور کرنے کی نیت سے جنگل کو لے گیا جنگل میں سیر کھلانے کا بہانہ کیا جنگل میں اُسے زندہ دفن کرنے کے لئے گڑھا کھودنا شروع کیا۔ اس بیچاری کو کیا خبر تھی گڑھا کھودتے ہوئے جو مٹی اڑ کر میری تہ بند تک پہنچی تھی تو وہ بچی بڑے پیار سے اپنے دوپٹہ سے اُسے جھاڑتی جاتی تھی۔ آخر کار میں اُسے دفن کرنے لگا تو وہ باپ باپ پکارتی رہی لیکن میں نے ایک نہ سُنی اور اُسے زندہ دفن کر کے چلا آیا۔" یہ سرگذشت سُن کر آنحضرت صلعم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ آخر کار اس رحیم و کریم انسان کے شفقت بھرے قلب کی قوتِ قدسی نے وہ کام کر دکھایا جو انگریزوں کا زبردست قانون بھی مکمل طور پر ہندوستان میں نہ کر سکا۔ اسی آیت کے نزول پر یک قلم تمام عرب سے دُختر کشی مٹ گئی۔ کیونکہ جب قوم نے سُنا کہ یہ وہ فعل ہے جس کی بازپُرس ہوگی۔ دُنیا میں تو جب کبھی ہوگی ہوگی لیکن خدا کے سامنے بازپُرس ہونی یقینی ہے۔ تو سنگدل سے سنگدل عرب بھی کانپ اُٹھا۔ دراصل یہ اُس پاک رُوحِ محمدی کا تزکیہ نفس اور فیضانِ روحانی تھا۔ جو کام کر گیا اور خدا کے آگے ایک قوم کی قوم کا سر جھک گیا۔ اور اتنا ہی نہیں کہ دُختر کشی کی رسم ملک میں سے مٹا دی۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اسلام سے قبل عورت عملی طور پر زندہ درگور تھی۔ نہ اُس کی کوئی عزت تھی۔ نہ اُس کے کوئی حقوق تھے نہ اُسے کوئی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ مرد کی ایک ذلیل سے ذلیل لونڈی اور بے جان اسباب کی طرح ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ اس سے بڑھ کر عورت کی زندہ درگور حالت ممکن نہیں۔ قرآن نے آکر عورت کو اس قبر میں سے نکالا۔ اُسے آزاد کر کے مرد کے برابر لا کر کھڑا کر دیا۔ اُس کی عزّت اور اُس کے حقوق قائم کر دیئے۔ اُس کی تعلیم و تربیت کے لئے احکام دیئے لیکن بایں ہمہ اُس وقت ابھی دُنیا میں قوموں کے باہمی تعلقات قائم نہ ہوئے تھے۔ اور وہاں تمام غیر مہذب اقوام اور ممالک میں جہاں اسلام کا اثر نہ پہنچا تھا جن میں سے ایک یورپ بھی تھا عورت اسی طرح زندہ درگور چلی آتی تھی اس لئے جناب الٰہی فرماتے ہیں کہ جب قوموں میں آپس میں میل جول بڑھے گا۔ اور تمدن و تہذیب ترقی کرے گا۔ تو پھر عورت کی عزت اور حقوق کا احساس عام طور پر قوموں میں پیدا ہو جائے گا۔ اور ان قوموں میں بھی جو مسلم نہیں ہیں دختر کشی قانوناً بند ہو جائے گی اور عورت اپنی زندہ درگور حالت میں سے باہر نکالی جائے گی اور اس کے حقوق قانوناً تسلیم کئے جائیں گے۔

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ ۝ اور جب صحیفے پھیلا دیئے جائیں گے۔

فرماتے ہیں یہ وہ زمانہ ہوگا جب علم و حکمت کا دنیا میں بڑا چرچا ہوگا۔ اور اخبارات اور ٹریکٹ رسالے اور کتابیں بڑی کثرت

سے دُنیا میں شائع کی جائیں گی تاکہ ایک ملک کی خبریں اور ایک قوم کا علم دوسرے ملک یا قوموں کو پہنچایا جاوے۔ اور دُنیا میں باہم ایک دوسرے کے خیالات علم اور سائنس وحکمت سے فائدہ اٹھایا جاوے۔ اب فرماتے ہیں کہ اس علم وحکمت کی نشرو اشاعت کے زمانہ میں خدا بھی اپنے علم پر سے پردہ اٹھائے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ○ اور جب آسمان کا پردہ اتار لیا جائے گا۔

آسمان کا پردہ اُتارنے سے یہ مراد ہے۔ کہ آسمانی علوم اور اسرار پر سے پردہ اٹھایا جائیگا یعنی آسمانی علوم اور باطنی حقائق کے اسرار وغوامض منکشف کئے جائیں گے۔ اور قاعدہ ہے کہ ہمیشہ کسی مرد باخدا کے قلب صافی پر یہ انکشاف ہُوا کرتا ہے اور اُس کے ذریعہ اس علمی خزانہ سے اہل دنیا کو مالا مال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ مقدر تھا جس کے متعلق آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا۔ کہ اگر ایمان ثریا پر بھی چلا جائیگا۔ تو ایک شخص ابنائے فارس میں سے اُسے واپس لے آئیگا۔ اور یہ پیشگوئی مجدد وقت حضرت مرزا غلام احمد علیہ الرحمۃ مسیح موعودؑ کے وجود میں پوری ہوئی کہ جب سرچشمہ نور آسمانی کا پلیٹ لیا گیا۔ اور علم قرآن دُنیا سے اُٹھ گیا اور علمائے ربانی معدوم ہو گئے۔ اور جو علما موجود تھے۔ اُن کے پاس نور آسمانی نہ رہا تو اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت کی اس نشرواشاعت کے زمانہ میں ایک بندہ کو جو حضرت محمد رسول اللہ صلعم کا خادم اور غلام تھا کھڑا کیا جس کے ذریعہ آسمانی علوم پر سے پردہ اٹھایا گیا۔ اور اُس کے زور قلم اور فیض روحانی سے دینی علوم کا ایک سمندر بہ نکلا جس نے اسلام کو دنیا کے ادیان باطلہ پر غالب کر کے دکھا دیا۔ اور یورپ کی اور دہریت کی رو کے سامنے سد سکندری بن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے آسمانی علوم و اسرار وغوامض پر سے ایسا پردہ اُٹھایا کہ دنیا حیران وششدر بن کر رہ گئی۔ اور مذہب کو اس طرح سائنس بنا کر دکھایا کہ عقلمندوں کے سر اُس کے زبردست دلائل کے سامنے جھک گئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ایام میں جب دُنیا تہذیب وترقی کے معراج پر تھی۔ خاص طور پر ایک شخص کو خدمت دین کیلئے کھڑا کرنے اور اس کے ذریعہ علوم آسمانی پر سے پردہ اٹھانے کی ضرورت کیا تھی۔ تہذیب وتمدن علوم اور حکمت کے اس اعلیٰ معراج کے باوجود انسان کو آسمانی علوم اور اس کے معلّم کی کیوں ضرورت پیش آئی۔ اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں:۔

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ○ اور جب جہنم بھڑکایا جائے گا۔

یعنی باوجود اس قدر مادی تہذیب وتمدن کے عروج کے انسان خواہشات نفسانی اور جذبات حیوانی کی غلامی سے آزاد نہ ہوگا۔ بلکہ ان مادی ترقیات کے ساتھ ساتھ خواہشات نفسانی اور جذبات حیوانی میں بھی مزید ہیجان پیدا ہوتا جائیگا گویا وہ جہنم جس کی آگ انسان کے قلب پر بھڑکتی ہے جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ (الھمزہ) کہ وہ اللہ کی بڑی سے روشن کی ہوئی آگ ہے جو دل پر بھڑکتی ہے وہ جہنم اور زیادہ بھڑکیگا۔ اور دیکھ لو کہ دنیوی علوم کی ترقیاں اور مادی کمالات وترقیات انسان کو نفس اور شیطان کی غلامی سے آزاد نہ کر سکے۔ اور نہ صرف نفس پرستی اور شہوت پرستی نے عیاشی اور شراب خوری زناکاری اور قمار بازی اور سُود خوری اور ہر قسم افعال شنیعہ کے ناپاک مظاہروں سے جہنم کو بھڑکایا بلکہ غضب اور حسد نے بھی جنگوں کی خطرناک

صورت میں جہنم کے بھڑکنے کو ایسا نمایاں کر کے دکھایا۔ کہ اذا الجحیم سعرت کا نظارہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں ہو سکتا۔

وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۝ اور جب جنت نزدیک کر دی جائے گی۔

فرمایا یہی وقت ہوگا جب نیکی اور خدمتِ دین بہت قابلِ قدر چیز ہوگی۔ اور تھوڑے عمل سے بہت ثواب ملے گا۔ کہ یہی معنے جنت نزدیک ہونے کے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جب دنیا میں فسق و فجور اور گمراہی و ضلالت کا زور ہو اس وقت خدا کے رستہ میں نیکی اور خدا تعالیٰ کے حکموں کی اطاعت جس قدر ثواب رکھتی ہے۔ اس قدر دوسرے وقت میں ثواب نہیں رکھتی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر خطبہ دیا اور فرمایا کہ جو اس زمانہ میں ایک مٹھی جو کی دیتا ہے۔ وہ جتنا ثواب رکھتا ہے وہ اس سے بہت بڑھ کر ہے جو بعد میں اُحد پہاڑ کے برابر سونا دینے سے حاصل ہوگا۔ بات یہ ہے کہ ضرورت کے وقت جو شخص کام آتا ہے وہ زیادہ قابل قدر ہوتا ہے۔ اس شخص سے جو ضرورت کے بغیر کوئی کام کرے۔ ایک مسکین کو جو بھوکا ہے روکھی روٹی کھلانی جو ثواب رکھتی ہے۔ وہ ثواب ایک پیٹ بھرے کو پلاؤ پیش کرنے سے نہیں مل سکتا جب دین کو خدمت کی ضرورت ہو اس وقت روپیہ خرچ کرنا جو ثواب رکھیگا وہ اس ثواب سے بدرجہا بڑھ چڑھ کر ہوگا بہ نسبت دین کے لئے اس وقت روپیہ خرچ کرنے میں ہوگا۔ جب اس کو چنداں ضرورت نہ ہو۔ اور ہمارے زمانہ کی نسبت تو آنحضرت صلعم نے صاف فرمایا۔ کہ اس وقت خدا کے حضور میں ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہوگا۔ وجہ یہ کہ بیدینی کے زمانہ میں دینداری واقعی ایک بڑی قابل قدر چیز ہے اور یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب جنت نزدیک کر دی جاتی ہے۔ اور تھوڑے سے عمل سے بہت سا ثواب انسان حاصل کر لیتا ہے۔

ان تمام پیشگوئیوں کے بعد اب فرماتے ہیں کہ اگر یہ سب باتیں صحیح ثابت ہوں تو پھر یہ بھی سچ ہے کہ۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ۝ ہر شخص جان لیگا جو وہ لایا ہوگا۔

یعنی ہر ایک نفس جو عمل کرتا ہے اس کے نتائج کا وہ ذمہ دار ہے اور ایک دن آخر کار ایسا آئے گا۔ کہ اپنے عملوں کی نسبت اس سے بازپرس ہوگی۔ اس بازپرس سے وہ بچ نہیں سکتا جہنم کے بھڑکنے اور جنت کے نزدیک ہونے کی پیشگوئیوں کے بعد اگر کوئی پیشگوئی اب بھی ہو سکتی تھی تو یہی تھی۔ کہ اعمال اپنے نتائج کو ایک روز ظاہر کر کے رہیں گے کیونکہ جہنم و جنت اسی کے دو مظاہرے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر اوپر کی بارہ زبردست پیشگوئیاں پوری ہوتی اسی دنیا میں نظر آجاویں تو یہ تیرھویں پیشگوئی آخرت کے متعلق بھی سچی ماننی پڑے گی کہ یہی وہ نبأ عظیم ہے جس پر یقین پیدا کرنے کی خاطر دوسری تمام پیشگوئیاں کرنی پڑیں۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝ پھر اتنا ہی نہیں بلکہ قسم کھاتا ہوں (یعنی گواہی میں پیش کرتا ہوں) پیچھے ہٹنے والوں کی۔

الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝ چلنے والوں اور غائب ہو جانے والوں کی۔

قسم کے متعلق میں سورۃ النازعات میں بحث کر آیا ہوں کہ اس کے معنے ہوتے ہیں فقط گواہی کے جس کے ساتھ تاکید بھی جمع ہو خُنَّس جمع ہے خانس کی جس کے معنے ہیں پیچھے ہٹ جانے والا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ الشیطٰنُ یُوَسْوِسُ اِلَی الْعَبْدِ فَاِذَا ذَکَرَ اللّٰہَ خَنَسَ

شیطان بندے کی طرف وسوسہ ڈالتا ہے۔ پھر جب وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اسی سے خنّاس آتا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں سورۃ الناس میں آتا ہے من شر الوسواس الخنّاس کہ خنّاس کے وسوسوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ خنّاس کی تعریف خود قرآن نے کی ہے الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس۔ وہ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالے خواہ وہ جن ہو یا آدمی ۲۔ الجوار جو سرعت سے دنیا میں چلے اور پھیل جائے۔ الکنّس جمع ہے کانس کی جس کے معنے ہیں غائب ہو جانے والا۔ الخنّس۔ الجوار۔ الکنّس کی نسبت یہاں نام لیکر تو بتایا نہیں کہ وہ کون ہیں۔ صرف اُن صفات کا ذکر کیا ہے جو اُن میں پائی جانیوالی تھیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ چیزیں جن کو بطور شہادت یہاں پیش کرتے ہیں اُن کا تعلق اسی زمانہ سے ہونا چاہیئے جس کے متعلق اُوپر پیشگوئیاں ہو چکی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ کون لوگ ہیں جو مومنوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور تمام روئے زمین میں پھیلے ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ یہ عیسائی پادری ہیں جن کا کام دن رات اسلام کے خلاف لٹریچر پھیلانا اور پروپیگنڈا کرنا ہے جس سے خدا کے دین کی نسبت لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا ہوں آدیوں یا کسی اور معترضین نے اگر کچھ لیا ہے تو انہی پادریوں کے لٹریچر سے لیا ہے اور وہ محض انہی پادریوں کی کاسہ لیسی کرتے ہیں اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اصل دشمن اسلام کے یہی پادری ہیں۔ جو نہایت خوش اسلوبی سے چپ چاپ دینِ حق کی نسبت وسوسے ڈالتے اور پیچھے ہٹ جاتے اور الگ ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ پادری عماد الدین امرتسری نے شائع کیا کہ "اگر ہم پادری لوگ مسلمانوں کو عیسائی نہ بنا سکے تو خیر ہم نے اس قدر لٹریچر اسلام کے خلاف تیار کیا ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان بھی نہیں رہنے دیں گے"۔ مشن ہسپتالوں، مشن اسکولوں اور مشن کالجوں کا بھی مقصد یہی ہے کہ عورتوں اور بچوں اور نوجوان طالب علموں کے نرم اور کچے دلوں کو اسلام کے خلاف طرح طرح کے وساوس سے زہریلا کیا جائے۔ جہاں عیسائیت کا وار نہیں چل سکتا تو مادہ پرستی کو سامنے کر دیتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو مسلمان مسلمان نہ رہے۔ میں نے بعض دیسی عیسائی پادریوں کا یہ بھی طریقہ دیکھا ہے کہ مسلمانوں کا سا لباس پہن کر مسلمانوں کا سا نام رکھ کر اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے پھر اسلام پر طرح طرح کے اعتراض کر کر کے مسلمان نوجوانوں کو گمراہ کرتے اور بہکاتے ہیں مطلب یہ کہ بحیثیت ایک عیسائی کے پیچھے اور الگ بھی ہٹے رہیں۔ اور ضرب بھی کاری لگے یعنی مسلمانوں کو مسلمان نہ رہنے دیں یہ تو ان کی ایک حالت الخنس کی ہوئی۔ اب الجوار کی حالت ملاحظہ ہو کہ دنیا کا کوئی حصہ یا گوشہ نہیں جہاں پادری نہ پہنچ گئے ہوں اپنے مشن کو لیکر جس تیزی سے یہ پادریوں کی قوم دنیا کے ہر گوشہ میں پھیلی ہے۔ وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے بہت سی ممنوع جگہوں میں بھی یہ پادری مخفیہ مخفیہ پھیل جاتے اور وہاں کے نقشے تیار کر کے اور حالات جمع کر کے اپنی اپنی حکومتوں کو خبریں پہنچاتے رہتے ہیں مذکورہ بالا واقعات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ الخنس الجوار الکنس میں جن لوگوں کا ذکر ہے۔ وہ یہی عیسائی پادری ہیں۔ اس سورت کے آغاز میں آج سے تیرہ سو سال قبل نہایت زبردست پیشگوئیاں کر کے جب موجودہ زمانہ کا مذہبی اور دنیوی نقشہ کھینچ چکے اور انہیں نتائج اعمال پر دلیل ٹھیرا چکے تو اس کے بعد ان آیات میں ایک اور اہم پیشگوئی فرمائی چنانچہ انسان کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ اتنا ہی نہیں ایک اور اہم واقعہ اس زمانہ کا سُن لو۔ کہ ایک قوم ہوگی جن کا کام ہی خدا کے دین کے خلاف وسوسے ڈال کر پیچھے ہٹ جانا ہوگا۔ اور وہ اپنے مشن کو لیکر تمام دنیا میں تیزی سے پھیل جانے والے ہوں گے۔ لیکن وقت آئے گا کہ یہ دجّال پانی میں نمک کی طرح گل جائیگا۔ اور یہ وسوسے ڈال کر پیچھے ہٹ جانیوالے اور دنیا میں تیزی سے پھیل جانیوالے

آخر غائب ہونا شروع ہو جائیں گے۔ آگے اس امر کو اور واضح کرتے ہیں:۔

وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۝ اور قسم ہے رات کی یعنی گواہ ہے رات جب وہ چڑھتی چلی آئے۔

وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۝ اور قسم ہے صبح کی یعنی گواہ ہے صبح جب وہ طلوع ہونے لگے۔

یعنی یہ ہستیاں جو اسلام کے خلاف کارروائیاں کرتی پھرتی تھیں اسی وقت تک کام کر سکتی تھیں جب تک گمراہی کی رات چڑھتی چلی آتی تھی۔ لیکن جس طرح تمام تاریکی کے فرزند خواہ وہ کیڑے مکوڑے ہوں یا درندے یا چور یا کوئی اور اہل باطل جو صرف رات کو ہی باہر نکلتے اور اپنی کارروائیاں کر سکتے ہیں صبح کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب اسلام کا آفتاب ہدایت طلوع ہونے لگے گا تو یہ سب خناس یعنی وسوسے ڈالنے والے دنوں میں ڈال کر پیچھے ہٹ جانے والے غائب ہو جائیں گے۔ اور اُن کی ساری کارروائیاں بے اثر ہو جائیں گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ طلوعِ آفتاب مغرب سے ہوگا یعنی اس مرتبہ اسلام کا آفتاب ہدایت خاص طور پر ارضِ مغرب یعنی یورپ اور امریکہ پر اپنے انوارِ ہدایت کو ڈالے گا۔ چنانچہ دیکھو آج یہ تنفس صبح اور طلوع آفتاب کا نظارہ یورپ میں نظر آرہا ہے۔ ووکنگ اور برلن وغیرہ سے جو صبح صادق طلوع ہو رہی ہے اس کے متعلق خواجہ کمال الدین مرحوم کیا خوب فرماتے ہیں ؎

اے خدا را قوم من برخیز از مستانہ خواب ❊ تا بکے غفلت ہر ہیں بر بام آمد آفتاب

کن نگاہ بر افقِ مغرب کہ نمود آثارِ صبح ❊ حیف باشد گر نہ ایں ایام فجا ہی شتاب

در ممالک غلغلہ شد نصرتِ اسلام را ❊ غلبۂ توحید مے خواہد خود احدیت مآب

دیکھو کس طرح یورپ کے پادری اور اُن کے مشن بے اثر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بلکہ بعض یورپ کے ملکوں سے تو یہ پادری خارج البلد کر دیئے گئے ہیں جب سے حضرت مجدد زمان مسیح موعود حضرت مرزا غلام احمد علیہ الرحمۃ اور آپ کی جماعت کے ذریعہ اسلام کی روشنی اور اس کے لٹریچر کی اشاعت ممالک یورپ وغیرہ میں ہونے لگی ہے۔ ان پادریوں کی تمام کارروائیاں اسلام کے خلاف خدا کے فضل سے بے اثر ہو گئی ہیں۔ احمدی علم کلام اور لٹریچر کے نور سے جو اپنے اندر آفتاب اسلام کا نور رکھتا ہے۔ تمام تاریکی کے فرزند گھبراتے اور اس کے سامنے آتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ عیسائی پادری احمدی مبلغین کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ اور یہ مذہب اب خود بھی مٹتا چلا جا رہا ہے۔ عیسائی ممالک میں لوگوں کے دلوں پر سے اس کی حکومت اب زائل ہوتی چلی جا رہی ہے کیونکہ اس کے غیر معقول اصول اب تعلیم یافتہ لوگوں پر حکومت نہیں کر سکتے۔ اب ان چاروں قسموں کے بعد جواب قسم فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ چاروں پیشگوئیاں مع ان بارہ پہلی پیشگوئیوں کے اس بات پر گواہ ہیں کہ:۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ یقیناً یہ قرآن معزز رسول کا قول ہے۔

یعنی یہ قرآن جو تم محمد مصطفےٰ صلعم کی زبان سے سنتے ہو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا قول نہیں بلکہ قولِ رسالت ہے یعنی آپ کے بھیجنے والے کا پیغام ہے جو وہ بحیثیت رسول پیش کر رہے ہیں۔ یہاں قول رسول میں اضافت تملیکی نہیں بلکہ ادنیٰ ملابست کے رنگ میں

اضافت ہے جیسا کہ میں اگر کہوں کہ میرا اسکول۔ یا گھوڑے کی زین۔ تو اس کے یہ معنے نہیں کہ اسکول میری ملکیت ہے یا زین گھوڑے کی ملکیت ہے۔ بلکہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ اسکول جہاں میں پڑھتا ہوں یا وہ زین جو گھوڑے پر پڑی ہوئی ہے اسی طرح قولِ رسول کا مطلب ہے وہ قول جو رسول کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور جو شخص بحیثیت رسول کے کسی قول کو پیش کرتا ہے وہ اس کا اپنا قول نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کا قول ہوتا ہے جو اس کا بھیجنے والا ہوتا ہے۔ چنانچہ خدا کا رسول اسی لئے رسول کہلاتا ہے کہ وہ قولِ رسالت کا حامل ہوتا ہے یعنی وہ اس لئے دنیا میں بھیجا جاتا ہے کہ اپنے بھیجنے والے یعنی اللہ تعالیٰ کے پیغام کو جسے قولِ رسالت کہتے ہیں اہلِ دنیا کو پہنچا دے پس جو قول یعنی کلام وہ بحیثیت رسول پیش کرتا ہے وہ اس کا اپنا قول نہیں ہوتا بلکہ خدا کا قول ہوتا ہے۔ لہٰذا جو اس قول کی فرمانبرداری کرتا ہے وہ خدا کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ اور جو اس قول کی مخالفت کرتا ہے وہ خدا سے لڑتا ہے رسول کی رسالت کا کام تو محض خدا کے قول کو بطور پیغام دنیا کے آگے پیش کر دیتا ہے۔ یعنی وہ محض پیغام بر ہوتا ہے اسی بات کو سورہ الحاقہ میں بھی فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

انہ لقول رسول کریم ۝ وما ھو بقول شاعر قلیلاً ما تؤمنون ۝ ولا بقول کاھن قلیلاً ما تذکرون ۝ تنزیل من رب العٰلمین۔ ولو تقول علینا بعض الاقاویل ۝ لاخذنا منہ بالیمین ۝ ثم لقطعنا منہ الوتین (الحاقہ) یقیناً یہ قول ہے معزز رسول کا اور نہیں ہے وہ شاعر کا قول تھوڑا ہے جو تم ایمان رکھتے ہو۔ اور نہ قول ہے کاہن کا۔ تم لوگ بہت کم نصیحت پکڑتے ہو۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اور اگر وہ ہماری طرف کوئی بات بطور افترا کے منسوب کرے۔ تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اس کی رگِ جان کاٹ دیں“۔ اس سے بڑھ کر صفائی اور کیا ہو گی۔ یہاں صاف بتلا دیا کہ یہ کلام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ خود اُن کا اپنا یعنی انسانی کلام نہیں۔ اگرچہ تم سنتے تو ہو محمد مصطفےٰ صلعم کی زبان سے۔ مگر اس طرح ان کا بیان کرنا محض ایک رسول کی حیثیت سے ہے۔ پھر فرمایا یہ شاعر کی شاعری بھی نہیں۔ اور کاہن کی کہانت بھی نہیں۔ بلکہ رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ کلام ہے۔ جسے وہ بحیثیت رسول کے تمہیں سناتے ہیں۔ اور پھر اس قدر احتیاط کے ساتھ سناتے ہیں کہ وہ ایک لفظ بھی اپنی طرف سے خدا کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ اور یہ احتیاط ہے بھی ضروری کیونکہ اگر وہ کوئی لفظ ہماری طرف از خود منسوب کر دیں جو ہم نے نازل نہیں فرمایا۔ تو ہم اُن کی رگِ جان کاٹ دیں۔ اور ہلاک کر دیں۔ دوسری جگہ فرمایا **وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحیٰ** (النجم) وہ نہیں بولتا ہے اپنی خواہش سے مگر وہی جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔ پس یہاں ان تمام پیشگوئیوں کو بیان کر کے فرمایا کہ یہ پیشگوئیاں جو دقیق در دقیق غیب پر مشتمل ہیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے رسول ہیں اور یہ کلام جو وہ سناتے ہیں اس خدا کا کلام اور پیغام ہے جس کے وہ رسول اور فرستادہ ہیں۔ پھر رسول کے ساتھ لفظ کریم بڑھایا یعنی یہ رسول معزز ہے۔ قاعدہ ہے کہ جو کسی بادشاہ کی طرف سے سفیر اور پیغام بر آتا ہے اس کی عزت مسلم ہوتی ہے اس کو ذلیل کرنا خود اس بادشاہ کو ذلیل کرنے کے مترادف ہوتا ہے جو اسے بھیجتا ہے جن لوگوں کی طرف وہ سفیر بن کر آتا ہے اگر وہ اُسے ذلیل کرنا چاہیں تو سفیر کا بھیجنے والا اس میں اپنی ہتک سمجھتا اور اُس کی خاطر لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے پس فرمایا کہ یہ خدا کا رسول ہے اس لئے اس کا معزز ہونا لازمی امر ہے جو اس کی عزت پر ہاتھ ڈالے گا۔ وہ خدا سے لڑتا ہے اس لئے ذلیل اور ہلاک ہو گا۔ اور یہ رسول چونکہ خدا کا ہے اس لئے یہ تو معزز ہو کر رہے گا۔ اگر یہ جھوٹا ہوتا تو خدا خود اس کا دشمن ہوتا اور اسے ذلیل اور ہلاک کر دیتا۔ پس باوجود مخالفت کے اس کا معزز ہوتے چلے جانا اس بات پر دلیل ہے کہ یہ خدا کا سچا رسول ہے اور واقعات عالم نے آخر کار آپ کے معزز اور مکرم ہونے پر تصدیق کی مہر لگا دی۔ نہ صرف آپ کے سامنے تمام عرب نے گردن جھکا

دی۔ بلکہ کروڑہا کروڑ انسان مختلف اقطاع عالم کے آپ کی غلامی کو فخر سمجھتے رہے اور آج بھی فخر سمجھتے ہیں۔ہادی لاکھ آپ کی شکلیں بگاڑ بگاڑ کر دُنیا کے آگے پیش کریں لیکن جسے خدا نے کریم یعنی معزز فرمایا ہے وہ دنیا بھر میں معزز ہو کر رہے گا۔ اور وہ وقت اب آگیا ہے روز بروز آپ کی عزّت و عظمت دنیا پر ظاہر ہو رہی ہے۔

ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ ۙ قوت والا۔ صاحب عرش کے نزدیک مرتبہ والا۔

ذی قوۃ۔ قوت والا یعنی یہ رسول ظاہری و باطنی دونوں قسم کی قوتوں کا مالک ہے عنقریب اس قوت والے رسول کی قوت قدسی کا تماشہ نظر آجائے گا۔ کہ تمام عرب کو شرک اور گن گی فسق و فجور اور غلامیٔ نفس سے نکال کر توحید و تقویٰ، طہارت اور اخلاق فاضلہ کے اعلےٰ منازل پر پہنچا دے گا۔ دنیا کی ظاہری قوتیں بھی اس کو زیر نہیں کر سکتیں بلکہ تمام قوتوں پر اس کی قوت غالب آئے گی اور کیوں نہ غالب ہو جبکہ وہ قوت والے خدا کا رسول ہے اور اس لئے خود خدا کی قوت اس کے ساتھ ہے چنانچہ دیکھ لو ایک طرف کس طرح شیطان کی بدی کی قوتیں آنحضرتؐ کی قوت قدسی کے آگے ٹوٹ گئیں۔ اور تمام عرب کی روحانی طور پر کایا پلٹ گئی اور دوسری طرف تمام ظاہری قوتیں آپ کی قوت کے آگے ٹوٹ گئیں عرب کی قوتیں ٹوٹیں قیصر و کسریٰ کی قوت ٹوٹی۔

عند ذی العرش مکین۔ صاحب عرش کے نزدیک مرتبہ والا۔ جب یہ رسول اس خدا کے حضور مقرب ہے جو صاحب عرش ہے۔ یعنی جو تمام کائنات کی ظاہری و باطنی سلطنت کا مالک ہے تو لازمی بات ہے۔ کہ اس کے مقام قرب اور درجات کا اظہار دنیا میں بھی ہو۔ اور یہ رسول باطنی اور ظاہری سلطنت کا مالک ہو۔ اور اُس کی قبولیت ایک عالم کے دل میں ڈالی جائے۔ چنانچہ خدا کے منہ کی یہ سب باتیں آنحضرت صلعم کی زندگی میں ہی آپ کے متعلق پوری ہوئیں۔

مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ۙ اطاعت کیا گیا اور امین۔

مطاع۔ اطاعت کیا گیا۔ فرمایا یہ مطاع ہے۔ ایک عالم اس کی اطاعت کریگا۔ مقام غور ہے جس وقت یہ سورت نازل ہوئی ہے اس وقت آپ کی اطاعت کرنے والا شاذ و نادر ہی کوئی موجود تھا۔ یا ایک زمانہ آیا کہ نہ صرف سارا عرب آپ کا مطیع ہوگیا بلکہ کروڑوں انسان جن میں بڑے بڑے سلاطین ہوئے آپ کی اطاعت کو اپنے لئے فخر سمجھتے رہے۔ اور آج بھی سمجھتے ہیں۔

ثمّ امین۔ اور ادھر دیکھو یہ امین ہے۔ ثمّ۔ ثا کے فتح کے ساتھ اس وقت استعمال ہوتا ہے۔ جب مخاطب کی توجہ کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیرنا ہو۔ اب تک تو حضرت نبی کریم صلعم کے متعلق زبردست پیشگوئیاں ہو رہی تھیں جن میں سے ہر ایک آپ کے منجانب اللہ اور صادق ہونے پر دلیل تھی لیکن اب آپ کی صداقت پر دلیل ایک اور طریق پر پیش کرتے ہیں اور وہ اس طرح کہ مخاطب کی توجہ کو مستقبل سے ماضی کی طرف پھیر کر فرماتے ہیں۔ کہ ایک اور بات کی طرف توجہ کرو۔ وہ یہ کہ یہ رسول ایک عمر تمہارے درمیان رہا ہے تم خوب جانتے ہو کہ کس قدر راستباز انسان ہے۔ اس کی دیانت اور امانت تم میں مسلّم ہے پس تم غور کرو کہ ایسا راستباز اور امین انسان کس طرح خدا پر جھوٹ افترا کرنے لگ جائیگا اس کی پہلی زندگی جو صدق اور امانت و دیانت سے بھرپور رہے اور جس کے تم گواہ ہو اس کی راستبازی پر دلیل قاطع ہے۔

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ۝ اور تمہارا ساتھی مجنون نہیں ہے۔

جب اس طرف توجہ دلائی کہ یہ رسول تم میں ایک عمر رہا ہے جس کی صداقت اور امانت پر تم گواہ ہو تو ایک وسوسہ پیدا ہو سکتا تھا۔ وہ یہ کہ اگرچہ ایسا امین اور صادق انسان جھوٹ نہیں بول سکتا لیکن ممکن ہے دماغ خراب ہو گیا ہو اور حالتِ جنون میں دعویٰ رسالت و وحی کیا ہو۔ اس کا جواب ایک لفظ صاحبکم سے دیدیا۔ کہ تمہارا ساتھی جو ہر وقت تمہاری صحبت میں رہتا ہے مجنون تو نہیں ہے ایک مجنون وہ ہوتے ہیں جو ہر وقت واہی تباہی بکتے رہتے ہیں۔ اُن کی شناخت تو مشکل نہیں ہوتی لیکن ایک مجنون وہ ہوتے ہیں جنہیں کسی خاص امر کا جنون ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی شناخت کا یہ طریق ہوتا ہے کہ انہیں کئی کئی دن زیر ملاحظہ رکھا جاتا ہے چنانچہ مشتبہ مجنونوں کو کئی کئی دن جیلخانوں یا شفاخانوں میں زیر ملاحظہ رکھا جاتا ہے تب اُن کی نسبت صحیح طور پر رائے قائم کی جاتی ہے کہ یہ مجنون ہیں یا نہیں کیونکہ زیر ملاحظہ رہنے سے اور باہم گفتگو کرنے سے کسی نہ کسی وقت ایسے لوگوں کا جنون ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ اس خاص معاملہ میں جن میں ان کا دماغ بہک گیا ہوتا ہے۔ واہی تباہی اور غیر معقول باتیں کرنے لگ جاتے ہیں پس اسی امر کی طرف جناب الٰہی توجہ دلاتے ہیں کہ تمہارا یہ ساتھی جو ہر وقت تمہاری صحبت میں رہتا ہے کوئی اس کی جنون کی بات بتاؤ۔ اگر نہیں بتا سکتے تو پھر وہ کیسے مجنون ہو سکتا ہے۔ جو شخص دن رات تمہارے زیر ملاحظہ اور صحبت میں رہتا ہے۔ اس کا جنون مخفی نہیں رہ سکتا۔ کسی نہ کسی وقت تو اس کا جنون ظاہر ہو جاتا۔ اور وہ غیر معقول اور واہی تباہی بات کر کے اپنے دیوانہ پن کو ظاہر کر دیتا کیا دن رات صحبت میں رہ کر بھی ایک باخدا اور صاحب اخلاق فاضلہ انسان کا ایک مجنون اور دیوانہ سے امتیاز نہیں ہو سکتا؟ جو نا ممکن امر ہے۔

وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ۝ اور بیشک اُس نے اپنے آپ کو یا خدا کو کھلے کھلے انتہائی مقام پر دیکھا۔

اُفق کے معنے ہیں انتہائی مقام۔ کونسا انتہائی مقام؟ وہ جو انسان کے حدِ کمال کو ظاہر کرتا ہے اس آیت میں بتلایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم مجنون نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو انسانی کمالات اور قربِ الٰہی کے اُس اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر کھلا کھلا دیکھ لیا ہے جس سے بڑھ کر کمالاتِ انسانی ممکن نہیں یا اللہ تعالیٰ کو اپنے قلب کی آنکھ سے اس حدِ کمال انسانی تک دیکھ لیا اور اس کی معرفت کو حاصل کر لیا ہے جس حد تک کہ انسان خدا کو دیکھ سکتا اور اس کی معرفت کو حاصل کر سکتا ہے اور اس امر کا ثبوت نہ صرف آپ کے اخلاق فاضلہ اور معرفت تامہ سے اظہار ہوتا ہے بلکہ آپ پر اللہ تعالیٰ نے اس قدر علوم غیبیہ اور اسرار لدنیہ کا اظہار کیا کہ ممکن نہیں کہ بغیر خدائی علم کے انسانی علم وہاں تک پہنچ سکتا ہو جس میں سے شمّے نمونہ از خروارے اس سورت میں متعدد پیشگوئیاں کی گئی ہیں جو کس قدر دقیق در دقیق علوم غیبیہ پر مشتمل ہیں۔ کیا یہ ایک مفتری یا مجنون انسان کا کام ہو سکتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ۝ اور وہ غیب پر بخیل نہیں ہے۔

یعنی اس قدر علوم غیبیہ کا اظہار کیا مفتریوں اور مجنونوں پر ہوا کرتا ہے ایسی کھلی کھلی پیشگوئیاں جو دقیق در دقیق علم غیب پر مشتمل ہیں صاف طور پر ثابت کرتی ہیں کہ اس کلام کا سرچشمہ علم الٰہی ہے اور اس شخص کا جو ان کا اعلان کر رہا ہے تعلق اس خدا سے ہے جو بکل شئ علیم ہے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ اور یہ (قرآن) مردود شیطان کا قول نہیں۔

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝ سو تم کدھر جاتے ہو۔

یعنی یہ خیال کہ ممکن ہے کہ یہ شیطان کا قول ہو نہایت درجہ کی گمراہی ہے اور حد درجہ کی غلط راہ پر اپنے آپ کو ڈالنا ہے کیونکہ شیطان تو خود مردود اور خدا کی درگاہ سے راندہ ہے اس کی آواز تو ہمیشہ بدی کی محرک اور گندگی اور ذلت اور ہلاکت کی طرف لیجانیوالی ہوگی۔ اور یہ قرآن اس کے برعکس خدا کی طرف بلاتا اور نیکی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وہ بیشک نہیں ہے مگر تمام عالموں کیلئے نصیحت اور موجب شرف۔

ذکر کہتے ہیں نصیحت اور مذہب فطرت کی یاددہانی کو جس پر عمل کر کے انسان اُس شرف اور بزرگی کو حاصل کرے جس کیلئے وہ پیدا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں قرآن کی تعلیم کو دیکھو کہ کس قدر اعلیٰ درجہ کی ہے اور کس قدر بلند اصولوں پر مبنی ہے جو انسانیت کے شرف اور بزرگی کا موجب ہے یعنی جس پر عمل کر کے انسان اُس شرف اور بزرگی کو حاصل کر سکتا ہے جس کیلئے وہ پیدا ہوا ہے۔ ایسی تعلیم کیا شیطان کی ہو سکتی ہے جو انسان کو شرف انسانیت بخشے اور بلند سے بلند عزت کے مقام تک پہنچا دے۔ اور پھر دیکھو کہ کس قدر جامع اور عالمگیر تعلیم ہے کہ تمام دنیا کی قومیں ہر ملک اور ہر زمانہ میں اس سے مستفیض ہو سکتی ہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ انسان خود اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے اسی لئے فرمایا کہ

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝ اس کیلئے جو تم میں سے چاہے کہ سیدھی راہ پر رہے۔

یعنی اگرچہ یہ تعلیم جناب الٰہی سے تمام عالم کے فائدہ کیلئے نازل ہوئی ہے لیکن اس تعلیم سے اور اس پر چلنے کے نتیجہ یعنی شرف و بزرگی سے وہی شخص حصہ لے سکتا ہے جو چاہے کہ میں صراط مستقیم پر رہوں کیونکہ خدا کسی پر جبر کر کے اُسے اپنی تعلیم نہیں منوانا چاہتا یہ انسان کا کام ہے کہ وہ خود اس ذکر سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اور تم نہیں چاہتے ہو مگر وہی جو اللہ چاہتا ہے۔

رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ جو تمام عالموں کی ربوبیت کرنے والا ہے۔ ع ۱ ۲۹ ۶

بدقسمتی سے اس آیت کے معنے ہمارے علماء نے یہ کر لئے ہیں کہ تم کچھ نہیں چاہتے ہو مگر وہی جو اللہ چاہتا ہے پس جو سیدھے رستہ پر آنا چاہتا ہے وہ بھی خدا کی مشیت ہے اور جو نہیں آنا چاہتا وہ بھی خدا کی مشیت ہے۔ ظاہر ہے کہ ان معنوں کے رُو سے انسان مجبور محض بن جاتا ہے اور پھر انسان کو اس کی گمراہی پر سزا دینا سخت ناانصافی ہوگی پس یہ معنے قطعاً غلط ہیں۔ جو قرآن کے منشا کے بالکل خلاف ہیں اس آیت کو اگر اسکی ماقبل آیت سے ملا کر پڑھو تو معنے بالکل صاف ہیں وہ اس طرح کہ اوپر جب ذکر کیا کہ یہ کتاب تمام دنیا جہان کے انسانوں کے واسطے شرف

اور بزرگی کا مقام حاصل کرنے کیلئے اُتاری گئی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ انہی لوگوں کو یہ شرف مل سکتا ہے جو تم میں سے سیدھا رستہ چاہتے ہیں اسکے بعد یہ آیت زیر بحث آتی ہے جس میں وہی لوگ مخاطب ہیں جو سیدھا رستہ چاہتے ہیں فرماتے ہیں تم جو سیدھا رستہ چاہتے ہو تو اس چاہنے میں تم اور تمہارا رب ایک ہیں تم بالکل وہی چاہتے ہو جو خود تمہارا رب چاہتا ہے اگر تم سیدھا رستہ اختیار کرنا چاہتے ہو تو تمہارا رب بھی تو یہی چاہتا ہے کہ تم سیدھا رستہ اختیار کرو چنانچہ اسی کی خاطر تو یہ قرآن جو تمام جہانوں کیلئے موجب شرف ہے۔ اس نے اتارا ہے اسکی صفت ربوبیت یہی چاہتی ہے کہ تمام عالم سیدھا رستہ اختیار کرے۔ ہاں وہ جبر کے ذریعہ نہیں منواتا۔ انسان کو جو صاحب ارادہ پیدا کیا ہے۔ تو ضروری ہے کہ وہ خود اپنی سمجھ اور ارادہ سے سیدھے رستہ کو اختیار کرے اور اپنی مشیت کو معطل نہ کرے پس خدا تو یہی چاہتا ہے کہ انسان سیدھا رستہ اختیار کرے کیونکہ وہ رب العالمین یعنی تمام عالموں کا رب ہے۔ اور اسی خاطر قرآن کو جو ذکر للعالمین ہے نازل فرمایا ہے اب تم میں سے جو سیدھا رستہ اختیار کرنا چاہتا ہے وہ عین مشیت الٰہی کے مطابق کام کرتا ہے۔ اور وہ وہی چاہتا ہے جو اس کا رب چاہتا ہے۔ اور جو سیدھا رستہ اختیار کرنا نہیں چاہتا وہ اپنے رب کی مشیت کے خلاف چاہتا ہے الغرض یہاں سیدھا رستہ چاہنے والوں کو ہی مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم وہی چاہتے ہو جو رب العالمین چاہتا ہے۔ سیدھا رستہ نہ چاہنے والوں کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ یہ بھی چاہے کہ انسان سیدھا رستہ اختیار نہ کرے اگر ایسا ہے تو اس نے قرآن کو جو ذکر للعالمین ہے کیوں نازل فرمایا اور یہاں اپنی صفت رب العالمین کا کیوں ذکر فرمایا۔ کیا تمام جہان کی ربوبیت کا یہی تقاضہ ہے کہ لوگوں کو صراط مستقیم پر چلنے نہ دیا جائے۔ ربوبیت کے تو یہ معنے ہیں کہ ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف بتدریج ترقی دیتے چلے جانا یہاں تک کہ وہ چیز اپنے کمال کو پہنچ جائے پس رب العالمین کی صفت تو جب چاہے گی یہی چاہے گی کہ انسان صراط مستقیم پر چل کر ادنیٰ سے اعلیٰ حالت کی طرف ترقی کرے۔ لہٰذا اس شخص کی نسبت جو صراط مستقیم پر چلنا چاہتا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا شخص وہی چاہتا ہے جو جناب الٰہی کی ربوبیت چاہتی ہے اور جو اسکے خلاف چاہتا ہے ظاہر ہے کہ اس کا قدم مشیت اور رضائے الٰہی کے خلاف پڑ رہا ہے اسلئے اس کا چاہنا ہرگز ہرگز اللہ تعالیٰ کا جو رب العالمین ہے چاہنا نہیں ہو سکتا

اب ذرا دوبارہ اس سورت کے آخری حصہ پر ایک نظر ڈالئے کس طرح آنحضرت صلعم اور آپ کی وحی رسالت یعنی قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر زبردست دلائل دیئے ہیں۔ اس سورت میں بیان کردہ زبردست علم غیب پر مشتمل پیشگوئیاں تو اس وقت ابھی مستقبل کے پردہ میں نہاں تھیں گو آج وہ ہمارے سامنے واقعات عالم کی شکل میں روز روشن کی طرح عیاں ہیں لیکن یہ تو اس وقت بھی کفار مکہ کو مسلم تھا۔ کہ آپ ایک عمران کے درمیان گذار چکے ہیں اور آپ کی امانت و دیانت اور راستبازی کے وہ پوری طرح معترف تھے۔ اسلئے پیشگوئیوں کے بعد سب سے پہلے اسی امر کو اُن کے سامنے پیش کیا۔ کہ جو شخص تمام عمر تمہارے درمیان صادق اور امین رہا ہے اور اسکی راستبازی اور امانت و دیانت کے تم اب بھی معترف ہو وہ خدا پر افترا کس طرح کر سکتا ہے اس پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہاں راستباز ہونے میں تو کوئی شک نہیں مگر ہو سکتا ہے کہ دماغ خراب ہو گیا ہو فرمایا رات دن تو تمہاری صحبت میں رہتا ہے کیا کوئی جنون کی بات بتا سکتے ہو۔ بلکہ اس کے برخلاف تم اسے صاحب معرفت تامہ اور عالم اسرار لدنیہ پاؤ گے۔ اور جس تو در علم غیب اس پر آئے دن ظاہر ہوتا ہے کیا مجنونوں اور مفتریوں پر ہُوا کرتا ہے یا اُن پر ہوتا ہے جن کا خدا کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور جن پر خدا کا کلام نازل ہوتا ہے۔ اس پر ایک اور اعتراض پڑتا تھا۔ وہ یہ کہ ممکن ہے کہ یہ شیطان کا کلام ہو۔ فرمایا شیطان جو مردود بارگاہ الٰہی ہے کب وہ ایسی تعلیم دے سکتا ہے جس پر چل کر انسان شرف و بزرگی کو حاصل کرے۔ اور انسانیت کے اعلیٰ مقاصد پر کامیاب ہو جائے۔ گویا ہر طرح کے وساوس اور اعتراض کو سامنے رکھ کر آنحضرت صلعم کی رسالت اور قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایسے زبردست دلائل دیئے ہیں کہ شک و شبہ کا کوئی پہلو باقی نہیں چھوڑا۔

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ وَهِيَ تِسْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً

یہ سورۃ بھی ابتدائی مکہ زمانہ کی اور اس میں بھی سورۃ التکویر کی طرح پیشگوئیوں سے نتائج اعمال پر استدلال کیا ہے۔ لیکن سورۃ التکویر میں اُن عظیم الشان پیشگوئیوں کا ذکر تھا جن کا ظہور آخری زمانہ سے وابستہ تھا۔ لیکن اس سورت الانفطار میں ان عظیم الشان پیشگوئیوں کا ذکر ہے جو آنحضرت صلعم کے زمانہ کے ساتھ وابستہ تھیں اور جن کا ظہور خود آنحضرت صلعم اور آپ کے بعد متصل زمانہ میں بڑی شان و شوکت سے ہوا۔ جیسا کہ میں ذکر کر آیا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ پیشگوئیاں اکثر لطیف استعارات پر مبنی ہوتی ہیں۔ جو اپنے وقت پر پوری ہو کر اصل حقیقت کا پتہ دیتی ہیں۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ○ جب آسمان پھٹ پڑے گا۔

یہ ایک لطیف استعارہ ہے یعنی آسمانی نشانات اور نصرتوں کی بارش ہوگی۔ گویا آسمان ان سب کو لئے ہوئے تھا اور حکم الٰہی کا منتظر تھا۔ وقت آیا اور اس طرح نشانات آسمانی اور نصرت الٰہیہ کی بارش ہوئی۔ گویا ایک بھری ہوئی چیز پھٹ پڑی۔

وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ○ اور ستارے پھیل جائیں گے۔

یہ بھی ایک لطیف استعارہ ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا اصحابی کالنجوم۔ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں انہیں ستارے اس لئے کہا کہ وہ اس آسمانی روشنی سے منور تھے۔ جو آنحضرت صلعم لائے تھے۔ پس مطلب یہ ہے کہ جب آسمانی نشانات اور نصرتوں کی بارش ہوگی۔ اور اسلام کا غلبہ ہو جائے گا۔ تو دوسرا نقشہ یہ پیش نظر ہوگا کہ یہ آسمانی ستارے یعنی صحابہ کرام اور دیگر مسلمان جو آسمانی روشنی سے منور ہیں اس آسمانی نور کو لے کر دنیا میں تبلیغ کے لئے پھیل جائیں گے۔

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ○ اور جب دریا بہائے جائیں گے۔

دریا سے استعارہ کی زبان میں مراد علم ہوتا ہے یعنی علم کے دریا دُنیا میں بہائے جائیں گے یہ تیسرا نقشہ ہے کہ مسلمانوں کی تبلیغ اور دُنیا میں پھیلنے کے ساتھ ساتھ اُن کے ذریعہ علم و حکمت ترقی کرے گا۔ اور عرب کی ایک اُمی قوم علم و حکمت، ترقی و تہذیب میں دُنیا کی معلم بنے گی۔

وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ○ اور جب قبریں کھول دی جائیں گی۔

یعنی مُردے زندہ ہوں گے یعنی وہ لوگ جن پر جہالت اور گمراہی کی موت طاری ہے۔ اور جاہلیت اور کفر کی قبروں میں مدفون ہیں زندہ ہو جائیں گے۔ اور اسلام کی ہدایت اور تعلیم دنیا میں جہاں جہاں بھی پہنچے گی زندگی کی ایک لہر دوڑ جائے گی۔

یہ چاروں غیبیہ امور جو یہاں بیان فرمائے ہیں اور ایسے وقت میں بیان فرمائے ہیں جب اسلام اپنی ابتدائی حالت

اور انتہائی غربت و بیکسی کے عالم میں تھا جس صفائی سے چند سالوں میں پورے ہو کر دنیا کے اسٹیج پر آئے ہیں وہ تاریخ عالم میں روشن حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝ ہر شخص جان لیگا جو اُس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے رکھا۔

اوپر چار زبردست پیشگوئیاں بیان کر کے پھر ارشاد فرمایا کہ اگر یہ باتیں سچی ثابت ہوں تو پھر یہ بھی سچ ہے کہ ہر ایک انسان کے اعمال اپنے نتائج ضرور دکھائیں گے۔ خواہ وہ اگلے جہان میں آگے چل کر نظر آئیں۔ خواہ انہیں ایک عمل کرنیوالا اس عالم میں بطور آثار پیچھے چھوڑ جائے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا چاروں پیشگوئیاں بھی دراصل اسلامی جماعت کے اعمال خیر کا ہی نتیجہ ہیں۔ میں سورۃ الفجر میں اس سے قبل ذکر کر چکا ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک نبی و رسول کے زمانہ میں چھوٹے پیمانہ پر ایک نقشہ قیامت کا قائم کر کے دکھاتا ہے تاکہ وہ اُس قیامت کبریٰ پر نشان ہو جس میں انسان اپنے اعمال کے نتائج پورے طور پر دیکھے گا۔ اسی لئے رسول کے زمانہ میں نیکوں کی کامیابی اور بدوں کی ہلاکت اور ناکامی کو بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں الساعۃ ہی فرمایا ہے۔ جو قیامت کبریٰ کا دوسرا نام ہے اور خدا کا منشا بھی اس نشان کے قائم کرنے سے دراصل یہی ہوتا ہے۔ کہ وہ اصلی قیامت پر بطور ایک نشان اور دلیل کے ہو۔ یعنی جب اعمال خدا کے منشا کے ماتحت اس دنیا میں بھی اپنے نتائج دکھاتے ہیں اور نیکوں کو نیک اور بدوں کو بد بدلہ اسی طرح مل جاتا ہے۔ جس طرح کہ قبل از وقت بتلایا ہوا ہوتا ہے۔ تو پھر اگر یہ بات بھی قبل از وقت بتلائی جائے کہ مرنے کے بعد اگلے عالم میں ایسا وقت بھی آئے گا جب نیکوں کو نیکی کا اور بدوں کو بدی کا بدلہ پورے پورے طور پر دیا جائیگا۔ تو پھر اس حقیقت کو ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ کیونکہ ٹھیک اسی لائن پر ہم یہ امور دنیا میں پورے ہوتے دیکھ چکے ہوتے ہیں اور نیکی کا نیک اور بدی کا بد نتیجہ نکلتا ہوا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہوتے ہیں پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق صحابہ کی جماعت اپنے اعمال خیر کے جو نتائج اور آثار دنیا میں چھوڑ گئی وہ اس بات پر دلیل ہے کہ وہ کیسی بلند اخلاق اور نیک اعمال کی مالک جماعت تھی اور اگلے جہان میں ان کے اعمال کتنے اعلیٰ پھل لائیں گے اور یہ کہ انسان کے اعمال اپنا اثر ضرور رکھتے ہیں خواہ ان کے نتائج دنیا میں ظاہر ہوں خواہ آخرت میں۔ پس انسان کو چاہیئے کہ اپنے اعمال میں محتاط ہو اور ایسے طریق پر دنیا میں عمل کرے کہ نہ صرف اگلے جہان میں بلکہ اس دنیا میں بھی نیک آثار چھوڑ جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ اے انسان تجھے کس چیز نے اپنے رب کے بارے میں دھوکا دیا

الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ ۝ وہ رب جس نے تجھے پیدا کیا پھر تجھے ٹھیک ٹھاک کامل حکمت کے ساتھ بنایا پھر تجھے اعتدال پر بنایا۔

مطلب یہ کہ انسان دنیا میں پڑ کر اپنے مقصد پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ اور اس کی نگاہ جذبات حیوانی یعنی کھانے پینے وغیرہ تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور اس رب کی طرف سے ہٹ جاتی ہے جس نے اسے ربوبیت یعنی حصول کمال اور ترقی کے لئے پیدا کیا تھا اور اپنی کریمی سے اُس نے اس کو ایسے قویٰ اور سامان عطا کئے تھے جس سے وہ اپنے کمالات کو حاصل کر سکتا اور اپنے رب کریم کا مقرب بندہ بن سکے۔ اس نے اُسے پیدا کیا تھا۔ پھر ٹھیک ٹھاک بنایا تھا یعنی جو قوت بھی عطا کی تھی وہ ایسی موزوں

و مناسب اور بدرجہ کامل عطا کی تھی۔ کہ انسان پوری طرح اپنے مقصد پیدائش کو حاصل کر سکے۔ پھر اسے اعتدال پر بنایا تھا یعنی اسکی ترقی کو اس اعتدال سے وابستہ کیا تھا جو تمام افراط و تفریط سے پاک اور خود اسکی فطرت میں اسکے خالق نے مضمر رکھا ہوا ہے پس اگر انسان اپنے رب کریم پر نظر رکھتا یعنی اس بات کو مدنظر رکھتا کہ میرے رب نے مجھے ربوبیت یعنی حصول ترقی کیلئے پیدا کیا ہے اور اپنی پیدائش پر غور کرتا اور دیکھتا کہ کیا کیا اعلیٰ قوتیں اسکو عطا ہوئی ہیں اور ان کو اعتدال میں رکھ کر کام لینے سے اُن سے کیا کیا کچھ کمالات اور ترقیات وہ حاصل کر سکتا ہے تو پھر خواہشات نفسانی اور جذبات حیوانی کی خاطر اپنے کمال باطنی اور ترقی اُخروی کو نظر انداز نہ کر دیتا کہ انہی باتوں پر درحقیقت انسان کی بزرگی کا دارومدار ہے۔ اور اپنے رب کی فرمانبرداری سے جس میں انسان کی عزت کا راز پنہاں ہے کبھی منہ نہ موڑتا۔

فِیۡۤ اَیِّ صُوۡرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ۝ جس صُورت میں چاہا تجھے ترکیب دی

یعنی صورت کا اختلاف منشائے الٰہی کے ماتحت ایک جدا امر ہے۔ اور وہ اس لئے ہے تاکہ انسان ایکدوسرے کو شناخت کر سکے اور علیحدہ شخصیت قائم ہو سکے لیکن صورت کا اختلاف ترقی روحانی میں روک نہیں ہو سکتا جس صورت میں بھی خدا نے کسی کو پیدا کیا ہے باطنی کمالات کیلئے سب کے واسطے یکساں راہ کھلی ہوئی ہے گورا ہو یا کالا خوبصورت ہو یا بدصُورت ترقی روحانی جو دُنیا کی زندگی کا اصل مقصد ہے اس کیلئے کسی کیواسطے کوئی روک نہیں

کَلَّا بَلۡ تُکَذِّبُوۡنَ بِالدِّیۡنِ ۝ یوں نہیں بلکہ تم دین کو جھٹلاتے ہو۔

یعنی تمہیں کسی چیز نے دھوکے میں نہیں ڈالا بلکہ تم کو اعمال کی ذمہ داریوں کا احساس نہیں۔ اگر تمہیں یقین ہوتا کہ ایک دن آئے گا جس دن اعمال کی جزا ملے گی تو پھر تم اپنے رب کریم کی نافرمانی ہرگز نہ کرتے۔ یہ جزا سزا کے دن پر یقین نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ تم غفلت اور نافرمانیوں میں پڑے ہوئے ہو جو درحقیقت یوم الدین کی عملی طور پر تکذیب ہے لیکن یاد رکھو کہ تمہارے اعمال ضائع نہیں جاتے وہ ریکارڈ میں محفوظ ہو رہے ہیں۔

وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ۝ اور بے شک تم پر حفاظت کرنیوالے مقرر ہیں۔

کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ۝ معزز لکھنے والے۔

یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ۝ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔

یعنی خدا کی طرف سے تم پر ایسے محافظ مقرر ہیں جو تمہارے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں اور کسی عمل کو ضائع نہیں جانے دیتے بلکہ ہر چیز کا ریکارڈ کرتے چلے جاتے ہیں اور لکھنے والے یعنی ریکارڈ کرنیوالے جو فرشتے ہیں وہ معزز اور معتبر ہیں دنیا کے خفیہ پولیس کے بعض ذلیل افراد کی طرح نہیں کہ جو چاہا لکھ لیا۔ بلکہ ان کی جو تحریر بھی ہوتی ہے وہ نہایت معتبر اور صحیح ہوتی ہے آج سائنس کے زمانہ میں یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ انسان کا کوئی قول ہو یا فعل اسفر کی موجوں میں محفوظ ہوتے چلے جا رہے ہیں اور اگر ہم کوئی ذریعہ ایسا حاصل کر سکیں جس سے ہم ان ریکارڈوں کو پڑھ سکیں تو ہم دنیا کی ساری تاریخ کو پڑھ سکیں گے اور کسی مکان کو دیکھ کر بتا سکیں گے کہ کب کیا کام اسکے اندر ہوئے اور کیا کیا باتیں اس میں کی گئیں اور

کی گئیں۔ انگریز نومسلم ایپن مرحوم نے ایک دفعہ جب وہ لائٹ کے ایڈیٹر تھے سائنس کے اس دریافت پر ایک بڑا مزیدار لطیفہ لکھا تھا انہوں نے لکھا تھا کہ جس دن دنیا کی تاریخ پڑھنے کا یہ ذریعہ پتہ لگ گیا اس روز مسیحی مذہب کا خاتمہ ہے کیونکہ پھر ہم قدرت کے ریکارڈ میں جب مسیح کو اظہار عبودیت کرتے سن لیں گے اور ان کو صلیب سے زندہ اترتے اور اپنی طبعی موت مرتے دیکھ لیں گے تو انکی الوہیت اور کفارہ کا عقیدہ جس کی محض تاریخی واقعات پر بنیاد ہے۔ فنا ہو کر رہ جائیگا۔ الغرض سائنسدان اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ہم قدرت کے اس ریکارڈ کو پڑھ لیں وہ لوگ اس پر قادر ہو سکیں یا نہ ہو سکیں لیکن خدا کے سامنے تو وہ ریکارڈ موجود ہے جس سے ہمارا کوئی قول و فعل بچا ہوا نہیں پس اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ:۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ بیشک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے (جو انکے نیک اعمال کا نتیجہ ہوگا)

وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝ اور بیشک بد لوگ دوزخ میں ہونگے (جو ان کے بداعمال کا نتیجہ ہوگا)

يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۝ اور وہ اب بھی اس سے غائب نہیں ہیں۔

یعنی دوزخ جو وہ اپنے اعمال بد سے بنا رہے ہیں اسی دنیا میں اُن کے ساتھ ساتھ ہے صرف اس کا احساس نہیں مرنے کے بعد جزا کے دن اُس کا احساس ہو جائے گا اور یہی دوزخ میں اُن کا داخلہ ہے۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ۝ اور تونے کیا سمجھا کہ جزا کا دن کیا چیز ہے۔

پھر سوال کرتے ہیں۔

ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ۝ پھر تونے کیا سمجھا کہ جزا کا دن کیا چیز ہے۔

یہ اس سوال کی اہمیت اور جزا کے دن کی ہیبت اور شوکت کے اظہار کے لئے طرز کلام ہے۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ط وہ دن ہوگا جس دن کوئی نفس کسی نفس کیلئے کوئی اختیار نہیں رکھیگا۔

وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ ۝ اور حکم اس دن اللہ ہی کا ہوگا۔

حکم تو ہر وقت اللہ کا ہی ہے مگر یہاں اس طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اس دنیا میں تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ ایک کام کو کرے یا نہ کرے یا ایک دوسرے کی کسی رنگ میں مدد کرے یا نفع پہنچائے یا حفاظت کرے لیکن جس دن اعمال کے نتائج نکلیں گے اس دن یہ اختیار کسی کو نہ ہوگا کہ اپنے کئے کا نتیجہ بھگتے یا نہ بھگتے یا کسی شخص کو اس کی سزا سے بچائے یا کسی رنگ میں اسکی مدد کر سکے۔ اسی لئے حضرت نبی کریم*

* صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کیا سچ فرمایا کہ اے میری بیٹی قیامت میں میرا باپ ہونا تیرے کام نہ آئیگا تیرے اعمال تیرے کام آئینگے کیا اعمال کی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کیلئے اس سے بہتر کوئی تعلیم ہوسکتی ہے؟ ◆

سُوْرَةُ التَّطْفِيْفِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ | وَهِيَ سِتٌّ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً

سورۃ التطفیف ابتدائی مکی زمانہ کی ہے۔ سورۃ الانفطار میں جو نیکی اور بدی کے ریکارڈ ہونے کا ذکر فرمایا۔ اور اس سے ابرار اور فجار کی دو قسمیں فرمائیں۔ اس سورت میں اُن کی مزید تشریح فرمائی فرماتے ہیں:۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ کم دینے والوں کیلئے افسوس ہے یا ہلاکت ہے یعنی اُن کا انجام اچھا نہیں۔

مطففین سے مُراد یہاں ہر قسم کی کمی کرنیوالے سے ہے خواہ وہ کمی حق اللہ میں ہو یا حقوق العباد میں۔ ان کی مزید تشریح فرماتے ہیں کہ:۔

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ زملے جو لوگ جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○ اور جب خود انہیں ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے متعلق یہ خوبصورت ترین تنبیہ ہے اور دُنیا میں جس قدر غصب حقوق ہو رہا ہے وہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ ظاہری الفاظ میں بھی یہ اس قدر خطرناک مرض ہے۔ کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ عام طور پر ہر ایک دوکاندار تجارت کا یہ بہترین اصول سمجھتا ہے۔ کہ زیادہ سے زیادہ داموں پر ناقص سے ناقص چیز بیچ دے یعنی خریدار کو اُلّو بنا دے اور خریدار کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کم سے کم قیمت پر بہتر سے بہتر چیز خرید لاوے یعنی دوکاندار کو احمق بنا دے۔ بعض دوکاندار تولنے میں ایسی چالاکی کرتے ہیں کہ سیر بھر چیز خرید کر لاؤ۔ گھر میں تو لو آدھ پاؤ یا پاؤ کم ہے۔ ترازو کی ڈنڈی پر تھوڑا سا ہاتھ کا دباؤ رکھو۔ جتنا چاہو ڈنڈی مار لو۔ قصائیوں کی دکان پر ترازو لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ ایک بوٹی ذرا اُوپر سے پڑے پر پھینکی پلڑا نیچے چلا گیا۔ خریدار نے سمجھا گوشت اصل وزن سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ وہ خوش ہے۔ حالانکہ گوشت کم ہے۔ بعض دوکانداروں نے زمینداروں عورتوں یا مردوں سے اناج لینے کا پیمانہ اور بنا رکھا ہے۔ اور انہیں غلہ دینے کا پیمانہ دوسرا رکھا ہوا ہے۔ اُن کے نام پنجتن پاک یا کچھ اس قسم کے رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ مثلاً دکان کے ملازم سے جو پیمانہ منگانا ہوا اُسے اس طرح لانے کو کہا۔ کہ بابا پنجتن پاک پڑوپی لے آ۔ ملازم سمجھ گیا کہ کونسا پیمانہ درکار ہے۔ غرضیکہ خریدار کو یا بیچنے والے کو دھوکا دینا بڑا فن سمجھا جاتا ہے آج کل تہذیب و ترقی کا زمانہ ہے اس لئے یہ ماپ تول کی کمی بیشی بھی اپنی نئی ترقی یافتہ شکل میں نظر آتی ہے چیز دکھائی کچھ اور۔ دیدی کچھ اور۔ اشتہاروں میں پروپیگنڈا خوب کیا۔ بڑی بڑی تعریفیں کیں کسی نے چیز منگائی تو ناقص نکمی چیز بھیجدی خریدار کے سامنے جس چیز کو جیسا ظاہر کر رہے ہو اور اس کے دام مانگ رہے ہو۔ اگر وہ چیز ویسی نہیں تو یہ صاف تطفیف ہے ہمارے نبی کریم صلعم بعثت سے قبل حضرت خدیجہ کا مال تجارت لے کر کئی مرتبہ شام کو تشریف لے گئے آپ کا قاعدہ یہ تھا کہ جیسی جو چیز ہوتی تھی صاف صاف خریدار سے کہ دیتے تھے خوبیاں ہوئیں تو خوبیاں بیان کر دیتے تھے عیوب ہوئے تو عیوب بیان فرما دیتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو آپ پر اس قدر اعتبار ہو گیا۔ کہ ہمیشہ آپ کا مال خوب بکا۔ یہ آپ ہی کا فیض صحبت تھا۔ کہ ایک مرتبہ ایک صحابی کے پاس ایک نوجوان شخص گھوڑا بیچنے آیا اور گھوڑے کا دام اس نے کچھ بتلایا (دام کے متعلق مجھے اس وقت ٹھیک یاد نہیں رہا) صحابی نے کہا گھوڑے کو قدم چلاؤ۔ اس نے چلایا۔ صحابی بولے کہ برخوردار تمہیں اپنی چیز کی صحیح واقفیت نہیں۔

یہ گھوڑا تو پیش کردہ قیمت سے سو درہم زائد کا ہے۔ پھر کہا کہ دُگنی چلاؤ۔ اُس نے دُگنی چلایا تو سو درہم اور بڑھا دیئے۔ پھر کہا پورے چلاؤ اُس نے پورے چلایا تو سو درہم اور بڑھا دیئے۔ اور فرمایا یہ گھوڑا زیادہ قیمت کا تھا تمہیں علم نہ تھا میں تمہاری لاعلمی سے ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ چنانچہ کئی گنا قیمت دے کر وہ گھوڑا خرید لیا۔ یہ تو تقویٰ کے بہت اعلیٰ اور بلند مراتب ہیں لیکن کم سے کم اتنا تو ہونا چاہیئے کہ دوسرے کو اس کے حق سے کم نہ دیا جائے۔ اگر تم یہ ضروری سمجھتے ہو کہ لوگ تمہیں تمہارا حق پورا پورا دیں۔ تو پھر کیا وجہ کہ تم دوسروں کے حقوق پورا پورا نہ دو۔ جس ماپ تول کا یہاں ذکر ہے وہ غلہ یا اجناس یا کسی سیال چیز کے ماپ تول تک محدود نہیں بلکہ تمام حقوق باہمی کے وزن پر مشتمل ہے ماپ تول میں کمی کی بیماری زندگی کے ہر شعبہ میں ہے۔ ہم لوگوں سے اپنے حقوق لینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں کوئی کم دے تو اس پر شکایت کرتے ہیں خفا ہوتے ہیں بگڑتے ہیں لیکن اُن حقوق کی ادائیگی کی ہمیں پروا نہیں ہوتی۔ جو بالمقابل ہم پر ہوتے ہیں لوگ گورنمنٹ سے تنخواہ کے لئے لڑتے ہیں۔ سفر خرچ کے لئے جھگڑتے ہیں لیکن تنخواہ لے کر گورنمنٹ کے اور پبلک کے حقوق نہیں ادا کرتے۔ بلکہ سستی غفلت بلکہ بددیانتی سے کام لیتے اور چالاکی سے اس کی پردہ پوشی کرتے رہتے ہیں سفر خرچ لیا مگر کام نہیں کیا۔ مثلاً کوئی ہیلتھ افسر صاحب شام کو موٹر پر بیوی کو ساتھ بٹھا کر سیر کو چلے گئے اور سفر خرچ چارج کر لیا۔ اور جھوٹ لکھ دیا کہ اتنے گاؤں کے دورے کرکے وہاں پبلک ہیلتھ کے لئے فلاں فلاں مفید کام کئے یہ حرام خوری اور تطفیف ہے۔ اسی طرح بیوی شوہر سے اپنے حقوق چاہتی ہے اور شوہر بیوی سے اپنے حقوق کا متوقع ہے۔ مگر اپنے اپنے حقوق کی ادائیگی کی پروا نہیں۔ لڑکے والدین سے اور والدین لڑکوں سے اپنے حقوق کے طلبگار رہیں لیکن جو حقوق خود اُن کے ذمہ بالمقابل ہیں وہ کہاں تک ادا کئے اس کی کوئی پروا نہیں۔ ہم عزیزو اقرباء سے، ہمسایوں سے۔ دوستوں سے اُن حقوق کے ہر آن متوقع ہیں جو ہمارے اُن پر ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے دکھوں میں وہ کام آئیں ہم بیمار ہوں تو وہ عیادت کریں۔ ماتم ہو تو وہ تعزیت کریں۔ اگر ان حقوق کی ادائیگی میں وہ ذرا بھی کمی کریں تو ہم کو ہزارہا شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن جب وہ مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ تو ہمیں پروا بھی نہیں ہوتی۔ وہ بیمار ہوں تو ہمیں یاد ہی نہیں رہتا کہ ہم نے عیادت بھی کرنی ہے اُن کے ہاں ماتم ہو جائے تو ہمیں سو حیلے بہانے عدم شمولیت کے لئے مل جاتے ہیں۔ غرضیکہ دوسرے اگر ادائیگی حقوق میں کمی کریں تو ہم نکتہ چینیوں اور شکایتوں سے اگلے کی ہوش بگاڑ دیں گے۔ لیکن اپنے اعمال کی نکتہ چینی ہم کبھی نہیں کرتے۔ حالانکہ حق تو یہ تھا کہ دوسروں کے اعمال پر نکتہ چینی کرنے اور خدائی فوجدار بننے کے بجائے اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے اور دیکھتے کہ ہم دوسرے لوگوں کے حقوق کما حقہٗ ادا کر رہے ہیں یا نہیں کیونکہ جس کے ہم ذمہ دار ہیں اور اسی کے متعلق ہم باز پرس کے نیچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے متعلق بھی یہی حال ہے ہم خدا سے ہر ایک نعمت اور مہربانی کے متوقع ہیں مگر اس کے حقوق ادا کرنے کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ خدا کی کسی تقدیر پر ہم اس کی دن رات کی ہزارہا نعمتوں اور رحمتوں کو یکسر فراموش کر کے اس سے نعوذ باللہ لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن اپنی کرتوت پر نظر نہیں کرتے کہ ہم اس کی کہاں تک فرمانبرداری کیا کرتے ہیں غرضیکہ کیا سچ فرمایا کہ افسوس اور ہلاکت ہے اُن لوگوں پر جو حقوق کی ادائیگی میں کمی کرتے ہیں کہ خود تو اپنے حقوق پورے پورے لیتے ہیں اور جب دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کا وقت آئے تو اس میں کمی کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ انہیں موت یاد نہیں اور خدا کے حضور کھڑے ہونے اور اپنے اعمال کے باز پرس کی پروا نہیں

أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ کیا وہ خیال نہیں کرتے کہ وہ اٹھائے جائیں گے ایک بڑے دن کے لئے۔

يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ جس دن لوگ جہانوں کے رب کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

آخرت کے دن کو یوم عظیم فرما کر یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ نہایت عظمت و جلال کا دن ہوگا جس دن تمام عالموں کے رب کے سامنے جوابدہی کو کھڑا ہونا ہوگا۔ تمام عالموں کا رب اس لئے فرمایا کہ اس دن فیضانِ ربوبیت سب پر یکساں عدل و انصاف کے ساتھ ہوگا۔ اس دن بڑے چھوٹے امیر غریب کی کوئی رعایت نہ ہوگی۔ بلکہ سب کے متعلق انصاف ہوگا کیونکہ اُس دن کا مالک عدالت ہوگا جو سب بڑے چھوٹوں کا یکساں رب ہے۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ سُن رکھو۔ بیشک بدکاروں کی کتاب یعنی فہرست یا نامۂ اعمال سجین میں ہے

سجین۔ سجن سے فعیل کے وزن پر ہے اسکے معنی سجن یا قید خانہ ہیں یہاں سجین کے متعلق خود بھی تشریح فرما رہے ہیں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ اور تو کیا جانتا ہے کہ سجین کیا ہے وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے

اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا تعلق قید خانہ سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں قیدیوں کا رجسٹر ہوا۔ یعنی بدکاروں کی فہرست اور اُن کا نامۂ اعمال قیدیوں کے رجسٹر میں ہوگا۔ یعنی وہ لوگ اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے قید خانہ میں ہوں گے۔ اور قید خانہ کی کتاب میں اُن کے نام اور نامۂ اعمال ہوں گے۔ جب فاجروں یعنی بدکاروں کے ناموں یا اعمالناموں کا اندراج قیدیوں کے رجسٹر میں ہوا تو ایسے لوگوں کے قیدی ہونے میں کیا شک باقی رہ گیا کیونکہ جس رجسٹر میں اندراج ہوگا بہرحال اُسی کے مطابق اُن کی حالت اور مقام ہوگا۔ یہ قید اپنے عملوں کی وجہ سے انہوں نے اپنے اُوپر لگائی۔ دُنیا میں قوانین الٰہیہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اپنے قویٰ میں اعتدال قائم کرنے کے لئے جو قید انسان اپنی مرضی سے اپنے جذبات پر لگاتا ہے اور افراط و تفریط سے اپنے آپ کو بچاتا ہے وہ ترقی و کمال کا موجب ہوتی ہے مگر جب انسان اپنے جذبات پر خود قیدیں لگاتا۔ اور جذبات کی غلامی میں حدِ اعتدال سے بڑھ جاتا ہے۔ تو حکومت الٰہی اس پر خود قید لگاتی ہے جو سزا بھی ہوتی ہے۔ وہ اصلاح کا مقصد بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ دنیا کی حکومتوں کا بھی یہی حال ہے گورنمنٹ کے جو قوانین بھی ہوتے ہیں وہ انسان کے افعال پر ایک حد بندی یا دوسرے لفظوں میں ایک قید لگاتے ہیں۔ جو لوگ اس قید یا حد بندی یا قانون کو قبول کر لیتے ہیں وہ پُر امن شہری اور معزز سمجھے جاتے ہیں لیکن جو لوگ اس قید کو قبول نہیں کرتے اور قانون شکنی کرتے ہیں اُن پر پھر گورنمنٹ دوسری قید لگاتی ہے۔ جو جبری رنگ میں ہوتی ہے۔ اور سزا اور اصلاح دو نو مقاصد اپنے اندر رکھتی ہے یعنی جیلخانہ کی قید۔ اسی طرح جو لوگ خدا کے قوانین شریعت کو توڑتے ہیں اور خدا کے قوانین کی قید کو اپنے جذبات پر عائد نہیں کرتے اور حدِ اعتدال سے گزر جاتے ہیں آخرت میں اللہ تعالیٰ اُن کو سجین میں داخل کریگا اور جبری قید اُن پر لگائے گا جو سزا اور اصلاح اپنے اندر دو نو مقاصد رکھے گی

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ افسوس ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے۔

الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں۔

خواہ کوئی عقیدہ کے رُو سے روز جزا کا منکر ہو یا عملی رنگ میں روز جزا کا منکر ہو سب اس تکذیب میں شامل ہیں عملی رنگ میں روز جزا کے منکر وہ لوگ ہیں جو عقیدتاً تو مانتے ہیں کہ روز جزا برحق ہے لیکن عمل کرتے وقت اُس کی مطلق پروا نہیں کرتے۔ ایسے سب لوگوں کے لئے اس دن افسوس اور تباہی ہوگی۔ پھر ان لوگوں کی مزید تشریح فرماتے ہیں۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ اور اُسے یعنی روز جزا کو نہیں جھٹلاتا مگر ہر حد سے بڑھنے والا گنہگار۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ جب اس پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں کہتا ہے کہ یہ پہلوں کی کہانیاں ہیں

یعنی ہر ایک خدا کے قانون پر قائم نہ رہنے والا حد سے بڑھنے والا گنہگار درحقیقت اپنے عملوں سے یوم جزا کی تکذیب کرتا ہے اور وہ کئی طریق پر ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس پر جب خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو حقارت و تکبر سے کہہ اٹھتا ہے کہ یہ اگلوں کی کہانیاں ہیں یعنی وہ زمانہ گیا جب ایسے وعظ اثر کیا کرتے تھے اب ترقی اور روشنی کا زمانہ ہے پرانے لوگوں کے افسانے اور ڈھکوسلے ہمیں مت سناؤ گویا وہ آیات الٰہیہ پر نہ صرف ایمان ہی نہیں لاتا بلکہ انہیں حقارت سے رد کرتے ہوئے پرانے ڈھکوسلے بتا کر لاپرواہی کی شان دکھاتا ہے اور اپنے اعمال کی ذمہ داری کی طرف سے اپنی بے اعتنائی کی شان کو قائم رکھتا ہے۔ یہ تو وہ رنگ ہے جو آجکل کے فیشن کے دلدادہ جنٹلمینوں میں اکثر نظر آتا ہے اور دوسرا طریق یہ ہے کہ آیات الٰہیہ پر تو ایمان لاتا ہے مگر ہمیشہ انہیں اگلے لوگوں پر ہی چسپاں کرتا رہتا ہے اور اپنے اوپر انہیں نہیں لگاتا۔ اور آیات قرآنی کے معیار پر کبھی اپنے اعمال کو نہیں پرکھتا۔ پرانے فیشن کے لوگوں میں علماء ہوں یا عوام الناس۔ یہ ان میں سے اکثر کا نقشہ ہے مثلاً شرک کے متعلق آیات ہوں تو یہ پرانے طرز کے لوگ ہمیشہ انہیں مشرکین مکہ پر لگاتے رہیں گے اور اپنے مشرکانہ اعمال پر ان کی تہدید و تنبیہ کو کبھی چسپاں نہیں کریں گے۔ حق کی مخالفت پر جو وعید ہیں اُن آیات کو ہمیشہ زمانۂ نبوی کے مخالفین پر چسپاں کرتے رہیں گے اور خود رات دن حق کی مخالفت کرتے رہیں گے اور کبھی اُن آیات کے بیان کردہ عذاب سے نہیں ڈریں گے ان لوگوں نے سارے قرآن کو عملی طور پر اساطیر الاولین یعنی گذشتہ لوگوں کے افسانے بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ تو مجدد وقت حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعودؑ کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے قرآن کو بطور حال اس زمانہ پر وارد کر کے بھی دکھایا جس سے سمجھ آگئی کہ قرآن جیسے اگلے لوگوں کیلئے تھا ویسے ہی ہمارے لئے بھی ہے۔ ہمارے ایمان اور اعمال کیلئے اس کی ہدایت بطور معیار کے ہے۔ ورنہ ان مولویوں نے تو قرآن کو اساطیر الاولین بنا دینے میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کی تھی۔ آج ہمیں جو قرآن پڑھنے میں لطف آتا ہے اور اسکی ایک ایک آیت زندگی بخش نظر آتی ہے تو اسی لئے کہ ہم اسے حالی طور پر اپنے اوپر وارد پاتے ہیں۔ اس کے وعدوں اور وعید پر آج بھی ہم اسی طرح ایمان رکھتے اور ان کے پورے ہونے کے متوقع ہیں جیسے زمانۂ نزول قرآن کے وقت اگلے مسلمان ان پر ایمان اور توقع رکھتے تھے۔ اسی لئے قرآن ہمارے لئے ایک زندہ کتاب ہے۔ ملانوں نے اس پر بھی بہت کچھ اظہار ناراضگی کیا اور شور کیا کہ مرزا سارا قرآن اپنے ہی اوپر نازل شدہ بتاتا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط اور افترا ہے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ جبتک قرآن مومن پر حالی طور پر وارد نہ ہو نہ قرآن ہی سمجھ آتا ہے نہ اس سے کوئی نفع ہی

پڑتا ہے۔ قرآن پڑھنے اور اُس پر عمل کرنے کا لطف یہی ہے کہ وہ بطورِ حال ہم پر وارد ہو۔ اور اُس کے فیوض و برکات کا نزول بھی بندہ پر اُسی حالت میں ہوتا ہے غرضکہ اساطیر الاوّلین کہنے والے صرف وہی نہیں ہیں جو حقارت سے مذہب کو پُرانے زمانہ کے افسانوں میں شامل سمجھتے ہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو آیاتِ قرآنی کو اگلے لوگوں تک ہی محدود کر کے خود ہر ایک قسم کی قیدِ شریعت اور وعدہ وعید سے آزاد پڑے پھرتے ہیں۔

كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ ہرگز نہیں بلکہ وہی ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے جو وہ کماتے تھے۔

یعنی آیاتِ الٰہیہ تو اساطیر الاوّلین نہیں ہیں۔ بلکہ اُن لوگوں کے اعمالِ بد کا زنگ ان کے دل پر بیٹھ گیا ہے جس سے ضمیر مُردہ ہو چکی ہے۔ اور اپنے اعمال کی ذمّہ واریوں کا احساس اُڑ گیا ہے۔ آنحضرت صلعم سے دل کے اس زنگ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ بندہ ایک گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اُس کے دل پر پیدا ہو جاتا ہے پھر اگر اس سے توبہ کرے تو دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر توبہ نہ کرے اور پھر گناہ کرے تو ایک اور نقطہ پڑ جاتا ہے یہاں تک کہ آخر کار دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ انسان کا جب اعمالِ بد کی وجہ سے دل سیاہ ہو جاتا ہے تو ضمیر مر جاتا ہے اور اُسے کوئی معقول وعظ و نصیحت اثر نہیں کرتا۔ کیونکہ اعمال کی ذمّہ واریوں کا احساس ہی جاتا رہتا ہے۔

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ○ سنو جی وہ اپنے رب سے اُس دن حجاب میں ہوں گے۔

یعنی ربوبیتِ الٰہی سے جس سے انسان کی ترقی اور کمال اور ہر قسم کی پرورش وابستہ ہے محروم رہیں گے دوسرے لفظوں میں یہ کہ تمام ترقیات و کمالات سے محرومی رہے گی۔ وہی حجاب جو دنیا میں انہوں نے اپنے اور اپنے رب کے درمیان حائل کر رکھا تھا وہی اُس دن ظاہر نظر آئیگا۔ نہ فیضانِ ربوبیّت سے کوئی حصہ ملے گا نہ جمالِ الٰہی کا دیدار میّسر ہو گا جس سے بڑھ کر انسان کے لئے کوئی خوشی اور راحت اور لذت متصوّر نہیں ہو سکتی۔ ایک بدعمل انسان کی آنکھوں پر جو پردہ دنیا میں پڑا ہوا ہوتا ہے اور اس کی نظر صدا پر نہیں ہوتی وہی پردہ آخرت میں خدا کے دیدار سے محرومی کا مُوجب ہو گا قلب کی جس آنکھ نے دُنیا میں خدا پر نظر نہ رکھی وہ آخرت میں بھی خدا کے دیدار سے محجوب اور بے نصیب رہے گی۔ حضرت مولانا روم علیہ الرحمۃ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

ہر کسے زاندازۂ روشن دلی ❊ غیب را بیند بقدرِ صیقلی
ہر کہ صیقل بیش کرد او بیش دید ❊ بیشتر آید بروصورت پدید
صیقلے کن یک دو سہ سینہ را ❊ دفتر خود ساز آں آئینہ را
آئینۂ دل چوں کنی صافی و پاک ❊ نقشہا بینی بروں از آب و خاک
ہم ببینی نقش و ہم نقّاش را ❊ فرشِ دولت را و ہم فراش را

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ○ پھر وہ ضرور دوزخ میں داخل ہوں گے۔

ربوبیت الٰہی سے محرومی الگ ہوئی یعنی تمام ترقیات و کمالات سے محروم رہ گئے۔ اور جذبات و خواہشات کی آگ نے جو جہنم بنایا تھا اس کا عذاب اور تکلیف الگ۔ سجین میں اندراج کا یہ نتیجہ کس قدر خطرناک ہے۔

ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ پھر اُن سے کہا جائیگا یہ وہ ہے جسے تم جھٹلاتے تھے۔

یعنی یہ وہی نتائج اعمال ہیں جن کی تم نے اپنے عمل کے وقت پہچان کی تھی۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝ سن رکھو۔ نیک لوگوں کی کتاب یعنی فہرست یا نامۂ اعمال علیین میں ہوگا۔

علیین کے معنے ہیں اعلیٰ درجہ کے مقامات یا اعلیٰ درجہ کے لوگ۔ یہاں خود بھی تشریح فرما رہے ہیں کہ:۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ اور تو نے کیا سمجھا کہ علیون کیا ہے۔ وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا تعلق بلند مقامات سے یا اعلیٰ درجہ کے بلند مرتبہ لوگوں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ بلند مرتبہ لوگوں کا رجسٹر ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ جن مقامات یا جن لوگوں کے رجسٹر میں کسی شخص کے ناموں یا اعمالناموں کا اندراج ہوگا اُسی قسم کے لوگوں کے ساتھ اور اسی قسم کے بلند مقامات میں اس کا مسکن بھی ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کی شریعت کے ماتحت دنیا میں اپنی جذبات اور خواہشات پر قید لگائی۔ اور انہیں اعتدال پر رکھا۔ اس کا نتیجہ ہوا کمال اور ترقی۔ علو مرتبت اور عالی مقامات میں سکونت۔ اور یہ وہ ترقی ہے جس پر کوئی قید نہیں۔ بلکہ قدم آگے ہی آگے بلندی کی طرف ہوگا۔

يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ مقرب لوگ اسے موجود پائیں گے۔

مطلب یہ کہ عالی مرتبہ لوگوں کے رجسٹر کو جن میں ابرار کے نام درج ہوں گے مقربین موجود پائیں گے۔ اور اپنے ناموں کو اس میں پاکر ابدی مسرت کے وارث ہوں گے۔ دنیا میں شاہی درباریوں کی فہرست میں نام درج ہو جائے تو انسان خوشی سے پھولا نہیں سماتا تو خدا کے درباریوں یا مقربین میں اگر انسان اپنے آپ کو لکھا ہوا پائے تو اس مسرت کا کیا ٹھکانا ہو سکتا ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ بیشک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝ تختوں پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے۔

یہ تخت عزت کے ہیں۔ دنیا میں جس طرح کرسی نشینی بادشاہ کے قرب کا نشان ہوتا ہے اسی طرح آخرت میں نیکوں کو خدا کے دربار میں تخت جو کرسی سے بھی بڑھکر عزت کی چیز ہے منصب ہوں گے۔ اس سے بڑھ کر عزت افزائی اور کیا ہو سکتی ہے پھر اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی سعادت نصیب ہوگی کہ ان کو نظارۂ جمال الٰہی بھی نصیب ہوگا۔ یہاں جن نعمتوں کا ذکر ابرار کے متعلق فرمایا ان میں

سب سے بڑھ کر نعمت محبوب حقیقی کا دیدار ہے۔ ینظرون میں نظارہ سے مراد جمال الٰہی اور اسکی عجائب شان و شوکت کا نظارہ ہے

تَعۡرِفُ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ نَضۡرَةَ النَّعِیۡمِ ۝ تو اُن کے چہروں پر نعمتوں کی تازگی پہچان لے گا۔

ایک مثل ہے کھایا منہ اور نہائے بال چھپے نہیں رہتے۔ انسان کے قلب میں جب خوشی ہو اور نعمتوں کا احساس اس کا دل و دماغ کر رہا ہو۔ تو چہرہ خود بخود خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔

یُسۡقَوۡنَ مِنۡ رَّحِیۡقٍ مَّخۡتُوۡمٍ ۝ خِتٰمُهٗ مِسۡكٌ ؕ انہیں ایک خالص پینے کی چیز پلائی جائیگی جس پر مہر لگی ہوگی۔ اسکی مہر مشک کی ہوگی۔

رحیق۔ خالص پینے کی چیز یا شراب خالص جس میں کوئی غش نہ ہو یعنی کوئی گندگی یا نقصان وغیرہ۔ یہ محبت الٰہی کی شراب ہے۔ محبت کو شراب سے ایک مشابہت و مماثلت ہے جس طرح شراب انسان کے تمام جذبات کو تحریک دیتی ہے اور انسان اُس کے اثر کے نیچے جس کام پر لگتا ہے۔ بڑے زور سے لگتا ہے۔ اور ہر دوسری چیز سے بے پروا ہو کر اپنی جس قدر طاقت ہو اس ایک کام پر خرچ کر دیتا ہے اسی طرح محبت بھی اپنے اندر ایک نشہ رکھتی ہے جس سے انسان کے ہر ایک قوت اور جذبہ میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور اپنے محبوب کے حصول کی خاطر ایک محب ہر دوسری چیز سے بے پروا ہو کر اپنی ساری طاقت خرچ کر دیتا ہے لیکن جس طرح دنیا کی شراب اپنے نتیجہ میں ایک مضر اثر رکھتی ہے یعنی اس تحریک کے بعد قویٰ پر خمار اور اضمحلال کی حالت وارد ہو جاتی ہے اور طاقت کے بعد ایک ضعف کی حالت وارد ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دنیا کی محبت کا انجام بھی زوال کی حالت اپنے اندر رکھتا ہے۔ جوش محبت کچھ عرصہ کے بعد زائل ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض حالتوں میں تو نفرت اور عداوت کی شکل میں مبدل ہو جاتا ہے پس دنیا کی محبّت کی شراب میں یہی وہ غش ہے جو نقصان کا موجب ہے۔ لیکن خدا کی محبت میں یہ غش نہیں۔ وہ ایک ایسا نشہ ہے جو کبھی اُترتا نہیں۔ اس کی محبت کا جو اثر قویٰ پر ہوتا ہے وہ پائدار ہوتا ہے جو گرمی اور قوت خدا کی محبت قوائے انسانی میں پیدا کر دیتی ہے اس میں زوال نہیں ہوتا بلکہ روز بروز وہ ترقی کرتی ہے۔ اسی لئے بندہ کی محبت کے جواب میں جزا کے طور پر جو محبت کا جام جناب الٰہی کی طرف سے بندہ کو ملے گا وہ بھی اسی طرح ہر ایک قسم کے غش اور نقصان و زوال سے پاک ہوگا۔ سر بمہر کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُس بندہ کے لئے مخصوص ہوگا۔ جس طرح جو چیز سر بمہر ہوتی ہے وہ اس شخص کے لئے مخصوص ہوتی ہے جس کے لئے وہ بھیجی جاتی ہے اور یہ امر ایک خصوصیت کو ظاہر کیا کرتا ہے جو اگر کسی بادشاہ کی طرف سے ہو تو عزت افزائی کا موجب ہوتا ہے پس جناب الٰہی کی سرکار سے جو جام بندوں کو عطا ہوں گے وہ سر بمہر ہوں گے۔ یعنی خاص اُن کے لئے مخصوص ہونگے۔ اور جیسا جیسا جس کا عشق و اخلاص ہوگا۔ ویسا ویسا ہی جام اُسے عطا ہوگا جیسا کہ ہر ایک قلب کا تعلق اپنے محبوب حقیقی سے جدا ہوتا ہے ویسے ہی عشق الٰہی کی محبت کا جام بھی ہر ایک کا جدا ہوگا۔ اور اسی کے لئے مخصوص ہوگا۔ اسی لئے سر بمہر ہوگا۔ کیا خوب کسی صوفی نے کہا ہے ؎

اے ترا با ہر دلے سازے دگر ٭ ہر گدا را بر درت نازے دگر

صد رباب عشق تا رے بیش نیست ٭ ہست بر جا نغمہ و سازے دگر

پھر فرمایا کہ مُہر مشک کی ہوگی اللہ تعالیٰ اپنی محبت سے جس بندہ کو سرفراز فرماتا ہے اگرچہ وہ بندہ اس محبت کو مخفی

سے فی المقدور نہایت درجہ مخفی رکھتا ہے کیونکہ وہ اپنے خلوص اور محبت میں کسی کے علم کا بھی دخل پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح خدا کی محبت کا جام بھی جب بندہ کو ملتا ہے تو وہ بھی سربمہر ہوتا ہے اور ساری دنیا سے مخفی اُسی بندہ کے لئے مخصوص ہوتا ہے لیکن عمر چونکہ مشک کی ہوتی ہے اس لئے وہ اپنی خوشبو ظاہر کئے بغیر نہیں رہتی۔ اس میں اشارہ یہ ہے کہ محبت الٰہی کے راز کو خواہ کتنا ہی چھپایا جائے اس کی خوشبو پھیل کر رہتی ہے دنیا میں بھی جناب الٰہی میں اگر کسی بندہ کو قرب اور محبت کا مقام حاصل ہوتا ہے تو اس کی خوشبو آخر پھیل کر رہتی ہے اسی کو حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں ؎

عشق تو گردد عیاں بر روئے او ❊ بوئے تو آید ز بام و کوئے او

وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝ اور چاہیئے کہ رغبت کرنیوالے یا ریس کرنیوالے اس میں رغبت کریں یا ریس کریں۔

مطلب یہ کہ دنیا میں ہر ایک آدمی جو چیز اُسے پسند ہوتی ہے اُس میں وہ رغبت دکھاتا ہے۔ اور اُس کی ریس کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے کہیں فیشن کی ریس ہوتی ہے کہیں زیور کی۔ کہیں تجارت اور حصول دولت میں انسان ریس کرتا ہے تو کہیں حصول مرتبہ و عزت میں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ ریس اور رغبت کرنے کی کوئی اگر چیز ہے تو یہ ہے کہ محبت الٰہی میں مست ہو کر انسان اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب کو حاصل کرے۔ ریس کرتے ہو تو اُس میں کرو جس میں دائمی فائدہ ہو۔ عارضی چیزوں کیلئے ریس کرنا کیا لطف رکھتا ہے

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝ اور اس کی ملونی تسنیم سے ہوگی۔

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ وہ ایک چشمہ ہے جس سے مقرب پیتے ہیں۔

تسنیم۔ سنام سے ہے ہر چیز کا سنام اس کا اُونچا حصہ ہوتا ہے پس تسنیم کے معنے ہیں ایسا پانی جو بلندیوں سے اُن کے اُوپر بہتا ہے پس اُن جاموں میں جو جناب الٰہی سے عاشقان الٰہی کو ملیں گے۔ ان میں تسنیم کی ملونی کا مطلب یہ ہوا کہ محبت الٰہی کا پانی اپنے اندر بلندی رکھتا ہے۔ اس پانی کے پینے کے بعد جو زندگی ملتی ہے وہ پہلے سے بلند ہوتی ہے بلندی کی ملونی اس پانی کے اندر بتائی ہے کہ جیسے جیسے انسان وہ پانی پیتا ہے یا پیئے گا بلندیوں اور ترقیوں کا وارث ہوتا چلا جائے گا۔ اور جیسے اُن جاموں کی کوئی حد نہیں اس لئے اُن ترقیات اور علو مرتبت کے سلسلہ کا بھی خاتمہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنت میں بندہ ایک بلند مقام دیکھے گا۔ اور وہ اپنے رب سے اس کی خواہش کریگا۔ اور عرض کرے گا کہ اس سے بڑھکر وہ اور طلب نہیں کریگا لیکن جب وہ بلند مقام اللہ تعالیٰ اسے عطا کرے گا۔ تو پھر وہ اس سے بھی زیادہ بلند مقام دیکھے گا۔ اور اس کی تمنا کرے گا۔ اور کہے گا کہ اس کے بعد وہ اور کچھ نہیں طلب کرے گا لیکن جب وہ اُس مقام کو بھی حاصل کرے گا۔ تو اور بلند مقام دیکھے گا۔ غرضکہ وہ اس طرح برابر ترقی کرتا چلا جائیگا۔ اور بلند سے بلند مقامات کو حاصل کرتا چلا جائے گا۔ اس کا ہر مقام پر یہ کہنا کہ میں اس سے زیادہ طلب نہ کروں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی نظر محدود ہوتی ہے اس کی نگاہ میں ایک مقام بلند سے بلند ہوتا ہے۔ اور اس سے زیادہ بڑھکر اس کی نگاہ میں کوئی دوسرا مقام نہیں ہو سکتا لیکن جب وہ مل جاتا ہے تو اگلی بلندی نظر آتی ہے جس کے مقابل

ہیں اپنا حاصل کردہ مقام پست نظر آنے لگتا ہے اس لئے پھر اُس سے اگلی بلندی کی خواہش پیدا ہونا تقاضائے فطرت ہے اور یہ عنایت ربّی ہے جو وہ اُن مقامات کو بخشتا چلا جاتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۝ بیشک جو لوگ مجرم ہیں یا خدا سے قطع تعلق کر چکے ہیں وہ ان لوگوں پر جو ایمان لائے ہیں ہنسا کرتے تھے

وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ۝ اور جب ان پر گذرتے تھے تو آنکھوں اور ابرو سے اشارے کرتے تھے۔

یہ تحقیر کی انتہا ہے دنیا پرست لوگ جو خود ہر طرح کی گندگیوں میں مبتلا ہوتے ہیں غریب مومنوں کا مذاق اڑایا کرتے ہیں اور اُن پر آوازے کستے اور آنکھوں اور ابرو سے حقارت آمیز اشارے کرتے رہتے ہیں۔ اُن میں یہ انسانیت اور شرافت تو ہوتی نہیں کہ اپنے کئے پر کبھی شرمندہ ہوں اُلٹے اترایا کرتے ہیں۔

وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَى أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ۝ اور جب اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ کر جاتے ہیں تو اتراتے ہوئے لوٹتے ہیں۔

یعنی ساتھیوں کے پاس جا کر الٹی ڈینگیں مارتے ہیں کہ ہم نے ایمان والوں کا یوں مذاق اڑایا۔ انہیں یوں بیوقوف بنایا گویا اپنی اُن نالائقیوں پر فخر کرتے اور اتراتے ہیں۔ پھر مذاق ہی نہیں بلکہ اُلٹے گمراہی و کفر کے فتوے لگاتے ہیں۔

وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ۝ اور جب انہیں دیکھتے ہیں کہتے ہیں یہ یقیناً گمراہ ہیں

یعنی اُلٹا مومنوں پر گمراہی کے فتوے لگاتے اور تکفیر بازی کرتے ہیں۔

وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ ۝ حالانکہ یہ اُن پر محافظ مقرر کر کے نہیں بھیجے گئے۔

یعنی اِن کو گمراہی یا کفر کا فتویٰ لگانے کا کیا حق تھا یہ خدا کو علم ہے کہ کون گمراہ ہے اور کون کافر ہے انسان کا کام نہیں کہ وہ اس قسم کے فتوے لگاتا پھرے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے جنگ میں ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جس نے قتل ہونے سے پہلے کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا چاہا تھا۔ اس کی اطلاع جب ہمارے نبی کریم صلعم کو ہوئی تو آپ کو سخت رنج ہوا اور اس صحابی سے جواب طلب کیا اس نے عرض کیا کہ حضور اس نے جان کے خوف سے کلمہ پڑھ دیا تھا۔ تو آپ نے غضبناک ہو کر فرمایا۔ ھلا انشقت قلبہ کیا تو نے اس کا دل پھاڑ کر دیکھا تھا۔ کیا پاکیزہ ارشاد ہے۔ کاش کہ ہمارے آجکل کے علما اس سے سبق لیں خدا تو فرمائے کہ کیا خدا کی طرف سے یہ اُن پر محافظ اور نگہبان مقرر ہیں۔ کہ گمراہی اور تکفیر کے فتوے لگانے کا ان کو حق حاصل ہو گیا ہے؟ اور محمد رسول اللہ صلعم فرمائیں کہ کیا تم نے لوگوں کے دلوں کو پھاڑ کر دیکھا ہے جو کسی کے مومن اور کافر ہونے کا فیصلہ تم کر سکو؟ مگر علمائے دین یہ فرمائیں کہ ہم اگر تکفیر بازی کو چھوڑ دیں تو مسلمانوں کو سیدھا کرنے کا حربہ پھر ہمارے ہاتھ میں کونسا رہ جائیگا۔ ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔ خدا ان تکفیر باز مولویوں کو سمجھ دے کہ ان آیات سے سبق لیں۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۝ پس آج جو لوگ ایمان لائے تھے وہ کافروں پر ہنستے ہونگے۔

یہ کلام بطور مجاز ہے فی الحقیقت ہنسنا مراد نہیں کیونکہ مومن تو دنیا میں بھی کافر کی مصیبت پر نہیں ہنستا بلکہ اس سے ہمدردی کرتا اور عبرت پکڑتا ہے مطلب یہاں یہ ہے کہ وہی لوگ جو تکبر اور حقارت سے مومنوں پر ہنستے تھے۔ آج ان کی حالت ان کے اپنے ہاتھوں سے ایسی ہوگی جو نہایت ذلیل اور مضحکہ انگیز ہوگی گویا ان کی ہنسی کا یہ جواب ہوگا کہ جو مومنوں پر ہنستے تھے وہ آخر کار خود ذلیل ہو کر ہنسی کا موجب بن گئے۔ اس ہنسی کی اصل حقیقت کو اگلی آیت سے واضح کر دیا۔ وہ یہ کہ:۔

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝ تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے۔

یعنی مومن عزت کے تختوں پر بیٹھے اُن لوگوں کی ذلیل اور زار حالت کو دیکھ رہے ہوں گے ہاں انہی لوگوں کی جو دنیا میں ان کی ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ گویا ان کی یہ عزت اور اُن کی یہ ذلت زبان حال سے اُن کی بے حقیقت ہنسی کا جواب ہوگی اور زبان حال کی یہ ہنسی اپنے اندر ایک سچی حقیقت رکھتی ہوگی۔

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ کافروں کا وہی بدلہ دیا گیا جو وہ عمل کرتے تھے۔

یعنی جو کچھ یہ بدلہ ملے گا ان کی اپنی کرتوت کا نتیجہ ہوگا۔ پس جو کچھ ہوگا عین عدل و انصاف کے مطابق ہوگا۔

ع ۱ ۲۶ ۸

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ — وَّهِيَ خَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۃ الانشقاق کا نزول ابتدائی زمانہ مکہ معظمہ میں ہوا۔ گذشتہ دو سورتوں میں اعمال کے لحاظ سے نیکوں اور بدوں کی تقسیم فرما کر اُن کی تشریح کی تھی۔ اس سورت میں بتایا ہے کہ عمل کے لئے ضرور ہے کہ انسان سعی اور جدوجہد سے کام لے سستی اور تغافل کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا سکتی

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ جب آسمان پھٹ گیا یا پھٹ جائیگا۔

انشقاق یعنی پھٹنے کیلئے ضروری نہیں کہ کوئی ایک ٹھوس ہی چیز ہو اور وہ پھٹے بلکہ پھٹنا بہت وسیع معنے رکھتا ہے مادی اور نظری دونوں چیزوں پر استعمال ہوتا ہے۔ یہاں مراد تمام آسمان کے نظام کے درہم برہم ہو جانے اور اُس کے کروں کے ٹوٹ پھوٹ جانے سے ہے۔ یہ قیامت کبریٰ کا نظارہ پیش کیا ہے۔

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ اور اُس نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل کی اور یہ اُس کا فرض تھا۔

یعنی آسمان کا پھٹ جانا خدا کے حکم کی تعمیل میں تھا۔ آسمان نے خدا کا حکم سُنا اور وہ بلا تامل پھٹ گیا فرمایا خدا کے حکم کی جو

اُس نے تعمیل کی یہ اُس کا فرض تھا۔

وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ اور جب زمین پھیل گئی۔

وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ اور جو اس کے اندر تھا وہ اس نے نکال پھینکا اور خالی ہو گئی۔

یہ قیامت کبریٰ کا دوسرا نظارہ ہے فرمایا زمین اور زیادہ پھیل گئی۔ اور پہلے سے بہت زیادہ وسیع ہو گئی اور جو کچھ اُس کے اندر تھا وہ سب اس نے باہر نکال پھینکا اور خالی ہو گئی۔

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ اور اُس نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل کی اور یہ اُس کا فرض تھا۔

یعنی زمین کا وسیع تر ہو جانا اور پھیل جانا اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے نکال پھینک کر خالی ہو جانا خدا کے حکم کی تعمیل میں تھا زمین نے خدا کا حکم سنا اور وہ پھیل گئی۔ اور اپنا سب کچھ باہر نکال پھینکا اور خالی ہو گئی۔ فرمایا خدا کے حکم کی جو اُس نے تعمیل کی یہ اس کا فرض تھا۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اے انسان تو اپنے رب کی طرف سخت کوشش کر کے

اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۚ پہنچنے والا اور پھر اُسے ملنے والا ہے۔

یعنی اے انسان تو اس کمال اور ترقی کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے رب سے ملاقی ہو مگر اس تک پہنچنے کے لئے سخت کوشش اور مجاہدہ کی ضرورت ہے چنانچہ اصل ایک قیامت ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری میں اپنے اوپر وارد کرنی پڑتی ہے تب اس مرتبۂ فنا ثبت کے بعد وہ ایک نئی زندگی حاصل کرتا اور اپنے رب سے ملاقی ہوتا ہے انسان سے اپنے نفس پر جس قیامت کے وارد کرنے کا مطالبہ کیا ہے اس کے لئے قیامت کبریٰ کا نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے۔ ایک طرف آسمان کا خدا کے حکم کی تعمیل میں پھٹ جانا بیان فرمایا۔ تو دوسری طرف زمین کا خدا کے حکم کی تعمیل میں پھیل جانا اور اپنا سب کچھ باہر نکال کر خالی ہو جانے کا ذکر فرمایا مطلب یہ کہ انسان جو خود ایک عالم صغیر ہے اور تمام عالم کبیر کا بہترین خلاصہ ہے۔ اور عالم کبیر کے تمام اجزا کو اپنے اندر چھوٹے پیمانہ پر رکھتا ہے اُسے بھی اپنے اوپر جب قیامت وارد کرنی ہو۔ تو اسی طریقہ پر کرنی چاہیئے جس طریقہ پر کہ عالم کبیر پر قیامت وارد ہو گی۔ عالم کبیر کے نقشہ کو جو مستقبل میں آنے والا ہے ماضی کے صیغہ میں اس لئے بیان فرمایا تا اس کا نقشہ انسان کے تصور میں کھنچ کر اس کے لئے باعث ہدایت ہو۔ اس کو تصور کی آنکھ سے دکھایا۔ کہ آسمان اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں پھٹ گیا۔ اور زمین اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں اور زیادہ پھیل گئی۔ اور سب کچھ اپنے اندر سے نکال پھینکا اور خالی ہو گئی۔ پھر انسان کو مخاطب کر کے بتایا کہ یہ آسمان اور زمین کا فرض تھا۔ کہ وہ اس طرح اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرتے۔ تو اے انسان تُو تو اعمال کا متکلف ہے تو کیوں

نہ اپنے رب کا حکم سُنے اور مانے کیونکہ حکم کی فرمانبرداری سب سے پہلے تیرا فرض ہے اور تیری ساری ترقی اسی فرمانبرداری پر منحصر ہے۔ پس اگر تو اپنے مرتبہ اور شان کے لحاظ سے بلندی و رفعت میں آسمان ہے۔ تب بھی اپنے رب کے حکم کے آگے جھک جا اور اس قدر تذلل اختیار کر کہ فنا ہو جا۔ اور خدا کے احکام کی تعمیل میں ہر ایک قسم کی موت کو اپنے اوپر قبول کر۔ کہ تعظیم لامر اللہ کے ماتحت یہ تیرا فرض ہے۔ اور اگر تو اپنی عظمت اور ذرائع کی وسعت کے لحاظ سے زمین ہے۔ یعنی زمین کی طرح وسیع ہے۔ تو اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں اور زیادہ وسیع اور فراخ ہو جا اور اپنی فروتنی اور انکسار اور فیوض اور عطا سے مخلوق کو نفع پہنچا کیونکہ شفقت علی خلق اللہ کے ماتحت یہ تیرا فرض ہے۔ اور جو کچھ تو نے اپنے اندر حب دنیا اور غیر اللہ اور ماسوی اللہ کو جگہ دے رکھی ہے ان سب کو اپنے رب کے حکم کے ماتحت اپنے اندر سے نکال پھینک اور دل کو اللہ تعالیٰ کے ذکر و اس کے انوار کی تجلیات کے لئے خالی کر دے کہ لا الٰہ الا اللہ کے ماتحت تیرا فرض ہے پس جب انسان سلوک کے یہ تمام مراحل طے کر لیتا ہے۔ یعنی تعظیم لامر اللہ۔ شفقت علی خلق اللہ اور لا الٰہ الا اللہ کے ماتحت اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری سے ایک قیامت اپنے اوپر وارد کر لیتا ہے۔ تب وہ ایک نئی زندگی پاکر اپنے رب سے ملاقی ہوتا ہے اور اس محنت و مشقت کے نتیجہ میں ترقی اور فلاح کی منزل مقصود کو پا لیتا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ پس جس کو کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دی گئی۔ یعنی نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا۔

فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۙ تو اُس کا حساب بھی آسان حساب ہوگا۔

وَّیَنْقَلِبُ اِلٰۤی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ اور وہ اپنے ساتھیوں کی طرف خوش خوش لوٹے گا۔

دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ پکڑنے والے وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے دنیا میں خدا کی کتاب کو دائیں ہاتھ میں پکڑا۔ یعنی اس پر مضبوطی سے قائم ہوئے۔ اور بڑے صبر اور استقامت کے ساتھ اس پر عمل کیا کیونکہ جو چیز دائیں ہاتھ میں پکڑی جائے اس کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ بائیں ہاتھ کی گرفت کمزور ہوتی ہے۔ اس لئے دائیں ہاتھ میں پکڑنا استعارہ ہے۔ اس امر کے لئے کہ اس پر پوری قوت کے ساتھ عمل کیا۔ پس جنہوں نے دنیا میں خدا کی کتاب شریعت کو دائیں ہاتھ میں پکڑا اُن کو آخرت میں اپنا اعمالنامہ بھی دائیں ہاتھ میں ملے گا۔ گویا یہ ایک نشان ہوگا۔ کہ انہوں نے خدا کی کتاب پر کما حقہ عمل کیا ہے اسی لئے ان کا حساب بھی آسان ہوگا۔ کیونکہ محاسبہ کے وقت جس قدر کسی کے اعمال میں غلطیاں کم ہوں گی اتنا ہی اس کے لئے مشکلات کا سامنا بھی کم ہوگا۔ شاید ہے آن ماکہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک است۔ اور قاعدہ ہے کہ اگر حساب پاک نکلے یا غلطیاں کم ہوں۔ اور کسی امتحان میں انسان پاس ہو جائے تو وہ کس قدر خوشی خوشی اپنے اہل و عیال و دوستوں کی طرف لوٹتا ہے یونیورسٹی کے امتحانوں کے نتائج نکلتے ہیں۔ تو جو کامیاب طلبا ہوتے ہیں وہ پاس شدہ لڑکوں کی فہرست میں اپنا نام دیکھ کر کس قدر خوش خوش اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹتے ہیں۔ اسی سے اندازہ اس آخرت کے نتائج کا کر لو جس کی کامیابی حقیقی اور ابدی ہے

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ اور جس کی کتاب اسکی پیٹھ کے پیچھے دی جائیگی۔

فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۝ وَّيَصْلٰى سَعِيرًا ۝ تو وہ ہلاکت مانگے گا اور دوزخ میں داخل ہوگا۔

جنہوں نے دنیا میں خدا کی کتاب کو پیٹھ کے پیچھے پھینکے رکھا یعنی اس پر عمل نہ کیا۔ اُسے آخرت میں اعمالنامہ بھی پیٹھ کے پیچھے ہی ملے گا گویا یہ اسکے کتاب اللہ پر عمل نہ کرنے کا نشان ہوگا۔ ایسا آدمی اپنے اعمال کے نتائج سے بچنے کیلئے موت نہ مانگے تو اور کیا مانگے۔ مگر فرمایا موت نہیں آئیگی۔ بلکہ اپنے اعمال کی پاداش میں آگ میں جا داخل ہوگا جو اہنسات وجذبات کی جو آگ دُنیا میں سُلگاتا رہا اُسی میں آخرت میں جا داخل ہوگا۔

اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ وہ دنیا میں اپنے اہل یعنی خاندان اور ساتھیوں میں خوش تھا۔

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۝ اُسکا خیال تھا کہ موجودہ حالتیں تغیر نہیں آئیگا یا وہ اپنے رب کی طرف نہیں لوٹے گا۔

بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ۝ یہ تغیر تو ہونا تھا بے شک اُسکا رب اُسے دیکھ رہا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو خدا نے اُسے آسودگی دے رکھی تھی تو اپنے ساتھیوں میں مگن اور مزے کرتا رہا یہ نہ سمجھا کہ یہ حالت سدا قائم نہیں رہے گی دنیا میں بھی انقلاب آتے رہتے ہیں۔ اور عمل کے نتائج کا مزہ چکھا جاتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی آخر ایک دن اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔ جہاں انسان نے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے پس عقلمندی یہ تھی کہ وقت کو غنیمت سمجھتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا۔ اور خدا کی کتاب کے مطابق عمل کرتا لیکن تعیش اور تغافل میں خدا کی کتاب کو پس پشت ڈالے رکھا۔ آخر وہ حالت قائم نہ رہی اور وقت آگیا۔ کہ اس کے اعمال نے اپنے نتائج پیدا کئے۔ اللہ تعالیٰ تو اس کی ساری کرتوتیں دیکھ رہا تھا اور کوئی امر اُس سے مخفی نہ تھا تو آج عذاب کے سوا اور کس امر کا سزاوار ہو سکتا ہے۔ تغیر تو سب پر آتا ہے لیکن مومن چونکہ غفلت سے کام نہیں لیتا اس لئے مومن تغیر سے نفع اٹھاتا ہے اور غافل انسان نقصان اٹھاتا ہے

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ (انقلاب زمانہ کی طرف سے غافل شخص کا خیال صحیح نہیں) میں قسم کھاتا ہوں شفق کی۔

وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ اور رات کی اور ان کی جنہیں وہ جمع کرتی ہے۔

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝ اور چاند کی جب وہ کامل ہوتا ہے۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ تم ضرور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف چڑھو گے یا بتدریج منازل طے کرو گے۔

میں قسم کے متعلق سورۃ النّٰزعٰت میں مفصل ذکر کر چکا ہوں کہ قسم کے معنے شہادت اور گواہی کے ہوتے ہیں جس کیساتھ

شدت اور تاکید شامل ہوتی ہے۔ اس جگہ تین چیزوں کو بطور گواہ پیش کیا ہے ایک شفق کو۔ دوسرے رات کو اور اس کو جسے وہ جمع کرتی ہے یعنی ظلمتوں کو اور تیسرے چاند کو جب وہ بتدریج کامل ہوتا ہے شفق اس سُرخی کو کہتے ہیں جو غروبِ آفتاب کے وقت مغرب میں نمودار ہوتی ہے اہل سائنس اور محققین اس کی ماہیت یہ بتلاتے ہیں کہ زمین سے جو ذرات و بخارات اُوپر اٹھتے ہیں وہ غروبِ آفتاب کے وقت جب سورج کی روشنی سے زمین محروم ہو جاتی ہے۔ اور تاریکی پھیل جاتی ہے تو بوجہ بلندی کے سورج کی روشنی سے چمک اٹھتے ہیں اور ان ذرات و بخارات پر سورج کی روشنی کا جو انعکاس ہوتا ہے زمین کی تاریکی اُن کی چمک کو اور زیادہ نمایاں کر دیتی ہے۔ اب اوپر کی آیات پر دوبارہ نظر ڈالو۔ انسان کے بد انجام کی وجہ بتائی ہے۔ اُس کی غفلت اور تغیرات و انقلاب زمانہ کی طرف سے بے پروائی۔ مومن کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ وقت کو غنیمت جان کر کسی انقلاب کے پیدا ہونے سے قبل جد و جہد سے اپنی حالت ایسی بنا لیتا ہے کہ اُس انقلاب کے وقت وہ کامیابی کا وارث ہو۔ اور ناکامیوں اور نامرادیوں سے بچا رہے۔ کیونکہ انقلاب دراصل نتائج اعمال ہی کا ایک مظہر ہوتا ہے۔

لا اُقسم فرما کر بتایا وہ شخص غلطی میں ہے جو اپنے گھر میں مگن یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ وہ تغیر و انقلاب سے محفوظ ہے فرمایا اُسے چاہیئے کہ نظامِ قدرت کی شہادتوں پر غور کرے شام ایک انقلابِ عظیم کا وقت ہے۔ زمین آفتاب سے جو آسمانی روشنی کا سرچشمہ ہے جیسے جیسے منہ پھیرتی چلی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی تاریکی اور ظلمتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو انبیاء اور اُن کی لائی ہوئی آسمانی ہدایتوں سے یعنی آفتابِ ہدایت کی طرف سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ ظلمتوں اور گمراہیوں کو اپنے اندر جمع کرتے چلے جاتے ہیں اور ناکامیوں اور نامرادیوں کے وارث ٹھہرتے ہیں لیکن جو لوگ ان زمینی لوگوں سے بلند ہو کر خدا کی طرف ترقی کرتے ہیں۔ اور خواہشات سفلی سے اونچے ہو کر آسمانی اخلاق کو اپنے اندر لے لیتے ہیں وہ بوجہ اپنے علوِ مرتبت اور آسمانی ہونے کے آسمانی نور سے حصہ لیتے ہیں۔ اور جیسے جیسے انقلاب اپنے عروج پر ہوتا ہے ویسے ویسے یہ لوگ آسمانی نور سے اور زیادہ چمکتے ہیں اور اُن کے اخلاقِ فاضلہ اور زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور اُن کی حسن سیرت اور نورِ باطنی کی چمک اور خوبصورتی کا نظارہ انقلاب کے اوقات میں ہی پوری طرح نظر آتا ہے۔ وہ انقلاب کے وقت ظلمتوں میں گرفتار نہیں ہوتے۔ بلکہ آسمانی روشنی سے معمور ہونے کی وجہ سے اُن کی خوبیاں اور زیادہ چمک اٹھتی ہیں۔ زمینی لوگ تو آفتابِ ہدایت کی طرف سے منہ پھیر کر طرح طرح کی ظلمتوں اور مشکلوں میں گرفتار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر ان کے بالکل برخلاف یہ لوگ چاند کی طرح روز بروز آفتابِ ہدایت کی طرف منہ کرتے چلے جاتے اور اس کے فیض سے کامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کافر یا فاجر زمین کی طرح خدا اور اُس کے آسمانی نور سے منہ پھیرتا ہوا ظلمتوں میں بڑھتا ہے۔ مومن خدا اور اُس کے نور کی طرف منہ کرتا ہوا چاند کی طرح روز بروز کمال کو حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ درجہ بدرجہ ہوتا چلا جاتا ہے جس طرح ہر دن کے بعد جب رات آتی ہے تو چاند جو آفتاب کی طرف منہ کر رہا ہے پہلے کی نسبت زیادہ کامل اور چمکدار نظر آتا ہے اسی طرح ہر مصیبت اور ہر انقلاب میں مومن کا قدم آگے بڑھتا ہے۔ اور اس کا کمال ترقی کرتا ہے۔ اور ہر انقلاب اور ہر ابتلا کے بعد مومن پہلے سے زیادہ کامل نظر آتا ہے۔ اس تغیر و انقلاب اور اُن کے نتائج اور اعمال کی وجہ سے انسان کے بتدریج ترقی یا تنزل کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:-

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ پس انہیں کیا ہو گیا کہ ایمان نہیں لاتے۔

وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ۩ اور جب اُن پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ سجدہ نہیں کرتے یا فرمانبرداری نہیں کرتے ۔

مطلب یہ کہ قرآن تو آسمانی نور کا سرچشمہ ہے ۔ اس پر ایمان نہ لانے اور اُسے پس پُشت پھینکنے سے تو تاریکی بڑھے گی اور اسکی فرمانبرداری سے کمال حاصل ہوگا پس ایسی نور اور ہدایت والی تعلیم پر ایمان نہ لانا موجب حیرت ہے ۔ اور یہ سچ ہے دنیا جس جس طرح قرآن کو غور سے پڑھیگی اور سمجھے گی اسکی صداقت کو ماننے پر مجبور ہوگی بقول یورپ کے مشہور فلسفی گوئٹے کے جو کہتا ہے کہ میں نفرت اور حقارت کے جذبات کیساتھ قرآن کو پڑھنے بیٹھا پڑھنے کے اثناء میں اسکی عزت کے جذبات میرے سینہ میں موجزن ہوئے ۔ اور جب ختم کر کے اٹھا تو اسکی محبت کے جذبات سے میرا دل بھرپور تھا " قرآن بجائے خود ایک نور اور ایک حکمت و صداقت ہے وہ ہر ایک عقلمند کے دل کو موہ لیتا ہے پس یہ کتاب تو ایسی ہے کہ اسکی صداقتوں کے آگے انسان سر تسلیم خم کر دے اور اسکے احکام کی فرمانبرداری میں کبھی تامل یا تاخیر نہ کرے لیکن حالت یہ ہے :۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ۝ زمیہ بلکہ جو لوگ کافر ہیں وہ جھٹلاتے ہیں ۔

یہ ناشکرے لوگ بجائے فرمانبرداری کرنیکے اس صداقت کی تکذیب کرتے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ اسکے مٹا دینے اور فنا کر دینے کی فکر میں ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے کہ

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝ زمیہ اور اللہ خوب جانتا ہے جو باتیں یہ اپنے دلوں میں بند رکھتے ہیں ۔

یعنی قرآن کے مٹانے کیلئے جو خفیہ منصوبے یہ لوگ کرتے اور دلوں میں مخفی رکھتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوب جانتا ہے ۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ پس انہیں دردناک عذاب کی خبر دیدے ۔

یعنی اُنہیں کہدے کہ تمہارے خفیہ منصوبے تمہارے کچھ کام نہ آئیں گے ۔ بلکہ اُلٹا تمہیں اُن کے بدنتائج بھگتنے پڑیں گے اور ایسا ہی ہوا جن لوگوں نے قرآن کو مٹانا چاہا ۔ انہوں نے اس کا خمیازہ بہت بُرا بھگتا ۔ اور سوائے ناکامی و نامرادی اور ذلت و خسران کے کچھ ہاتھ نہ آیا ۔ ایسا ہی آج بھی جو لوگ قرآن کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ وہ بھی اپنے اسی انجام کے منتظر رہیں ۔ انشاء اللہ تعالیٰ

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ہاں جو لوگ ایمان لاتے اور نیک عمل کرتے ہیں ۔

لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ اُن کے لئے اجر ہے جو کبھی منقطع (اور ختم) نہیں ہوگا ۔ ع ۱ ۲۵ ۹

یہاں اِلَّا استثنا منقطع ہے یعنی اُوپر کی بات سے الگ یہ دوسری بات ہے ۔ فرمایا جو اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی بتائی ہوئی راہوں کے مطابق اعمال صالحہ بجالاتے ہیں وہ ترقی و کمال کو حاصل کریں گے ۔ اور ان کا اجر اور ترقی و کمال اس قرآن کی فرمانبرداری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے فضل سے لامتناہی ہوگا ۔ بدر کامل بننے کی مثال تو دنیا کے لئے تھی اور فیض الٰہیہ سے بتدریج کمال حاصل کرتے چلے جانے کے لئے ایک تمثیل تھی ورنہ ترقیات و کمالات جو آخرت میں مومن کیلئے مقدر ہیں وہ لامتناہی ہیں ۔

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ وَهِيَ اثْنَتَانِ وَعِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۃ البروج کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ اس وقت جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کو طرح طرح کے دکھ دیئے جارہے تھے۔ اور کفار مکہ نے ایک فتنہ کی آگ اُن کے گرد بھڑکا رکھی تھی۔ اور طرح طرح کے خفیہ منصوبے اُن کو مٹا ڈالنے کیلئے کر رہے تھے جس کی طرف سورۃ الانشقاق میں اشارہ فرمایا تھا کہ خدا خوب جانتا ہے جو خفیہ منصوبے وہ سینوں میں بند رکھتے ہیں اور پھر اس پر انہیں عذاب کی خبر سنائی تھی۔ اسی پیشگوئی کو اس سورت شریف میں کھول کر بیان کیا ہے اور اُسے مدلل و مستحکم کر کے ہمیشہ کے لئے بطور ایک اصول اور سنت الٰہیہ کے قائم کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ○ گواہ ہے آسمان ستاروں والا۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ○ اور وعدہ کا دن۔

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ○ اور دیکھنے والا اور وہ جسے دیکھا گیا یا گواہی دینے والا اور وہ جس کی گواہی دی گئی۔

اُس وقت عرب پر جو ظلمت و ضلالت چھائی ہوئی تھی اُس پر غور کرو۔ اور چاروں طرف جو مصائب اور فتن گھیرے ہوئے تھے اُن پر بھی نظر ڈالو۔ اور پھر اس پیشگوئی کی شوکت اور صفائی کا اندازہ کرو جس میں امر حق کے غلبہ کو کیسا کھول کر بیان کیا ہے۔ ستاروں والے آسمان کی گواہی سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ وقت آتا ہے کہ یہ ملک عرب آسمانی تعلیم کو قبول کریگا اور خدا کی بادشاہت جو آسمان پر ہے اس شان و شوکت کے ساتھ زمین پر قائم ہوگی کہ مجازاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ زمین آسمان بن جاویگی اور جس طرح آسمان ستاروں سے بھرپور ہے اسی طرح یہ زمین بھی اُن لوگوں سے بھر جائے گی جو ستاروں کی طرح آسمانی روشنی سے منور ہوں گے جیسا کہ حضرت نبی کریم صلعم نے فرمایا۔ اصحابی کالنجوم کہ میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں۔

وعدہ کے دن کی گواہی سے مراد یہ ہے کہ ان تمام باتوں کے پورا ہونے کے لئے ایک دن مقرر ہے جس کا وعدہ دیا گیا ہے۔ جس میں امر حق غالب آئے گا۔ اور وہ دن گواہ ہوگا اس امر پر کہ امر حق جس طرح آج غالب آیا ہے ہمیشہ اہل باطل کے مقابل پر غالب رہیگا

شاہد سے مراد ہے گواہی دینے والا اور وہ آنحضرت صلعم تھے جنہوں نے امر حق کے غلبہ کی گواہی دی اور پیشگوئی فرمائی تھی اور نیز مراد ہے دیکھنے والا اور وہ صحابہ کا گروہ تھا جنہوں نے اس پیشگوئی کو پورا ہوتے دیکھا۔ اور مشہود سے مراد ہے وہ جس چیز کی گواہی دی گئی یعنی امر حق کا غلبہ اور نیز مراد ہے وہ جنکو دیکھا گیا اور وہ کفار کا گروہ تھا جو مغلوب اور ہلاک اور ذلیل اور خوار ہوتے دیکھے گئے۔ اور یہ نظارہ اس امر پر گواہ ٹھیرا کہ امر حق کو پھیلانے والے ہمیشہ غالب ہونگے اور ان کو ستانیوالے اور مٹانیکی کوشش کرنیوالے ہمیشہ اسی طرح مغلوب اور ہلاک ہونگے

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ○ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ○ ہلاک ہوگئے آگ کے خندقوں والے جن میں ایندھن ڈالا جاتا ہے۔

اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ جب وہ اس پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝ اور جو وہ مومنوں کے ساتھ کر رہے ہیں اسے دیکھ رہے ہیں یا اُس پر گواہ ہیں۔

خندق والے کون تھے اُن کے متعلق مفسرین میں بڑا اختلاف ہے بہت سی حکایتیں ذکر کی گئی ہیں ان میں بائیبل والی روایت بہت مشہور ہے کہ بخت نصر شاہ بابل نے تین یہودیوں کو اس قصور پر کہ وہ بادشاہ کے بنے ہوئے بُت کو سجدہ نہ کرتے تھے۔ آگ کی جلتی ہوئی بھٹی میں ڈلوا دیا مگر ان کا کچھ نقصان نہ ہُوا۔ مجھے ان روایات کے تسلیم کرنے میں کوئی عُذر نہیں اس صورت میں مطلب یہ ہُوا کہ جب وہ لوگ جو ایسے ظالم اور جابر اور سنگدل تھے جو آگ کی خندقیں کھود کر اور مومنوں کو اس میں ڈال کر اور اُن خندقوں کے اوپر بیٹھ کر مومنوں کے جلنے اور مرنے کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔ ہلاک ہو گئے اور خدا نے ان کو اس ظلم اور مومنین کے قتل اور ایذا دہی کی سزا اسی دُنیا میں دی تو پھر کفارِ مکہ کیا چیز ہیں یہ اگر مومنوں کو قتل کرتے اور ایذا دے رہے ہیں تو کیا خدا کی پکڑ اور سزا سے بچ جائیں گے ہرگز نہیں۔
لیکن مجھے جو معنے پسند ہیں وہ اس سے مختلف ہیں میرے خیال میں اصحاب الاخدود وہی کفارِ مکہ کو کہا گیا ہے جو مسلمانوں کے راستوں میں طرح طرح سے خندقیں کھودتے تھے تا کہ اُن کی ترقیات کو روک دیں۔ استعارہ کی زبان میں کسی کے لئے خندق کھودنے سے مراد ہوتا ہے اس کی ترقی میں روک ڈالنے کے اسباب مہیا کرنا۔ کفارِ مکہ نے مسلمانوں کی ترقیات کے رستے میں جو خندقیں کھودیں وہ فتنہ اور جنگ کی صورت میں کھودیں۔ خود قرآن کے الفاظ بھی یہی ظاہر کرتے ہیں الاخدود کا بدل ہے النار ذات الوقود سے۔ گویا خندقوں کی تشریح خود قرآن کریم فرما رہا ہے۔ فرماتا ہے وہ خندقیں کیا تھیں وہ النار تھی یعنی آگ۔ عرب میں النار جنگوں کو بھی کہتے ہیں۔ اور یہ مشہور محاورہ ہے جیسا کہ قرآن کریم بھی دوسری جگہ فرماتا ہے کلما اوقدوا نارا للحرب اطفاھا اللہ۔ جب جب جنگ کی آگ انہوں نے جلائی اللہ نے اُسے بجھا دیا۔ کفارِ مکہ نے مسلمانوں کو تباہ و ہلاک کرنے کیلئے چاروں طرف فتنہ کی آگ بھڑکا رکھی تھی۔ اور مسلمانوں کی ترقیات کو روکنے کے لئے اسی آگ کی خندقیں ہر طرف کھود رکھی تھیں اور چونکہ کوئی آگ بغیر ایندھن کے نہ جل سکتی ہے نہ قائم رہ سکتی ہے جیسا کہ قرآن بھی النار کو ذات الوقود فرماتا ہے لہٰذا اس فتنہ اور جنگ کی آگ میں ایندھن ڈالنے والے بھی ذات شریف یعنی کفارِ مکہ تھے جو طرح طرح سے لوگوں کو اکساتے اور انہیں مسلمانوں کو ایذا دینے اور ان سے لڑنے اور ان کو ہلاک کرنے کیلئے ترغیبیں دیتے اور تحریکیں کرتے رہتے تھے تا کہ یہ فتنہ اور جنگ کی آگ قائم رہ سکے اور اس طرح مومنوں کو فتنہ و جنگ کی آگ کی خندقوں میں ڈال کر اور مزہ سے بیٹھ کر اُن کی تکالیف کا تماشا دیکھتے اور خوش ہوتے تھے فرمایا مسلمانوں کی ترقی میں روک ڈالنے کیلئے یہ خندقیں کھودنے والے یعنی فتنہ و جنگ کی آگ [illegible] اور انہیں اپنی ترغیبوں اور تحریکوں سے ایندھن [illegible] مومنوں کو فتنہ و تکالیف میں مبتلا کر کے مزہ سے بیٹھ کر تماشا دیکھنے والے ہلاک ہو گئے یعنی ان کی ہلاکت یقینی ہے جس خندق کو یہ کھود رہے ہیں اسی میں یہ خود گریں گے جس فتنہ و جنگ کی آگ کو یہ بھڑکا رہے ہیں اس آگ میں یہ خود جل جائیں گے یعنی مغلوب اور ہلاک اور ذلیل و خوار ہو جائیں گے۔ دیکھ لیجئے اس سورۃ اور [illegible] سے بھی سلسلہ قائم رہتا ہے سب سے پہلے تاروں بھرے آسمان کا منظر پیش کر کے پیشگوئی فرمائی کہ جس طرح تاروں بھرے آسمان کو دیکھو بس اسی طرح عرب کی زمین آسمان بنکر ستاروں کی طرح آسمانی نور سے منور لوگوں سے بھر جائیگی [illegible] کا غلبہ مقدر ہے ایک دن کیساتھ جو وعدہ دیا گیا ہے اور وہ فتح مکہ کا دن تھا فرمایا اس دن ایک قوم تم ان پیشگوئیوں کو پورا ہوتے دیکھے گی اور وہ قوم صحابہ کی تھی اور دوسری قوم مغلوب ہو کر اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا منظر دیکھ [illegible] اور وہ کفارِ مکہ کی قوم تھی

اسلام کی ترقی کو روکنے کیلئے انکی کھودی ہوئی خندق اور مسلمانوں کو ہلاک کرنے کیلئے انکی بھڑکائی ہوئی فتنہ و جنگ کی آگ خود انہی کے ہلاکت کا موجب ہو گی انہوں نے تو یہ آگ مومنوں کو جلانے اور اُن کا تماشہ دیکھنے کے لئے جلائی ہے لیکن یہ خود اس آگ کی خندق میں گریں گے اور جلیں گے اور مومن اُن کا تماشہ دیکھیں گے اور یہ تمام واقعات گواہ ہوں گے اس بات پر کہ امر حق یعنی اسلام کو جسے خدا دنیا میں قائم اور مستحکم کرنا چاہتا ہے۔مٹانے والے اور اس کی راہ میں روڑا اٹکانے والے اور اس کے خدمت گذاروں کو ہلاک کرنے اور انہیں ایذا دینے والوں کا انجام ہمیشہ اسی طرح ہوگا۔کہ جس آگ کی خندق کو وہ مومنین کو ہلاک کرنے کے لئے جلائیں گے اس میں وہ خود گر کر اور جل کر دنیا کو عبرت کا تماشہ دکھائیں گے اسی لئے اصحاب الاخدود بھی عام رکھا کسی ایک قوم سے مخصوص نہیں کیا۔جو بھی امر حق کو روکنے کے لئے خندق کھودے گا۔اس کا یہی انجام ہوگا۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ اور انہوں نے یعنی کفار نے اُن سے یعنی مومنین سے اسی بات کو بُرا منایا کہ

الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وہ اللہ غالب تعریف کئے گئے پر ایمان لے آئے۔ وہ جس کی بادشاہت آسمانوں

وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اور زمین کی ہے۔اور اللہ ہر چیز کا نگران حال ہے۔

ان آیات میں یہ بتلایا ہے کہ کفار کے غیظ و غضب اور مومنوں کو ایذا دہی کا سبب آخر کیا ہے وہ کونسا قصور ہے جس کی وجہ سے مومنوں پر اس قدر ستم ہو رہا ہے فرمایا کوئی قصور نہیں سوائے اس بات کے کہ وہ اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔گویا وہ قصور جو کفار کے نزدیک کشتنی و گردن زدنی کے قابل بنا ہوا ہے۔وہ فقط اتنا ہے کہ یہ لوگ اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اللہ بھی کیسا جو غلبہ اور عزت والا اور تعریفوں والا ہے اور آسمانوں اور زمین کی پادشاہی جس کی ہے پس یہ تمام امور اللہ سے چھپے ہوئے تو نہیں وہ سب دیکھ رہا ہے ان لوگوں کیلئے جو اس اللہ پر ایمان لائے ہیں جو غلبہ وعزت اور تعریفوں والا ہے اور جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے یہی صفات الٰہیہ جو اس جگہ مذکور ہیں اس امر کی متقاضی ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں غلبہ وعزت بخشے اور اُن کو ایسی خوبیوں اور اخلاق فاضلہ کا مالک بنا دے کہ دنیا میں انکی تعریف ہو اور آسمانی اور زمینی دونو قسم کی سلطنتوں کا وارث بنا دے کفار کی اس ایذا دہی کا جو نتیجہ ہے وہ اگلی آیت میں مذکور ہے فرماتے ہیں

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ بیشک وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا اور دکھ دیتے ہیں پھر باز نہیں آتے۔

يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝ اور توبہ نہیں کرتے تو اُن لوگوں کے لئے دوزخ کا عذاب ہے اور اُن کیلئے جلنے کا عذاب ہے۔

یہاں اصحٰب الاخدود النار ذات الوقود کا معاملہ لہم عذاب الحریق فرما کر صاف کر دیا۔فرمایا مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا اور دکھ دینے والے اور جنگوں اور فتنوں میں مبتلا کرنیوالے خود اس آگ کا مزہ آخرت میں بھی چکھیں گے اور دنیا میں بھی۔آخرت میں جہنم کی شکل میں۔اور دنیا میں حسرت اور ناکامی اور نامرادی کی آگ میں جلیں گے۔اور جو آگ کی خندق مومنوں کے لئے کھودی اور جلائی تھی

اُس میں خود گریں گے اور جلیں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ بیشک وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اُن کے لئے باغ ہیں

تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔

مطلب یہ کہ ایمان اور اعمال صالحہ والوں کو یقیناً اللہ تعالیٰ آخرت میں جنت عطا فرمائے گا اور اُن کے ایمان کو باغات کی شکل میں اور اعمال صالحہ کو نہروں کی شکل میں عطا فرمائے گا۔ لیکن اتنا ہی نہیں کامیابی و فلاح کی جنت انہیں دنیا میں بھی ملے گی خیال کرو وہ کیسی مومنوں کے لئے سکھ اور مسرت کی گھڑی تھی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں خون کے پیاسے دشمنوں پر غلبہ عطا فرمایا اور اُن کے محبوب مذہب کو دُنیا میں مستحکم کر کے دکھایا۔ اور اُن ریگستان کے رہنے والوں کو اُن تمام ممالک پر جن میں جیحوں وسیحوں و جلہ و فرات اور نیل بہتے تھے۔ اور جو دنیا کے باغات سے بھرے ہوئے تھے قابض کر کے آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی عظیم الشان کامیابی عطا فرمائی۔

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ بے شک تیرے رب کی پکڑ بہت سخت ہے۔

یہ مسلمانوں کے لئے آگ کی خندقیں تیار کرنے والے اور ایذا دینے سے باز نہ آنے والوں کو تنبیہ کی ہے کہ اگر تم باز نہ آئے تو یاد رکھو کہ محمد رسول اللہ صلعم کا رب پکڑنے پر آیا تو اس کی پکڑ بہت سخت ہے۔

إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی بار بار پیدا کرتا ہے یا دُہراتا ہے۔

ابداء کہتے ہیں پہلی بار پیدا کرنے کو۔ اور اعادہ کہتے ہیں پیدائش کو بار بار دہرانے کو۔ میں ایک مثال سے سمجھاتا ہوں۔ مثلاً ہمارا مشاہدہ ہے کہ انڈے سے مرغی پیدا ہوتی ہے اور مرغی سے انڈا پیدا ہوتا ہے یقینی طور پر کوئی نہیں جانتا کہ ابتدا میں کیا چیز پیدا ہوئی تھی پہلے انڈا پیدا ہوا تھا جس سے یہ سلسلہ چل پڑا کہ انڈے سے مرغی اور مرغی سے انڈا پیدا ہوتا ہے یا پہلے مرغی پیدا ہوئی تھی اور اس نے انڈا دیا اور پھر انڈے سے مرغی اور مرغی سے انڈے کا دور تسلسل چل پڑا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک پہلے پیدا ہوا تھا اور وہ پیدائش اس قانون کے ماتحت نہ تھی جو ہمیں آج نظر آ رہا ہے۔ وہ مرغی یا وہ انڈا جو پہلے پیدا ہوا تھا وہ کسی اور طریق سے پیدا ہوا تھا جو ہمیں آج نظر نہیں آتا۔ اس پہلے انڈے کی پیدائش جس قانون الٰہی کے ماتحت ہوئی اس کا نام قانونِ ابداء قرآن نے رکھا ہے اور انڈے سے مرغی اور مرغی سے انڈا پیدا ہونے کا دور تسلسل جو آج چل رہا ہے وہ جس قانون الٰہی کے ماتحت ہے اس کا نام قانونِ اعادہ قرآن نے رکھا ہے اسی کو فرماتا ہے کہ انہ ھو یبدئ ویعید۔ کہ بیشک وہ خدا ابداء بھی کرتا ہے اور اعادہ بھی کرتا ہے یعنی دونوں قسم کی پیدائش کا خالق وہ خود ہے دنیا کو پہلے جس طرز پر اس نے چاہا پیدا کیا، وہ قانون ابداء کے ماتحت تھا پھر اس کے چلانے کیلئے اس نے ایسے قوانین بنائے جو بطور سنن الٰہیہ کے اس سارے عالم کی مشینری کو چلا رہے ہیں انہیں قانون اعادہ کہتے ہیں۔ اعادہ اس لئے نام دیا گیا کہ اُن قوانین کے ماتحت

جن اسباب سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ وہی اسباب پھر جب دوبارہ جمع ہو جاتے ہیں تو نتائج بھی وہی دوبارہ پیدا ہو جانے لازمی ہوتے ہیں۔ اسی کو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔ قرآن اُسے یعید سے تعبیر کرتا ہے۔ کہ خدا ان واقعات کو دُہراتا یا اعادہ کرتا ہے۔ یہاں بھی یہی سمجھانا مقصود ہے کہ تم مومنین کی ایذا دہی سے باز نہ آئے۔ تو یاد رکھو کہ وہ رب جس نے محمد رسول اللہ صلعم کو مبعوث کیا ہے۔ وہ ضرور اس کی ربوبیت کریگا۔ اور اُسے کمال پر پہنچائے گا اسکی پکڑ بہت سخت ہے اور اس میں وہ اسی امر کو دُہرائے گا۔ جو تاریخ عالم میں خدا کی سنت چلی آتی ہے۔ جو تم سے قبل خدا کے بندوں کو ستانے والوں کا انجام ہُوا وہی تمہارا ہوگا۔ ابھی تک کیوں نہیں پکڑا اس کی وجہ بھی سُن لو۔

وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ۝ اور وہ مغفرت کرنے والا اور محبت کرنیوالا ہے۔

یعنی یہ خدا کی صفات غفور اور ودود ہیں جنہوں نے تمہیں سزا سے ابھی تک بچایا ہُوا ہے وہ چاہتا ہے کہ بندے سزا سے بچ جائیں کیونکہ اُسے اپنے بندوں سے بڑی محبت ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے صحابہ سے فرمایا کہ کیا کوئی ماں چاہتی ہے کہ اُس کا بچہ آگ میں جل جائے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہرگز نہیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی محبت ماں سے بھی بڑھ کر ہے پس یہ خدا کی محبت اور مغفرت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے بندوں کو عذاب سے بچانا چاہتا ہے۔ اسی خاطر وہ انبیاء و رسل مبعوث کرتا ہے کتابیں بھیجتا ہے کہ بندے کسی طرح سمجھ جائیں اور بداعمالیوں کی سزا اور عذاب سے بچ جاویں شریر لوگ مخالفتیں کرتے ہیں۔ اور خدا کے بندوں کو بے حد ستاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ اُن کی سزا میں تاخیر کرتا رہتا ہے۔ کہ کسی طرح یہ سمجھ جاویں۔ اور اپنی حرکات سے باز آجاویں پس یہاں یہ بتایا کہ ستانے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے ستایا اور ہمارا کچھ نہ بگڑا۔ یہ خدا کی مغفرت اور محبت کا نتیجہ ہے کہ سزا میں تاخیر ہو رہی ہے لیکن تم اگر کسی طرح بھی باز نہ آئے تو یاد رکھو کہ وہ خدا

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝ تخت کا مالک بڑی شان والا ہے۔

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۝ وہ جو چاہتا ہے کر کے رہتا ہے۔

دُنیا میں معمولی بادشاہ اپنی سلطنت کے اندر بغاوت اور قانون شکنی کی سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتے تو پھر خدا تو اپنی عظمت و شان میں نظیر نہیں رکھتا۔ اُس کی سلطنت کے قوانین توڑنے والے کس طرح بچ سکتے ہیں۔ اور دُنیا کے حکمرانوں کے لئے تو ممکن ہے کہ وہ کسی بات کو چاہیں اور کر نہ سکیں لیکن خدا کی قدرت اور طاقت تو اس قدر کامل اور زبردست ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ وہ جو چاہے وہ کر نہ گذرے۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ۝ فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ۝ کیا تجھے لشکروں کی خبر پہنچی ہے فرعون اور ثمود کی۔

اب یہاں گذشتہ تاریخ کو لیا ہے اور اس پر ایک فلسفی کی طرح نظر ڈالنے کی دعوت دی ہے اور فرمایا ہے کہ فرعون اور ثمود کی

تباہی پر غور کرو۔ اُن کے پاس بھی نبی آئے تھے۔ انہوں نے بھی اُن کو ستایا تھا۔ اور ہلاک کر دینا چاہا تھا۔ جو نتیجہ وہاں نکلا خدا کے قانونِ ارادہ کے ماتحت وہی نتیجہ یہاں نکلنا چاہیئے جس طرح وہ لوگ ہلاک اور نامراد ہو گئے اسی طرح تم بھی ہلاک اور نامراد ہو گے دُنیا کی تاریخ کو اس فلسفیانہ نگاہ سے دیکھنے اور قوموں کے ترقی و تنزل کے اسباب پر غور کرنے کی تعلیم سب سے پہلے قرآن نے دی ہے اُس نے بتایا کہ عروج و زوال انفرادی ہو یا قومی یہ سب قوانین الٰہیہ کے ماتحت ہوتے ہیں۔ جن پر غور کرنے سے انسان نفع اٹھاتا اور نقصان سے بچ جاتا ہے۔ ثمود کی قوم حجاز کے شمال میں آباد تھی گویا مکہ والوں کی ہمسایہ تھی۔ انہوں نے بھی اپنے نبی صالح کی جان لینے کی اسی طرح کوشش کی تھی جس طرح کفارِ مکہ نے آنحضرت صلعم کی جان لینے کے منصوبے کر رکھے تھے اور فرعون مصر کے بادشاہ کا خطاب تھا اُس نے بھی حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کو اسی طرح ستایا تھا جیسا کہ مکہ کے ابوجہل اور اس کی ساری قوم نے آنحضرتؐ اور آپ کی جماعت کو ستا رکھا تھا۔ فرمایا جو نتیجہ وہاں نکلا تھا تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی اور وہی نتیجہ یہاں نکلے گا۔ کیونکہ اسباب جو وہاں تھے وہی یہاں ہیں اس لئے ضروری ہے کہ نتائج بھی یکساں ہوں۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۝ بلکہ وہ جو کافر ہیں جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔

وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۝ اور اللہ ان کو سب طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

یعنی یہ کافر گذشتہ تاریخ اور حالات سے فائدہ تو کیا اٹھائیں گے اور باز تو کیا آئیں گے یہ تو اور بھی زیادہ سے زیادہ تکذیب میں بڑھتے جاتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اللہ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے یعنی یہ مومنین کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اور خود بچ کر بھی کہیں سے نہیں نکل سکتے۔ بچنے کی جو راہ تھی اُسے اختیار نہیں کرتے۔ تکذیب کی راہ سے یہ نہ بچ سکیں گے نہ کچھ بگاڑ سکیں گے۔

ع ۲۲ ۱ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝ بلکہ قرآن بڑی شان اور بزرگی والا ہے اور محفوظ تختی میں ہے۔

یہاں قرآنِ کریم کے متعلق تین بڑی زبردست پیشگوئیاں فرمائی ہیں۔ ایکؔ تو خود قرآن کا نام، دوسرےؔ مجید، تیسرےؔ فی لوحِ محفوظ۔ قرآن کہتے ہیں جو پڑھنے کے لائق ہو اور کثرت سے پڑھا جائے اس کتاب کو قرآن فرما کر پیشینگوئی کی کہ یہ کتاب دنیا میں نہایت کثرت سے پڑھی جائے گی۔ سو دیکھ لو نمازوں میں روزانہ بطور وظائف اس قدر قرآن پڑھا جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب خواہ دینی ہو یا دنیوی اس کثرت سے نہیں پڑھی جاتی۔ دنیا کی کتابیں تو ایک دو دفعہ پڑھ کر پھینک دی جاتی ہیں دینی کتب میں آسمانی کتابیں البتہ عمر بھر انسان پڑھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ویدیا ژند اوستا کو پڑھنا تو کیا ہے اُن کی تو شکل بھی مشکل سے نظر آتی ہے۔ ایک بائیبل ہے جس کی کثرت اشاعت اس قدر ہے کہ حیرت ہوتی ہے لیکن کس قدر تعجب ہوتا ہے کہ باوجود اس قدر اشاعت کے کثرت سے پڑھی وہ بھی نہیں جاتی۔ اتوار کو گرجے میں کوئی دعا پڑھ لی اور قصہ ختم۔ اور قرآن ہے کہ نمازوں میں، تراویحوں میں، ناظرہ، حفظ غرضکہ بیسیوں طرح اس قدر پڑھا جاتا ہے اور مسلمانوں کی قوم نے اس کا پڑھنا اس قدر اپنے اوپر لازم کیا ہوا ہے کہ اسکی نظیر تمام دنیا میں نہیں مل سکتی پس اس پیشگوئی میں کفار کو یہ بتلایا کہ تم تو اسکی تکذیب اور مٹانے کی فکر میں ہو اور ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ دنیا میں کثرت سے پھیلے گا اور پڑھا جائے گا اور پھر دیکھو

مجید فرما کر پیشگوئی کی کہ یہ نہ صرف کثرت سے پڑھا جائے گا بلکہ دنیا میں عزت اور بزرگی پائیگا۔ سو اس کی عزت اور بزرگی جو کروڑ ہا کروڑ مسلم قوم نے کی وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن یہ پیشگوئی یہیں ختم ہو جاتی بلکہ اس میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ غیر مسلم اقوام بھی جیسے جیسے اس کا علم صحیح حاصل کریں گے۔ اسکی عزت کرنے کیلئے مجبور ہوں گی۔ آج سے بہت سال قبل انگلستان میں جب اخباروں میں عقلمند اور اہل علم لوگوں سے مطالبہ ہوا تھا کہ ہدایت اور رشد اور علم و معرفت کے لحاظ سے جو کتابیں سب سے زیادہ معزز اُن کی نظر میں ہوں وہ لکھیں۔ اور بلحاظ عزت و بزرگی کے ترتیب وار لکھیں۔ اس وقت قرآن کا نام اس فہرست میں چھٹے نمبر پر لکھا گیا۔ اسکے بعد دو سال ہوئے جب یہی مطالبہ پھر ہوا اور اہل علم لوگوں کی آرا جمع کی گئیں تو قرآن کا نام اس فہرست میں دوسرے نمبر پر دکھایا گیا اور پہلے نمبر پر بائبل کا نام دکھایا گیا۔ اب جنہوں نے بائبل اور قرآن دونوں کو پڑھا ہے وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ بائبل کو قرآن سے اُوپر رکھنا محض قدامت پسندی اور تعصب پر مبنی ہے۔ ورنہ بائبل کو قرآن سے نسبت ہی کیا ہے اُمید ہے اگر قرآن کے مختلف زبانوں میں تراجم اسی طرح ہوتے گئے جیسے ہماری انجمن اور دیگر احباب نے کئے ہیں اور اسلامی لٹریچر پھیلتا گیا تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ وقت دُور نہیں جب یہ غیر مسلم خود قرآن کا نام پہلے نمبر پر شائع کریں اور یورپ کے مشہور فلسفی گوئٹے کے ہمنوا ہو کر اعلان کریں۔ کہ وہ انسان بھی جو قرآن کو حقارت اور نفرت کے جذبات لے کر پڑھنے بیٹھتا ہے پڑھنے کے دوران میں اسکی عزت کے جذبات سے پر ہو جاتا ہے۔ اور ختم کرنے پر محبت کے جذبات لیکر اٹھتا ہے" پس کفار کو جو تکذیب کے درپے تھے۔ اور آج بھی ہیں خدا کی طرف سے یہ اعلان سنایا گیا۔ کہ تم جو چاہو ایڑی چوٹی کا زور لگا لو یہ قرآن تو دنیا میں عزت اور بزرگی پا کر رہے گا۔

فی لوح محفوظ فرما کر یہ پیشگوئی کی کہ تم زور لگا لو یہ قرآن تو محفوظ تختی میں لکھا ہوا ہے یعنی یہ قرآن مٹ نہیں سکتا نہ کوئی اس کے الفاظ کو مٹا سکتا ہے نہ معنی کو۔ الفاظ کو تو خدا نے حفاظ اور تحریر اور طباعت کے ذریعہ ایسے غیر معمولی طریق پر محفوظ کیا کہ دُنیا کی کوئی کتاب اپنے الفاظ کی حفاظت کی اس قوت اور یقین کے ساتھ دعویٰ نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ قرآن مدعی ہے معنی کے متعلق حفاظت کا یہ حال ہے کہ جو اصول قرآن نے قائم کئے ہیں وہ ابدی صداقتیں ہیں جن کی صداقت اور بزرگی کو دنیا کا کوئی فلسفی باطل نہیں ٹھہرا سکتا۔ وہ قوانین الٰہیہ ہیں جن کے نتائج اٹل ہیں وہ اصول حقہ ہیں جن کے خلاف چل کر کبھی انسان سچی خوشی اور راحت کا وارث نہیں ہو سکتا۔ پھر قرآن میں جو امور غیبیہ بیان ہوئے ہیں۔ اور جو پیشین گوئیاں کی گئی ہیں چونکہ وہ علم الٰہی پر مبنی ہیں۔ اسلئے وہ ہمیشہ پوری ہوتی رہیں اور آئندہ بھی پوری ہوتی رہیں گی واقعات تاریخی اس پر گواہ ہیں زمانہ کے واقعات مشاہدات اور تجربات نے انکی صداقت پر مہر لگائی اور برابر لگاتا چلا جا رہا ہے اہل دنیا کبھی دکھ سے نجات اور سچی خوشی اور راحت دُنیا میں اور آخرت میں حاصل نہیں کر سکتے۔ جبتک کہ قرآن کے اصول حقہ پر عمل پیرا نہ ہونگے پس قرآن خدا کی اُس محفوظ تختی میں ہے جسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ دنیا کی تختیوں میں جو تحریریں ہوتی ہیں وہ مٹ سکتی ہیں انسان اسے مٹا سکتا ہے لیکن خدا کی تختی میں جو بات ہوتی ہے اُسے کون مٹا سکتا ہے وہ ابدی صداقتیں ہوتی ہیں جن کا رد ممکن نہیں وہ قوانین الٰہیہ ہوتے ہیں جنکے نتائج اٹل ہوتے ہیں پس جو قرآن کہتا ہے۔ وہی سچ ہے اور پورا ہو کر رہے گا کیونکہ یہ خدا کی تختی کی تحریر ہے جو بندوں سے نہ محو ہو سکتی ہے نہ رد کی جا سکتی ہے

لوح سے یہاں کوئی لکڑی کی تختی مراد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم کامل اور اسکے سنن و قوانین کی تختی مراد ہے جس کی تحریر کو کون ہے جو مٹا سکے اور کون ہے جو اسے باطل کر سکے۔ کیونکہ وہ ایک حقیقت اور صداقت ہے جس میں کسی باطل کا گذر نہیں وہ ایک طاقت اور قدرت کاملہ ہے جس میں کسی ضعف اور کمزوری کا نشان نہیں پس خوش قسمت ہے وہ جو قرآن کو اپنا دستور العمل بناتا ہے

سُوْرَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ | وَهِيَ سَبْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۃ الطارق کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ اس سورت میں بڑے زور سے اعمال کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ضائع نہیں جاتے سورۂ بروج کو تو اس پر ختم کیا تھا۔ کہ خدا کی کتاب جس کی ہدایات کے مطابق عمل کرنا ہے خدا کی حفاظت میں ہے اور محفوظ ہے اس سورت میں یہ بتایا کہ انسان کے اعمال کے لئے بھی خدا نے حفاظت کا سامان کیا ہوا ہے۔ کیونکہ انہی پر انسان کی آئندہ زندگی کا انحصار ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کے اظہار کے لئے محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت ہوئی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ○ آسمان گواہ ہے اور رات کو آنیوالا اور دروازہ کھٹکھٹانے والا گواہ ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ○ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ○ اور تو کیا سمجھا کہ رات کو آنیوالا کیا ہے چمکتا ہوا ستارہ ہے۔

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ○ کوئی نفس نہیں مگر اس پر حفاظت کرنیوالا ہے۔

یہاں حفاظت سے مراد اعمال کی حفاظت ہے۔ جیسا کہ ان علیکم لحٰفظین کراما کاتبین یعلمون ما تفعلون سے واضح ہے۔ کہ تم پر حفاظت کرنے والے مقرر ہیں جو معزز لکھنے والے ہیں جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔

الطارق عربی زبان میں اُسے کہتے ہیں جو رات کو آئے۔ اور دروازہ کھٹکھٹا کر سوتوں کو جگائے خواہ وہ کوئی مہمان ہو یا کسی اور ضرورت کے لئے آنے والا ہو محققین مفسرین نے الطارق آنحضرت صلعم کو قرار دیا ہے کیونکہ آپ ایک شدید جہالت اور ضلالت کی رات میں تشریف لائے۔ اور یہ بالکل سچ ہے لیکن پھر آسمان کی گواہی سے کیا مراد ہوگی۔ اس میں اختلاف ہے۔ لیکن میرا اپنا ذوق یہ ہے کہ جس طرح الطارق آنحضرت صلعم کی ایک شان کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح آسمان آپ ہی کی دوسری شان کو ظاہر کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جو رات کو آتا ہے اور دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اس کے آنے کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ کسی اپنی ضرورت کے لئے آئے گا یا پھر جو سوئے پڑے ہیں اُن کو کسی خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے آئے گا۔ سو آنا کسی شدید ضرورت کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ ضرورت آنے والے کو درپیش ہو یا وہ ضرورت اُن لوگوں کے متعلق ہو جو گھروں میں دروازے بند کئے سوئے پڑے ہیں۔ اور اسے محسوس کر کے کوئی شخص وقت پر خبردار کرنے کے لئے آوے۔ اور دروازہ کھٹکھٹا کر سونے والوں کو ہوشیار کرے۔ تو یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کا اس ضلالت اور گمراہی کی رات میں آنا اور دنیا کے غافل اور سوئے ہوئے لوگوں کو جگانا کسی اپنے مقصد کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ محض خلق اللہ کی ہمدردی اور شفقت نے مجبور کیا کہ آپ ان غافلوں کے دروازے کھٹکھٹائیں۔ اور انہیں سوتے سے جگائیں۔ اور ان کے انجام بد سے انہیں ہوشیار کریں ورنہ محمد رسول اللہ صلعم تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس قدر شدید تعلق رکھتے ہیں۔ اور دنیا اور اس کی خواہشات اور جذبات سے اس قدر بلند ہیں کہ اگر انہیں بوجہ اس رفعت اور بلندی اور انقطاع الی اللہ کے آسمان کہا جائے تو بجا ہے۔ جس طرح زمین کی تباہی سے آسمان

کو کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اہلِ دنیا کی ہلاکت اور ضلالت سے محمد رسول اللہ صلعم کا کیا نقصان ہو سکتا تھا لیکن آپ کو اس قدر شفقت اور ہمدردی خلق اللہ سے ہے کہ آپ اپنے تمام آرام و آسائش کو چھوڑ کر اس ضلالت کی رات میں غافلوں کو سوتے سے جگانے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ اور دروازے کھٹکھٹا رہے ہیں۔ اور انجام سے بے پرواہ لوگوں کو ہوشیار کر رہے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اپنا ایک کشف لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ایک مثلث شکل میرے سامنے آگئی جس کا قاعدہ اوپر اور نوک نیچے تھی۔ اس طرح ▽ ۔ پھر وہ شکل غائب ہو گئی۔ پھر ایک اور مثلث شکل ظاہر ہوئی اور اب کے دفعہ نوک اوپر تھی اس طرح △ ۔ پھر وہ شکل غائب ہو گئی۔ اس کے بعد ایک مستطیل شکل نظر آئی اس طرح ▭ پھر وہ بھی غائب ہو گئی بعد ازاں آنحضرت صلعم تشریف لے آئے۔ فرمایا کہ ولی اللہ! ان شکلوں کا مطلب کچھ سمجھے؟ عرض کی کہ ہاں تینوں شکلیں خود حضور کی ہی تھیں فرمایا کس طرح؟ عرض کیا کہ پہلی شکل جو اس طرح تھی ▽ اس کا مطلب یہ تھا کہ حضور کو اوپر سے یعنی اللہ تعالیٰ سے اس قدر تعلق ہے کہ آپ فنی اللہ ہو چکے ہیں۔ اور فنائیت کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ گویا نیچے سے یعنی مخلوق سے کوئی تعلق نہیں رہا مثلث کی نوک کا نقطہ عدم کو ظاہر کرتا ہے دوسری شکل جو △ اس طرح تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ حضور مخلوق کی ہمدردی اور شفقت میں اس قدر فنا ہیں کہ گویا اوپر سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ تیسری شکل جو اس طرح ▭ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حضور کا تعلق ایک طرف تو جناب الٰہی سے کمال درجہ کا ہے۔ اور دوسری طرف مخلوق کی شفقت اور ہمدردی کمال درجہ کی ہے۔ گویا حضور ان دونوں کمالات کے جامع واقع ہوئے ہیں۔ جو ایک سچے اور حقیقی اور کامل شفیع کی شان ہے۔ اس جواب پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہنس پڑے فرمایا ولی اللہ! تو بڑا ذہین ہے خوب سمجھا۔ پس یہاں بھی والسماء والطارق میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی انہی دونوں شانوں کے کمال کا اظہار ہے ایک طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور انقطاع الی اللہ اس قدر تام ہے کہ آپ روحانیت کے آسمان میں اور دنیا سے بے نیاز ہیں۔ دوسری طرف شفقت علی خلق اللہ کا اس قدر وفور ہے۔ کہ آپ نے اپنی تمام ضروریات پر اس کام کو مقدم کر رکھا ہے۔ کہ اس ضلالت و گمراہی کی رات میں اپنا تمام آرام و چین چھوڑ کر آپ سوئے ہوئے غافل لوگوں کے دروازے کو کھٹکھٹاتے اور انہیں بیدار کرتے پھریں تاکہ وہ ہلاک نہ ہوں اور دنیا و آخرت کو برباد نہ کر بیٹھیں۔ پس ضرورت تو ان سوئے ہوئے لوگوں کو ہے کہ انہیں کوئی جگائے۔ اور یہ اُن کی ہی ضرورت تھی کہ محمد رسول اللہ صلعم جیسا انسان جو اپنی بلندی و رفعت میں آسمان ہے۔ اور دُنیا سے بے نیاز ہے۔ اُن کے دروازوں کو کھٹکھٹا رہا ہے۔ اور یہ عرب کے لوگ جو مہمان نوازی کے لئے مشہور تھے۔ جب اُن کے پاس خدائی مہمان آتا ہے تو اس کی ناقدری کرتے اور اس سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ انہی کے فائدہ کے لئے عین ضرورت کے وقت آیا تھا۔ اس وقت جب دنیا ضلالت کی رات میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ اور کسی آسمانی روشنی کی سخت محتاج تھی۔ وہ آیا اور چمکتا ہوا ستارہ بن کر آیا۔ اور آسمانی روشنی اور ہدایت اپنے ساتھ لایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ان کل نفس لما علیھا حافظ کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے عملوں کے اندر اس کی آئندہ ہستی محفوظ کی جا رہی ہے پس عملوں کو درست کرو۔ تاکہ اگلی زندگی جو حقیقی اور ابدی زندگی ہے راحت و مسرت کی زندگی بنے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو ہر ایک انسان کو ہر وقت مدنظر اور مقصود خاطر رہنا چاہیئے۔ گویا آپ کی بعثت کی اصل غرض یہاں پر یہی بتائی کہ عملوں پر دنیا کی توجہ کو مضبوط کیا جاوے۔ کہ اس پر آئندہ زندگی کا دارومدار ہے۔ اور یہی وہ ہدایت اور روشنی تھی جو آپ کے وجود میں جو اس تاریک دنیا کے لئے بمنزلہ ایک روشن ستارہ کے تھا جس سے لوگ تاریکیوں میں روشنی لیتے اور ہدایت پاتے ہیں نظر آئی

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ پس چاہیئے کہ انسان دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔

خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ وہ گرائے ہوئے پانی سے پیدا ہوا ہے۔

يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝ وہ پیٹھ اور سینہ کی پسلیوں کے بیچ میں سے نکلتا ہے۔

پیٹھ اور سینہ کے درمیان سے نکلنے سے مراد ہے۔ انسان کے شرمگاہ میں سے نکلنا جس کے ایک طرف پیٹھ ہے دوسری طرف سینہ اور اس کی پسلیاں ہیں۔ اور اُن کے درمیان وہ جگہ ہے۔ جہاں سے انسان کا وہ نطفہ خارج ہوتا ہے جس سے انسان پیدا ہوتا ہے یہ طرزِ بیان اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر دلالت کرتا ہے جس پر قرآن پہنچانا چاہتا ہے۔ اس بات کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہ انسان بحیثیت ایک نطفہ کے اس جگہ سے خارج ہوتا ہے جس کا نام لینا بھی خلاف تہذیب ہے اس کی ایک وجہ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا خوب اپنے خطبہ میں بیان فرمائی فرماتے ہیں انسان جو اس قدر تکبر اور فخر و مباہات کا بندہ بنا ہوا ہے۔ کیا شیخی کرتا ہے جبکہ ایک دفعہ وہ اپنے باپ کی پیشاب گاہ میں سے خارج ہوا۔ اور دوسری دفعہ اپنی ماں کی پیشاب گاہ میں سے خارج ہوا۔ صحابہ کہتے ہیں۔ کہ یہ سن کر ہمیں اپنی ہستی حقیر نظر آنے لگی لیکن ایک دوسری وجہ بھی اس بیان کی ہے جس کا تعلق اوپر کی آیات سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اوپر کی آیات میں یہ بتلایا ہے کہ انسان کی اگلی زندگی کے لئے اس کے اعمال کو محفوظ کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہی اعمال اس کی اگلی زندگی کے لئے بمنزلہ ایک باطنی نطفہ کے ہیں خواہ ظاہری نطفہ ہو جس سے موجودہ زندگی پیدا ہوتی ہے یا اعمال کا باطنی نطفہ ہو جس سے اُخروی زندگی بنتی ہے۔ غافل انسان دونوں کے متعلق نہایت بے پروائی اور غفلت سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنے ظاہری نطفہ کی قطعاً پروا نہیں کرتا۔ اور اس کے اخراج کو پیشاب سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ حالانکہ یہ نطفہ اس جوہرِ انسانی پر مشتمل ہے کہ جب وہ رحم میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ تو اس سے ایک نئی زندگی اور ہستی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وہ اپنے اعمال کے معاملہ میں بھی بہت بے پروا واقع ہوا ہے۔ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک انسان جس طرح ظاہری نطفہ کے اخراج میں بے پروا ہوتا ہے اور نطفہ کے گرانے میں کسی احتیاط اور مآل اندیشی سے کام نہیں لیتا۔ اسی طرح بغیر کسی احتیاط اور مآل اندیشی کے وہ عمل بھی کرتا چلا جاتا ہے۔ حالانکہ یہی اعمال اگلی زندگی کے لئے بمنزلہ باطنی نطفہ کے ہوتے ہیں۔ جو اگر ظاہری نطفہ کی طرح محفوظ کر لئے جائیں تو اگلی زندگی کے پیدا ہونے کا موجب بنیں گے ہر ایک عقلمند جانتا ہے کہ نطفہ انسانی اگر ضائع ہونے سے بچ جائے اور رحم میں محفوظ ہو جائے۔ تو وہ ایک نئی زندگی کے پیدا ہونے کا موجب ہو جاتا ہے گویا نطفہ سے نئی زندگی کا پیدا ہونا صرف اس امر پر منحصر ہے کہ اسے محفوظ کر لیا جائے جہاں نطفہ رحم میں محفوظ ہوا اور نئی زندگی پیدا ہوئی۔ اسی طرح اعمال کے نطفہ باطنی سے بھی نطفہ ظاہری کی طرح نئی زندگی کے پیدا ہونے کے لئے جو چیز درکار ہے وہ ہے اس کی حفاظت چنانچہ اسی امر کا جناب الٰہی یہاں اعلان فرماتے ہیں کہ ہم نے تمہاری اگلی زندگی کو وجود میں لانے کے لئے تمہارے اعمال کی حفاظت کا خاص طور پر سامان کیا ہے جو عمل بھی انسان کرتا ہے ریکارڈ ہوتا چلا جاتا اور محفوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔ پس انسان کو چاہیئے کہ نطفہ اور اس سے زندگی کے پیدا ہونے پر غور کرے اور اپنے اعمال کو سوچ سمجھ کر بجالائے

کیونکہ اس کے سامنے کے سامنے اعمال اگلی زندگی کے لئے نطفہ کی طرح ہیں جسے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اور جس سے اگلی زندگی اور ہستی انسان کی پیدا ہونی مقدر ہے مجھے اس امر کے دوہرانے کی ضرورت نہیں کہ آج سائنس کی تحقیقات کا نچوڑ بھی یہی ہے کہ ہمارا ہر ایک قول اور فعل ارتعاش کی موجوں میں نقش ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی سب محفوظ ہوتی چلی جا رہی ہے یہی جذب الٰہی فرماتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ محفوظ شدہ اعمال اگلی زندگی کے لئے بطور نطفہ اور بیج کے ہیں۔ اور حق بھی یہی ہے کیونکہ اعمال کی اس حفاظت کا آخر کوئی مقصد اور نتیجہ بھی ہونا چاہیئے اور وہ ہے اُخروی زندگی۔

اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝ بیشک وہ اس کی رجعت یعنی لوٹانے پر قادر ہے۔

آج سائنسدانوں کو یہی رونا لگا ہوا ہے کہ اس محفوظ ریکارڈ کو جو ایتھر میں نقش ہو رہا ہے پڑھنے کے ذرائع ہمارے پاس اب تک نہیں ہیں وہ نہ ہم دنیا کی صحیح تاریخ پڑھ لیتے۔ انہوں نے تو کیا پڑھنا ہے لیکن جناب الٰہی کیا لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں کہ اعمال کا یہ سارا ریکارڈ لوٹانا ہمارے لئے کیا مشکل ہے۔ کیونکہ جو چیز حفاظت میں لے لی جائے اس کا لوٹانا مشکل نہیں ہوتا۔ گریموفون کو دیکھو جس کے ذریعہ آواز کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ ایک سیاہ توے پر مہین مہین نقطے لگے ہوئے ہوتے ہیں جنہیں کوئی پڑھ نہیں سکتا لیکن سوئنڈ بکس لگانے اور اس کو چکر دینے کی دیر ہے بس ساری باتیں لوٹ کر موجود ہو جاتی ہیں اور جو کہا تھا یا گایا تھا ایک ایک لفظ سُن لو۔ جب انسان اپنی حفاظت کردہ آواز کو لوٹا لیتا ہے تو خدائے قادر مطلق کیوں اپنے محفوظ کردہ ریکارڈ کو لوٹا نہیں سکتا۔ ہاں یہ ایک راز ہے جسے ابھی پا لینا انسان کے لئے محال ہے۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝ جس دن راز ظاہر ہو جائیں گے۔

فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝ تو پھر اس کے لئے نہ کوئی قوت ہوگی نہ مددگار۔

فرمایا ایک دن آجائے گا کہ یہ راز ظاہر ہوں گے۔ اور اعمال کا ریکارڈ لوٹے گا۔ لیکن پھر اس دن نہ تو انسان کے اپنے اندر کوئی طاقت اس کے نتائج سے بچنے کی ہوگی۔ اور نہ خارج میں کوئی اس کا مددگار ہوگا۔ جو اُسے اس کے اعمال کے نتائج بد سے بچا سکے۔ پس انسان کو چاہیئے۔ کہ اس ریکارڈ بھرے جانے کے وقت اعمال میں احتیاط کرے۔ یہاں ایک معمولی تحریر کرنے کے وقت انسان کس قدر محتاط ہو جاتا ہے۔ مسینما کے فلم تیار ہوتے وقت جو ایکٹر کام کرتے ہیں وہ کس قدر احتیاط سے کام کرتے ہیں کیونکہ اُن کا ایک ایک فعل واپس لوٹتا ہے اور پبلک میں ظاہر ہوتا ہے۔ تو پھر انسان کو اس عظیم الشان خدائی ریکارڈ کے لئے کس قدر محتاط ہونے کی ضرورت ہے جس کے لئے آیا ہے کہ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ کہ جو ایک ذرہ کے برابر نیکی کرتا ہے وہ اسے بھی دیکھے گا اور جو ایک ذرہ کے برابر بدی کرتا ہے وہ اُسے بھی دیکھے گا۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ اور آسمان گواہ ہے جو مینہ کو لوٹاتا ہے۔

وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝ اور زمین گواہ ہے جو پودوں کے اُگنے سے پھٹ پڑتی ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝ بیشک یہ فیصلہ کی بات ہے اور یہ بے بنیاد لغو بات نہیں۔

فرمایا اعمال کی حفاظت ایک قول فیصل ہے اور بے بنیاد بات نہیں۔ اعمال کے نتائج تمہیں اسی دنیا میں بھی کسی حد تک ہم دکھائے دیتے ہیں۔ فرمایا جس طرح بارش آتی ہے تو زمین میں جو بیج بھی محفوظ ہوتے ہیں وہ پھوٹتے اور نشو و نما پاتے ہیں۔ اسی طرح جب خدا کا نبی دنیا میں آتا ہے تو وہ اپنے ساتھ ایک روحانی بارش لاتا ہے جو قلوب کی مخفی استعدادوں کو نشو و نما دیتی ہے۔ اور ہر ایک شخص کے اعمال کے ریکارڈ میں جس قسم کے اعمال کے بیج محفوظ اور مخفی ہوتے ہیں خواہ نیکی کے ہوں یا بدی کے وہ پھوٹ پڑتے اور ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور انسان کے اعمال نیک و بد اسی دنیا میں کسی قدر نشو و نما پا کر ایک چھوٹے پیمانہ پر اپنا پھل لاتے اور نتیجہ پیش کرتے ہیں۔ اور اس طرح قیامت کا نقشہ کسی حد تک دنیا میں بھی دکھا دیا جاتا ہے اور نیکوں کو کامیابی اور فلاح اور بدوں کو ناکامی اور ہلاکت و ذلت کا نظارہ اسی دنیا میں نظر آ جاتا ہے۔ اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ تا وہ آخرت کی زندگی اور اعمال کے نتائج پر بطور ایک دلیل اور حجت کے ہو۔ پس تمہیں یہ نقشہ محمد رسول اللہ صلعم کی زندگی میں بھی بوجہ احسن دکھائے دیتے ہیں۔

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝ یہ لوگ بھی ایک تدبیر میں لگے ہوئے ہیں اور میں بھی ایک تدبیر کر رہا ہوں۔

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ پس تو کافروں کو مہلت دے انہیں تھوڑی ہی مہلت دے۔ ع

فرمایا یہ کافر لوگ شب و روز محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے مشن کو تباہ اور فنا کرنے کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں اور میں بھی اسلام کی حفاظت اور نصرت کی تدبیر کر رہا ہوں پس کچھ عرصہ کے بعد نتائج دیکھ لینا کہ کون کامیاب ہوتا ہے اور کون ہلاک اور نامراد ہوتا ہے۔ بیج کا درخت بننے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ لہذا ان کے عملوں کے بیج کو نشو و نما پانے اور پھل لانے کے لئے بھی کچھ مہلت دینی چاہیئے۔ یہ عمل پھل لائیں گے۔ اور انہیں اپنے عملوں کی پاداش سے پتہ لگ جائے گا۔ کہ اعمال کی حفاظت ایک حقیقت ہے پس مہلت دینی چاہیئے خواہ وہ تھوڑی سی ہو۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کو اپنے دشمنوں پر جس قدر جلد اور کامل طور پر کامیابی نصیب ہوئی وہ مذہبی دنیا میں بے نظیر ہے پس یہ مہلت لمبی نہ تھی جلد ہی اعمال نے اپنا پھل دے دیا۔

الغرض اس سورت میں اعمال کی حفاظت پر پہلے تو فلسفیانہ اور سائنٹیفک بحث کی اور نظائر قدرت اور قوانین ظاہرہ سے اس پر استدلال کیا۔ پھر تمام مخالفین معترضین کے سامنے اعلان کیا کہ محمد رسول اللہ کے مقابلہ میں تم جو کارروائیاں کر رہے ہو اس کا نتیجہ ایک حد تک ہم اسی دنیا میں نکال کر دکھائیں گے۔ اور تمہیں ذرا اپنے ان عملوں کا پھل اسی دنیا میں دے کر

دکھائیں گے تاکہ اس بات پر یقین کامل پیدا ہو کہ اعمال اپنے نتائج ضرور رکھتے ہیں۔ اور تاکہ یہ نتائج اتفاقاتِ زمانہ پر محمول نہ کئے جائیں اس لئے قبل از وقت پیش گوئی کے ساتھ یہ چیلنج بھی کر دیا کہ تم جو خفیہ منصوبے اور تدبیریں کر رہے ہو انہیں خوب زور لگا کر لو۔ اور جو نتائج ہم نے قبل از وقت بتا دیئے ہیں اُن کو روکنے کے لئے اپنا پورا زور لگا لو۔ اس کے بالمقابل میری بھی کچھ تدبیر ہے اور وہ صرف اس قدر ہے کہ تمہارے اعمال کے نتائج تمہیں ضرور کچھ تھوڑے سے اس دنیا میں چکھا دیئے جائیں اس اعلان کے بعد ان کی تمام کوششوں کے باوجود دیکھ لو ان کے اعمال بد کے نتائج ایسے خطرناک اور مہلک نکلے کہ ان کی ساری تدبیریں خاک میں مل گئیں اور بدوں کو بد اور نیکوں کو نیک نتیجہ مل کر حفاظتِ اعمال اور نتائج اعمال پر بیّن اور یقینی شہادت واقعات کی قائم ہو گئی جس کا کہ قبل از وقت اعلان کر دیا گیا تھا۔

نکتہ مذکورہ بالا معانی کے علاوہ والسماء ذات الرجع اور والارض ذات الصدع میں بعض باریک اور لطیف دلائل انسانی زندگی کے بقا اور اعمال کے نتائج پر بھی موجود ہیں۔ آسمان کے مینہ کو لوٹانے میں یہ دلیل ہے کہ جس طرح پانی بخارات بن کر فنا نہیں ہو جاتا صرف اس کی شکل بدل جاتی ہے اور جب مشیت الٰہی ہوتی ہے تو آسمان اسے مینہ کی شکل میں لوٹاتا ہے۔ اور وہ پھر پانی بن کر برسنے لگتا ہے۔ اسی طرح نفس انسانی بھی جسم سے الگ ہو کر فنا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی حالت بدل جاتی ہے وقت پر رجعت ہو جائے گی۔ البتہ جس طرح بارش کے پانی میں علاوہ زمینی پانی کے آسمانی تاثرات بھی شامل ہو جاتے ہیں جو اپنے اندر ایک زندگی اور نمو کی قوت رکھتے ہیں اسی طرح نفس انسانی رجعت کے وقت آسمانی تاثرات اور زندگی بھی اپنے ساتھ رکھے گا۔ دوسری مثال اعمال کی دی ہے کہ جس طرح زمین میں سے بیج پھوٹتا ہے اور وہ بارش کے پانی سے مل کر نشو و نما پاتا ہے اور جس قسم کا بیج ہوتا ہے اسی قسم کا پھل لگتا ہے۔ اسی طرح آخرت میں اعمال کے بیج نفس انسانی کے ساتھ جو اپنے اندر ایک آسمانی زندگی رکھتا ہو گا مل کر پھوٹیں گے اور نشو و نما پائیں گے اور جیسے جس کے اعمال ہوں گے اسی قسم کے پھل آئیں گے اور ویسی ہی زندگی بنے گی ؎

گندم از گندم بروید جَو ز جَو،
از مکافاتِ عمل غافل مشَو،

(مثنوی مولانا رومؒ)

پھر فرمایا یہ قول فیصل ہے بے بنیاد بات نہیں۔ چنانچہ عملوں کے نتائج ایک حد تک اس دنیا میں بھی دکھا دیتے ہیں تم جیسے جیسے عمل کر رہے ہو کچھ دنوں میں ان کا نتیجہ ملا جاتا ہے۔

سُوْرَۃُ الْاَعْلٰی مَکِّیَّۃٌ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَھِیَ تِسْعَ عَشْرَۃَ اٰیَۃً

سورۃ الاعلیٰ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی سورۃ الطارق میں تو یہ بتلایا تھا کہ انسان کی اگلی زندگی کا انحصار اعمال کی حفاظت پر ہے۔ اب اس سورت میں اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ دراصل اس دنیا میں انسان کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس سے اعمال صالحہ صادر ہوں۔ کیونکہ رب اعلیٰ کی تسبیح کا تقاضہ ہی یہی ہے ارشاد ہوتا ہے:۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ تو اپنے رب بہت بلند و بالا کے نام کی تسبیح کر۔

حدیث شریف میں آتا ہے جب یہ آیت پڑھی جائے خواہ نماز میں ہی پڑھی جائے تو اس وقت کہنا چاہیئے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی

تسبیح کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو اپنی صفات میں بے عیب اور ہر ایک نقص سے پاک سمجھنا یا ماننا یا بیان کرنا۔

تقدیس کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو اپنے افعال میں ہر ایک عیب اور نقص سے پاک سمجھنا یا ماننا یا بیان کرنا۔

تحمید کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو اپنی صفات میں ہر ایک خوبیوں اور صفات کاملہ سے موصوف سمجھنا یا ماننا یا بیان کرنا۔

بدقسمتی سے آجکل ہمارے ملک میں تسبیح اس مالا کو کہنے لگے ہیں جو ہندو پنڈت اور جوگی اور مسلمان فقراء اور اکثر مولوی اور اُن کی تقلید میں بہت سے دیندار کہلانے والے لوگ پھیرا کرتے ہیں۔ یہ بدعت ہے نہ ہمارے نبی کریم صلعم نے کوئی مالا پھیری نہ صحابہ کرام نے۔ یہ مجوسیوں، عیسائیوں، ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی پھیرنی شروع کر دی۔ بلکہ نماز تو پانچ منٹ میں گھاس کی طرح کاٹ کر رکھ دیتے ہیں اور بعد میں گھنٹوں مالا پھیرتے رہتے ہیں۔ اور اس کا نام تسبیح رکھا ہوا ہے۔ بلکہ جس قدر مکر اور فریب کے مجسمے پیر فقیر پھیرا کرتے ہیں اُن کی ریاکاری کا سب سے بڑا حربہ یہی مالا ہوا کرتی ہے۔ بیٹھے ہیں تو مالا پھیر رہے ہیں باتیں کر رہے ہیں تو مالا پھیر رہے ہیں۔ گالیاں دے رہے ہیں تو مالا پھیر رہے ہیں رشوت لے رہے ہیں یا کوئی اور بددیانتی کا کام کر رہے ہیں تو بھی مالا پھیر رہے ہیں کسی عورت پر نظر بد ڈال رہے ہیں تو بھی مالا پھیر رہے ہیں اسی کو امیر خسرو نے ایک شعر میں فرمایا ہے ؎

تسبیح بدست زاہد نظرش بہ مال مردم
چنیں کافرے مسلماں دیدم نہ دیدہ بودم

ایک مسلمان سب اوورسیر تھا جو غریب مزدوروں کی روزانہ اُجرت میں سے بھی اپنے لئے پیسے وضع کر لیا کرتا تھا۔ مگر ہزار حیلے کی مالا پھیرا کرتا تھا اور ہر وقت مالا یا بقول اُن کے تسبیح پھیرا کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ میرے پاس بیٹھا ہوا مالا پھیر رہا تھا۔ اور کسی کو ہزار ہزار گالیاں دے رہا تھا اور تسبیح کے دانے کھٹا کھٹ گر رہے تھے۔ میں نے کہا کیا مالا پر گالیاں گن رہے ہو جو ہر گالی پر ایک دانہ گرتا ہے۔ جھینپ گیا لیکن فوراً بول اٹھا کہ بادشاہو! اگرچہ زبان گالی دے رہی ہے مگر ہمارا قلب ذکر کر رہا ہے میں نے کہا پھر آپ کی زبان اور آپ کا قلب ایک نہیں۔ اس پر کہنے لگا کہ یہ فقیر کی باتیں ہیں۔ تم انگریزی خواں لوگ سمجھ نہیں سکتے۔" غرضکہ یہ بدعات ہیں۔ البتہ مکر و ریا کے لئے بہت مفید ہیں۔ اس سے دینداری کا رعب اچھا جمتا ہے ایک دفعہ ایک

صوفی اسی طرح تسبیح یا مالا پھیرتے تھے کوئی عورت قریب سے گذری اس نے کہا یہ کیا کرتے ہو کہنے لگے کہ محبوب کا نام لے رہا ہوں عورت بولی۔ کہ میرا بھی ایک محبوب ہے میں نے تو کبھی اُس کا گن گن کر نام نہیں لیا میرے دل میں وہ ہر وقت بسا ہؤا ہے اور زبان پر اسی کا ذکر رہتا ہے۔ اس پر وہ صوفی رو پڑے اور مالا پھینک دی۔

حضرت نبی کریم صلعم نے فرمایا ہے کہ کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان علی المیزان سبحان اللہ وبحمدہٖ وسبحان اللہ العظیم کہ وہ کلمے ہیں جو زبان پر تو بہت ہلکے ہیں لیکن میزان پر بہت بھاری ہیں اور وہ ہیں سبحان اللہ وبحمدہٖ اور سبحان اللہ العظیم۔ حضرت نبی کریم صلعم اکثر ان کا ورد رکھتے تھے۔ علیٰ ہذا مولوی نورالدین صاحب مرحوم بھی نمازوں میں بھی سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلےٰ کی تسبیح ہوتی ہے لیکن زبان سے ان تمام تسبیحوں کا مقصد یہ ہے کہ ان کا اثر قلب پر پڑے اور قلب انسانی اللہ تعالیٰ کی سبحانیت کو یاد رکھے تا اُس کے مطابق اس کے اعمال ہوں۔

الغرض تسبیح دو رنگ کی ہے (۱) ایک تو زبان سے جس کی قلب تصدیق کرے یعنی انسان اپنے اعتقاد سے اللہ تعالیٰ کو ہر ایک نقص اور عیب سے پاک سمجھے اور انہی خیالات کا زبان سے بھی ذکر کرتا ہے یعنی اس کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب نہ کرے جو اس کی صفات کاملہ اور حسنہ کے خلاف ہو اسی کے مطابق دل سے وہ اللہ تعالیٰ کی نسبت اعتقاد رکھے۔ اور زبان سے بھی تبلیغ اور ذکر کرے توحید اور معرفت صحیحہ سب اسی تسبیح پر منحصر ہیں۔ چونکہ شرک جناب الٰہی میں نقص اور کمزوری کو ظاہر کرتا ہے اس لئے تسبیح اور توحید لازم ملزوم چیزیں ہیں۔ توحید کامل نہیں ہوتی جب تک تسبیح کامل نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس جب تک اللہ تعالیٰ کی صفات کو ہر ایک نقص اور عیب سے پاک اور مبرا اور کامل نہ سمجھے معرفت صحیح نصیب نہیں ہوتی۔ تسبیح کی یہ قسم نوع انسان سے مخصوص ہے۔

(۲) دوسری تسبیح حالی اور عملی رنگ میں ہوتی ہے۔ اور یہ ہر ایک مخلوق کے لازم حال ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر ایک مخلوق اپنے خالق کی اعلیٰ درجہ کی کاریگری اور حسن صفت پر دلالت کر رہی ہے جو چیز جس مقصد کے لئے پیدا ہوئی ہے اور اُسے اس مقصد کے حصول کے لئے جو قوتیں اور استعدادیں عطا ہوئی ہیں ان سے بہتر عقل انسانی تجویز نہیں کر سکتی۔ پس ہر ایک چیز ہر ایک ذرہ جو اپنی اپنی جگہ اس کائنات میں موجود اور اپنا کام کر رہا ہے۔ اور اپنے مقصد پیدائش کے حصول کے لئے سرگرم جدوجہد ہے وہ اپنے خالق کے کمال اور ہر ایک نقص وعیب سے پاکیزگی یعنی سبحانیت پر دلالت کر رہا ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ زبانِ حالی سے اپنے پیدا کرنے والے کی تسبیح کر رہا ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ وان من شیءٍ الا یسبح بحمدہٖ ولکن لا تفقھون تسبیحھم کہ کوئی چیز نہیں مگر وہ اپنے خالق کی تسبیح وتحمید کر رہی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں کیسی خوبصورت بات فرمائی ہے فرماتے ہیں کہ ہر ایک چیز جس مقصد کے لئے کہ وہ پیدا کی گئی ہے اپنی جگہ اس طرح کامل پیدائش رکھتی ہے کہ اس کا مشاہدہ اس کے پیدا کرنے والے کے کمال اور ہر ایک نقص وعیب سے مبرا ہونے پر دلیل واضح ہے۔ صرف مشکل یہ ہے کہ انسان چونکہ اس چیز کے مقصد کو نہیں جانتا اور اس چیز کے ہر ایک قوت واستعداد کا علم نہیں رکھتا۔ اس لئے اپنی لاعلمی اور کم فہمی کے باعث اعتراض کر بیٹھتا ہے ورنہ اگر انسان کا علم کامل ہو اور وہ کائنات کے ہر ایک ذرہ کی قوتوں اور مقصد پیدائش کا علم رکھتا ہو تو وہ خالق کائنات کی تسبیح کو ذرہ ذرہ سے سُنے گا اور خود اس کا قلب اس تسبیح کا ورد کرے گا۔ جیسا کہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

ایک دفعہ ایک انگریز دہریہ ڈاکٹر انڈے میں بچہ کی پیدائش کو خوردبین سے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی روح وجد کر اٹھی اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کہ "یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سچ مچ کوئی خدا اپنے ہاتھوں سے بنا رہا ہے"

میں سن ۱۹۰۸ء میں مشرقی افریقہ گیا وہاں سے دو تین مرتبہ ہندوستان قلیوں کو لے کر آیا اور دو تین دفعہ واپس گیا۔ ایک دفعہ سمندر میں متواتر کئی دن تک بارش کا سلسلہ جاری رہا۔ میں جہاز کے عرشہ پر بیٹھا بارش کا نظارہ دیکھ رہا تھا کہ دل میں وسوسہ پڑا کہ اس بارش کا سمندر پر کیا فائدہ؟ خشکی پر بارش ہوتی تو فصل کو نفع دیتی سمندر پر پانی برسا بیکار گیا۔ کیا سبحانیت اور حکمت الٰہی کے خلاف نہیں؟ اس وسوسہ پر استغفار پڑھی یہ فضل ربی تھا جو اس وقت یہ خیال آگیا کہ خدا کے علم کے سامنے میرا علم کیا چیز ہے سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم۔ لیکن جناب الٰہی کی غریب نوازی یہ ہوئی کہ اس وسوسہ کے ۲۵ برس کے بعد ایک کتاب کے ذریعہ میرے علم کو اس معاملہ میں واضح فرما دیا۔ ایک انگریز سائنسدان کی کتاب میری نظر سے گذری اس نے لکھا کہ سمندر کی مچھلیوں کو آکسیجن اور نائٹروجن وغیرہ سب بارش کے ذریعہ پہنچتا ہے۔ اگر سمندر پر بارشیں نہ ہوں تو کچھ عرصہ کے بعد مچھلیاں ہلاک ہو جائیں" اس علم کے ملنے پر میری روح کی گہرائیوں سے خدا کی تسبیح اٹھی۔ اور اس وقت مجھے ذرہ ذرہ سے تسبیح کی آواز آنے لگی۔ الغرض یہ انسان کی لاعلمی ہے جو وہ کسی چیز کے نفع کو نہیں سمجھتا اور معترض ہو بیٹھتا ہے۔ سارے کائنات کے عالم کی پیدائش اور اس کے کمال اور مقصد کو انسان کی محدود کھوپڑی کیسے احاطہ کر سکتی ہے؟ پس جاننا چاہئے کہ ہر ایک چیز اپنی اپنی جگہ زبان حال سے تسبیح کر رہی ہے اور وہ اس طرح کہ جس مقصد کے لئے وہ پیدا ہوئی ہے اس کے حصول کے لئے سرگرم جدوجہد ہے اسی لئے ارشاد ہوتا ہے کہ سبح اسم ربک الاعلیٰ کہ اے انسان تو بھی تسبیح کر اس کی جس نے تجھے پیدا کیا اور جو اپنی ربوبیت کاملہ سے تجھے اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی دینا چاہتا ہے جس طرح وہ خود اعلیٰ ہے اور اس کی صفات اپنے اندر اعلیٰ سے اعلیٰ شان رکھتی ہیں۔ اور ان کا علو ہر ایک نقص اور عیب سے مبرا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی ربوبیت سے انسان کو بھی اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج پر پہنچانا چاہتا ہے۔ پس انسان اگر ربوبیت کاملہ سے مستفیض ہو کر اعلیٰ سے اعلیٰ ترقیات کا وارث ہونا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے رب کی تسبیح کرے دل اور زبان سے بھی اور اپنے عمل اور حال سے بھی۔ دل اور زبان کی تسبیح کی تشریح تو میں کر چکا ہوں۔ عمل اور حال کی تسبیح کی تشریح خود جناب الٰہی سے سنو۔ فرماتے ہیں:۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وہ جس نے پیدا کیا اور ٹھیک ٹھاک اور کامل بنایا۔

وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝ اور وہ جس نے اندازہ کیا پھر ہدایت دی۔

یہاں تسبیح کی چار وجوہات دی ہیں اول خلق۔ دوم تسویہ۔ سوم تقدیر۔ چہارم ہدایت۔ چونکہ ان افعال کا کوئی مفعول مذکور نہیں اس لئے ساری مخلوق ہی یہاں مفعول قرار دی جائے گی یعنی خدا نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا۔ ہر ایک چیز کو ایک کمال عطا کیا

ہر ایک چیز کے لئے ایک اندازہ اور حد بست مقرر کی جس سے وہ باہر نہیں نکل سکتی۔ اور ہر ایک چیز کو ہدایت دی یعنی ایک قانون پر لگا دیا جس پر چل کر وہ اپنے کمال کو حاصل کرے۔ گویا ہر ایک چیز جو پیدا ہوتی ہے چار چیزیں اس کے لازم حال ہوتی ہیں (۱) ایک تو اسکی پیدائش (۲) دوم جس مقصد کے لئے وہ پیدا ہوئی ہے اس کے لئے اس کے اندر جو قوتیں اور استعدادیں عطا کیں وہ اپنے اندر درجہ کمال رکھتی ہیں یعنی ان سے استراس کام کے لئے انسانی ذہن تجویز نہیں کر سکتا یہ تسویہ ہے (۳) پھر اُس چیز کے خواص اور قوتی کے کام کرنے کے لئے ایک قانون اور اندازہ بنایا جس پر وہ چلی چلے اور اس سے اِدھر اُدھر نہ ہو یہ تقدیر ہے (۴) پھر اپنے مقصد پیدائش کو حاصل کرنے کے لئے ایک صراط مستقیم پر چلتا اس کی فطرت اور خاصیت میں رکھ دیا جس پر وہ چل رہی ہے اور اپنے مقصد پیدائش کو حاصل کر رہی ہے یہ ہدایت ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا اعطیٰ کل شئ خلقہ ثم ھدیٰ۔ کہ ہر ایک چیز کو پیدا کیا پھر اُسے ہدایت دے دی جس پر چل کر وہ اپنے مقصد پیدائش کو حاصل کر سکے۔ اور یہ ہدایت اس کی فطرت میں مرکوز ہوتی ہے جس سے وہ اِدھر اُدھر نہیں ہوتی۔ اسے ہم فطرت اور خاصیت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اب ایک اور بات سمجھ لینی چاہیئے وہ یہ کہ انسان اپنے اندر دو قسم کے قوتیں رکھتا ہے ایک تو وہ جس میں وہ دوسری مخلوق کے ساتھ اشتراک رکھتا ہے۔ اور وہ قوتیں بے اختیار قوانین فطرت کی تعمیل کرتے ہیں جس میں انسان کا کچھ دخل نہیں مثلاً زبان کسی چیز کے ذائقہ کو کھٹا یا میٹھا اگر بتاتی ہے تو انسانی ارادہ کو اس میں کوئی دخل نہیں وہ کھٹے کو کھٹا اور میٹھے کو میٹھا بتائے گی۔ خواہ انسان ہزار چاہے کہ وہ کھٹے کو میٹھا بتائے۔ لیکن وہ کبھی نہیں بتلائے گی لیکن ایک اور قسم کے قوتیں ہیں جو انسان کے ارادہ کے ماتحت کام کرتے ہیں اور چونکہ انسان صاحب عقل و تمیز پیدا کیا گیا ہے اور اُسے خود شناسی و خود اختیاری عطا ہوئی ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ قوتیں انسان کی مرضی اور ارادہ کے ماتحت کام کرتے ہیں مثلاً زبان سچ بھی بول سکتی ہے اور جھوٹ بھی بول سکتی ہے اب یہاں انسانی ارادہ کام کرتا ہے زبان اس کے ارادہ کی پیروی کرے گی۔

پس ہدایت جو انسان کو دی گئی ہے وہ بھی دو ہی قسم کی دی گئی ہے ایک تو ان قوتوں کو دی گئی جو اس کے ارادہ کے ماتحت نہیں ہیں اور وہ اس میں اور تمام مخلوق میں مشترک ہیں۔ اس لئے وہ ہدایت بھی اس طرح فطرت کے اندر مرکوز ہے جس طرح سب مخلوق میں ہے انسان کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ مثلاً انسان کا معدہ پھیپھڑا، جگر، دل وغیرہ بغیر انسان کے ارادہ کے دخل کے سب کام کر رہے ہیں اور اپنے مقصد پیدائش کو پورا کر رہے ہیں۔ دوسری قسم کی ہدایت ان قوتوں کے لئے دی گئی ہے جن کو کام میں لانے کے لئے انسانی ارادہ اور علم کو دخل ہے۔ اس لئے اس قسم کی ہدایت میں ضروری تھا کہ انسانی ارادہ کو قائم رکھا جاتا۔ لہٰذا علم کے رنگ میں انسان کو یہ ہدایت دی گئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے انسان کو اس کا مقصد پیدائش بتلایا۔ اور اسے اپنے مقصد پیدائش کے حصول کے لئے وہ راہیں بتلائیں جن پر چل کر وہ ان کمالات کو حاصل کر سکتا ہے جو خلافت الٰہیہ کا تقاضا ہیں اور جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے اس طرح انسان کو ہدایت بھی ملی۔ اور اس کا ارادہ اور اختیار بھی قائم رہا۔ جو انسان کا امتیاز خصوصی ہے۔ اس لئے خدا نے اسلام کو دین فطرت فرمایا۔ مطلب یہ کہ انسان کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ایسے علم کا ملنا جو اُسے ان راہوں کو بتا دے جن پر چل کر وہ ان کمالات کو حاصل کر سکے

جو اس کا مقصد پیدائش ہیں انسان کا پیدائشی حق تھا۔ اگر تمام دیگر مخلوقات کو اور خود انسان کے وجود کے اُن قوتی کو جو اس کے ارادہ کے ماتحت نہیں ہیں ہدایت خدا کی طرف سے ملی ہوئی ہے جو اُن سب کی فطرت میں مرکوز نظر آتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان کو خدا کی طرف سے اُن قوتی کے لئے کوئی ہدایت نہ ملتی جن میں انسانی ارادہ کو دخل ہے اور جو اس کے علم اور عقل کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ پس انسان کو صحیح راستہ پر ڈالنے کے لئے خدا کی طرف سے بذریعہ وحی علم و حکمت کی شکل میں جو ہدایت ملی وہ عین مطابق قانونِ فطرت ملی۔ اور جو انسان ان ہدایات پر چلتا ہے وہ عین فطرت کے مطابق خالق فطرت کی آواز پر عمل کرتا ہے اور اس طرح اپنی پیدائش کے مقصد کو حاصل کر کے کمالاتِ عالیہ کا وارث ہو کر اپنے خالق کی صفات کاملہ پر ایک دلیل واضح بن جاتا ہے۔ اور اپنے اعمال اور ترقیات کی وجہ سے زبان حال سے اپنے خالق کی تسبیح کرتا ہے

پس اس سورت میں جو تسبیح کرنے کا حکم دیا ہے۔ تو اس میں دونوں قسم کی تسبیح کا حکم ہے۔ زبانی تسبیح بھی جس میں یہ اشارہ ہے کہ انسان کے عقائد اس کے دل میں اور زبان پر اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفات کی نسبت ایسے ہوں کہ شرک یا کسی قسم کا نقص و عیب صفات الٰہیہ میں قطعاً راہ نہ پا سکے۔ اور حالی تسبیح بھی یعنی اس کے اعمال ایسے ہوں جن سے انسان اپنے مقصد پیدائش کو حاصل کر سکے۔ اور اس طرح اپنے فطری کمالات عالیہ کو پا کر اپنے خالق کی سبحانیت پر ایک دلیل واضح بن جائے۔ اور وہ ربّانی ہدایت جو ان ہر دو قسم کی تسبیح کے لئے ضروری تھی انسان کو اپنی پوری مکمل شکل میں قرآن کے ذریعہ ملی۔

وَالَّذِیْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۙ۝ اور جو چارہ نکالتا ہے۔

فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی ؕ۝ پھر اُسے کوڑا کرکٹ سیاہ کر دیتا ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس کے ذریعہ انسان کے ذہن نشین کرنا چاہا ہے کہ اگر کوئی چیز اپنا مقصد پیدائش پورا نہ کرے تو اس کی پیدائش بیکار محض ہو جاتی ہے۔ اور اس کی ہستی اس قابل ہو جاتی ہے کہ سیاہ کوڑے کرکٹ کی طرح اُس سے نفرت کی جائے اور اسے پھینک دیا جائے یا جلا دیا جائے۔ سرسبز چارہ جب زمین سے نکلتا ہے تو کس قدر خوشنما اور پیارا ہوتا ہے۔ اُس کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ جانور اُسے کھا دیں۔ اگر جانوروں کی خوراک کے وہ کام آ جاوے تو گو بظاہر تو وہ فنا ہو گیا لیکن اس فنائیت میں اس کا مقصد پیدائش پورا ہو گیا اور وہ اپنے سے اعلیٰ جنس یعنی حیوان کا جزو بدن بن گیا۔ اور اس طرح ادنیٰ سے اعلیٰ حالت میں ترقی کر گیا۔ لیکن اگر اس کا مقصد پیدائش پورا نہ ہو یعنی وہ کسی جانور کی خوراک نہ بنے تو پھر اس کا انجام یہی ہے کہ وہ سیاہ کوڑا کرکٹ بن کر پھینک دیا جائے یا جلا دیا جائے۔ پس اگر انسان اپنے مقصد پیدائش کے حصول کے لئے جد و جہد کرتے ہوئے فنا بھی ہو جائے تو اس کی یہ ہلاکت نہ ہو گی۔ بلکہ ایک اعلیٰ زندگی میں تبدیل ہو گی۔ اسی لئے شہداء کے متعلق فرمایا کہ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولٰکن لا تشعرون کہ جو اللہ کی راہ میں جد و جہد کرتے ہوئے مارے بھی جائیں اُن کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم اُسے محسوس نہیں کرتے الغرض

انسان اگر اپنے مقصدِ پیدائش کو حاصل کرے خواہ اُس میں موت بھی قبول کرنی پڑے۔ تو وہ اس کے لئے ترقی و کمال کا موجب ہے جس سے اس کے رب کی سُبحانیت پر ایک دلیل قائم ہوتی ہے۔ اور اپنے اعمال سے وہ اپنے رب کی تسبیح کرنے والا ٹھیرتا ہے۔ لیکن اگر مقصدِ پیدائش کو اس نے حاصل نہ کیا تو گو وہ کتنا ہی عرصہ دنیا میں رہے اس کی حیثیت سیاہ کوڑے کرکٹ سے بڑھ کر نہیں جس سے نفرت کی جاتی ہے۔ اور جو سوائے پھینک دینے اور جلا دینے کے اور کسی کام نہیں آتا۔ پس خدا کی تسبیح کامل طور پر تبھی ادا ہوتی ہے۔ جب نہ صرف قولاً و اعتقاداً خدا کی صفات اور توحید میں کسی قسم کا نقص و عیب روا نہ رکھا جائے۔ بلکہ خدا کی ہدایت پر پوری طرح عمل کر کے انسان اپنی پیدائش کے مقصد کو حاصل کرے خواہ اس کے لئے کتنی بھی قربانیاں ادا کرنی پڑیں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ انسان کو ہدایت اس طرح دی جاتی کہ وہ بھول نہ سکتا۔ اور ہمیشہ کے لئے اس کے پاس محفوظ رہتی۔ کیونکہ اسی پر اس کی تسبیح کی مقبولیت کا انحصار ہے چنانچہ اسی لئے ارشاد ہوتا ہے:۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہ بھولے گا۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ ہاں جو اللہ چاہتا ہے۔ بیشک وہ کھلی بات کو یا پکار کر پڑھنے کو بھی۔

يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝ جانتا ہے اور اُسے بھی جو مخفی ہے یا جو آہستہ پڑھا جاتا یا چھپا جاتا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ جس ہدایت پر انسان کی ترقی و کمال اور تسبیحِ الٰہی موقوف ہے ضروری تھا کہ اُسے انسان کو اس طرح پڑھایا جاتا کہ وہ اسے نہ بھولتا اسی لئے ارشاد ہوتا ہے۔ کہ ہم تجھے پڑھائیں گے تو تُو اسے نہ بھولے گا۔ چنانچہ خدا نے جب محمد رسول اللہ صلعم کو پڑھایا تو آپ کے دل و دماغ میں وہ ایسا محفوظ رہا کہ آپ اُسے کبھی نہ بھولے بعض کے نزدیک سنقرئك میں سَ اظہارِ تاکید کے لئے ہے تو معنے ہوں گے کہ یقیناً ہم تجھے پڑھاتے ہیں تو تُو نہیں بھولتا۔ دونوں معنوں کا مفہوم یہی ہے۔ کہ ہمارے پڑھانے کا نشان خصوصی یہ ہے۔ کہ تو وحی نازل شدہ کو کبھی نہیں بھولے گا۔ کیونکہ جس چیز کو خدا پڑھائے اُسے پڑھنے والا کیسے بھول سکتا ہے۔ آنحضرت صلعم بھی آخر ایک انسان تھے اور ہر انسان بھولتا بھی رہتا ہے اور یہ تقاضائے بشریت ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم دیگر امور میں بہ تقاضائے بشریت بھول بھی جاتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے پڑھانے کا نشان یہ تھا کہ جو کچھ آپ نے اللہ تعالیٰ سے پڑھا آپ اُسے کبھی نہ بھولے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ بحیثیت رسول ہونے کے آپ کو جو کچھ بھی وحی ہوتی تھی آپ اُسے کبھی بھولتے نہ تھے۔ آپ قرآن کے الفاظ کبھی نہیں بھولے آپ پر بیس بیس رکوع کی سورت اکٹھی ایک مرتبہ نازل ہوئی۔ اور ان سورتوں کے مضامین توحید و نبوت کے دلائل سے پُر ہونے کی وجہ سے نہایت دقیق ہیں۔ بایں ہمہ آپ کبھی ایک لفظ نہیں بھولے پھر ایک ایک سورت کا نزول کئی کئی سال تک ممتد رہا جب ایک آیت اُترتی تو حکمِ الٰہی کے ماتحت اُسے آپ کسی خاص جگہ کسی سورت میں لکھوا دیتے۔ اور دوسری آیت اترتی تو اُسے کسی دوسری سورت میں لکھوا دیتے۔ آپ خود نہ پڑھنا جانتے ہیں نہ لکھنا۔ نہ گھر میں کوئی پاکٹ بک ہے جس میں یادداشت

کے لئے نوٹ کرتے جاتے ہوں۔ ہمیشہ قرآن حافظہ سے زبانی پڑھتے ہیں لیکن جب بھی آپ قرآن پڑھتے ہیں خواہ کسی حالت میں پڑھتے ہوں نمازوں میں یا نماز سے باہر آپ کبھی ایک نقطہ کی غلطی نہیں کرتے۔ پھر ایک جگہ سے نہیں متفرق مقامات سے نمازوں میں قرآن پڑھتے رہتے ہیں لیکن نہ کسی سورت میں ایک حرف کی کمی بیشی وقوع میں آتی ہے نہ ترتیب میں کبھی ایک آیت بھی آگے پیچھے ہوتی ہے پھر تمام تشریحات دین جو قرآن کی ہی تفسیر تھی۔ اور جس کے پہنچانے کے لئے آپ مامور تھے لوگوں کو سکھاتے ہیں۔ اور شریعت کے ہزارہا مسائل آپ تعلیم فرماتے ہیں۔ لیکن چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ کو بھی آپ نہیں بھولتے کہ کبھی ایک طرح بتادیا ہو تو کبھی دوسری طرح۔ یہاں مصنفین کتابوں میں لکھ کر بھی بھول جاتے ہیں۔ مگر آپ کبھی نہیں بھولتے یہ خدا کے پڑھانے کا کھلا اور بین نشان ہے۔ اور ایک عظیم الشان معجزہ ہے جس کے آگے عقل انسانی حیرت سے سر جھکا دیتی ہے۔ کیونکہ واقعات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

الا ماشاء اللہ سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ آپ قرآن کا کوئی حصہ بھول بھی جاتے تھے۔ کیونکہ اس طرح عبارت بے معنی ہو جاتی ہے پھر عبارت یوں ہوگی کہ ہمارے پڑھائے ہوئے کو تم نہیں بھولتے مگر اس میں سے جو خدا چاہے تم بھول بھی جاتے ہو۔ کسی بات کو خدا جب بھلانا چاہتا ہے تو پڑھاتا ہی کیوں ہے۔ پس یہ معنے لغو اور غلط ہیں۔ الا یہاں استثنائے منقطع ہے مطلب یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پڑھاتا ہے اُسے تم نہیں بھول سکتے۔ اور یہ ایک نشان ہے۔ دوم تیری باتیں تم دوسرے انسانوں کی طرح بھول بھی جاتے ہو جو تقاضائے بشریت ہے۔ یہاں ماشاء اللہ یعنی جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے فرما کر بتلایا کہ آپ کا یہ تقاضائے بشریت بھولنا بھی الٰہی مشیت کے ماتحت ایک غرض اپنے اندر رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ بحیثیت رسول ہونے کے آپ جو کچھ خدا سے پڑھتے ہیں۔ قرآن ہو یا اس کی تشریحات یعنی مسائل شریعت ہوں اُس میں آپ کبھی نہیں بھولتے لیکن بحیثیت ایک بشر ہونے کے جب کبھی آپ بھولتے ہیں وہ ایک تقدیر ہوتی ہے جس کے اندر کوئی حکمت الٰہی مضمر ہوتی ہے ایک تو یہی کہ تا معاملات شریعت اور وحی میں آپ کا نہ بھولنا ایک معجزہ اور نشان ہو۔ کیونکہ اگر آپ کبھی بھی نہ بھولتے تو یہ خیال کیا جا سکتا تھا۔ کہ آپ کی دماغی بناوٹ ہی ایسی تھی کہ آپ بھول نہیں سکتے تھے۔ لیکن آپ کا تقدیری معاملات میں ایک بشر کی حیثیت سے بھولنا اور بحیثیت رسول کے شریعت و تبلیغ وحی و رسالت کے معاملہ میں کبھی نہ بھولنا بشریت اور خدائی تصرفات میں ایک بین فرق کو پیش کرتا ہے دوم بحیثیت ایک بشر کے بھولنا نوع انسان کے لئے نفع بخش تھا کیونکہ اس طرح انسانی فطرتی کمزوریوں کے لئے شریعت میں مراعات ملتی چلی گئیں۔ اسے میں ایک مثال کے ذریعہ واضح کرتا ہوں۔ مثلاً آپ نے نماز کی فرض رکعتوں کی تعداد بحکم خدا مقرر فرمائی اور اس میں آپ کبھی نہیں بھولے۔ ظہر کے فرضوں کی چار رکعت کی بجائے کبھی کسی کو تین رکعت نہیں بتایا یہ تو تھی رسالت۔ لیکن اب بشریت ملاحظہ ہو نماز پڑھتے ہوئے آپ کو سہو ہوا اور چار کے بجائے دو رکعتیں پڑھیں صحابہ کے دریافت کرنے پر آپ نے دو رکعتیں اور پڑھیں اور سجدہ سہو ادا کیا اب اگر یہ تقاضۂ بشری آپ سے سرزد نہ ہوتا اور بھول نہ ہوتی تو امت کے لئے بڑی مشکل تھی۔ انسانوں نے بھولنا تھا اور اس کیلئے کوئی علاج ضروری تھا اس لئے مشیت الٰہی کے ماتحت آپ سے تقاضۂ بشریت سرزد ہوتا ہے اور اُس کے مطابق شریعت میں علاج مہیا کیا جاتا ہے پس یہاں یہ بتلایا ہے۔ کہ آپ کو جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ پڑھائے گا۔ اُسے آپ تعلیم دیتے ہوئے یا اپنے عمل سے نمونہ پیش کرتے ہوئے کبھی بھی نہیں

بھولیں گے جس طرح آپ کو قرآن کے الفاظ یاد تھے اسی طرح اس کی تعلیم بھی ہر وقت یاد تھی۔ اور آپ کا عمل بھی اسی طرح ہر وقت قرآن کے مطابق تھا اور تشریحات بھی۔ جب کبھی بہ تقاضۂ بشریت آپ بھولتے بھی تھے۔ تو قرآن و شریعت یعنی تبلیغ وحی و رسالت کے معاملہ میں ہرگز نہیں بلکہ ان معاملات میں جن میں آپ دوسرے انسانوں کے ساتھ اشتراک رکھتے تھے۔ اور یہ بھولنا بھی بجائے خود ایک تقدیر الٰہی تھی جس میں بشریت کو رسالت سے الگ کر کے دکھانا اور شریعت میں انسان کی فطری کمزوریوں کا علاج مہیا کرنا مدنظر تھا تاکہ انسان کی ترقی ایمان کے لئے دلیل قاطع اور سہولت اعمال کے لئے راہیں پیدا ہوں

انہ یعلم الجہر وما یخفی میں دو لطائف کی طرف اشارہ ہے ایک تو یہی کہ خدا نے جو یہ نشان قائم کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم جو کچھ خدا سے پڑھتے ہیں اُسے کبھی نہیں بھولتے وہ دو قسم وحی پر مشتمل ہے۔ جہر پر بھی اور خفی پر بھی۔ جہر تو ہوئی وحی متلو یعنی قرآن جسے آپ پڑھ کر سُنا دیتے تھے اور خفی ہوئی وحی غیر متلو جس کا تعلق آپ کے قلب سے خفی طور پر تھا اور جس کے ماتحت آپ قرآن کی تشریحات کرتے اور خود بھی عمل فرمایا کرتے تھے۔ دو قسم کی وحی کا پڑھانے والا خدا تھا۔ اور اس کے منجانب اللہ ہونے کا نشان یہ قائم کیا تھا کہ آپ خدا کی تعلیم کردہ وحی کو بھولتے نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر وحی جہر کو نہ بھولنا اس کے منجانب اللہ ہونے کا ایک نشان تھا۔ تو تشریحات شریعت میں علمی و عملی طور پر بھی کبھی نہ بھولنا اس بات پر دلیل ہونا چاہیئے۔ کہ یہ چیزیں بھی آپ کو اللہ تعالیٰ ہی پڑھاتا تھا جسے وحی خفی کہتے ہیں پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا جو جہری طور پر پڑھنے کو یعنی قرآن کی وحی کا بھی علم رکھتا ہے۔ اور جو مخفی طور پر پڑھنے کو یعنی وحی خفی کا بھی جس کے ماتحت تمام تشریحات شریعت ہوا کرتی ہیں علم رکھتا ہے وہ اپنے علم کی بنا پر یہ شہادت دیتا ہے کہ خدا کا پڑھایا ہوا محمد رسول اللہ صلعم کبھی نہیں بھولتے پس یہ ہدایت محفوظ ہے اور انسان کے لئے قابل عمل اور قابل تقلید ہے دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ انسان کی اُن تمام ضروریات کو جو وہ ظاہر کرتا ہے یا اس کے اندر مخفی ہیں۔ اور اُسے اُن کا پتہ بھی نہیں۔ اُن سب کی ضروریات کے مطابق ہدایت دینا اور اس کا تعلیم کرنا خدا کا ہی کام ہو سکتا تھا۔ جو خالق فطرت اور انسان کے ہر ایک ظاہر اور مخفی قوٰی اور استعداد کو جانتا اور ان کے تزکیہ اور نشوونما کے لئے راہیں بتا سکتا ہے۔ اس لئے ضرور تھا کہ خدا خود محمد رسول اللہ صلعم کو انسان کی ہدایت کے لئے تعلیم دیتا اور ایسی تعلیم دیتا جس میں سے غلطی اور بھول کا ہر ایک امکان خارج کر دیا جاتا۔ ورنہ انسان اپنے ناقص علم سے ان تمام ضروریات کو نہ سمجھ سکتا تھا نہ ان کے لئے ہدایت کے واسطے صحیح راہیں تجویز کر سکتا تھا۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝ اور ہم یسریٰ کی طرف تمہیں چلا دیں گے۔

یسریٰ عمل خیر کو کہتے ہیں کیونکہ اس کا نتیجہ سہولت ہے۔ یعنی تم جو خدا سے تعلیم حاصل کر کے لوگوں کی ہدایت جیسے عمل خیر کے لئے کوشاں ہو ہم اس میں تمہاری مدد کریں گے۔ اور تمہارے لئے سہولتیں مہیا کر دیں گے اور جو رستہ میں مشکلات ہوں گی وہ اٹھا دیں گے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کوئی عمل خیر ہو اور انسان اُسے کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے سہولتیں مہیا فرور کرتا ہے اور اس کی مدد کرتا ہے اور اگر مشکلات اس کے رستہ میں پیدا ہوں تو انہیں ضرور دور کر دیتا ہے یہ تمام اہل حال اور صاحب ذوق

لوگوں کا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ انسان خود ہی اپنی غفلت اور نالائقی سے نیکی کی طرف توجہ نہ کرے یہ اس کی بدبختی ہے ورنہ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو خدا کی طرف بالشت بھر بڑھتا ہے خدا اس کی طرف گزوں آگے بڑھتا ہے جو خدا کی طرف چل کر آتا ہے خدا اس کی طرف دوڑ کر آتا ہے۔ بندہ نیت کے اخلاص کے ساتھ عمل خیر کے لئے قدم اٹھائے سہی پھر جناب باری خود مدد دیتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے۔

فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ ۝ پس نصیحت کرتا رہ نصیحت یقیناً نفع دیتی ہے۔

ہدایت دینے کے لئے کوئی زبردستی تو کرنی ہی نہیں، سمجھانا ہی ہے۔ پس انسان تھکے نہیں اور مایوس نہ ہو۔ اپنا فرض تبلیغ ادا کئے جائے

سَيَذَّكَّرُ مَن يَخْشَىٰ ۝ وہ نصیحت حاصل کرے گا جو ڈرتا ہے۔

یعنی جسے خدا کا ڈر ہے اور اس کے حضور میں بازپرس اور اعمال کی ذمہ داری کا خیال ہے وہ تو ضرور اس نصیحت سے فائدہ اٹھائے گا۔

وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۝ اور جو بدبخت ہے وہ اس سے گریز ہی کرتا رہے گا۔

شقی اور سعید اعمال کے نتائج کے لحاظ سے تقسیم ہے یہ پیدائشی تقسیم نہیں یعنی خدا نے کسی کو ازل سے ہی دوزخی اور جنتی یا شقی اور سعید نہیں بنایا۔ لوگ اپنے اعمال کے لحاظ سے دوزخی اور جنتی بنتے ہیں جو دوزخی ہے وہ شقی یا بدبخت ہے۔ اور جو جنتی ہے وہ سعید یا خوش قسمت ہے۔ غرضکہ شقاوت و سعادت اعمال کے نتائج ہیں۔ یہاں بھی یہی ہے کہ بدبخت نصیحت سے بھاگتا ہے یعنی قرآن جیسی اعلیٰ تعلیم سے بھاگنے والے سے بڑھ کر اور کون بدقسمت ہو سکتا ہے۔ یہ شقاوت نتیجہ ہوتی ہے انسان کے اپنے اعمال بد کا اور خدا کی بازپرس سے نہ ڈرنے کا۔ من یخشیٰ کے مقابل میں اشقیٰ لا کر واضح کر دیا کہ جو خدا سے ڈرتا ہے اور قرآن کی نصیحت کو پلے باندھتا ہے وہ خوش قسمت ہے۔ اور جو خدا سے نہیں ڈرتا اور اس نصیحت سے بھاگتا ہے وہ شقی یعنی بدقسمت ہے حدیث شریف میں بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے استفسار پر فرشتے عرض کرتے ہیں۔ کہ فلاں مقام پر ایک مجلس تھی۔ جس میں تیرا ذکر ہو رہا تھا وہاں ایک شقی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لا یشقیٰ جلیسھم۔ کہ اس مجلس میں بیٹھنے والا شقی نہیں ہوا کرتا یعنی جو اس مجلس میں بیٹھا ہے وہ شقی کیسے ہو سکتا ہے۔ شقی تو اسے کہنا چاہئے جو اس مجلس سے گریز کرتا ہے۔

الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَىٰ ۝ یہ بدبخت وہ ہے جو بڑی آگ میں داخل ہوگا۔

یعنی ایسے شخص کو جو بدبخت کہا تو اس لحاظ سے کہا کہ اس کا انجام کیسا بد ہے کیونکہ وہ ایک آگ میں داخل ہوگا اور وہ

بہت بڑی آگ ہے دنیا میں مختلف قسم کی آگ ہیں اور اپنی حرارت اور سوزش کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں انسان کی خواہشات اور جذبات کی آگ جو دوزخ کے رنگ میں انسان کو ملتی ہے اس سے بڑی آگ اور کوئی نہیں۔ دنیا میں اس کا احساس بہت کم ہے۔ آخرت میں اس کا پورا پورا احساس ہوگا۔

ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۝ پھر وہ نہ اس میں مرے گا نہ جئے گا۔

جہنم کے عذاب کی تکلیف کا اظہار اس سے بہتر طریق پر نہیں ہو سکتا۔ یعنی نہ موت ہی آئے گی کہ عذاب ختم ہو اور نہ وہ زندگی ایسی ہوگی کہ جسے زندگی کہا جا سکے۔ گویا وہ ایسی دکھ کی زندگی ہوگی کہ موت اس سے بہتر ہوگی۔ مگر نہ موت ہی آئے گی اور نہ یہ زندگی زندگی کہلانے کی مستحق ہوگی جس کی تمنا کی جا سکے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ ۝ بیشک فلاح پا گیا وہ جو اپنا تزکیہ کرتا ہے۔

یعنی دین و دنیا کی کامیابی اور نجات منحصر ہے۔ انسان کے پاکیزگی اختیار کرنے پر جس سے اس کے قوائے باطنی نشوونما پاتے ہیں۔ اور یہ پاکیزگی جس طریق پر حاصل ہوتی ہے وہ تسبیح ہے جس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۝ اور اپنے رب کے نام کو یاد رکھتا ہے پھر نماز پڑھتا ہے۔

اپنے رب کے نام کو یاد کرنے کی ترکیب شروع سورت میں ہی بتا دی تھی کہ اپنے رب کے نام کی تسبیح کر جو اعلیٰ ہے۔ پس جو اپنے رب کے نام کی تسبیح قولی اور عملی دو نو رنگ میں کرتا ہے اور اپنے پیدائش کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کی عطا کردہ ہدایات پر عمل کرتا ہے۔ تو روز بروز اس کا قدم پاکیزگی کی طرف بڑھتا ہے۔ اور جیسے جیسے وہ خدا کی سبحانیت یعنی پاکیزگی و کمال کا اظہار اپنے اقوال و اعمال سے کرتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے خدا بھی جو اس کا رب ہے اُسے پاکیزگی اور کمال عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ گویا خدا کی تسبیح کا نتیجہ انسان کا اپنا تزکیہ ہے اور خدا کی صفت اعلیٰ کے ساتھ تسبیح انسان کو تزکیہ کے ساتھ علو مرتبت تک پہنچا کر چھوڑتی ہے۔ لیکن انسان کمزور ہے۔ اُسے اپنے مقصد پیدائش کے حصول کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ خدا سے مدد طلب کرے اس کے لئے ضرورت ہے نماز کی۔ کہ وہ خدا کے حضور میں جھکے اور دعائیں کرے اور صراط مستقیم پر ہدایت طلب کرے۔ اسی لئے سورہ فاتحہ مغز ہے تمام نماز کا۔ ایاك نعبد وایاك نستعین اهدنا الصراط المستقیم میں اسی ہدایت پر چلنے کے لئے مدد چاہی ہے جس پر چل کر انسان اپنے مقصد پیدائش کو حاصل کر لیتا ہے۔ اور خدا کی تسبیح کرنے کا حق ادا کرتا ہے۔ چنانچہ اسی لئے سجدہ میں گر کر جو نماز میں انتہائی تذلل و عبودیت کا نشان ہے۔ اُسی تسبیح کا بندہ ذکر کرتا ہے۔ جس کا حکم اس سورت میں ہے۔ اور وہ ہے۔ سبحان ربی الاعلیٰ۔ گویا وہ انتہائی عجز و تذلل کے ساتھ زبان اور دل سے تسبیح کرتا ہوا جناب الٰہی سے عملی تسبیح کی تکمیل کا خواستگار ہوتا ہے جس کے لئے اس نے سورۂ فاتحہ کے اندر درخواست کی تھی۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ حالانکہ آخرت دنیا سے کہیں زیادہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

یہاں اصل مرض کا ذکر کیا کہ ساری شقاوت اور خدا کی ہدایت کی طرف سے بے پروائی کی اصل وجہ دنیا اور اس کی خواہشات کو مقدم کرنا ہے حالانکہ ہر ایک عقلمند سمجھتا ہے۔ کہ دنیا کا ہر ایک عیش اور راحت محدود اور فانی ہے۔ پس اس فانی اور محدود چیز کے واسطے آخرت کو چھوڑنا جو دائمی اور بہت بہتر ہے پرلے درجہ کی حماقت اور بدبختی ہے۔ اس زمانہ کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب نے آج دنیا کے مرض کی کیسی صحیح تشخیص اور کیسا درست علاج تجویز کیا۔ جو اپنی بیعت میں "دین کو دنیا پر مقدم" کرنے کی شرط خاص طور پر رکھی۔ جو قوم خدا کی تسبیح کے لئے دنیا میں اٹھے گی ضرور ہے کہ وہ دین کو دنیا پر مقدم کرے۔

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ بے شک یہ پہلے صحیفوں میں ہے۔

صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝ ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔ ع ۱ ۱۹ ۱۲

یعنی یہی تعلیم تمام انبیاء کے صحیفوں میں دی گئی تھی کہ قد افلح من تزکی۔ یعنی تزکیہ کے ساتھ ہی انسان فلاح کو حاصل کر سکتا ہے۔ اور تزکیہ خدا کی تسبیح کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر تمام انبیاء کی تعلیم ہمیشہ سے یہی رہی ہے اور یہ تمام نبیوں کی متفق علیہ تعلیم ہے۔ کہ انسان اپنی نظر کو دنیا کی زندگی تک ہی محدود نہ رکھے۔ بلکہ اس زندگی کا جو مقصد ہے یعنی آخرت کو مدنظر رکھے جہاں وہ ایک نئی زندگی کو حاصل کرے گا جس میں فلاح پانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنا تزکیہ اور اپنے خالق کی تسبیح قول اور فعل دونوں طریق پر کرے

حضرت ابراہیم اور حضرت موسےٰ کا خاص طور پر اس لئے ذکر کیا کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل قوم کے مسلّم نبی اور مقتدا اور حضرت ابراہیم علیہما السلام بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں کے بزرگ تھے۔ اس لئے جو قومیں اس وقت پہلی مخاطب تھیں ان کے لئے ان دونوں بزرگ نبیوں کی تعلیم کا خاص طور پر نام لینا ایک خاص اثر رکھتا تھا۔ لیکن بات کو انہی دو نو میں محدود نہیں رکھا بلکہ کل صحف اولیٰ کی یہی تعلیم بتا کر تمام دنیا کی قوموں پر حجت تمام کی ہے۔ کہ ساری دنیا کے مسلّم راستبازوں کی متفقہ شہادت اور تعلیم کو رد کر دینا کسی عقلمند کا کام نہیں ہو سکتا۔

سورۃ الغاشیۃ مکیۃ	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝	وھی ست و عشرون اٰیۃ

سورۃ الغاشیہ کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا اور اوپر کی سورت الاعلیٰ اور اس سورت الغاشیہ کا آپس میں اس قدر شدید تعلق اور اُن کے مضامین اتنے اہم ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلعم ان دونو سورتوں کو اکثر نماز جمعہ میں اور بعض دفعہ عیدین کی نماز میں بھی پڑھا کرتے تھے۔ گویا ایک اجتماع کثیر کے وقت لوگوں میں ان کے مضامین کو ذہن نشین کرنا آپ کے زیر نظر تھا سورۃ الاعلیٰ میں خدا کی تسبیح کرنیکا حکم ہے اور بتلایا ہے کہ اس کی تکمیل اسی سورت میں ہو سکتی ہے۔ کہ انسان خدا کی بتائی ہوئی ہدایتوں پر عمل کرے اور اس طرح اپنے مقصد پیدائش کو پورا کرے اور اس سورت الغاشیہ میں یہ بتایا ہے کہ تمہارے اعمال حساب کے نیچے ہیں اپنے اعمال کو اس معیار ہدایت کے مطابق بجا لانے کی کوشش کرو جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی شکل میں تمہیں دیا ہے۔ حساب کے وقت تمہارے عمل اچھے اور الٰہی ہدایت کے مطابق ثابت ہوئے تو مقصد پیدائش پورا ہو گیا اور آخرت درست ہو گئی ورنہ بگڑ گئی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝ کیا تیرے پاس خبر آئی ہے ڈھانک لینے والی کی یعنی قیامت کی۔

قیامت کے مختلف نام قرآن کریم میں آئے ہیں۔ کہیں الساعۃ فرمایا کہیں القارعہ کہیں الحاقہ کہیں الطامۃ کہیں الصاخۃ کہیں الآخرۃ وغیرہ وغیرہ مختلف ناموں سے مختلف مقامات پر یاد فرمایا ہے۔ اور ہر جگہ جو نام دیا ہے وہ کسی خاص مفہوم اور حالت کو مدنظر رکھ کر اس موقعہ و مقام کے حسب حال دیا ہے یہاں الغاشیہ نام دیا ہے تو یہاں بھی مدنظر اُس کا وہ خاص مفہوم ہے جسے ذہن نشین کرنا یہاں مقصود خاطر ہے قیامت کو "ڈھانک لینے والی" یہاں کیوں کہا اس کے سمجھنے کے لئے اس اصول کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ قرآن کریم جس مطلب کو کسی سورت میں ذہن نشین کرنا چاہتا ہے اُسے شروع سورت میں بیان فرما کر اس پر مختلف رنگ کے دلائل دے کر اور ہر قسم کی توضیح و تشریح کر کے آخر اسی مطلب پر سورت کو لا کر ختم کرتا ہے۔ موسیقی جو دنیا میں سب سے بڑھ کر منظم چیز مانی جاتی ہے اس کی تنظیم کا بھی یہی رنگ ہے کہ ایک گانے والا جس راگ کو اٹھاتا ہے وہ پہلے اس راگ کی اصل سُروں سے گانا شروع کرتا ہے پھر اُسے اونچا اٹھاتا ہے اور اس کے سارے اتار چڑھاؤ دے کر آخر میں راگ کی اُنہی پہلی اصلی سُروں پر لا کر ختم کرتا ہے پس ترتیب و تنظیم کسی امر کی موسیقی سے بہتر نہیں ہو سکتی جس طرح ایک راگ سے ناواقف اسکی ترتیب و تنظیم کو نہیں سمجھتا اور گانیوالے کے اتار چڑھاؤ کو مختلف آوازوں کا ایک بے ترتیب مجموعہ سمجھ کر اس پر ہنستا ہے لیکن ایک راگ کا ماہر جو آواز کی اس ترتیب و تنظیم کو سمجھتا ہے اُس پر اُس کی روح وجد کر اٹھتی ہے اسی طرح قرآن کریم کی آیات کی لطیف ترتیب و تنظیم کو اپنی کمیٔ علم اور نقص فہم سے نہ سمجھنے والا ٹھوکر کھاتا اور اسے نعوذ باللہ بے ترتیب خیال کرتا ہے لیکن اس شخص کیلئے جو قرآن کا علم رکھتا ہے اور اسکی آیات کی باہمی ترتیب و تنظیم کا فہم رکھتا ہے قرآنی نظم و ترتیب موسیقی کے بہترین ترنم سے بھی بڑھ کر مکمل اور وجد آفرین ہے۔ الغرض سورۃ کا شروع اور آخر ایسا باہمی اتحاد رکھتا ہے کہ ایک دوسرے کی تشریح ہو جاتی ہے اس سورت کے شروع میں الغاشیہ کہہ کر جس چیز کی ہیبت دلائی ہے اُسے اس سورت کے آخر میں اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ فرما کر واضح کر دیا کہ یہ حساب ہوگا۔ جو قیامت کے دن سب پر چھا جائے گا

اور اس حساب سے کوئی نہ بچ سکے گا اور سچ تو یہ ہے کہ حساب دینے سے بڑھ کر کوئی مشکل اور مصیبت نہیں ہو سکتی سرکاری ملازمتوں میں مختلف محکموں میں جب مختلف آفیسر معائنہ کرنے آتے ہیں یا آڈیٹر آ کر محاسبہ کرتے ہیں تو اس وقت کی مشکلات کا اندازہ وہی لوگ کرتے ہیں جن پر یہ مصیبت بیتی ہے یہ تو سچ ہے کہ آنرا کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک است لیکن با ایں ہمہ کتنا ہی حق ہو محاسبہ اس قدر انسان کے دل دماغ پر چھایا رہتا ہے کہ اُن دنوں میں نیند آنی مشکل ہو جاتی ہے اور ابھی دنیا کے آڈیٹر سارا حساب نہیں پڑتال کرتے کہیں کہیں جگہ سے کوئی ایک دو صفحے دیکھ لیتے ہیں پھر اُن کا علم ناقص۔ اُن کو دھوکا بھی دیا جا سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا محاسبہ کس قدر شدید ہوگا جس سے کوئی عمل مخفی نہیں اور پھر ساری عمر کا حساب دینا ایک ایک عمل کا اور اُن کی نیتوں کا حساب دینا۔ دلوں کے مخفی بھیدوں کا حساب دینا۔ الامان۔ الحفیظ خدا ہی مغفرت اور رحم سے کام لے تو یہ بیل منڈھے چڑھتی ہے۔ ورنہ عاجز انسان کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اس سے بڑھ کر غاشیہ اور کوئی نہیں ہو سکتی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی نے بارہ برس کے بعد خواب میں دیکھا۔ دیکھا کہ نہائے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر فرمانے لگے کہ اب حساب سے فارغ ہوا ہوں پس حساب بڑی خطرناک چیز ہے فرماتے ہیں تو نے کیا سمجھا کہ غاشیہ کیا ہے جواب میں خود غاشیہ کے مفہوم کو بیان نہیں فرماتے بلکہ اس کے تاثرات اور نتائج کو سامنے لاتے ہیں جس سے کہ انسان خود سمجھ جائے کہ وہ کیا چیز ہے جو یہ نظارہ دکھائے گی۔ نظارہ کیسا پُر اثر ہے ملاحظہ ہو۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ کتنے ہی منہ اس روز ذلیل ہو رہے ہوں گے۔

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ محنت کرنے والے تھکے ماندے۔

یہ نقشہ بتلاتا ہے کہ جہنم بھی آخرت کا جیلخانہ ہے جو حالت مجرموں کی بیان فرمائی ہے اس کا نقشہ چھوٹے پیمانہ پر ہمیں دنیا کے جیلخانوں میں صاف نظر آتا ہے جیلخانہ میں قیدیوں کا سب سے پہلا نشان جو ہر ایک دیکھنے والے کو نظر آتا ہے وہ ذلت کا نشان ہے کتنا ہی معزز اور بڑا آدمی ہو جیلخانہ میں کسی جرم کی پاداش میں داخل ہوا اور ذلت اس کی پیشانی پر لکھی گئی۔ پھر وہاں صبح سے شام تک محنت کرائی جاتی ہے لیکن اس محنت کا پھل قیدی کو نہیں ملتا سوائے اس کے کہ وہ تھکا ماندہ ہو کر شام کو پڑ رہتا ہے۔ گویا محنت اور عمل کرتا ہے اور پھل سوائے تکان اور کوفت کے کچھ نہیں ملتا۔ حالانکہ وہی آدمی جب جیلخانہ سے باہر وہی کام کرتا تھا تو اپنی محنت کا ثمرہ پاتا تھا مثلاً ایک دری بننے والا۔ ایک مونج کوٹنے والا۔ ایک چکی پیسنے والی جب جیلخانے سے باہر اپنا کام کیا کرتے تھے تو اس محنت کا ثمرہ بھی پاتے تھے۔ اور اپنے عمل کے نتیجہ میں مزدوری اور نفع کے مالک ٹھیرتے تھے لیکن جیلخانہ میں وہی دری بننے والا صبح سے شام تک اپنی جان مارتا ہے مونج کوٹنے والا مونج کوٹ کوٹ کر شام تک مر رہتا ہے چکی پیسنے والی چکی پیس پیس کر فنا ہو جاتی ہے لیکن انہیں ان کا کوئی ثمرہ اور کوئی مزدوری نہیں ملتی سوائے تکان اور کوفت کے وہ کسی چیز کے وارث نہیں بنتے۔ اسی طرح آخرت میں جہنم کے جیلخانہ میں ذلت چہروں پر برستی ہوگی۔ اصلاحی رنگ میں سزا کے طور پر عمل اور محنت وہاں کرنی پڑے گی لیکن سوائے تکان اور کوفت کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ دنیا میں اگر یہی عمل اپنی مرضی سے کرتے تو آج اُس کا ثمر پاتے اور آخرت میں نفع

اٹھاتے لیکن آخرت کے جیلخانہ میں یہ عمل جبراً کرائے جائیں گے اور پھر وہ کچھ نفع نہ دیں گے البتہ کوفت اور تکان اس سے پیدا ہوگی اور موجب تکلیف ہوگی۔ سچ پوچھو تو آخرت عالمِ مثال ہے۔ انسان نے جو دنیا میں باطنی طور پر اپنی حالت بنائی تھی وہی ظاہر میں وہاں نظر آئے گی جنھوں نے اپنی خواہشات و جذبات کی قید میں اپنے آپ کو تمام عمر ڈالے رکھا اور اُن کے حکموں کے ماتحت عمل کئے وہی باطنی قید وہاں جیلخانہ کی شکل میں ظاہر میں نظر آئے گی۔ ان سفلی قیود کے ماتحت جو عمل کئے وہ اپنے نتیجہ میں کوئی نفع اور ثمر نہیں رکھتے تھے سوائے کوفت اور تکان کے۔ اسی لئے آخرت میں ان قیدیوں کو کسی نفع کی توقع رکھنی عبث ہے۔ ہاں تکان اور درماندگی کی تکلیف کا احساس وہاں ضرور ہوگا جو قیدی کے عملوں کا نتیجہ ہوا کرتا ہے اور خواہشات و جذبات کے قیدی کی ذلت تو اسکے چہرہ سے صاحب ذوق اور اہلِ نظر اس دنیا میں بھی پڑھ لیتے ہیں

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۙ جلتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

اور یہ سچ ہے جن خواہشات اور جذبات کی قید میں اپنے آپ کو دنیا میں ڈالے رکھا وہ خواہشات اور جذبات تو بجائے خود ایک باطنی آگ تھے۔ اب آخرت میں وہ جیلخانہ آگ کا نہ ہو تو اور کس چیز کا ہو۔ پس یہ آگ کا جیلخانہ تو دنیا سے ہی ساتھ جاتا ہے

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۭ کھولتے ہوئے چشمے سے اُنہیں پانی پلایا جائے گا۔

دنیا کی خواہشات و جذبات کو پورا کرنے کے لئے جو تگ و دو ہوتی ہے اس سے انسان کو کبھی ٹھنڈک اور طمانیت نصیب نہیں ہوتی۔ اور جس چیز کو بھی وہ اپنی طمانیت اور سکینت کے لئے حاصل کرنا چاہتا ہے اور اُسے دنیا کی پیاس بجھنے کا وہ ایک ذریعہ سمجھتا ہے وہ جب ملتی ہے تو بجائے سکینت اور ٹھنڈک پیدا کرنے کے گرم پانی کی طرح اس کی بے چینی اور کرب کو بڑھاتی ہے۔ تسکین دینے کے بجائے وہ دنیا طلبی کی آگ کو اور بھڑکاتی ہے یہی کھولتا پانی آخرت میں اُسے سامنے نظر آئے گا۔ جسے پینے سے نہ پیاس بجھتی ہے نہ ٹھنڈک اور تسکین حاصل ہوتی ہے۔

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۙ سوائے کانٹوں کے اُن کیلئے کوئی کھانا نہ ہوگا۔

لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۭ جو نہ موٹا کرتا ہے اور نہ بھوک کو تسکین دیتا ہے۔

غذا کے دو نفع ہوا کرتے ہیں۔ ایک تو وہ معدہ میں ہضم ہو کر جزو بدن بنتی ہے۔ اور انسان کے جسم کو نشو و نما دیتی ہے۔ دوم معدہ کو بھر کر بھوک کو تسکین بخشتی ہے۔ اگر کوئی کھانا ثقیل یا ادنیٰ قسم کا ہو اور وہ ہضم ہو کر جزو بدن نہ بن سکے یا اس کے اندر اعلیٰ غذائیت نہ ہو تو کم سے کم اس کا اثر اتنا تو ضرور ہوتا ہے کہ بھوک کی آگ کو تو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ آخرت میں جو مجرموں کو غذا ملے گی وہ کانٹوں کی طرح اس وقت کے انسانی وجود کو نشو و نما کے رنگ میں کوئی نفع نہ دیگی لیکن دنیا میں کانٹے اگر کوئی کھائے تو گو وہ ہضم نہ ہوں اور جزو بدن نہ بنیں مگر بھوک تو مٹ جاتی ہے فرمایا وہ آخرت کے کانٹے ایسے ہوں گے کہ نہ جسم کوئی نفع اٹھائے

نہ بھوک کو ہی تسکین ہو یہ بھی اسی دنیا طلبی کی بھوک کا نقشہ ہے۔ جو آخرت میں ظاہر طور پر محسوس ہوگی جو دنیا دار انسان رات دن دنیا طلبی میں لگا رہتا ہے اور جس قدر بھی دنیا حاصل کرتا ہے اس سے نہ تو اس کے باطنی وجود کی جس نے آخرت میں ظاہر ہونا ہے کوئی نشو و نما ہوتی ہے اور نہ اس کی دنیوی بھوک میں ہی کوئی کمی ہوتی ہے شیخ سعدی صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

چشم تنگ مرد دنیا دار را یا قناعت پُر کند یا خاک گور

پس جہنم کا جیلخانہ انسان کی اپنی ہی خواہشات وجذبات کے قیود کا ایک مرقع ہے۔ اور جہنم کی آگ انہی خواہشات وجذبات کی آگ کا ایک مظاہرہ ہے۔ وہاں کا کھولتا پانی اور کانٹے اسی دنیا طلبی کے نتائج ہیں جن سے فطرت کی پیاس کبھی نہیں بجھتی اور روح کو سکینت اور ٹھنڈک کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ اور جن سے نہ تو انسان کا دنیا کا پیٹ بھر کر دنیا طلبی کا خاتمہ ہوتا ہے اور نہ انسان کی روح کو وہ نشو و نما دے سکتا ہے جس سے آخرت میں ہی کچھ بھلا ہو۔ ایسے اعمال آخرت میں کوئی پھل نہیں رکھتے سوائے تکان اور کوفت کے جو ایک قیدی کی محنت کے لازم حال ہیں۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝ کتنے ہی منہ اس دن ہوں گے جو تر و تازہ بشاش ہوں گے۔

لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝ اور اپنی سعی اور کوشش کے نتیجہ سے راضی اور خوش ہوں گے۔

یہ وہ ہیں جو حساب میں پاس ہو گئے۔ فیل سے کھایا منہ اور ہنسا ئے بال چھپے نہیں رہتے۔ کامیاب طالب علموں کا چہرہ دیکھو کیسا خوش و خرم نظر آتا ہے کوئی بھی شخص ہو جب اپنی سعی میں کامیاب ہوتا ہے اور محنت کا پھل پاتا ہے تو اسکے چہرہ کی ترو تازگی اور خوشی و مسرت کوئی چھپی ڈھکی چیز نہیں رہتی ہر ایک اس کا نظارہ کرتا ہے چونکہ یہ لوگ دنیا میں خواہشات و جذبات کے قیدی نہ تھے۔ اس لئے ایک آزاد آدمی کی طرح اُن کے اعمال آخرت میں اپنا پھل لائیں گے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ نتیجہ اگر کامیابی اور حسب منشا ہو تو محنت کی تکان مسرت اور خوشی سے بدل جاتی ہے۔ وہ جس طرح دنیا میں خدا کو راضی رکھتے تھے آج خدا ان کو راضی کر دیگا وہ جیلخانہ میں نہیں اس جنت میں ہوں گے جسے وہ خدا کی مرضی کے ماتحت اپنے اعمال سے بنا کر ساتھ لائے مقرر ماتے ہیں۔

فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ وہ بلند جنت میں ہوں گے۔

جذبات و خواہشات کی آگ جنہیں دنیا میں انہوں نے رضائے الٰہی کے پانی اور اپنے اعمال کے بیجوں سے باغ و بہار بنا دیا تھا آج وہ جنت کی شکل میں نظر آئیں گے اور جنت بھی بلند و بالا جو ان کی ترقی اور علو مرتبت کا نشان ہوگا مولانا روم اپنی مثنوی میں ایک حدیث کو نظم کرتے ہیں اور ہمیں بتلاتے ہیں کہ جنتی جب جنت کے دروازہ پر پہنچیں گے تو وہ ملائکہ سے دریافت کرینگے کہ ہم نے تو سنا تھا کہ ہمارا گذر جہنم پر سے ہوگا مگر ہمیں تو رستہ میں کوئی جہنم نظر نہیں آیا تو ملائکہ کہیں گے کہ رستہ میں تم نے کچھ باغ دیکھے تھے وہ کہیں گے ہاں چار باغ نظر آئے تھے تو ملائکہ کہیں گے کہ وہی جہنم تھا تم نے چونکہ دنیا میں اپنی خواہشات و جذبات کی

آگ کو باغ میں تبدیل کر لیا تھا۔ اس لئے وہ جہنمیوں کے لئے تو آگ ہے مگر تمہارے لئے باغ ہے" پھر مولانا روم صاحب چار باغ کی تشریح میں بتاتے ہیں کہ وہ چار باغ انسان کے چار جذبات کو قابو کرنے کا نتیجہ ہیں (۱) حرص و طمع (۲) شہوت (۳) غضب (۴) حسد

لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ۝ وہاں کوئی لغو بات اُن کے کان میں نہیں پڑے گی۔

ایک چیز تو نقصان دہ ہوتی ہے اور ایک چیز نفع بخش ہوتی ہے مگر ایک چیز ایسی ہوتی ہے جو اگر نقصان نہیں دیتی تو نفع بھی نہیں دیتی اسے لغو کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے والذین ھم عن اللغو معرضون فرما کر مومن کے لئے فلاح اس میں رکھی ہے کہ وہ اس چیز سے بھی پرہیز کرتا ہے جو نفع نہیں دیتی۔ گویا نقصان رساں چیزوں سے بچنا تو سب ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن مومن اس چیز سے بھی بچتا ہے جو نفع رساں نہیں ہے گویا اس کا ہر لمحہ مفید کاموں میں صرف ہوتا ہے پس جنہوں نے دنیا میں لغو سے پرہیز کیا جنت میں بھی وہاں لغو چیزوں سے الگ رہیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو سوسائٹی جنت میں ہوگی وہ کس قدر اعلیٰ تہذیب و اخلاق رکھتی ہوگی کہ لغویات کا وہاں ذکر اذکار تک نہ ہوگا اور انسان نفع ہی نفع کا وارث ہوگا۔

فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝ اُس میں چشمہ بہتا ہوگا۔

پانی کا یہ چشمہ وہ زندگی کا پانی ہے جو قوانین حقہ کی شکل میں اعمال کی آبیاری کرتا ہے اور اپنے اندر وہ ٹھنڈک اور طمانیت رکھتا ہے جس سے مومن کی روح نفس مطمئنہ کے مقام عالی کو پا کر ابدی راحت کی وارث ہوتی ہے اور ایک نئی جنتی زندگی کو حاصل کرتی ہے

فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ۝ وَّأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ۝ اس میں اونچے تخت ہوں گے اور آبخورے رکھے ہوں گے۔

وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ۝ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ۝ اور گاؤ تکیے قطاروں میں لگے ہوئے ہونگے اور خوبصورت فرش بچھائے ہوئے ہونگے

یہ عزت افزائی کا نظارہ ہے جو جناب الٰہی کی طرف سے جنتیوں کو نصیب ہوگی کیسی دربار یا محفل میں جن لوگوں کو بلند تخت پر بٹھایا جاتا ہے وہ ان کی عزت کا نشان ہوتا ہے جس کا بادشاہ یا میزبان کی طرف سے اس طرح برسر محفل اظہار کیا جاتا ہے اور پانی اور شربت کے گلاس اور آبخورے اور ہر قسم اکل و شرب کے لوازمات اس محبت کا نشان ہوتا ہے جو بادشاہ یا میزبان کو اپنے مہمانوں سے ہوتی ہے اور گاؤ تکیے وغیرہ اس راحت کا نشان ہوتا ہے جو بادشاہ یا میزبان اپنے مہمانوں کیلئے مہیا کرنا چاہتا ہے۔ اور فرش فروش اس اظہار مسرت کا نشان ہوتا ہے جو بادشاہ یا میزبان کو اپنے مہمانوں کے آنے سے ہوتی ہے۔ یہاں چاروں باتیں جمع کر دی ہیں۔ جو جنتیوں کو اپنے اخلاق فاضلہ کے عوض میں بطور انعام عطا ہوں گی۔

(۱) بلند تخت۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے دربار میں اُن کی عزت ہوگی

(۲) آبخورے۔ یعنی جناب الٰہی کو اُن سے محبت ہوگی

(۳) گاؤ تکیے۔ جناب الٰہی ان کی ہر قسم کی راحت کا سامان مہیا فرما دیں گے

(۴) فرض. جناب الٰہی اُن پر اظہار خوشنودی و مسرت فرما دیں گے۔

یہ چار انعام دراصل اُن چار اعلیٰ اصولوں کے بالمقابل ہیں جن پر جنتی دنیا میں عامل رہے اور وہی اصل دین فطرت ہیں جس کا نام اسلام ہے۔ وہ چاروں کیا ہیں جو اصل دین فطرت ہیں انہیں صحیفۂ فطرت سے ہی اگلی چار آیتوں میں دکھایا ہے فرماتے ہیں

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وقف تو کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کئے گئے ہیں۔

وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وقف اور آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسا اونچا کیا گیا ہے۔

وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وقف اور پہاڑ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے کھڑے کئے گئے ہیں۔

وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝ اور زمین کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسی بچھائی گئی ہے۔

شریعت اسلام دو حصوں پر منقسم ہے (۱) ایک تو شفقت علیٰ خلق اللہ یعنی خدا کی مخلوق سے شفقت اور ہمدردی اور اس کے لئے ایثار (۲) دوم تعظیم لامر اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی ایسی کامل فرمانبرداری اور اس سے ایسا تعلق شدید ہو کہ اس کے لئے وہ تمام ماسوی اللہ سے منقطع ہو سکے۔

اسی طرح تقدیر الٰہی بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔

(۱) ایک تو دُکھ اور (۲) دوسرے سُکھ جو انسان کو وقتاً فوقتاً پہنچتے رہتے ہیں۔

اب ان چاروں آیتوں میں علی الترتیب پہلی دو آیتوں میں شریعت کے دو نو اصول اور دوسری دو آیتوں میں تقدیر کی دونوں حالتیں صحیفۂ فطرت سے دکھائی ہیں اور دین فطرت کو اس طرح انسان کے ذہن نشین کرنا چاہا ہے اور انسان کو ہدایت دی ہے کہ وہ دین کے ان چاروں امور کے لئے ان چار نظائر قدرت سے سبق لے اور جب تک یہی چاروں باتیں اسی رنگ میں اپنے اندر نہ پیدا کریگا وہ دین کا کامل پیرو نہیں کہلا سکتا مذہب فطرت کو سمجھانے کا یہ طریق ایسا مؤثر ہے کہ بڑے سے بڑا فلسفی اور بیابان و جنگل کا ایک وحشی عرب یکساں اس سے نفع اٹھا سکتا ہے ذرا تصور میں ایک نقشہ جماؤ عرب کا ایک ریگستان ہے جو جہاں تک نظر پڑتی ہے پھیلا ہوا ہے اور ایک طرف بڑے عظیم الشان خشک پہاڑوں کا سلسلہ ہے اس خشک تنگ وادی میں ایک جنگلی عرب کھڑا ہے اونٹ سے ابھی اترا ہے وہ تمام دنیا سے منقطع ہے کوئی مخلوق چرند پرند انسان درخت سبزہ اس کے سامنے نہیں صرف چند چیزیں اسے نظر آتی ہیں یا تو اپنا اونٹ جو پاس کھڑا ہے یا آسمان جو سر پر نظر آرہا ہے یا وہ خشک عظیم الشان پہاڑ جو ایک پہلو پر نظر آرہا ہے یا پھر وہ ریگستان جو جہاں تک نظر جاتی ہے پھیلا ہوا ہے۔ وہاں قرآن اُسے اس کا دین سکھاتا ہے اور فطرت کی کتاب سے اسے مذہب فطرت پڑھاتا ہے فرماتا ہے کہ اے انسان دین فطرت یعنی اسلام کا پہلا اصول شفقت علیٰ خلق اللہ ہے جسے اس اونٹ سے سیکھ لے اس کی جفاکشی اور ایثار کو دیکھ کس طرح یہ دوسروں کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ اور اس بوجھ کو اٹھا کر شب و روز

چلتا ہے اور نہیں تھکتا۔ اُنکے بوجھ کو لیکر اُن بیابانوں میں سے گذرتا ہے جہاں سے کسی جانور اور انسان کا گذر محال ہے جن کا یہ بوجھ اٹھاتا ہے وہ نعمتیں کھاتے ہیں اور یہ کانٹے کھا کر گذارہ کر لیتا ہے وہ پانی پیتے ہیں اور یہ کئی کئی دن بلکہ کئی کئی ہفتے پانی نہیں پیتا بلکہ جب اس کے ساتھیوں کو جن کا یہ بوجھ اٹھا رہا ہے کچھ کھانے کو اور پانی پینے کو نہیں ملتا تو وہ اسے ذبح کر ڈالتے ہیں اور اس کا گوشت کھاتے اور اس کے اندر جو پانی کی ایک مشک خدا نے پیدا کر دی ہے اس میں سے پانی لیکر پیتے ہیں اور اس طرح اپنی جان بچاتے ہیں کیا اس جانور سے بڑھ کر خاموش ایثار اور جفاکشی کا نمونہ کہیں نظر آتا ہے۔ پھر کس طرح سینکڑوں اونٹ ایک قطار میں خاموش، ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کے بغیر منزلیں طے کرتے ہیں۔ پس شفقت علیٰ خلق اللہ جو دین فطرت یعنی اسلام کا پہلا اصول ہے اُسے سیکھنا ہے۔ تو اونٹ سے سیکھ لے جو تیرے پاس کھڑا ہے۔ تو دوسروں کا بوجھ اٹھا اور ان مشکلات اور مصائب میں لوگوں کا بوجھ اٹھا جہاں اور کسی کی ہمت نہ پڑتی ہو تو اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر لوگوں کو آرام پہنچا اور کبھی نہ تھک۔ آپ بھوکے رہ کر لوگوں کا پیٹ بھر اور اگر لوگوں کی خیر خواہی اور بہبودی کے لئے جان دینے کی بھی ضرورت ہو تو دریغ نہ کر۔ اجتماعی کاموں میں اونٹوں کی طرح خاموشی اور متانت، ہمدردی اور اتحاد کے ساتھ شمولیت کر الغرض دین فطرت کا نصف تو اس اونٹ سے سیکھ لے (۲) دوسرا نصف یعنی تعلق باللہ اور تعظیم لامر اللہ سیکھنے کیلئے آسمان کی طرف نظر کر اور دیکھ کہ کیسا اونچا بنایا گیا ہے پس اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری میں اور اس کے ساتھ تعلق پیدا کرنے میں یعنی انقطاع الی اللہ میں وہ کمال حاصل کر کہ آسمان بن جا جو زمین اور اس کے لوازمات سے کس قدر بلند ہے پس تیرا بھی انقطاع الی اللہ اسی رنگ کا ہونا چاہیئے کہ تو تمام سفلی جذبات اور دنیوی خواہشات سے آسمان کی طرح بلند ہو جائے اور زمینی سے آسمانی بن جائے جس میں دُنیا کی ملونی ہوتی ہے۔ اس کی توحید اور تعلق باللہ کامل نہیں ہوتے شریعت کو یوں کامل کرنے کے بعد اب تقدیر کی دونوں حالتوں کو لیتے ہیں (۱) فرمایا دکھ اور مشکلات کا سامنا ہو تو اس پہاڑ کی طرح مستقل مزاج رہ کر اس کا مقابلہ کر۔ مصائب اور آفات کی موجیں اور ہوائیں جتنا بھی چاہیں تجھ پر حملہ کریں۔ لیکن تو پہاڑ کی طرح اٹل ہو اور اپنی جگہ اور اپنے اصولوں سے متزلزل نہ ہو غرضکہ دکھ میں صبر اور استقامت کا نمونہ پہاڑ سے سیکھ لے (۲) اور اگر سکھ اور عیش اور دولت کی حالت پیدا ہو تو زمین کی طرح بچھ جا۔ اور بجائے تکبر اور بخل کے چاہیئے کہ تجھ میں فروتنی اور انکسار اور حلم اور تواضع اور فیاضی اور وسعت زمین کی طرح پیدا ہو جائے جو جہاں تک نظر ڈالو بچھی ہوئی ہے اور اگرچہ دوست دشمن کے قدموں سے رات دن پامال ہوتی رہتی ہے لیکن باایںہمہ اُس کا فیض عام ہے۔ امیر ہو یا غریب دوست ہو یا دشمن سب اُس کے سینوں پر آرام پاتے ہیں۔ اُس کے غلے اجناس پھل سبزی، پانی ہوا ہر چیز سے نفع اٹھاتے ہیں پس سکھ اور غلبہ کی حالت میں شکر کا نمونہ زمین سے سیکھ لے تیری فروتنی اور خاکساری حلم اور تواضع فیاضی اور بے نفسی ایسی ہو جس کا نظارہ زمین میں نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ دین فطرت ختم ہو گیا اور ایک بدو کو بیابان میں کھڑے کھڑے سارا دین پڑھا دیا (۱) شفقت علیٰ خلق اللہ سیکھنے کیلئے اونٹ پر نظر ڈال (۲) تعظیم لامر اللہ و تعلق باللہ سیکھنے کے لئے آسمان کا نظارہ کر (۳) دُکھ میں صبر و استقامت سیکھنے کے لئے پہاڑ پر نگاہ کر (۴) سکھ اور فراوانی میں شکر اور فروتنی اور تواضع اور فیاضی کا نمونہ دیکھنا ہو تو زمین پر نظر ڈال یہی دین فطرت ہے جو قرآن سکھانا چاہتا ہے اس کا ہی نام اس نے اسلام رکھا ہے انہی چار اصولوں پر عمل کرنے والا سچا مسلم ہے جس کے لئے جنت کا وہ انعام ہے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے (۱) جس نے دنیا میں مخلوق کی ہمدردی اور خدمت کیلئے جفاکشی اور ایثار سے کام لیا وہ خدا کے حضور میں عزت کے بلند تخت پر بٹھایا جائیگا دنیا بھی ایسے لوگوں کی عزت کرتی اور آنکھوں پر بٹھاتی ہے تو آخرت

میں یہ کیوں مدعزت کے بلند تخت پر بٹھائے جائیں گے (۲) جنہوں نے خدا سے تعلق جوڑا اور اسکی فرمانبرداری و محبت میں انقطاع الی اللہ کا ایسا کامل نمونہ دکھایا کہ جذبات سفلی و خواہشات نفسانی سے بلند ہو کر آسمانی بن گئے۔ خدا بھی قیامت کے دن ان سے اظہار محبت کریگا جس کا اظہار محبت کے جاموں اور آبخوروں کی صورت میں ہو گا۔ جیسا کہ میں اُوپر ذکر کر آیا ہوں (۳) جنہوں نے دکھ میں خدا پر بھروسہ رکھا اور اپنے سچے اصولوں پر قائم رہے اور صبر و استقامت کا نمونہ دکھایا۔ دنیا میں یہ خدا پر بھروسہ اور اس پر سہارا آخرت میں گاؤ تکیوں کی شکل میں متشکل ہو گا۔ اور خدا کیلئے جو دکھ اٹھائے تھے۔ اسکے بدلہ میں خدا ان کے سکھ اور راحت کے سامان کریگا (۴) دُنیا کے سکھ اور فراوانی میں جنہوں نے نعمت الٰہی کا شکر کیا اور فروتنی اور خاکساری اور فیاضی و وسعت سے کام لیا۔ اور خدا کی مخلوق کے لئے فرش کی طرح بچھ گئے آخرت میں اُن کے لئے جناب الٰہی کی طرف سے اظہار خوشنودی و مسرت کے طور پر اعلیٰ درجہ کے فرش بچھائے جائیں گے۔ غرضکہ یہی چاروں اصول جن پر دین کی بنا قائم ہے آخرت میں چاروں مذکورہ بالا انعامات کی شکل میں مومن کو ملیں گے اور یہ چاروں اصولِ دین اس قدر سادہ اور صحیفۂ فطرت سے ہویدا ہیں کہ ایک جنگلی آدمی بھی سنسان بیابان میں اپنے ماحول سے پڑھ سکتا ہے پھر اگر کوئی محمد رسول اللہ صلعم کے پڑھانے سے بھی نہ پڑھے اور ان اسرار کو بتا دینے کے بعد بھی توجہ نہ کرے تو پھر اسکی اپنی بدقسمتی ہے اسلئے ارشاد ہوتا ہے

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ سو نصیحت کئے جا تو صرف نصیحت کرنیوالا اور یاد دہانی کرنیوالا ہے۔

یعنی باوجود اسکے کہ اُسی دین فطرت کو تم یاد دلانے والے ہو جو درحقیقت انسان کی اپنی فطرت میں بھی مرکوز اور صحیفۂ قدرت میں عیاں ہے پھر اگر کوئی نہیں مانتا تو

لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ۝ تو اُن پر داروغہ تو نہیں۔

پس تو ان کو دین پہنچا دے کسی پر جبر اور زبردستی نہیں۔ صرف پیغام کا پہنچا دینا تیرا کام ہے۔

إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۝ ہاں جو منہ پھیرتا ہے اور انکار کرتا ہے۔

فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝ تو اللہ اسے بڑا عذاب دیگا۔

یہاں اِلَّا استثنائے منقطع ہے فرمایا تیرا کام نصیحت کرنا اور خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے کسی پر زبردستی نہیں جو منہ پھیرتا اور انکار کرتا ہے خدا خود انہیں اُن کے کرتوتوں کے بدلہ میں سزا دیگا۔ آخر یہ جا کہاں سکتے ہیں اپنے عمل کا بدلہ بھگتنے کیلئے ہمارے ہی پاس آئینگے

إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ۝ بیشک ان سب کو ہماری ہی طرف لوٹکر آنا ہے پھر ان سے حساب لینا ہمارا کام ہے ع ۱۳ النصرة

یہی وہ حساب ہے جسے شروع سورت میں الغاشیہ فرمایا تھا جو سب کو ڈھانک لینے والا ہے۔ اور کوئی اس سے بچ نہیں سکتا فرمایا تم دین کو لوگوں تک پہنچا دو۔ کوئی نہیں مانتا تو تم پر اس کا کچھ دوش نہیں آخر انہوں نے ہماری طرف ہی لوٹنا ہے۔ پھر ہم اُن سے ان کے عمل کا مواخذہ خود کریں گے۔ تعالےٰ دین عیسائی کا الزام دینے والوں یا عقیدہ رکھنے والوں کی اس میں کھلی تردید اور عند ان شکن جواب ہے ؎

سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | وَهِيَ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً

سورۃ الفجر کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا پچھلی سورت الغاشیہ میں دین فطرت اور اس کے مطابق اعمال بجالانے پر زور دیا تھا اور ان کے نتائج کا نقشہ کھینچ کر دکھایا تھا اور فرمایا تھا کہ لوگوں کو نصیحت کئے جاؤ مذہب کے بارے میں کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا البتہ نصیحت کرنا اور فطرت کے دین کو یاد دلانا تمہارا کام ہے لیکن برخلاف اس کے منکرین مخالفین خود نبی اور اسکی جماعت کی حق گوئی کو برداشت نہیں کر سکتے نبی تو دین میں زبردستی نہیں کرتا لیکن مخالفین زبردستی اُس کے گلے کا ہار بن کر اُس کا منہ بند کرنا چاہتے ہیں اسلئے نبی اور اسکی جماعت کو تبلیغ حق کیلئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے جسے اسلامی اصطلاح میں جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں یعنی حق کی حفاظت و اشاعت کیلئے طرح طرح کے مصائب سہنے پڑتے اور قسم قسم کے مالی اور جانی قربانیاں کرنی پڑتی اور عبادتوں اور دعاؤں سے کام لینا پڑتا ہے علاوہ ازیں نبی کے وقت میں بلکہ ہر زمانہ میں مومن کو ایک اور بھی جہاد کرنا پڑتا ہے جو اپنے کافر نفس کے ساتھ ہوتا ہے جس کی خواہشات و جذبات کو زیر کرنے کیلئے اُسے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھانی اور قربانیاں کرنی پڑتی ہیں اور سب سے بڑھکر دعاؤں اور عبادتوں سے کام لینا پڑتا ہے پس اس سورت الفجر میں نفس کے ساتھ اس جہاد کو سامنے رکھکر نبی کے وقت کے جہاد فی سبیل اللہ کے متعلق روشنی ڈالی اور ہدایت دی ہے اور پیشینگوئی کی ہے اور بتایا ہے کہ جن طریقوں پر نفس کے ساتھ جہاد کرنے والا کامیاب ہوتا ہے انہی طریقوں پر چل کر ہر ایک مجاہد فی سبیل اللہ کامیاب ہوا کرتا ہے۔ خواہ جہاد کافر نفس سے ہو خواہ کفار قوم سے۔ اور یہی وہ راہیں ہیں جن پر چل کر انسان خدا کے قرب اور رضا کی تمام منازل کو طے کر جاتا ہے اور آخر نفس مطمئنہ کا وارث ہو کر خدا کے خاص بندوں میں داخل ہو جاتا ہے اور جنت کو حاصل کر لیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

وَالْفَجْرِ ۙ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۙ فجر گواہ ہے اور دس راتیں۔

وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۙ اور جفت اور طاق گواہ ہیں۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۚ اور رات گواہ ہے جب وہ جانے لگے۔

هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۗ اس میں نفس کو حرص ہوا سے روکنے والوں کیلئے بڑی بھاری قسمیں ہیں

میں اللہ تعالیٰ کی قسموں کی نسبت کئی مرتبہ ذکر کر چکا ہوں کہ اُن سے مراد محض گواہیاں ہوتی ہیں جن میں تاکید اور شدت مدنظر ہوتی ہے۔ اور حجر وہ چیز ہے جو انسان کو حرص و ہوا کے اتباع سے روکتی ہے۔ اس لئے عقل کو بھی مجازاً حجر کہتے ہیں پس ذی حجر کے لفظی معنے ہوئے نفس کو حرص و ہوا کی اتباع سے روکنے والے اور هل فی ذالك قسم لذی حجر کے معنے ہوئے اس میں اُن لوگوں کے لئے جو نفس کو حرص و ہوا کی اتباع سے روکتے ہیں بڑی اہم گواہیاں ہیں لہٰذا اب ہم اُن گواہیوں پر نظر ڈالتے ہیں

جن کے متعلق فرمایا کہ ان کی صداقت اور اہمیت کو وہ لوگ خوب سمجھتے ہیں جو نفس کو حرص و ہوا کی اتباع سے روکتے ہیں جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ نفس کو حرص و ہوا کی اتباع سے روکنے میں جس قسم کی سعی اور مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے ان میں ہمیشہ ان امور پیش کردہ کو صاحب تجربہ لوگوں نے صحیح پایا ہے۔ لہذا ان طریقوں پر چل کر کامیابی حاصل کی ہے جناب الٰہی نے ان امور کی صداقت اور بدیہی ہونے کی وجہ سے اس امر کی ضرورت بھی یہاں نہیں سمجھی۔ کہ جواب قسم کو علیحدہ ذکر کریں کیونکہ ان قسموں یا گواہیوں کا جواب خود ان کے اندر ہی موجود ہے یعنی اس کا مطلب یہ کہ تم خود ان امور پر عمل کر کے دیکھ لو اُن کا نتیجہ خود تم سے منوالے گا کہ واقعی نفس کو حرص و ہوا سے روکنے اور قرب الٰہی کی منازل کو طے کرنے کے لئے کامیابی کی یہی راہیں ہیں۔ اب ایک ایک امر کو لے لیتے ہیں جو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔

والفجر۔ فجر گواہ ہے یہ کامیابی و مسرت یا عید کی فجر ہے ولیال عشر۔ یہ رمضان کی آخری دس راتیں ہیں۔ جن میں لیلۃ القدر بھی شامل ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ اور جن راتوں میں ہمارے نبی کریم صلعم خاص طور پر شب بیداری کرتے اور عبادت کرتے تھے۔ اور نیز مراد ذی الحجہ کی پہلی دس راتیں بھی ہیں جن ایام میں حج اور اس کے مناسک ادا ہوتے ہیں اور خاص طور پر عبادتیں کی جاتی ہیں

والشفع۔ جفت اور والوتر طاق۔ دونوں یہاں بہت وسیع مفہوم رکھتے ہیں۔ اس سے پچھلی رات کی نماز تہجد بھی مراد ہے۔ جو جفت یعنی دو دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں اور دس رکعتیں اس طرح پڑھ کر پھر وتر سے یعنی ایک رکعت سے جو طاق ہوتی ہے سب کو وتر کر دیا جاتا ہے لیکن اس جفت اور طاق کے اندر جو اصل حقیقت پنہاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ مخلوق کو الشفع کہا ہے جیسا کہ قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا ومن کل شئی خلقنا زوجین لعلکم تذکرون۔ کہ ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا تاکہ تم نصیحت پکڑو گویا مخلوق جو بھی ہے وہ الشفع یعنی جفت ہے اور خالق کو الوتر کہا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے واللہ وتر و یحب الوتر کہ خدا وتر یعنی طاق ہے اور طاق کو پسند کرتا ہے پس یہاں الشفع اور الوتر میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ مخلوق تو اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعلق جوڑ کر اور ازدواج بن کر رہے یعنی انسانوں میں باہمی اتحاد و وحدت اور ہمدردی و شفقت عین رضائے الٰہی اور مقصد پیدائش انسانی ہے۔ اور خالق کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ الوتر یعنی طاق ہے یعنی اس کے متعلق توحید کے سوا اور کوئی عقیدہ نہ رکھا جائے۔ یہاں مخلوق میں الشفع کا رنگ یعنی ان کا باہمی اتحاد اور ہمدردی کا کمال اس امر کا متقاضی ہے کہ باوجود کثرت کے وحدت تام پیدا ہو جائے۔ اور یہ کمال وحدت شفع کو وتر بنانے سے یعنی سب ایک کا حکم رکھیں اور خدا جو وتر ہے اس کی فرمانبرداری اور محبت اور توحید میں بندہ کا کمال یہ ہے کہ اس سے تعلق پیدا ہو کر وتر شفع بن جائے یعنی بندہ اپنے رب سے واصل ہو جائے۔ گویا انسان کی ترقی اور کمال منحصر ہے ایک طرف مخلوق کے اندر ایسی باہمی اتحاد و محبت کے پیدا ہو جانے میں کہ وہ شفع کے ہوتے ہوئے وتر بن جائیں یعنی باوجود کثرت کے وحدت کا حکم رکھیں اور دوسری طرف خالق جو وتر یعنی اکیلا ہے اس کے ساتھ بندہ کو ایسا تعلق اور جوڑ پیدا کرنا چاہیئے کہ باوجود اس کے وتر ہونے کے شفع کا رنگ پیدا ہو جائے اسی کو شفاعت کا مقام کہتے ہیں اور پچھلی رات کی نمازوں کی جفت رکعتوں اور سب سے آخر میں ایک طاق رکعت میں بھی یہی اشارہ مدنظر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی توجہ اس عبادت میں مذکورہ بالا شفع اور وتر سے نہ ہٹنے پائے۔ کیونکہ یہی وہ شفع اور وتر ہے جو انسان کا مقصود اصلی اور اسکے

کمال و ترقی کا حقیقی مرتع ہے والیل اذا یسر سے مراد رات کا آخری حصہ ہے جب وہ جا رہی ہو اور یہی وہ آخری ثلث حصہ رات کا ہے۔ جس کی عبادت کی فضیلت اور قبولیت کا ذکر خاص طور پر احادیث میں آیا ہے۔ والفجر کو ولیال عشر سے یہ تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دس رات کے مجاہدہ کے بعد ایک عید کی صبح رکھی ہے رمضان کی آخری دس راتوں کی عبادت اور مجاہدہ اور ادائیگی فرض صیام کے بعد عید الفطر کی صبح آتی ہے۔ جو اپنے ساتھ مسرت کا پیغام لاتی ہے۔ اسی طرح حج کی ابتدائی دس تاریخوں میں عبادت اور مجاہدہ اور ادائیگی فرض حج کے بعد عید الاضحیٰ کی صبح آتی ہے۔ جو اپنے ساتھ مومن کے لئے خوشی اور مسرت کا پیغام لاتی ہے مسلمانوں کے لئے جو دو عیدیں رکھی گئی ہیں وہ دونوں کی دونوں ادائیگی فرض اور مجاہدہ کے بعد رکھی گئی ہیں رمضان کے روزوں اور آخری دس راتوں کے سخت مجاہدہ کے بعد عید الفطر کی صبح اور حج کی ادائیگی اور دس راتوں کے سخت مجاہدہ کے بعد عید الاضحیٰ کی صبح بتاتی ہے کہ مسلمان کی عید ہی اُس روز ہوتی ہے جس دن وہ اپنے فرض کو ادا کر چکتا اور مجاہدہ سے فارغ ہوتا ہے اسی لئے دیکھ لو اسلام میں کوئی عید کسی کی ولادت کی خوشی میں یا کسی کے وفات کے غم میں یا کسی فتح کی خوشی میں نہیں رکھی گئی یہ عید میلاد تو زمانہ حال کی ایجاد اور بدعت ہے اسلام کی صرف دو عیدیں ہیں اور دونوں ادائیگی فرض اور مجاہدۂ نفس کے بعد رکھی گئی ہیں گویا اسلام نے یہ بات مدنظر رکھنی چاہی ہے۔ کہ مومن کی عید تو ادائیگی فرض اور جہاد فی سبیل اللہ کے بعد ہوتی ہے اور وہ صبح واقعی ایسی ہوتی ہے کہ اس پر جتنی خوشی اور اظہار مسرت کیا جائے کم ہے کیونکہ ادائیگی فرض اور مجاہدہ سے بڑھ کر انسان کا کوئی کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس کو بجالانے والا جس قدر بھی خوشی کرے کم ہے پس ایک شخص جو اپنے نفس کو ہر حرص و ہوا سے روکنے کے لئے جد و جہد کرتا ہے وہ ان امور کو بطور گواہ کے موجود پاتا ہے کہ جب وہ دس راتیں رمضان اور دس راتیں ذی الحج میں نفس کے ساتھ جہاد کرتا ہے اور راتوں کو اٹھتا ہے۔ اور اس کے آخری حصہ میں جب وہ جانے لگتی ہے تو جذبات اور طاق رکعتوں میں خدا کی عبادت کرتا اور اس امر کو مدنظر رکھتا ہے کہ مخلوق کے ساتھ شفقت و ہمدردی کے ذریعہ وحدت اور خدائے واحد کے ساتھ فرمانبرداری سے تعلق اور جوڑ پیدا ہو تو وہ دیکھتا ہے کہ ان مجاہدات کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خوشی اور مسرت کی صبح مقرر ہے جو ضرور آتی ہے اور مسلمانوں کی عید کہلاتی ہے۔ اس دن ایک مومن اپنی ادائیگی فرض سے حقیقی مسرت حاصل کرتا اور مجاہدہ نفس سے ایک روحانی لذت اور ترقی محسوس کرتا ہے پس ایک مجاہدہ نفس کرنے والے کے لئے ان امور کی گواہیاں کیسی بیّن ہیں وہ کیسے صاف طور پر دیکھتا ہے کہ ان قبولیت کے موقعوں سے اگر فائدہ اٹھایا جائے تو نفس کا کفر کس طرح زیر ہوتا ہے اور کامیابی اور مسرت کی صبح کس طرح رونما ہوتی ہے فرمایا پس ان گواہیوں سے تم بھی فائدہ اٹھاؤ محمد رسول اللہ صلعم کا وقت بھی اسی طرح ایک قبولیت کا وقت ہے۔ اس وقت اگرچہ قسم قسم کی ضلالت کی راتیں چھائی ہوئی ہیں لیکن یہ وہی راتیں ہیں جن میں تم نے اپنا فرض ادا کرنا ہے اور حق تبلیغ ادا کرنا ہے اور خدا کے رستہ میں جہاد کرنا ہے اور تکلیفیں اٹھانی ہیں۔ نفس اور مخلوق کے کفر کو زیر کرنے کے لئے یہی راتیں ہیں یہی مواقع ہیں۔ مجاہدات کرلو کہ پھر یہ موقعہ ہاتھ نہیں آئیگا۔ دعائیں کرلو کہ پھر یہ قبولیت کی گھڑیاں نہیں ملنے کی۔ کیونکہ یہ رات جاتی ہے اور ضلالت کی جگہ ہدایت کا سورج طلوع ہونے کو ہے۔ اور کامیابی اور مسرت کی صبح آتی ہے۔ پس خوش قسمت ہے وہ جو آج ان مجاہدات سے نفس اور مخلوق کے کفر کو زیر کرے اور نسل انسانی کی وحدت اور شفقت علی خلق اللہ کو قائم کر کے اور خدائے واحد کی محبت اور تعلق سے بہرہ یاب ہو کر سچی خوشی اور

کامیابی کا وارث بن جائے۔ یہ رات تو اب جاتی ہے اب اللہ تعالیٰ خود چاہتا ہے۔ کہ دنیا میں آفتاب ہدایت طلوع ہو اور روشنی پھیلے پس ایک مجاہد نفس کی طرح جو رات کے پچھلے حصہ سے فائدہ اٹھاتا ہے تم بھی فائدہ اٹھا لو دعائیں کرلو۔ خدا سے تعلق جوڑلو کہ اسی جوڑ میں ساری ترقیات وکمالاتِ انسانی کا راز پوشیدہ ہے آپس میں شفقت وہمدردی سے وحدت پیدا کرلو کہ اسی میں قومی زندگی کا راز اور رضائے الٰہی کا انعام مضمر ہے۔ مفت کا ثواب ہے لوٹ لو ورنہ پچھتاؤ گے ہمارے حضرت مسیح موعود نے بھی اسی نکتہ کو دو شعروں میں بیان فرمایا ہے۔ کاش کہ ہمارے احمدی اور غیر احمدی مسلمان بھائی اس آواز پر کان دھریں فرماتے ہیں:۔

ؔ بفت این اجر نصرت را دہندت اے اخی ورنہ
قضائے آسمانست این بہر حالت شود پیدا

ؔ دیں غار میں چھپا ہے ایک شور کفر کا ہے
اب تم دعائیں کرلو غارِ حرا یہی ہے

دوسرے لفظوں میں یہ کہ خدا کے نبی یا مامور کا وقت خدا سے جوڑنے اور کمالات حاصل کرنے کا ہوتا ہے پس اس موقعہ کو غنیمت سمجھو۔ ان ضلالت کی راتوں کا اب خاتمہ ہے۔ اور کامیابی ومسرت کی صبح اب قریب ہے پس خدا کے رستہ میں جس قدر جہاد اور مجاہدہ کرسکتے ہو کرلو۔ تمہیں شاید اگر یہ خیال ہو کہ بالمقابل کفر کی قوتیں بڑی زبردست ہیں۔ اس لئے ضلالت کی راتیں کس طرح ختم ہوسکتی ہیں۔ تو تسلی رکھو بڑی بڑی طاقتیں اور قومیں جنہوں نے حق کو مٹانا چاہا اور خدا کے دین سے ٹکرائیں نیست ونابود ہو کر رہ گئیں تو آج اتنے بڑے زبردست حق کے مقابلہ میں جو قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں دنیا میں ظاہر ہوا ہے۔ دنیا کی مخالف طاقتیں کیا بنا سکتی ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا۔

اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ عاد ارم بلند عمارتوں یا بلند قد وقامت والے۔

الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ جن کی مثل شہروں میں پیدا نہ ہوئے تھے۔

ارم عاد اولیٰ نامی قوم کے دادا کا بھی نام تھا۔ اور اسی لئے یہ عاد ارم کہلاتے تھے۔ اور ان کے ایک خاص شہر کا نام بھی ارم تھا جس کو ان کے دادا نے غالباً بسایا ہوگا۔ ذات العماد۔ اُنہیں کئی وجوہ سے کہا۔ ایک تو وہ بہت قوی ہیکل اور لمبے قد وقامت کے لوگ تھے عماد ستون کو کہتے ہیں گویا قد وقامت میں وہ ستون کی طرح لمبے چوڑے تھے۔ دوم وہ اپنی فتوحات اور حکومت کی نشانیاں ستونوں کے رنگ میں بنایا کرتے تھے۔ جیسے ہندوستان کے راجا اور بادشاہ لاٹ بنایا کرتے تھے مثال کے طور پر اشوک کی لاٹ۔ فیروز شاہ کی لاٹ دہلی میں موجود ہیں سوم وہ بہت بلند عمارتیں بنایا کرتے تھے۔ یہ قوم عرب کے جنوب میں

یمن اور حضر موت کے علاقہ میں آباد تھی۔ آج نئی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کے تمدن سے قدیم مصر کا تمدن ہے اور مصر کے تمدن سے بھی قدیم یمن کا تمدن ہے وہاں کی کھدائی میں ابھی حال ہی میں ایک تختی نکلی ہے جس میں حضرت ہود کا نام اور کچھ حالات لکھے ہوئے پائے گئے ہیں اس تختی نے ان پادریوں پر موت وارد کر دی جو ہود نبی کے وجود سے منکر تھے اور قرآن کی صداقت پر مہر لگا دی جس نے سب سے پہلے ہود کا ذکر کیا۔ غرضکہ یہ قوم اپنے زمانہ میں ایسی اعلیٰ تمدن و طاقت کی مالک تھی کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لم یخلق مثلہا فی البلاد کہ شہروں اور ملکوں میں اس وقت اُن جیسی کوئی قوم نہ تھی ہمارے مسلمان بادشاہ بھی کیسا لطیف مذاق رکھتے تھے۔ کہ بڑی خوبصورت پچی کاری کے ساتھ آگرہ کے تاج محل کے دروازہ پر ساری سورۂ والفجر کو لکھا ہے۔ اور محض اس ایک آیت کی خاطر کہ لم یخلق مثلہا فی البلاد۔ کہ اس جیسی ملکوں اور شہروں میں پیدا نہیں کی گئی۔ اور حق تو یہ ہے کہ یہ آیت صادق بھی خوب آئی۔ تاج کی طرح کی عمارت حسن اور نزاکت میں اس وقت شہروں اور ملکوں میں نظر نہیں آتی۔

وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ اور تیرے رب نے ثمود کے ساتھ کیا کیا جو وادی میں چٹانوں کو تراشا کرتے تھے۔

یہ قوم حجاز کے شمالی حصہ میں جو بالکل پتھریلا ہے۔ آباد تھی اور مضبوطی اور قوت کے لئے یہ لوگ پہاڑوں اور چٹانوں کو تراش کر مکان بنایا کرتے تھے۔ اُن کے آثار تو سینکڑوں سال سے چلے آتے ہیں کیونکہ وہ پتھروں میں تراشے ہوئے مکان تو ابھی تک موجود ہیں۔ لیکن ابھی حال میں ایک بڑا عظیم الشان سرخ پتھر کا شہر نکلا ہے۔ اس کے حالات اور فوٹو میں نے ٹائمز آف انڈیا میں پڑھے اور دیکھے ہیں۔ پتھر میں تراشی ہوئی عمارت بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ انگریزوں نے عدن کو جو سمندر میں ایک خشک پہاڑ ہے اندر ہی اندر کاٹ کر اس پتھریلے پہاڑ کے اندر اس قدر زبردست قلعہ بنایا ہے۔ کہ کسی طاقت کا جنگی جہاز ان کے خلاف مرضی گزرے تو پہاڑ کے اندر جو توپیں لگی ہیں اُسے اڑا دیں۔

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۝ اور تیرے رب نے فرعون کے ساتھ کیا کیا جو میخوں والا یعنی لشکروں والا تھا۔

فرعون مصر کے بادشاہ کا لقب تھا۔ میخوں والے سے اُس کے لشکر کی کثرت کا نقشہ کھینچنا مقصود ہے جب لشکر بے شمار ہو تو اس وقت خیموں اور گھوڑوں کی میخوں کا ایک جنگل نظر آتا ہے۔

یہاں تین قوموں کو لیا ایک تو عاد جو مکہ کے جنوب میں تھی۔ دوم ثمود جو مکہ کے شمال میں تھی۔ اور سوم فرعون جس نے بنی اسرائیل کے صاحب شریعت نبی حضرت موسیٰ کا مقابلہ کیا تھا اور جس نبی کے مثیل ہونے کے محمد رسول اللہ صلعم مدعی تھے اور ان تینوں کے ذکر میں انسانی قوت کے تمام ذرائع کا ذکر فرما دیا۔ (۱) قوم کا قد آور اور قوی ہیکل ہونا (۲) بڑی بڑی بلند عمارتوں اور قلعوں اور فتوحات کے نشانوں کا مالک ہونا (۳) بڑی بڑی مضبوط اور مستحکم عمارتوں کا مالک ہونا جو پتھروں میں تراش کر بنائی جاتی ہیں (۴) بے حساب فوجوں کا مالک ہونا مگر باایں ہمہ خدا سے سرکشی اور حق کی مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ خدا کے مقابل ان کی قوتوں کے یہ تمام ذرائع کچھ بھی کام نہ آئے چنانچہ فرماتے ہیں:-

الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ وہ لوگ تھے جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی۔

فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝ پھر ان میں بہت فساد پھیلایا۔

یعنی ایک تو ظلم جو براہ راست خدا کی نافرمانیوں سے فساد پھیلایا۔ دوم حق کی مخالفت میں سخت شورش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ۔

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ سو تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا چلایا۔

جس طرح بدمعاشوں کو جو کہیں فساد کر رہے ہوں۔ ایک منتظم افسر آکر اُن پر کوڑا پھٹکارتا ہے اور ان سب کو بھگا دیتا ہے اسی طرح خدا کے رسولوں کی مخالفت کرنے والوں اور فساد مچانے والوں پر بھی جب خدائی کوڑا چلتا ہے تو سب فنا ہو جاتے اور بھاگ جاتے ہیں کوئی باقی نہیں رہتا۔ فرمایا پس آج بھی:۔

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ بیشک تیرا رب گھات میں ہے۔

تیرا رب تمام امور کو دیکھ رہا ہے اور جس طرح ایک سپہ سالار تاک میں بیٹھا ہوتا ہے اور جس وقت موقعہ دیکھتا ہے دشمن پر آپڑتا ہے اور اُسے فنا کر دیتا ہے فرمایا اسی طرح تیرا رب بھی گھات میں ہے۔ وہ ان کی شورشوں کو دیکھ رہا ہے وقت آتا ہے کہ اُن کو اس طرح اپنی شرارتوں کے بیچ میں پکڑے گا کہ یہ ہل نہ سکیں گے۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ انسان کا تو یہ حال ہے کہ جب اُسے اُس کا رب آزماتا ہے۔

فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ پھر اُسے عزت دیتا ہے اور نعمت بخشتا ہے تو وہ کہتا ہے میرا رب میری عزت کرتا ہے۔

وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ اور جب اسے اس طرح آزماتا ہے کہ اس پر اسکی روزی تنگ کر دیتا ہے

فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝ تو وہ کہتا ہے میرا رب میری تذلیل کرتا ہے۔

ان آیات میں دنیا کی خوشحالی و تنگی، امارت و غربت کے فلسفہ کو حل کر دیا ہے۔ دولت و حکومت کا جن قوموں کو نشہ ہوتا ہے وہ کسی کی نصیحت و وعظ کی طرف کان لگانا بھی پسند نہیں کرتے۔ غریب کا مذہب بھی اُن کی نگاہوں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ دنیا اور مال کے رنگ میں بڑائی اُن کے اندر یہ ذہنیت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں یا کم سے کم ظاہر ایسا کرتے ہیں کہ خدا بھی اُن سے راضی اور خوش ہے تبھی تو اس نے اتنے انعامات کر رکھے ہیں کہ جدھر قدم اٹھاتے ہیں حکومت

اور دولت قربان ہوتی چلی آتی ہے (لطیفہ) "آج سے کئی سال قبل حضرت مولوی نورالدین صاحب مرحوم کے زمانہ میں جب جنگ بلقان ختم ہوئی تو پادریوں کا ایک طائفہ لاہور آیا۔ اور انہوں نے لیکچر دینا شروع کیا کہ دیکھ لو خداوند یسوع مسیح کی برکت سے عیسائی سلطنتیں ہر جگہ کامیاب ہیں اور تمام دُنیا پر غالب ہیں اور مسلمانوں کا حال دیکھ لو کہ ایک ٹرکی کی سلطنت تھی وہ بھی تباہ ہوگئی۔" حضرت مولانا نورالدین مرحوم نے ایک وفد احمدیوں کا اُن کی طرف بھیجا اور نصیحت کی کہ جو بات وہ حق کہیں اُن کی تائید کرو۔ اور جو باطل کہیں اُن کی تردید کرو۔ اور اُن کو ہمارا یہ پیغام دو کہ عیسائیوں کی سلطنتوں کا باعث وہ نہیں جو تم بیان کرتے ہو۔ بلکہ اس کا باعث وہ واقعہ ہے جو انجیل میں لکھا ہے اور تمہارے لئے وہی مستند ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ یسوع مسیح برابر چالیس دن تک شیطان سے آزمائے گئے۔ اور وہ انہیں جنگلی پہاڑوں میں لئے پھرا۔ آخر ایک دن شیطان انہیں پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا۔ اور تمام دنیا کی بادشاہتیں یسوع کو دکھائیں اور کہا کہ اگر تم مجھے سجدہ کرو تو یہ ساری بادشاہتیں تمہاری ہیں اس پر یسوع نے اس سے کہا کہ اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو اپنے خداوند خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہ کر پس مجھے یہ منظور نہیں۔" یسوع مسیح نے جس سجدہ سے انکار کیا تھا اور دنیا کی بادشاہتوں کو رد کر دیا تھا مسیحیوں نے یہ دیکھ کر کہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خداوند یسوع ساری عمر افلاس اور غربت میں دُکھ اٹھاتے رہے۔ یسوع کی تقلید اس معاملہ میں دانائی نہیں سمجھی۔ پس انہوں نے شیطان کو سجدہ کر کے ساری دنیا کی بادشاہتوں کو حاصل کر لیا یعنی اُن کو تمام دنیا کی بادشاہتوں کا مل جانا انجیل کے رُو سے تو صاف نظر آتا ہے کہ شیطان کو سجدہ کرنے کا نتیجہ ہے۔" اس پیغام کا جواب پادریوں سے بن نہ پڑا اور چند روز کے اندر ہی وہ بستر گول کر گئے۔

الغرض اس نکتہ کو جسے انجیل حل نہ کر سکی۔ قرآن نے دو فقروں میں حل کر دیا۔ فرمایا دولت کا بڑھنا اور افلاس یہ دونوں ابتلا ہیں یعنی خدا کی طرف سے امتحان ہوا کرتے ہیں جن میں بندوں کے اخلاق کی آزمائش مقصود ہوتی ہے اس لئے دولت اور عزت کی فراوانی پر یہ سمجھ لینا کہ خدا ان سے راضی ہے بلکہ اُن کی عزت کرتا ہے اور اسی لئے طرح طرح کے انعام دیتا ہے یہ خطرناک غلطی ہے اسی طرح افلاس اور تنگی سے یہ سمجھ لینا سخت غلطی ہے کہ خدا ناراض ہے یا اسے ذلیل سمجھتا ہے اسی لئے روپیہ پیسہ نہیں دیتا یہ دونوں حالتیں خدا کی طرف سے بندہ کے امتحان کے رنگ میں آیا کرتی ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کیا خوب فرمایا کہ بُلینا بالضراء فصبرنا وبُلینا بالسراء فلم نصبر کہ ہم تنگی و مصیبت سے آزمائے گئے پس ہم نے صبر کیا لیکن جب ہم دولت اور خوشحالی سے آزمائے گئے تو صبر نہ کر سکے۔ یہ کلام تو انہوں نے کسر نفسی سے اپنے پر چسپاں کیا تھا انہوں نے تو تنگی اور خوشحالی دونوں حالتوں میں صبر کا جو نمونہ دکھایا وہ بے نظیر تھا۔ لیکن بعد میں آنے والے مسلمانوں پر یہ خوب چسپاں ہوتا ہے گویا یہ کلام کیا تھا ایک پیشگوئی تھی جو ان کی زبان پر جاری ہوئی مسلمانوں کو جب سلطنت اور دولت ملی تو مذہب کا رنگ پہلے کی طرح قائم نہ رہ سکا۔

الغرض خوشحالی ہو یا تنگی یہ دونوں ابتلا کی حالتیں ہیں جب تک اللہ تعالیٰ کسی انعام یا کامیابی، سلطنت یا دولت کے متعلق خود نہ جتلائے کہ یہ اعمال کا نتیجہ ہیں۔ اور بطور اجر کے عنایت ہوئے ہیں۔ یا کسی شکست اور ذلت کے متعلق خود قبل از وقت پیشگوئی نہ کرے۔ کہ یہ اعمال کی سزا ہوگی اس وقت تک کسی قوم یا شخص کی دولتمندی یا حکومت کو خدا کی خوشنودی پر اور افلاس یا ذلت کو خدا کی ناراضگی پر محمول کرنا سخت غلطی اور حماقت ہے۔ پس اسلام کے مخالف اپنی دولت مندی اور حکومت کو اس بات کا

نشان نہ سمجھیں کہ خدا ان سے راضی ہے اس لئے وہ انہیں سزا نہیں دے گا۔ فرمایا ہرگز نہیں انہیں سزا ضرور ملے گی۔ کیونکہ خدا کی رضا تو اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ پر مبنی ہوا کرتی ہے سو وہ ان میں نہیں۔ پس اپنی خوشحالی کو خدا کی خوشنودی اور تکریم پر محمول کرنا ان کی خطرناک غلطی ہے محض خوشحالی خدا کی خوشنودی کا نشان نہیں ہوا کرتی۔

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝ ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے۔

وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ اور مسکین کے کھانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے۔

وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۝ اور میراث سب کچھ سمیٹ کر کھاتے ہوئے کھا جاتے ہو۔

وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ اور مال سے بیحد پیار کرتے ہوئے محبت کرتے ہو۔

فرمایا یہ خیال درست نہیں کہ تمہاری خوشحالی خدا کی خوشنودی کو ظاہر کرتی ہے۔ ہرگز نہیں جب تم میں نہایت ذلیل اخلاق پائے جاتے ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ تو تم خواہ کتنے ہی امیر اور معزز اور خوشحال کیوں نہ ہو خدا تم سے راضی نہیں ہو سکتا اور اس کے دربار میں تم معزز نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ ان ذلیل اخلاق کی تشریح ملاحظہ ہو فرماتے ہیں تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور مسکین کے کھانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے۔ یہ دونوں امور تشریح طلب ہیں۔ یتیم اُسے کہتے ہیں جو دنیا میں اکیلا رہ جائے اس حالت میں کہ اپنی پرورش کے لئے وہ ابھی دوسروں کا محتاج ہو یعنی ابھی وہ اس قابل نہیں ہوا تھا کہ اپنی روزی خود کما سکے اور اپنی حفاظت خود کر سکے۔ کما کر روزی مہیا کرنے والا اور اس کا حفاظت کرنے والا دنیا سے اٹھ جائے اسی لئے جس کا باپ مر جائے اُسے یتیم کہتے ہیں اور دُرِّ یتیم اُس موتی کو کہتے ہیں جو بوجہ اپنی خوبصورتی کے دنیا میں اکیلا ہو۔ مسکین اُسے کہتے ہیں جو اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہے اور اپنی روزی آپ کما سکتا ہے لیکن روزی کمانے کے ذرائع اسکے جاتے رہیں مثلاً ایک درزی تھا اسکی سلائی کی مشین چوری ہو گئی یا ہاتھ ٹوٹ گیا تو وہ اب مسکین ہو گیا یعنی اسکی روزی کمانے کے ذرائع جاتے رہے۔ ایک مزدور تھا اُسے فالج ہو گیا ایک پیشہ ور تھا اندھا ہو گیا۔ ایک تاجر تھا دوالہ نکل گیا۔ ایک ملازم تھا نوکری چھوٹ گئی۔ غرضکہ جس کے روزی کمانے کے ذرائع جاتے رہیں اُسے مسکین کہتے ہیں۔ اس کا مادہ سکن ہے۔ یعنی چلتا ہوا کام ساکن ہو گیا یعنی رُک گیا۔ پس یتیم وہ ہوا جو ابھی روزی کمانے کے قابل نہ ہوا تھا۔ کہ اس کو روزی کما کر دینے والا اُٹھ گیا۔ اور مسکین وہ ہوا جو روزی کمانے کے قابل تھا اور کماتا تھا لیکن اُس کے روزی کمانے کے ذرائع جاتے رہے کوئی سوسائٹی دنیا میں اپنی عزت اور خوشحالی کو قائم نہیں رکھ سکتی جب تک وہ اپنے ان دو طبقوں یتامیٰ اور مساکین کی حالت بہتر بنانے کے لئے توجہ اور کوشش نہیں کرتی۔ یہی دو طبقے ہیں جن سے افلاس اور غربت اور مصیبت اور ذلت کسی سوسائٹی میں داخل ہو جاتی ہے اگر ان دو طبقوں کو قوم سنبھال لے۔ تو اُس کی دولت و خوشحالی اور عزت و تکریم میں کیسے فرق پڑ سکتا ہے؟ سنبھالنے کے طریق کیسے خوبصورت بتائے ہیں۔ فرماتے ہیں یتیم کی عزت کرنا اور مسکین کے کھانے کیلئے ایک دوسرے کو ترغیب دینا

(۱) یتیم کی پرورش دو رنگ میں ہو سکتی ہے ایک عزت کے رنگ میں۔ دوم ذلت کے رنگ میں۔ آج ہماری قوم میں یتیموں کی پرورش ذلت کے رنگ میں ہو رہی ہے کسی کا بچہ یتیم مل گیا۔ پالنے کے بہانہ سے گھر میں رکھ لیا۔ سارے گھر کا کام لیا کوئی دوسرا ہوتا تو تنخواہ لیتا یتیم کے پالنے کے احسان احسان میں تنخواہ بھی ندارد۔ دن رات کی گھرکی دھمکی الگ۔ بار بار احسان بھی جتلایا کہ اے شکر کر تجھے پال رہے ہیں اور لوگوں میں دینداری اور تقدس کا اڈا جمایا کہ دیکھئے صاحب ہم قوم کے یتیموں کو پال رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر بدمعاشی اور چالاکی ممکن نہیں۔ یہ یتیم کا پالنا نہیں بلکہ اس پر ظلم کرنا ہے اور لا تکہرون الیتیم میں داخل ہے۔ اسی لئے یہاں حکم دیا کہ یتیم کی عزت کرو یعنی اس کے حقوق کی حفاظت اور پرورش ایسے طریق پر ہو جس میں اس کی ذلت نہ ہو۔ ہر ایک یتیم خواہ وہ امیر کا بچہ تھا یا غریب کا اس کی عزت کرنا قرآن کا حکم ہے۔ اس کے حقوق کی عزت کرو اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں اس کی عزت کو ملحوظ رکھو تاکہ وہ بچہ اپنے آپ کو ذلیل نہ سمجھے اور اخلاق رذیلہ اس میں پیدا نہ ہونے پائیں اور اس طرح وہ سوسائٹی کا ایک مفید ممبر بن سکے۔ اس قسم کی یتیم کی پرورش کی نسبت آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ یتیم کا پالنے والا اور میں قیامت کے دن اس طرح ہوں گے جس طرح دو انگلیاں ملی ہوئی ہوتی ہیں (۲) مسکین کی نسبت یہاں یہ نہیں فرمایا کہ مسکین کو کھانا کھلانا چاہیئے۔ بلکہ مسکین کی روزی کے لئے ایک دوسرے کو ترغیب دینے کا حکم ہے مسکین کو کھانا کھلانا بھی بڑا ثواب ہے۔ مگر ایک وقت یا دو وقت کھانا دینے سے عمریں نہیں کٹا کرتیں۔ طعام کے معنے صرف پکا ہوا کھانا لینا غلطی ہے طعام سے مراد روزی ہوا کرتا ہے۔ خواہ پکا ہوا کھانا ہو یا روزی کا سامان ہو پس یہاں ایک دوسرے کو مسکین کے طعام کے لئے ترغیب دینے کا جو حکم ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ جب تک قوم آپس کی ترغیب اور مشورہ سے اپنی سوسائٹی کے مساکین کی روزی کا انتظام نہیں کریگی اس قوم کی خوشحالی اور عزت معرض خطر میں ہے۔ جو قوم چاہتی ہے کہ وہ دنیا میں دولتمند اور معزز رہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مساکین کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے بحیثیت قوم کے آپس کے غور اور مشورہ سے کوئی صورت پیدا کرے جس سے مساکین کی روزی کا سامان ہو سکے۔ پارسی قوم کی دولت مندی کا راز یہی ہے۔ کہ وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر قرآن کے اس حکم پر نہایت سختی سے عامل ہے ان کے ہاں قوم نے ایک فنڈ بنا رکھا ہے جس میں سے ہر ایک پارسی کو جو مسکین ہو جائے رقم مل جاتی ہے جس سے وہ تجارت کرتا یا حسب موقعہ اپنی حالت کو درست کرتا ہے۔ اور جب اس کی حالت درست ہو جاتی ہے۔ تو وہ بھی اس فنڈ میں اپنا حصہ رسدی دیتا ہے۔ قوم کی اس توجہ کا نتیجہ یہ ہے کہ پارسی قوم میں کوئی مسکین نظر نہیں آتا۔ کیا اسلام میں زکوٰۃ اور بیت المال کا مقصد یہی نہ تھا کہ امیروں سے روپیہ لے کر اور ایک جگہ جمع کر کے یتامیٰ اور مساکین کی حالت کو بہتر بنانے اور ان کی تعلیم اور پرورش اور روزی کا سامان معزز اور شریفانہ طریق پر مہیا کرنے کا انتظام کیا جائے لیکن بدقسمتی سے آج نہ زکوٰۃ ہے نہ بیت المال۔ نتیجہ یہ کہ قوم کے یتامیٰ اور مساکین کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کی ساری قوم تنگدست اور ذلیل ہو گئی۔ جو گرا وہ گرتا چلا گیا پھر نہ ابھرا۔ ابھارے کون اول تو امرا زکوٰۃ ہی نہیں دیتے اور جو دیتے ہیں سو اپنی اپنی جگہ بھیک مانگنے والوں کو دے چھوڑتے ہیں نتیجہ یہ کہ ایک تو قوم میں بھیک مانگنے کی ذلیل عادت بڑھتی جاتی ہے دوم بہت سے غیر مستحق لوگ لے جاتے ہیں۔ اور مستحق محروم رہ جاتے ہیں اگر بیت المال ہوتا۔ اور اجتماعی رنگ میں زکوٰۃ جمع ہو کر اس کا مصرف صحیح اور مستحقین پر ہوتا تو دونوں میں مسلمان قوم کی حالت سدھر جاتی۔ اور عسر کی جگہ یسر اور ذلت کی جگہ

عزت نصیب ہوتی سان آیات میں بھی یہی ذکر ہے کہ خدا کی نگاہ میں اس قوم کی کوئی عزت نہیں جو نہ تو یتیم کا اکرام کرتے ہیں اور نہ مسکین کی روزی کے لئے ایک دوسرے کو ترغیب دے کر کوئی سامان کرتے ہیں بلکہ اس کے بالمقابل نہایت رذیل اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ یتیم کا اکرام کرنے کے بجائے اس کا جائز حق بھی نہیں دیتے۔ اور ترکہ میں اگر کسی یتیم کا ورثہ ہو تو وہ بھی اسے نہیں دیتے۔ اور سب کچھ سمیٹ کر خود کھا جاتے ہیں۔ اور مساکین کی روزی کا سامان کرنے کے بجائے مال سے اتنا پیار ہے کہ اسے کسی صورت میں اپنے سے جدا کرنا گوارا نہیں کرتے یہاں لاتکرمون الیتیم کے مقابلہ میں تاکلون التراث اکلا لما لائے ہیں اور لا تحاضون علی طعام المسکین کے مقابلہ میں تحبون المال حبا جما رکھا ہے پس اس قوم کی ذلت میں کیا شک ہے جو یتیم کا اکرام کرنے کی بجائے اسے ورثہ میں بھی حصہ نہیں دیتی۔ اور مسکین کی روزی کا سامان کرنے کی بجائے مال سے پیار کرتی اور بخل کی مرتکب ہوتی ہے یہ قوم نہ صرف خدا کی نگاہ میں ذلیل ہے بلکہ دنیا میں بھی اس کا انجام ضرور ہے کہ ذلت اور بربادی پر ہو۔

الغرض مذکورہ بالا آیات میں جناب الٰہی کو یہ امر ذہن نشین کرنا مقصود خاطر ہے کہ جب انسان کو دولت سے آزمایا جائے تو وہ تکبر اور خود پسندی میں نہ پڑ جائے۔ اور اپنی دولت مندی کو خدا کی طرف سے کوئی عزت نہ خیال کرے کہ یہ ہلاکت کا نشان ہے اور جب کسی انسان کو تنگیٔ رزق سے آزمایا جائے تو وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں تو ذلت کیلئے پیدا کیا گیا ہوں اس سے ترقیٔ انسانی میں روک پیدا ہوتی ہے افلاس ذلت کا نشان نہیں۔ ذلت کا نشان وہ بد اخلاقیاں اور بداعمالیاں ہیں جن کا انسان مرتکب ہوتا ہے۔ کہ یتامیٰ و مساکین کی طرف سے نہ صرف غفلت و بے پروائی کرتا ہے بلکہ حقداروں اور بیکسوں کے حق غصب کرتا اور مال کی محبت میں دناءت نفس کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں سبق یہ دیا ہے کہ کفار اپنی دولت پر نہ اترائیں۔ اور مسلمان اپنے افلاس سے نہ گھبرائیں۔ بلکہ اپنے اندر وہ اخلاق فاضلہ پیدا کریں جن سے حقیقی عزت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پس پردہ نگران ہے۔ وہ دونوں قوموں کے حالات کو دیکھ رہا ہے تم اپنے اخلاق درست کرو تمہاری کامیابی یقینی ہے۔ کفار ان شرارتوں اور بد اخلاقیوں اور بداعمالیوں کے ساتھ بچ نہیں سکتے

كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ ہرگز نہیں جب زمین ٹکڑے ٹکڑے کر کے توڑ دی جائیگی۔

وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ اور تیرا رب آجائے گا اور فرشتے صف بستہ۔

فرمایا یہ ہرگز بچ نہیں سکتے ایک وقت آتا ہے کہ یہ زمینی پردہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اور پردہ کے پیچھے سے تیرا رب مع صف بستہ ملائکہ کے نکل آئیگا اور انسان یا یہ قوم ایسی پکڑی جائیگی کہ کہیں مفر نہ ہوگا نادان انسان سمجھتا ہے کہ میری بداعمالیوں کو کوئی نہیں دیکھ رہا اور میری شرارتیں کسی کی نظروں میں نہیں۔ فرمایا خدا اور اس کے ملائکہ تو نزدیک ہی ہیں لیکن شریر انسان اور خدا کے درمیان زمینی و مادی اسباب کے پردے حائل ہیں ایک وقت آجاتا ہے کہ پردے اٹھ جاتے ہیں اور زمینی اسباب ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی گھات میں سے باہر نکل آتا ہے اور بدعمل کو اسکی بدعملی کے ساتھ پکڑ لیتا ہے۔ جیسے کسی باغ میں سے کوئی شخص پھل چوری کر رہا ہو۔ اور سمجھتا ہو کہ کوئی نہیں دیکھ رہا اور باغ کا مالک اور اس کے ملازم گھات میں پوشیدہ ہوں جیسے ہی وہ چوری کے پھل لے کر باغ سے نکلنے لگے۔ تو وہیں گھات میں سے یا درختوں کے اوٹ میں سے باغ کا مالک اور اس کے

ملازم نکل آئیں اور چور کو بمعہ چوری کے مال کے پکڑلیں بالکل یہی نقشہ انسان کا اور اسکے رب کا ہے انسان بدعملیاں کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کوئی نہیں دیکھ رہا حالانکہ صرف درمیان میں ایک زمینی یا مادی پردہ حائل ہے جس کے پیچھے سے اس کا رب سب کچھ دیکھ رہا ہے ایک وقت آجاتا ہے کہ یہ زمینی پردہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے۔ اور رب اور اسکے ملائکہ سامنے نظر آنے لگتے ہیں اور انسان ایسا پکڑا جاتا ہے کہ کہیں بھاگنے کی راہ نظر نہیں آتی

اس زمینی پردہ کے ٹوٹنے کے تین موقعہ ہوتے ہیں (۱) ایک تو انسان کی موت کے وقت یہ پردہ اٹھتا ہے اُسے ساعت صغریٰ کہا گیا ہے

(۲) اور دوسرے اسوقت جب نبی کی زندگی میں مومن کامیاب اور کافر ذلیل اور ہلاک ہوتا ہے۔ اسی کی نسبت قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے فاتٰھم اللہ من حیث لم یحتسبوا کہ اللہ وہاں سے آگیا۔ جہاں سے انہیں گمان بھی نہ تھا۔ کفار اپنے تکبر اور قوت کے بل پر مومنوں کو پیس ڈالنا چاہتے ہیں مگر خود ہی اس طرح مغلوب اور ہلاک اور ذلیل ہوجاتے ہیں۔ کہ صاف خدا کا ہاتھ کام کرتا نظر آتا ہے۔ اور خدا بمعہ اپنے ملائکہ کے مومنوں کو مدد اور کافروں کو سزا دینے کے لئے ادھر سے آجاتا ہے جہاں سے انہیں گمان بھی نہیں ہوتا۔ فرعون بنی اسرائیل قوم کو پکڑنے گیا تھا لیکن خود پکڑا گیا اور غرق کردیا گیا کفار مکہ مسلمانوں کو پیس ڈالنے کیلئے مدینہ کی طرف گئے تھے۔ لیکن بدر کے مقام پر ایک چھوٹی سی جماعت کے ہاتھ سے پیس ڈالے گئے صلح حدیبیہ کا عہدنامہ بظاہر کفار کے ہاتھ کو اونچا دکھارہا تھا لیکن وہی فتح مکہ اور کفار مکہ کی ہمیشہ کے لئے مغلوبیت کا سبب بن گیا۔ اس پردہ کے اٹھنے کا نام ساعت وسطیٰ ہے

(۳) تیسرا وقت زمینی پردہ کے اٹھنے کا وہ ہے جب قیامت قائم ہوگی اور تمام امور ظاہر ہوجائینگے اُسے ساعت کبریٰ کہا گیا ہے

وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۙ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ اور اس دن جہنم لائی جائیگی اُسدن انسان چیتے گا یعنی الْاِنْسَانُ وَاَنّٰی لَهُ الذِّكْرٰی ۝ نصیحت اختیار کرے گا مگر اُسوقت اس کیلئے چیتنے کا کیا فائدہ ہے

فرمایا جب یہ زمینی پردے ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بندہ اپنے رب کے حضور میں اپنی بداعمالیوں سمیت پکڑا ہوا حاضر ہوگا اور جہنم جو وہ اپنے عملوں سے بنا رہا ہے اس کے سامنے پیش ہوگی تو اس وقت اُسے ہوش آجائے گا۔ مگر اس وقت اس کا چیتنا اور نصیحت پکڑنا بے فائدہ ہوگا۔ ایک لڑکا جو کھیلتا پھرا۔ اور امتحان میں نالائق ثابت ہوکر فیل ہوگیا۔ اب نتیجہ نکلنے پر اس کا پچتانا بے فائدہ ہے

یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ ۝ کہے گا اے کاش میں نے اپنی زندگی کیلئے کچھ آگے بھیجا ہوتا۔

یہاں آخرت کی زندگی کو اصل زندگی فرمایا ہے پس عقلمند وہ ہے جو اُس زندگی کیلئے سامان کرتا ہے جو حقیقی زندگی ہے۔

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ۝ سو اُس دن کوئی شخص اسکے عذاب جیسا عذاب نہ دیگا۔

وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ۝ اور نہ اُس کے جکڑنے کی طرح کسی نے جکڑا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی ہر ایک چیز بے نظیر ہے اس کے انعامات کا بھی کوئی انتہا نہیں اُس کی سزا بھی ایسی ہی ہونی چاہیئے اور پکڑ بھی ایسی

مکمل ہونی چاہیئے کہ اور کوئی اس طرح کی پکڑ نہ پکڑ سکے۔ انسان کی پکڑ سے انسان بچ بھی سکتا ہے نکل بھی سکتا ہے۔ انسان کی سزا دہی میں غلطی بھی ہو سکتی ہے کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے نہ انسان بچ سکتا ہے نہ نکل سکتا ہے۔ اس کی سزا عین جرم کے مطابق اور ایسی مکمل ہوتی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں پس انسان کو چاہیئے کہ وہ خدا کی سزا سے بچے۔ کیا وجہ کہ انسان کی سزا سے تو ہر ایک عقلمند بچنے کی کوشش کرے جس سے بچ نکلنا ممکن ہے۔ لیکن خدا کی سزا کی پروا نہ کرے حالانکہ اس کی پکڑ سے بڑھ کر پکڑ اور اس کی سزا سے بڑھ کر سزا اور نہیں ہو سکتی۔ اس اعلان کا مقصد یہ ہے۔ کہ انسان دنیا کے ہر ایک دکھ کو برداشت کرے لیکن خدا کی سزا سے اپنے آپ کو۔ بچائے خدا کی سزا سے بچنے کے لئے اگر دنیا کے حکام کی سزاؤں کو بھگتنا بھی پڑے تو بھگت لے کیونکہ یہ اس سزا کے مقابل میں ہیچ ہیں جو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ اے نفس اطمینان یافتہ۔

ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ تو اپنے رب کی طرف لوٹ آ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی

فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ ع ۱۴ پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

زمینی پردہ ٹوٹنے پر کافر کا جو حال ہوا وہ سن لیا۔ اب اس مومن کا حال سنو۔ جو اتوں کو عبادت اور مجاہدۂ نفس میں لگا رہا اور گمراہی کے زمانہ میں تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ اور حصول اخلاق فاضلہ میں کوشاں رہا وہ آخر کار اس مقام عالی کو پا گیا جسے نفس مطمئنہ کہتے ہیں یہ سب جانتے ہیں کہ قرآن نے نفس کی تین قسمیں کی ہیں ایک نفس امارہ یعنی انسان کی وہ حالت جس میں نفس بدی کا حکم کرتا رہتا ہے۔ اور خواہشات نفسانی اور جذبات سفلی کے ماتحت انسان کو کسی بڑے کام سے عار نہیں ہوتا دوسرا نفس لوامہ جس میں انسان کی اور شیطان کی جنگ ہوتی رہتی ہے انسان بدی سے اور شیطانی تحریکات اور خواہشات و جذبات حیوانی سے بچنا چاہتا ہے جس میں کبھی تو وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور بدی سے بچ جاتا ہے اور کبھی وہ شیطانی تحریک کے مقابلہ میں ناکام رہتا ہے اور بدی کا ارتکاب اس سے ہو جاتا ہے لیکن اس کا نفس یا ضمیر اسے اس پر ملامت ضرور کرتا ہے۔ تیسرا نفس مطمئنہ جس میں انسان اور شیطان کی جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ اور شیطان ہمیشہ کیلئے مغلوب ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرت نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ میرا جن یعنی شیطان مسلمان ہو گیا ہے اس حالت میں انسان سے نیکی کے افعال اس طرح بے تکلف سرزد ہونے لگتے ہیں گویا وہ اس کی طبیعت ثانی ہیں اطمینان یافتہ کے مفہوم کو خود جناب الٰہی نے یہاں بیان فرما دیا ہے راضیۃ مرضیۃ۔ راضیۃ یعنی خدا کی تقدیر اور شریعت سے راضی مرضیہ شریعت کی فرمانبرداری اور تقدیر کے سامنے تسلیم و رضا سے خدا کی رضا حاصل کی ہوئی۔ اس بندہ کے نفس کی طمانیت اور سکینت کس قدر قابل رشک ہے جو خدا کے ہر ایک حکم اور فعل سے راضی ہو اور خدا اس کے قول و فعل سے راضی ہو میں ذرا مزید تشریح کئے دیتا ہوں:۔

راضیہ خدا کی شریعت اور تقدیر سے راضی۔ راضی انسان اس چیز سے ہوتا ہے جو پسند ہو (۱) نفس مطمئنہ پر جب انسان

پہنچتا ہے تو وہ شریعت کے احکام یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی فرمانبرداری تکلف سے نہیں کرتا بلکہ وہ اُن کی فرمانبرداری میں نفس میں ایک خوشی اور لذت محسوس کرتا ہے اور اسی لئے نافرمانی اس سے سرزد ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں وہ دکھ اور رنج محسوس کرتا ہے یہی وہ مقام عبودیت ہے جو انسان کا منتہائے کمال ہے جس میں فرمانبرداری طبیعت ثانی بن کر بجائے خود ایک جنت پیدا کر دیتی ہے اسی وجہ سے نبی کریم صلعم نے فرمایا قرۃ عینی فی الصلوٰۃ کہ نماز میں میری آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے سید عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں کہ جب اس مقام پر انسان پہنچتا ہے تو نماز کا ثواب اُٹھ جاتا ہے کیونکہ وہ فعل بجائے خود اب ایک لذت اور خوشی بن گیا لہذا ثواب کیسا؟ اس فعل میں ہی اس کا اجر پنہاں ہوتا ہے پس اس مقام پر اگر آواز آجائے کہ فادخلی فی عبادی میرے بندوں میں داخل ہو جا تو کس قدر مناسب حال ہے (۲) اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تقدیری احکام جاری ہوتے ہیں یعنی دکھ اور سکھ اور رنج اور خوشی کی کیفیات جو بندہ پر وارد ہوتی ہیں ان میں بھی صاحب نفس مطمئنہ اپنے رب سے راضی رہتا ہے دُکھ اور رنج کی حالت میں ایک مقام تو یہ ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ طبیعت پر بار تو ہوتا ہے لیکن خدا کی تقدیر کے سامنے انسان جزع و فزع نہیں کرتا اور خاموشی سے سب کچھ برداشت کر لیتا ہے اُسے تسلیم کا مقام کہتے ہیں۔ جو ہر ایک مسلم میں ہونا ضروری ہے لیکن ایک اس سے بلند مقام ہے جسے رضا کا مقام کہتے ہیں جو نفس مطمئنہ کو حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مومن دکھ اور رنج میں بھی ایک لذت اور راحت محسوس کرتا ہے اس خیال سے کہ اس کے رب کی مرضی پوری ہوئی۔ صوفیا نے لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ایک کام ہماری مرضی کے مطابق کر دیتا ہے۔ تو ہمیں خوشی تو ہونی چاہیئے لیکن نہ اتنی جتنی کہ اُس وقت خوشی ہونی چاہیئے جب ایک کام اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کے مطابق کرے۔ اور اس میں ہمیں اپنی مرضی چھوڑنی پڑے اور اپنے رب کی مرضی کو مقدم کرنا پڑے۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ اُن دعاؤں کا جو بندے کیں اور وہ قبول نہ ہوئیں۔ اور خدا نے اپنی مرضی کے مطابق تقدیر وارد کی اور بندہ اس سے راضی رہا ان کا قیامت کے دن جو اجر ملے گا اُس وقت بندہ یہ تمنا کرے گا کہ کاش کہ میری ساری دعائیں ہی نامقبول ہوئی ہوتیں حضرت رابعہ بصری سے کسی نے جو پوچھا کہ آپ کو کبھی غم بھی ہوتا ہے وہ بولیں ہاں اس وقت جب دل میں کوئی غم نہ ہو" غم کا ہونا تو ایک فطرت انسانی ہے لیکن اس غم میں اس خیال سے ایک لذت محسوس کرنا کہ میرے رب کی یہی مرضی ہے اور اس طرح رب کی رضا سے راضی اور خوش رہنا یہ وہ مقام عالی ہے جس سے نفس کو طمانیت اور سکینت کا وہ مقام ملتا ہے جسے جنت کہتے ہیں اور اگر اس موقعہ پر آواز آجائے کہ وادخلی جنتی کہ میری جنت میں داخل ہو جا تو کس قدر عین مناسب حال ہے۔

صرضیہ۔ جس نے خدا کی خوشنودی اور رضا کو حاصل کر لیا اور وہ کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ شریعت کے احکام کی فرمانبرداری اور تقدیری احکام کے سامنے تسلیم و رضا سے۔ پس جو بندہ خدا کے احکام خواہ وہ شرعی ہوں یا تقدیری فرمانبرداری کرتا ہے اور اُن کو پسند کرتا اور اُن سے راضی رہتا اور خوش ہوتا ہے اس کا رب بھی اُس بندہ سے راضی اور خوش ہو جاتا ہے غور کا مقام ہے کہ کس قدر خوش قسمت ہے وہ انسان جس سے اس کا رب راضی ہو جائے۔ یہاں معمولی دنیا کے حاکم جو آج ہیں اور کل نہیں ہیں اُن کی خوشنودی کا پروانہ اگر مل جائے تو انسان خوشی سے پھولا نہیں سماتا لاٹ صاحب ذرا ہنس کر بات کر لیں اور اتنا کہہ دیں کہ دل تم سے ہم خوش ہیں" تو انسان کی خوشی و مسرت کا سمندر لہریں مارنے لگتا ہے۔ تو ذرا خیال کرو کہ احکم الحاکمین رب العالمین کی خوشنودی جسے مل جائے اسکی خوش نصیبی کس قدر عظیم الشان ہے لیکن یہاں راضیہ پہلے رکھا اور مرضیہ بعد میں۔ وجہ یہ کہ راضیہ بندہ کا عمل ہے

اور مرضیہ اس کا نتیجہ۔ اور سچ پوچھو تو بندہ کا یہی وہ عمل ہے جو رضائے الٰہی کو جذب کرتا ہے اس دنیا میں بندہ کا اپنے رب سے راضی ہونا ایک ایسا مشکل مرحلہ ہے کہ بہت کم لوگ ہیں جنہیں یہ میسّر آتا ہے اگر اپنے رب کے شریعت کے احکام بندہ کو پسند ہوں اور وہ اُن سے راضی ہو تو نافرمانی کیسی؟ اور تقدیر کے احکام پر تو بندہ روز اپنے رب سے لڑا کرتا ہے ذرا دکھ پہنچا اور کوئی تقدیر خلاف مرضی جاری ہوئی تو بندہ صاحب آپے سے باہر ہوگئے۔ اور سارا دین و ایمان طاق پر دھرا رہ گیا۔ اور پھر ناشکری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ پس اپنے رب سے راضی ہونا یہ بڑا مشکل مقام ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص سچے دل سے روزانہ یہ کلمات پڑھتا ہے۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوگا۔ اور وہ یہ ہیں کہ رضیت باللہ ربًا و بمحمدٍ رسولًا و بالاسلام دینًا۔ کہ میں راضی ہوگیا۔ اللہ کو اپنا رب مان کر اور محمد صلعم کو رسول مان کر اور اسلام کو اپنا دین قبول کرکے۔ ساری مشکلات کی وجہ یہ ہے کہ الٰہی احکام کی حکمت اور اس پر عمل کے نتائج بندہ سے مخفی ہوتے ہیں اس لئے اسے ٹھوکر لگ جاتی ہے پس بندہ کا اپنے رب سے راضی ہونا ایمان بالغیب کا سب سے اعلیٰ مقام ہے۔ اور اسی لئے اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کا اعلیٰ سے اعلیٰ انعام ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی انعام نہیں۔ اور ایسا بندہ کچھ شک نہیں کہ خدا کی عبودیت کا حق ادا کر گیا۔ اور نفس کی طمانیت اور سکینت کے ساتھ جنت کا وارث ہوگیا۔ پس فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی کی آواز عین حسب حال ہے کہ میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ یہاں بعض لطائف بیان کر دینا بھی میں ضروری سمجھتا ہوں۔

لطیفۂ اوّل تو یہ ہے کہ قرآن سے ہمہ اوست کا مسئلہ غلط ثابت ہوتا ہے قرآن کے رُو سے انسان کا انتہائی مرتبہ جو ہے وہ ربوبیت کا مقام نہیں بلکہ عبودیت کا مقام ہے۔ جیسا کہ فرمایا فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ گویا رب میں اور انسان میں جو جوڑ قائم ہوتا ہے وہ عبودیت کا ہے۔ جو جتنا فرمانبرداری کرے گا اتنا ہی وہ زیادہ عبد بنتا چلا جائے گا۔ اور اتنا ہی وہ فنا فی اللہ یعنی اپنے رب سے واصل ہوتا چلا جائے گا۔ فرمانبرداری یعنی عبودیت کے سوا اور کوئی ذریعہ وصال الٰہی کا نہیں۔ اسی لئے انسان کے لئے انتہائی عزت کا مقام جو جناب الٰہی کے دربار میں حاصل ہو سکتا ہے وہ عبد کا مقام ہے چنانچہ انسان کے متعلق فرماتے ہیں کہ ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون کہ میں نے جن و انس کو نہیں پیدا کیا۔ مگر عبودیت یعنی عبد بننے کے لئے اور اسی لئے ہمارے نبی کریم صلعم کو سب سے معزز خطاب جو ملا وہ عبد کا ملا۔ جیسا کہ فرماتے ہیں۔ وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا۔ اشھد ان محمدًا عبدہٗ و رسولہ میں عبد کو رسول پر بھی مقدم کیا۔ عبد نہ بنتے تو رسول بھی نہ بن سکتے جس طرح رب کے مقابلہ میں عبد انسان کا بہترین مقام عزت ہے۔ اسی طرح رسول کے مقابلہ میں امتی کا لفظ انسان کے لئے بہترین مقام عزت ہے۔ جو جتنا رسول کا فرمانبردار ہے اتنا ہی وہ زیادہ امتی ہے گویا فنا فی الرسول کا مقام امتیت ہی کے کمال کا دوسرا نام ہے اسی کو فرمایا قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ کہ کہدے اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ کے محبوب بن جاؤ گے۔ گویا جو جتنا متبع رسول یعنی دوسرے لفظ میں اُمتی ہے اتنا ہی وہ خدا کی نظروں میں محبوب ہے۔

لطیفۂ دوم یہ ہے کہ اس آیت میں ارجعی الیٰ ربک سے معلوم ہوا کہ مرنے کے ساتھ ہی عالم برزخ میں جنت کی نعما کا آغاز ہو جاتا ہے بلکہ جو نفس مطمئنہ ہوتے ہیں وہ عبودیت کے مقام کو پانے کے بعد اسی دنیا میں اس جنت کو محسوس کر لیتے ہیں کیونکہ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی سے عبد بننا اور جنتی بننا باہم ایک ہی وقت میں معلوم ہوتا ہے یعنی جو عبد بن گیا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔

سُوْرَةُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَهِيَ عِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۃ البلد کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ سورۃ الفجر میں جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر اور اس کی کامیابی کی بشارت ہے۔ اس سورۃ البلد میں بتایا ہے کہ بغیر جدوجہد اور جہاد کے بڑے سے بڑا آدمی بھی کبھی اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس لئے حکم دیا کہ جدوجہد کئے جاؤ کامیابی یقینی ہے کیونکہ تم اُس پیغام کو لے کر کھڑے ہوئے ہو جو نسل انسانی کیلئے حریت و مساوات کا پیغام ہے فرماتے ہیں

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ نہیں میں قسم کھاتا ہوں اُس شہر کی۔

وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ اور تو اُس شہر میں حرمت سے آزاد کیا گیا ہے

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۙ اور باپ کی اور جو اس سے پیدا ہوا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ؕ یقیناً ہم نے انسان کو مشقت کیلئے پیدا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قسموں کی نسبت میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ اُن سے گواہی اور اس میں تاکید اور شدت مراد ہوا کرتی ہے لا سے مراد اس خیال کی نفی ہے جو کسی کے دل میں پیدا ہونا ممکن تھا کہ خدا کے رسول کو تو بغیر کسی تکلیف اور جدوجہد کے اپنے مشن میں کامیاب ہو جانا چاہیئے۔ فرمایا یہ خیال صحیح نہیں گواہی میں شہر مکہ کو پیش فرمایا۔ البلد میں ال خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے اور وہ خصوصیت اس کے حرم ہونے کی تھی فرمایا وہ شہر جو دار الامان اور حرم ہے جس میں ہر ایک جاندار کیلئے امن ہے اور کسی کو تنگ کرنے کا حکم نہیں یہاں تک کہ اس کے درخت تک نہیں کاٹے جاتے۔ مگر انت حل بھذا البلد۔ اس شہر کی حرمت تیرے لئے نہیں رہی اس میں دو حالتوں کا ذکر ہے۔ ایک تو حال کا یعنی مکہ معظمہ میں جو حالات رسول اللہ صلعم کو اس وقت پیش آ رہے تھے دوسرے مستقبل کا یعنی جو حالات آپ کو مکہ میں آئندہ پیش آنے والے تھے فرمایا اس حرم کے اندر جس میں کسی جاندار کو ایذا دینا تو درکنار درخت تک نہیں کاٹے جاتے۔ اسی شہر میں آج تیرے لئے کوئی امن نہیں تجھے طرح طرح کی تکلیفیں اور ایذائیں دی جاتی ہیں تیرے قتل کرنے کے منصوبے ہیں۔ گویا جو شہر تمام دنیا کی مخلوق کے لئے حرم اور دار الامان کا حکم رکھتا ہے اسی حرم کے اندر تیرے لئے کوئی امن نہیں کفار نے اس شہر کی حرمت کو پس پشت پھینک کر تجھے دکھ دینے کا تہیہ کر لیا ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ایک وقت آتا ہے کہ تم بحیثیت فاتح اس شہر میں داخل ہو گے حل کے معنی حرمت سے آزاد ہونا بھی ہیں اور کسی جگہ کامیابی کے ساتھ اترنا بھی ہیں۔ پس انت حل بھذا البلد میں دونوں امور نہایت خوبصورتی سے بیان فرمائے ہیں۔ اس وقت کی موجودہ حالت بھی بتائی کہ باوجود مکہ کے حرم ہونے کے کس طرح آنحضرت صلعم کو دکھ دیا جا رہا تھا۔ اور اس شہر کی حرمت آپ کے لئے کچھ کام نہ آتی تھی۔ اور مستقبل کا بھی ذکر فرمایا۔ کہ یہی مصائب اور ان پر صبر و استقامت کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ تو اسی شہر میں بحیثیت فاتح کے

داخل ہوگا اور تو اس وقت اس شہر کی حرمت سے آزاد ہوگا یعنی چاہے تو اپنے خونخوار دشمنوں کو قرار واقعی سزا دیوے۔ فتح مکہ کے وقت کس خوبصورتی سے یہ پیش گوئی پوری ہوئی! اُسی شہر میں جہاں رسول اللہ صلعم کو امن نہ تھا اور زندگی معرض خطر میں تھی اُسی شہر میں بحیثیت فاتح حضورؐ داخل ہوتے ہیں اور اس وقت آپ چاہتے تو اپنے دشمنوں سے پورا پورا بدلہ لے سکتے تھے لیکن آپ کی رحیمی کی شان نے سب کو معاف کر دیا۔ خیر یہ تو مکہ معظمہ کے حرم ہونے کے ذکر کے ساتھ درمیان میں ایک اور بات پیش فرما دی تھی۔ کہ اس حرم کے اندر تیری حالت اب کیا ہے اور آئندہ کیا ہوگی۔ اور نیز یہ کہ مستقبل کی کامیابی تیری مشقت اور جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہے لیکن دراصل پہلی گواہی جو اس شہر کے حرم ہونے کی تھی اس کے ساتھ دوسری گواہی **ووالدٍ وما ولد** کی پیش فرمائی ہے یعنی باپ اور جو اس سے پیدا ہوا یعنی بیٹا۔ یہ باپ اور بیٹا کون تھے؟ صاف ظاہر ہے کہ یہاں وہی باپ اور بیٹا مراد ہو سکتے ہیں جن کا تعلق اس شہر سے تھا۔ اور وہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل تھے جنہوں نے اس شہر کو بسایا اور جن کی وجہ سے یہ شہر حرم بنا۔ اُن کو نکرہ میں بیان کرنا تعظیم کے لئے ہے یعنی یہ باپ اور بیٹے اس قدر صاحب عظمت و شان تھے اور مکہ کے لوگ انہیں ایسا جانتے اور پہچانتے تھے۔ کہ کسی معرفہ یعنی شناخت کروانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جواب قسم ہے کہ **لقد خلقنا الانسان فی کبد** ہم نے انسان کو مشقت کے لئے پیدا کیا ہے یعنی انسان کو ایسی حالت پر پیدا کیا ہے کہ وہ مشقت اور جدوجہد سے الگ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ضرور ہے کہ وہ مشقت اور محنت کے ساتھ ایک حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف ترقی کرے۔ چنانچہ شہادت کے طور پر اسی شہر مکہ کو لے لو جو تمہارے سامنے ہے۔ اور آج اس قدر محترم ہے اس کے احترام کے بانی مشہور باپ اور بیٹے کی مثال پر غور کرو۔ کہ خدا کی راہ میں کس قدر قربانیوں کے بعد وہ اس قابل ہوئے کہ خدا نے اُن کو اس قدر دنیا و آخرت میں عزت بخشی۔ کہ آج ایک عالم کی گردنیں اُن کی عظمت کے آگے جھک جاتی ہیں۔ اور ان کے احترام کے ساتھ اس شہر کا احترام کس قدر مقبول عالم ہو رہا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان باپ بیٹے کی قربانیاں کس قدر مشکلات اور مشقت سے پُر تھیں! حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کے ہاتھوں جو دُکھ اٹھانے پڑے اور مصائب کی جس آگ میں سے گذرنا پڑا وہ محتاج بیان نہیں لیکن خاص اس شہر مکہ کے لئے جو قربانیاں انہوں نے کیں وہ کس قدر بے نظیر ہیں! بوڑھی عمر کا اکلوتا بیٹا اسمٰعیل آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب تھا حکم ہوا اسے اور اس کی ماں کو حجاز کے ریگستان میں جو ان کے مسکن سے تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلہ پر تھا چھوڑ آؤ۔ یہ وہی مقام تھا جہاں کعبہ کی جو دنیا میں سب سے پہلا خدا کی عبادت کا گھر بنا تھا بنیادیں باقی رہ گئی تھیں کعبہ کی تعمیر اور مکہ کی آبادی کے لئے یہ پہلی قربانی تھی جو حضرت ابراہیمؑ کو کرنی پڑی کوئی ریل نہ تھی۔ موٹر نہ تھی۔ گاڑی نہ تھی۔ ڈاک نہ تھی۔ اونٹوں کا سفر۔ فاصلہ اس قدر دور دراز۔ پھر آگے وہاں کوئی شہر نہیں، آبادی ہوٹل نہیں۔ سرائے نہیں۔ کھیتی نہیں۔ باغ نہیں۔ حتیٰ کہ پانی تک نہیں۔ ایک بے آب و گیاہ ریگستان۔ ہُو کا مقام، مخلوق کا نام و نشان نہیں۔ ہمارے بچے انگلستان جاتے ہیں۔ ریل کا سفر نہایت آرام دہ۔ جہاز کا سفر جنت کی طرح پُر بہار۔ کونسا عیش و نشاط کا سامان ہے جو جہاز میں نہیں ہوتا۔ پھر بھی تاکید ہوتی ہے کہ بیٹا کنارے پہنچتے ہی تار دینا۔ پھر آگے انگلستان باغ ارم کی طرح راحت و آرام کا مسکن۔ لیکن والدین کا دل ہوتا ہے بیٹھا جاتا ہے ہفتہ بھر ولایت کی ڈاک کی طرف آنکھیں لگی رہتی ہیں پھر سال دو سال کا عرصہ کاٹنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن یہاں سفر اس قدر دشوار، رستہ اس قدر خراب، نہ ڈاک نہ تار، فاصلہ اس قدر دور دراز، آگے

جہاں چھوڑنے کا حکم ہے وہاں نہ کوئی شہر نہ آبادی نہ کھانے کیلئے غلّہ نہ پینے کے لئے پانی۔ ارد گرد کسی جاندار کا نشان تک نہیں پھر یہ کہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ اے ابراہیم تجھ پر سلام۔ تیری قربانی کی یاد سے میرا تو دل کانپ اٹھتا ہے جان لرز جاتی ہے۔ کیا ایمان تھا جس نے اس حکم کی تعمیل میں ذرا بھی چون و چرا نہ کی۔ اس وحشت بھرے بیابان میں پہنچ کر ہاجرہ حیران ہو جاتی ہیں بچہ گود میں ہے نہ کوئی گھر نہ چھت نہ جھونپڑا نہ چھپّر۔ نہ درخت نہ پانی۔ دھوپ اور بارش سے بچنے کیلئے بھی تو کوئی سامان نہ تھا۔ کچھ کھانا اور پانی دیکر حکم الٰہی کے ماتحت حضرت ابراہیم رخصت ہونے لگے۔ تو حضرت ہاجرہ نے دریافت کیا کہ ہمیں کس پر چھوڑ چلے۔ فرمایا اللہ پر۔ کہا۔ جائیے ہم اللہ سے راضی ہیں وہ ہمیں ضائع نہ کرے گا۔ اللہ اللہ بیابان ریگستان نہ دانہ نہ پانی۔ ایک کمزور عورت اور اُسکا ایک ننھا سا بچہ۔ اور آبادی ختم۔ کیا ایمان حضرت ہاجرہ کا تھا! اے ہاجرہ تجھ پر سلام! کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ دوسری عورت ہوتی تو رو رو کر چیخ چیخ کر خدا جانے کیا حال کرتی، سبحان اللہ کیا ایمان تھے۔ جن کے کرشمے یہ نظر آرہے تھے۔ کھانا پانی جلد ختم ہو گیا۔ خود تو برداشت کرتی رہیں لیکن بچہ پیاس سے بے حال ہو گیا چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کہیں پانی نہ تھا۔ پاس ہی دو پہاڑیاں تھیں صفا اور مروہ۔ ایک پہاڑی پر چڑھ کر نظر دوڑائی۔ کہیں پانی یا آبادی کا نشان نظر نہ آیا۔ اس سے اتر کر دوسری پہاڑی پر چڑھنا چاہا تو نشیب میں بچہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اس لئے دوڑ پڑیں۔ اور دوڑ کر دوسری پہاڑی پر چڑھ گئیں وہاں سے بھی کہیں پانی کا نشان نظر نہ آیا۔ خیال آیا کہ پہلی پہاڑی پر پھر چڑھ کر دیکھوں شائد اب کچھ نظر آئے۔ نشیب میں پھر دوڑنا پڑا۔ کیونکہ نشیب سے بچہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ پہلی پہاڑی سے پھر دیکھا کہیں پانی نظر نہ آیا۔ اسی طرح دل کی اُمید و بیم کی حالت نے کئی مرتبہ دوڑایا اور بار بار اُن پہاڑیوں پر چڑھ کر دیکھا۔ کہیں پانی نظر نہ آیا۔ آخر تھک کر بچہ کے پاس آن بیٹھیں۔ وہ زمین پر پڑا ہوا پیاس کی تکلیف سے ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ اُس کی یہ کرب کی حالت دیکھی نہ گئی۔ جناب الٰہی کی چوکھٹ پر اُن کی روح پانی کی طرح گری۔ وہاں کی ادا ہی یہی ہے کہ جب بندہ بے بس ہو کر چوکھٹ پر آن گرے تو اپنی رحمت سے فائدہ دیتے ہیں۔ ہاجرہ کی آہ و زاری سے رحمت کے چشمہ میں جوش آیا۔ حضرت ہاجرہ کو کشفی نظر میں ایسا معلوم ہوا کہ فرشتہ نے اُن کے سامنے زمین پر ٹھوکر ماری اور پانی کا چشمہ بہ پڑا۔ آنکھ کھولی تو دیکھا کہ بچہ جہاں ایڑیاں رگڑ رہا تھا وہاں سے ریت ہٹ گئی ہے اور اس میں سے پانی رِس رہا ہے انہوں نے جلدی سے ریت ہٹائی تو پانی بڑے زور سے اُبل کر نکلنا شروع ہوا۔ حضرت ہاجرہ نے فوراً چاروں طرف پتھر رکھ کر پانی کو گھیر لیا۔ حضرت نبی کریم صلعم فرماتے ہیں کہ انسان کمزور ہوتا ہے حضرت ہاجرہ کے پانی کو گھیر لینے سے پانی کنوئیں کی شکل میں رک کر رہ گیا۔ ورنہ ہاجرہ اور اسمٰعیل کی تکلیف پر جس زور سے رحمت الٰہی نے جوش مارا تھا۔ اگر حضرت ہاجرہ نہ روکتیں تو ہمیشہ کے لئے وہاں دریا بہتا۔ مقرب بندوں کی ذرا سی غلطی بھی حساب میں ہوتی ہے۔ ہاجرہ جیسی عظیم الشان متوکل علی اللہ خاتون کا پانی کو روکنا حساب میں آگیا۔ دنیا داروں کی نگاہ میں تو بڑی دانائی کی۔ مگر توکل کے اعلیٰ مقام کے لحاظ سے غلطی ہو گئی۔ خیر پانی تو مل گیا۔ اب کھانے کا سامان جناب الٰہی نے کرنا تھا۔ عرب کے ملک میں قافلے چلا کرتے ہیں اور چونکہ اس ملک میں پانی عنقا کا حکم رکھتا ہے۔ اس لئے قافلے وہیں ٹھیرا کرتے ہیں۔ جہاں پانی ہو۔ اس میدان میں پانی نہ تھا اس لئے کبھی کوئی قافلہ نہ ٹھیرتا تھا۔ اب کے دفعہ جو ایک قافلہ وہاں سے گذرا تو دیکھا کہ پانی کا چشمہ اُبل رہا ہے انہوں نے ڈیرہ ڈالدیا

انہیں جب معلوم ہوا کہ اس چشمہ پر ایک بی بی بمعہ اپنے بچہ کے رہتی ہیں تو انہوں نے اسے بہت غنیمت سمجھا اور ان سے عرض کی کہ آپ اسی چشمہ پر رہ کر اس کی حفاظت کریں ہم آپ کو یہاں جھونپڑا بنا دیتے ہیں اور آپ کے کھانے کا بھی انتظام کر دیں گے۔ چنانچہ مکان بھی بن گیا۔ اور وہ کھانے کے لئے بھی بہت کچھ خدمت کر گئے۔ عرب کے تمام ملک میں انہوں نے شہرت دے دی کہ فلاں جگہ ایک بہت عمدہ چشمہ نکل پڑا ہے چنانچہ اب جو قافلہ آتا ہے وہاں مقام کرتا ہے اور حضرت ہاجرہ کی خدمت کرتا ہے۔ غرضکہ نہایت آرام اور راحت سے زندگی بسر ہونے لگی۔ لیکن ابھی قربانیوں کا خاتمہ نہیں ہوا۔ مکہ شہر کی تو حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کے مکان سے بنیاد پڑ گئی۔ لیکن کعبہ کی بنیادوں کے اٹھانے کے لئے ایک اور زبردست قربانی کی ضرورت تھی۔ مکہ کی بنیاد ڈالنے کے لئے تو ایک بچہ کے باپ اور ماں کی قربانی کی ضرورت تھی۔ جب اس کی بنیاد پڑ گئی تو کعبہ کی بنیادوں کو اٹھانے کے لئے خود اس بچہ کی قربانی کی ضرورت تھی۔ اور ساتھ ہی اس کے باپ کا پھر امتحان لینا منظور تھا۔ حضرت اسماعیل جوان ہوئے تو جناب الٰہی نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا کہ ذرا جا کر اب دیکھ کہ تمہاری بیوی اور بچہ کی ہم نے کس طرح حفاظت اور پرورش کی ہے۔ حضرت ابراہیم تشریف لے گئے تو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جوان بیٹے کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اور بیٹا بھی کیسا نیک اور صالح۔ لیکن کیا خبر تھی کہ ابھی کوئی اور امتحان باقی ہے۔ خواب میں دیکھا کہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں نبی کا خواب خدائی حکم ہوتا ہے بیٹے سے پوچھا کہ میں نے ایسا خواب دیکھا ہے اب تمہاری کیا رائے ہے۔ بیٹے نے وہ جواب دیا۔ جو تاریخ عالم میں بے مثال ہے۔ یٰابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین۔ کہ اے میرے باپ جو خدا کا حکم ہوا ہے اُسے کر ڈالیے آپ انشاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے باپ کی فرمانبرداری اور خدا کے حکم کے آگے بے مثال قربانی کی نظیر اس سے بہتر کیا تاریخ عالم پیش کر سکتی ہے؟ آج کا زمانہ ہوتا تو بیٹا کہتا کہ بڈھے کا دماغ پھر گیا ہے اسے جو خواب نظر آتا ہے الٹا ہی نظر آتا ہے وہ گیا خدا۔ تو آج اُس کے حکموں کی تابعداری اور ان کیلئے قربانی کون کرتا ہے۔ ملک اور قوم۔ خاندان اور اپنے نفس کے لئے قربانیاں ہوتی ہیں کیونکہ ان سب کے ساتھ انسان کو تعلق ہے اس میں اپنا اور اپنے خاندان اور اپنی قوم کا نفع نظر آتا ہے لیکن خدا کے لئے قربانی آج کون کرے جس میں بظاہر کوئی دنیوی نفع نہیں بلکہ سراسر نقصان ہی نقصان بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ الغرض باپ بیٹے دونوں اس قربانی کے لئے تیار ہو گئے۔ بیٹا گلا کٹانے کے لئے سر بسجود ہو گیا اور باپ خدا کے حکم کے ماتحت بیٹے کا گلا کاٹنے کھڑا ہو گیا۔ چھری ہاتھ میں تھی لیکن ہر ایک سلیم الفطرت باپ جانتا ہے کہ جو چھری بیٹے کے گلے پر چلتی ہے دراصل وہ پہلے باپ کے دل اور احساسات پر چلتی ہے۔ اللہ اللہ وہ کیا ایمان تھا۔ جو سب سے زیادہ زبردست فطری محبت پر چھری چلانے لگا تھا عین اس وقت رحمت الٰہی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا بس امتحان ہو چکا۔ قربانی مقبول ہو گئی۔ بیٹے پر چھری چلانے سے مراد یہی تھا۔ کہ خدا کی محبت اور فرمانبرداری کے لئے تمام ماسوی اللہ پر چھری پھیر دو۔ جس نے بیٹے کے گلے پر چھری پھیری اُس نے درحقیقت کل ماسوی اللہ پر چھری پھیر دی۔ کیونکہ اولاد سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی۔ اور اولاد بھی وہ جو ایک نہایت بوڑھے کا اکلوتا بیٹا ہو۔ ابھی تک حضرت اسحاق پیدا نہ ہوئے تھے اس کے بعد حکم ہوتا ہے جس کے ماتحت کعبہ کی دیواریں اٹھتی ہیں۔ اور انہی باپ بیٹے کے احترام میں یہ شہر حرم بنتا ہے فرمایا پس

اُن باپ بیٹے کی قربانیوں اور جدوجہد پر نظر ڈالو کہ کس قدر مشکلات اور مصائب کے بعد خدا کی رضا اور کامیابی و عزت کے وارث ٹھہرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اگر دنیا و آخرت میں مراتب عالیہ اور کمالات حاصل کرنا چاہتا ہے تو پھر مشقت اور مصائب اور جدوجہد کے بحرِ ذخار میں سے گذر کر ہی کامیاب ہو سکتا ہے خدا کا کتنا ہی محبوب اور مقرب کیوں نہ ہو مشقت اور جدوجہد کے سوا چارہ نہیں پس اے محمد رسول اللہ صلعم تو بھی اپنی امت کے لئے روحانی باپ ہے اور تیری امت تیرے روحانی بیٹے ہیں۔ مانا کہ اس شہر میں تمہیں امن نہیں لیکن یہ سب تکالیف برداشت کرنی ضروری اور قربانیاں دینی ضروری ہیں۔ جب تک ابراہیم کی طرح تم اور اسماعیل کی طرح تمہاری جماعت ہر قسم کی قربانیوں کے لئے تیار نہ ہوں گے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ وقت آتا ہے کہ تم بحیثیت فاتح کے اس شہر میں داخل ہو گے اور پھر دوبارہ یہ حرم بتوں اور مشرکوں کے قبضہ سے نکل کر خدائے واحد کی پرستش کا معبد بنے گا۔ اور قیامت تک کے لئے دارالامان بنے گا۔ لیکن یہ تمام کامیابیاں اُسی قربانی کو چاہتی ہیں جو باپ بیٹا یعنی ابراہیم و اسماعیل نے دی تھیں۔

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۘ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کو قدرت حاصل نہیں۔

فرمایا تم کو جو آج حرم کے اندر ستا رہے ہیں۔ کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ان پر کسی کو قدرت حاصل نہیں۔ اگرچہ یہ خیال ہے تو بہت غلط خیال ہے وقت آتا ہے کہ وہ

يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۘ کہے گا کہ میں نے بہت سامال برباد کر دیا۔

یعنی یہ لوگ جو آج خدا کے رسول کی مخالفت میں بے شمار روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ اور گمان کر رہے ہیں کہ ان پر کسی کو قدرت حاصل نہیں ایک دن پچھتائیں گے۔ اور اپنی ناکامیوں پر دست افسوس ملیں گے اور کہیں گے کہ اتنا مال ہم نے ناحق برباد کیا۔ کیسی صاف پیش گوئی ہے اور کیسی سچی نکلی۔ آج بھی جو لوگ اسلام کے خلاف روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ اس خدائی آواز کو سن رکھیں۔

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ ۘ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اُسے کوئی نہیں دیکھتا۔

یعنی جو کچھ نتیجہ نکلے گا اعمال پر مبنی ہوگا۔ وہ شخص غلطی کرتا ہے جو ناحق پر ہے اور ظلم کرتا ہے اور چالاکی اور شرارت اور زبردستی اور ہتھکنڈوں سے غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے فرمایا خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے کوئی بدعملی اور زبردستی اُس سے مخفی نہیں۔ وہ ان باتوں کا ضرور بدلہ دے گا۔ ظلم کرنے والا یہ نہ سمجھے کہ خدا نہیں دیکھ رہا

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۙ کیا ہم نے اُس کیلئے دو آنکھیں نہیں بنائیں اور زبان اور دو ہونٹ۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ اور ہم نے اُسے دونوں اُونچے رستوں کی طرف ہدایت کی۔

دنیا میں انسان کو منزل مقصود پانے کے لئے تین امور کی ضرورت ہوتی ہے خواہ وہ منزل مقصود دنیا کی ہو خواہ آخرت کی۔ دنیا میں سفر کے وقت اگر منزل مقصود کے رستہ کا علم نہ ہو تو اس کے متعلق علم حاصل کرنے کیلئے تین طریق ہوا کرتے ہیں اوّل تو سفر کرنے والا خود دیکھے اور نظر دوڑائے خواہ وہ نظر اس جسمانی آنکھ کی ہو یا عقل اور قیاس کی۔ دوم کسی واقف کار سے زبان اور ہونٹوں سے پوچھے یعنی دریافت کرے تاکہ مزید تشفی ہو جائے سوم گورنمنٹ کی طرف سے یہ ہونا چاہئے کہ وہ منزل مقصود کیلئے شاہراہ بنا دے اور اگر اور بھی رستے اس راہ کے سوا نکلتے ہوں جو منزل مقصود کو نہیں پہنچتے۔ تو مسافروں کی ہدایت کے لئے کوئی اعلان شائع کر دے یا لکھ کر لگا دے جیسا کہ آج کل چوک میں ڈنڈوں پر کتبے اور اعلان لکھے ہوئے لگے ہوتے ہیں کہ یہ سڑک فلاں طرف کو جاتی ہے۔ اور یہ سڑک فلاں شہر کو جاتی ہے پس مسافر کا فرض ہے کہ اوّل تو خود رستہ کو دیکھے اور عقل دوڑائے دوم کسی سے رستہ کے متعلق دریافت کرے۔ لیکن ان دو ذرائع میں غلطی لگ جانے کا امکان ہے اس لئے وہ جب گورنمنٹ کی طرف سے کوئی شاہ راہ بنی ہوئی دیکھے اور ساتھ ہی اس کا اعلان بھی دیکھے کہ یہ رستہ فلاں طرف جاتا ہے اور وہ رستہ فلاں طرف تو ضروری ہے کہ اس ہدایت سے فائدہ اٹھا کر منزل مقصود کی راہ کو اختیار کرے خواہ وہ مشکل اور کٹھن ہی کیوں نہ ہو پس یہاں سفر اُخروی یعنی دین کے رستہ کے متعلق بھی جناب الٰہی نے انہی تین طریقوں کی طرف توجہ دلائی ہے اوّل تو یہ کہ انسان خدا تک پہنچنے کی راہوں کو اپنی عقل کی آنکھ سے خود پرکھے۔ دوم یہ کہ مزید تشفی کے لئے پھر دوسرے واقف کار یعنی خدا رسیدہ لوگوں اور دینی علم اصحاب سے دریافت کرے سوم جب خدا کوئی ہدایت کسی رسول کی معرفت بھیجے اور حق اور باطل کی راہوں کا امتیاز جناب الٰہی کی طرف سے ہو جائے اور خدا کی طرف سے صحیح رستہ کا اعلان ہو جائے تو پھر اس راہ کو اختیار کرے خواہ وہ کتنی ہی کٹھن ہو۔ نجد کہتے ہیں اُونچی زمین کو یا اونچے رستہ کو۔ یہاں شاہراہ مراد ہے اُونچا اُسے اس لئے کہا ہے کہ نیکی اور بدی کے رستے آسانی سے نظر آجاتے ہیں۔ جیسے ایک اونچا رستہ سب کو نظر آجاتا ہے کیسی خوبصورت مثال سے وحی کی ضرورت کو ثابت کیا ہے اور عقل، نقل اور وحی تینوں کا باہمی تناسب اور تعلق کیسی خوبصورتی سے سمجھایا ہے پہلے انسان اپنے دماغ اور عقل سے کام لے۔

پھر انسان دوسرے کے دماغوں اور عقلوں سے فائدہ اُٹھاوے۔ لیکن ان دو تو ذرائع کے باوجود ممکن ہے کہ صحیح راہ نہ ملے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ ہدایت آئے اور وہ نیکی اور بدی کے راہوں کی نشان دہی کرے سڑک بنانے والے کا یہ اعلان ایسا یقینی ہوتا ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اسی لئے جب قرآن دنیا میں آیا تو اس نے ہدایت کا اس طریق پر اعلان کیا کہ الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ کہیں خدا سب سے بڑھ کر جاننے والا یہ اعلان کر رہا ہوں کہ یہ کتاب ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ یہی سیدھا رستہ اور ہدایت نامہ ہے متقیوں کے لئے۔ اس راہ کے سیدھا اور صحیح ہونے کے متعلق جناب الٰہی کے اس اعلان نے عقل و نقل کی کمی کو پورا کر کے انسان کو یقینی راہ منزل مقصود کی دکھلا دی۔ جیسا کہ فرمایا اولٰئِكَ عَلٰى

ھدًی من ربھم واولٰئِك ھم المفلحون۔ یہ لوگ سیدھے رستہ پر پڑ لئے اور کامیابی کی منزلِ مقصود کو پا گئے پس بڑی بابرکت وہ راہ ہوتی ہے جو منزلِ مقصود کو لے جاتی ہے اسی لئے اس پر چلنے والوں کا نام اسی سورت میں آگے چل کر اصحاب المیمنۃ فرمایا کہ دائیں ہاتھ کو جانے والے لوگ یا برکت کی جانب جانے والے لوگ اور جو دوسرے رستہ پر پڑ لئے اُن کا نام اصحاب المشئمۃ۔ یعنی بائیں ہاتھ کو جانے والے لوگ یا بدبختی کی جانب جانے والے لوگ گویا ایک راہ تو دائیں طرف جارہی ہے جو منزلِ مقصود کو جارہی ہے اور اس لئے بابرکت ہے۔ اور دوسری راہ بائیں طرف جارہی ہے جو گمراہی و ہلاکت کی طرف لیجاتی ہے۔ اس لئے وہ بدبختی کی راہ ہے لیکن قاعدہ ہے کہ اترائی کی طرف جانے والی راہ ایک پست ہمت آدمی کو بہت پسند آتی ہے اور چڑھائی کا رستہ اُسے بہت مشکل نظر آتا ہے۔ چونکہ گمراہی کا راستہ اترائی یعنی تنزل کا رستہ ہوتا ہے اسلئے ایک پست ہمت سہولت پسند آدمی جو مشکلات میں پڑنا نہیں چاہتا اس راستہ کو جلدی اختیار کرتا اور آخر کار منزلِ مقصود سے دُور جا پڑتا اور ہلاک ہوجاتا ہے۔ اور ہدایت و منزلِ مقصود کا رستہ چونکہ چڑھائی یعنی ترقی کا راستہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو پست ہمت سہولت پسند ارام طلب آدمی اختیار کرنے سے گھبراتا ہے۔ حالانکہ وہی اس کے لئے بہتر اور کامیابی کا راستہ ہوتا ہے اور اسی پر چل کر وہ منزلِ مقصود کو پا سکتا ہے اسی لئے ارشاد ہوتا ہے:۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ سو وہ اُونچی گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا۔

یہ وہی ترقی اور کمال کا راستہ ہے۔ جو قرآن نے دکھایا ہے لیکن اس میں مشکلات اور مشقت کا سامنا ہوتا ہے جیسا کہ ایک اونچی گھاٹی پر چڑھنے والے رستہ میں پیش آیا کرتی ہیں۔ پس یہ انسان کی بدبختی اور نامرادی ہوتی ہے اگر وہ اس راستہ کو اختیار کرنے سے ہچکچائے اور اپنی پست ہمتی اور سہولت پسندی کی وجہ سے اس کی چڑھائی سے گھبرا جائے۔

وَمَا أَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ اور تُو نے کیا سمجھا کہ اُونچی گھاٹی کیا ہے۔

یہ طرزِ کلام تاکید اور اہمیت جتلانے کے لئے ہوا کرتا ہے اب ترقی کی اُس اُونچی گھاٹی کی جس پر قرآن انسان کو چڑھانے کے لئے آیا تھا جناب الٰہی اگلی آیات میں خود ہی تشریح فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اُونچی گھاٹی پر چڑھنا کیا ہے وہ یہ ہے:۔

فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ گردن کا آزاد کرنا۔

گویا انسانی ترقی و کمال کی گھاٹی کا پہلا قدم اور پہلا زینہ گردنوں کی آزادی ہے یعنی غلامی سے آزادی جسے اسلامی اصطلاح میں حریت کہا گیا ہے کس قدر افترا ہے اُن لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ اسلام نے غلاموں کی آزادی کا انسداد کلی طور پر نہ کیا میں کہتا ہوں کہ قرآن نے ہدایت اور گمراہی کے دو رستے جو تمام کئے ہیں ان میں ہدایت کے رستہ کا پہلا زینہ حریت یعنی غلاموں کی آزادی کو قرار دیا ہے اور پھر نسل انسانی کو ایک قسم کی نہیں بلکہ ہر قسم کی غلامی سے آزاد کیا ہے جسے میں دس حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ (۱) ایک تو یہی غلامی جس کا رواج ہزارہا سال سے دنیا میں چلا آتا تھا (۲) دوم معبودان باطلہ کی غلامی

یعنی شرک (۳) سوم نسلی غلامی یعنی کالے اور گورے اور ذاتوں اور قوموں کی بڑائی چھوٹائی کا امتیاز (۴) چہارم ذہنی غلامی یعنی علما اور مشائخ کی کورانہ تقلید (۵) پنجم رواج کی غلامی (۶) ششم جہالت اور اوہام باطلہ کی غلامی (۷) ہفتم سیاسی غلامی یعنی شخصی حکومتوں کا وجود اور ان کا استبداد (۸) اقتصادی غلامی یعنی سرمایہ داروں کا ظلم مزدوروں پر اور سود کی لعنت (۹) معاشرتی غلامی یعنی عورت پر مرد کا ظلم۔ (۱۰) نفس کی غلامی یعنی جذبات و شہوات کی غلامی مجھے تو بالفعل یہ دس قسم کی غلامیاں خیال میں آئی ہیں۔ ممکن ہے تحقیقات کرنے پر اس سے بھی زیادہ نکل پڑیں۔ قرآن کریم نے ان سب سے آزادی عطا فرمائی اور ہمارے نبی کریم صلعم نے اپنے پاکیزہ نمونہ سے ان تمام قسم کی غلامیوں سے انسان کو آزاد کرکے دکھایا۔ بعد میں اگر لوگ غلام رکھنے لگے یا سیاسی غلامی کو واپس لے آئے۔ یا اقتصادی غلامی یعنی سود کی لعنت کو اپنے اوپر وارد کرنے کا شوق دامنگیر ہو گیا یا نفس کی غلامی پر شیدا ہو گئے وغیرہ وغیرہ تو اس کا ذمہ دار نہ قرآن ہو سکتا ہے نہ محمد رسول اللہ صلعم فذکر انما انت مذکر لست علیہم بمصیطر۔ خدا کا تو محمد رسول اللہ صلعم کو یہی حکم تھا کہ تو نصیحت کر اور یہ پیغام پہنچا دے کہ ایسا کرنا تیرا فرض ہے تو کوئی ان پر داروغہ نہیں یعنی ان کے عملوں کا ذمہ دار نہیں تعجب ہے اُن علما اور فقہا پر جو دن رات حریتِ اسلامی کے راگ گاتے ہیں اور پھر غلامی کے جواز کے بھی فتوے دیتے ہیں اور سچ پوچھو تو ان میں سے اکثر نے پبلک کی ذہنیت کو اپنا غلام بنا رکھا ہے اور خود نفس کے غلام بنے ہوئے ہیں۔

أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝ یا بھوک کے دن میں کھانا کھلانا یا روزی کا سامان کرنا۔

يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ یتیم قربت والے کو۔

أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ یا مسکین مٹی سے لتھڑے ہوئے کو۔

حریتِ اسلامی کے پہلے زینہ کے بعد یہ دوسرا زینہ مساواتِ اسلامی کا ہے مساوات کا جو طریق ان آیات میں مذکور ہے بالکل عملی طریق ہے بڑے اور چھوٹے امیر اور غریب کا مل کر نماز میں کھڑا ہونا اور ایک ہی لباس اور حالت میں میدان عرفات میں جا حاضر ہونا یہ اُس مساوات کا مظاہرہ ہے جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے لیکن عملی پہلو کے لئے ان آیات نے جو طریق بتایا ہے اس سے بہتر ممکن نہیں اور وہ یہ ہے کہ قوم کے اس طبقہ کو جو نیچے گر گیا ہو ابھار کر برابر سطح پر لا کر کھڑا کیا جائے سورۃ الفجر میں میں عرض کر چکا ہوں کہ یتیم وہ ہوتا ہے جس میں روزی کمانے کی ابھی اہلیت نہیں پیدا ہوئی تھی اور اس کے لئے وہ دوسروں کا محتاج تھا۔ کہ اس کا وہ سہارا اٹھ گیا جو اس کی روزی کا کفیل تھا۔ ایک بچہ جس کا باپ مر گیا اسی لئے یتیم کہلاتا ہے اور مسکین وہ ہے جس میں روزی کمانے کی اہلیت موجود تھی اور وہ روزی کما تا تھا لیکن روزی کمانے کے ذرائع اس سے جدا ہو گئے۔ مثلاً ایک محنت کرنے والا شخص اندھا ہو گیا مفلوج ہو گیا۔ ہاتھ کٹ گیا۔ ملازمت چھوٹ گئی۔ تجارت میں دیوالہ نکل گیا۔ درزی کی مشین چوری ہو گئی۔ کاشتکار کے بیل چوری ہو گئے وغیرہ وغیرہ یہ دو طبقے ہیں جن کے گرنے سے اور ان کی طرف توجہ نہ

کرنے سے آخرکار قوم گر جاتی اور مفلس اور ذلیل ہو جاتی ہے پس ان کی روزی کا سامان کرکے ان کو اُبھارنا یہی حقیقی مساوات ہے۔ بھوک کے دن کی خصوصیت کا یہ مطلب نہیں کہ بھوکا ہو تو روٹی کھلادی ورنہ پروانہ کی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ یتیم اور مسکین کی دستگیری وقت پر کرنا چاہیئے۔ جب ان کو احتیاج اور ضرورت ہو اُس وقت تو انسان کام نہ آئے اور اُن کی ضروریات کا اس وقت تو انتظام نہ کرے اور بعد میں پھر پھڑاتا پھرے یہ بالکل لغو طریق ہے جو انتظام وقت پر ہو وہی مفید ہوتا ہے پس یتیم اور مسکین کی روزی کا سامان کرنا تاکہ یتیم پرورش پاکر اور مسکین اپنی حالت کو درست کرکے سوسائٹی کے مفید اور برابر کے ممبر بن سکیں یہی مساوات اسلامی ہے یعنی گرے ہوئے طبقہ کو اٹھا کر اپنے برابر کھڑا کرنا۔ زبان سے بھائی بھائی کرتے پھرنا اور اس کی گری ہوئی حالت کو اُبھارنے کی کوشش نہ کرنا یہ مساوات اسلامی ہرگز نہیں۔

بدقسمتی سے ان آیات میں ہمارے علما کو بہت سی غلط فہمیاں ہوگئی ہیں ایک تو اطعام سے مراد لے لیا کہ دس پانچ مشٹنڈے مسجد کے طالب علموں یا درویشوں کو روٹی کھلادی اور سبکدوش ہو گئے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ اطعام سے مراد یہاں روزی کا سامان کرنا ہے ایک دن کھانا کھلانے سے کسی کی بھوک کے دن تو ختم نہیں ہوجاتے۔ یہاں تو بھوک کے دنوں میں برابر طعام کا ذکر ہے۔ کسی نے ایک دن روٹی کھلادی۔ یا بہت سے لوگوں نے مہینہ بھر روٹی کھلادی تو اس سے بھوک کے دن تو ختم نہیں ہوتے بلکہ بڑھ گئے۔ کیونکہ بھیک کا ٹکڑا کھانے کی عادت پڑ گئی پس بھوک کے دنوں کا اطعام تو اسی طرح ہو سکتا ہے۔ کہ اس کی بھوک کا مستقل انتظام کیا جائے۔ اور وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ان کی روزی کا سامان اس طریق پر کیا جائے کہ بھوک کے دن ان سے دور ہو جائیں۔ اسی طرح یتیماً ذا مقربة سے ہمارے مولویوں نے مراد رشتہ دار یتیم لے لئے گویا اسلامی ہمدردی کو خاندان اور کنبہ تک محدود کر دیا۔ اور یہ اسلام کی عالمگیری کی صریح ہتک ہے انہوں نے ذا مقربة کو یتیم کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ لیکن اگر ذا مقربة یتیم کی خصوصیت ہے تو پھر اسی قسم کی ترکیب مسکیناً ذا متربة کی بھی ہے۔ لہذا اس میں بھی ذا متربة مسکین کی خصوصیت ماننی پڑے گی جس کے معنے یہ ہوں گے کہ ایسے مسکین کے کھانے کا سامان کرو جو مٹی میں ملا ہوا ہو۔ یا جس پر مٹی لگی ہوئی ہو۔ اگر وہ مٹی میں ملا ہوا نہ ملے تو پھر اطعام کی ضرورت نہیں۔ اور یہ صریح طور پر غلط ہے پس یہاں نہ ذا متربة کسی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے نہ ذا مقربة دونوں علی الترتیب مسکین اور یتیم کی حالت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مسکین کی حالت کا اظہار ذا متربة سے کیا یعنی وہ شخص ایک عزت کے مقام سے نیچے گر کر مٹی میں مل گیا ہے اس لئے قابل دستگیری ہے اس کی حالت کو عبرت کی شکل میں پیش کرکے مسلمانوں کے دل پر اثر ڈالنا چاہا ہے۔ اسی طرح یتیم کی حالت کا اظہار ذا مقربة سے کیا یعنی یتیم جو ہوتا ہے وہ قربت والا ہوتا ہے یعنی قوم کے ہر ایک فرد سے اس کی نسبت ایک قریبی کی ہے۔ گویا یتیم ہر ایک مسلمان کا رشتہ دار ہے۔ ایک بچہ تو صرف اپنے باپ کا بیٹا یا اپنے رشتہ داروں کا قریبی ہوتا ہے لیکن ایک یتیم قوم کا بیٹا ہے۔ ہر ایک مسلمان اس کا دینی باپ ہے۔ اسے قربت ہر ایک مسلمان سے حاصل ہے۔ پس ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ اس سے اپنے بچوں اور بیٹوں اور عزیزوں کا سا سلوک کرے کیونکہ اس کے باپ کی قائم مقام اب قوم ہے۔ پس ذا مقربة یتیم کی صفت و حالت کا اظہار ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ یتیم کو قربت ہر ایک مسلمان سے حاصل ہے پس ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ اس سے بیٹوں بچوں عزیزوں کا سا سلوک کرے۔ ہمارے نبی کریم صلعم کا طرز عمل یہی تھا۔ ایک دفعہ عید کا روز تھا۔ مدینہ منورہ میں سینکڑوں مسلمان عید کی نماز پڑھنے جا رہے تھے ان کے ساتھ ان کے بچے بھی تھے جو اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بعض کو ان کے باپوں نے اٹھایا ہوا تھا۔

ایک گلی کے نکڑ پر ایک بچہ کھڑا تھا وہ یتیم تھا۔ وہ سب کا منہ تک رہا تھا اور آتے جاتوں کو حسرت سے دیکھ رہا تھا کہ ادھر سے اس شخص کا گذر ہوا جو دنیا کے لئے رحمت بن کر آیا تھا یعنی محمد رسول اللہ صلعم ادھر سے گذرے اس بچہ کے اداس چہرہ پر نظر پڑی۔ پاس آکر دریافت فرمایا کہ وہ کیوں اداس کھڑا ہے اس نے کہا۔ مجھے عید گاہ لے جانے والا کوئی نہیں۔ میرا باپ فوت ہو چکا ہے آپ کا دل بھر آیا۔ فوراً اُسے گود میں اٹھا لیا اور فرمایا کہ میں جو تیرا باپ ہوں میں لے چلوں گا چنانچہ آپ خود اُسے گود میں اٹھا کر لے گئے۔ یہ تھے وہ پاک نمونے جن کے لئے آج آنکھیں ترستی ہیں۔ اور یہ تھی وہ گھاٹی جس پر قرآن چڑھانا چاہتا ہے اور یہ تھی وہ مساوات جو اس گھاٹی کا حریت کے بعد دوسرا زینہ ہے۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ پھر ان لوگوں میں سے ہو جو ایمان لاتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں

وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ اور ایک دوسرے کو رحم اور ہمدردی کی نصیحت کرتے ہیں

جس گھاٹی پر قرآن نے چڑھانا تھا۔ اس میں حریت اور مساوات حقیقی کے بعد جس مقام کا ذکر فرمایا وہ ایمان تھا ایمان سے وہی مراد ہو گا جو دوسری جگہ جہاں اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت آتا ہے۔ اٰمنوا سے مراد لیا جاتا ہے یعنی ایمان باللہ و ایمان بالملائکہ۔ ایمان بالکتب۔ ایمان بالرسل۔ ایمان بالیوم الآخر جیسا کہ قرآن خود فرماتا ہے کلٌّ اٰمن باللہ و ملائکتہٖ وکتبہٖ ورسلہٖ۔ اور والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالاٰخرۃ ھم یوقنون لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن جس ایمان کو لایا ہے اس کا ذکر تو سب سے پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ حریت اور مساوات کے بعد ایمان کا ذکر کیا معنے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سچ ہے کہ سب سے پہلے جو چیز کسی راہ یا مذہب کے لئے ہوا کرتی ہے وہ ایمان ہی ہوتا ہے۔ جب اصول ہی نہیں تو کسی نے عمل کس پر کرنا ہے۔ لہذا یہاں جو حریت اور مساوات کے بعد ایمان کا ذکر کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک حریت اور مساوات پر انسان کا عمل نہ ہو اس کا دعویٰ ایمان کا بیکار ہے گویا جو شخص حریت اسلامی اور مساواتِ حقیقی کو عمل کے ذریعہ اپنا دستور نہیں بناتا۔ اس کا دعویٰ ایمان کا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ البتہ حریت اور مساوات کے عامل کو زیب دیتا ہے کہ وہ ایمان کا دعویٰ اور اس کا ذکر کرے۔ پس حریت اور مساوات کے عامل کے متعلق فرمایا کہ پھر وہ ایمان بھی لاتا ہو یعنی جو کچھ کرتا ہو وہ اللہ کے لئے کرتا ہو جو ایک مومن کی اور اس کے ایمان باللہ کی شان ہے۔ اس کی حریت اور مساوات کے لئے تنگ وو اپنے نفس یا کسی سیاسی غرض سے نہ ہو۔ کیونکہ سیاست کی گہرائیوں میں اگر تحقیقات کا غوطہ لگایا جائے تو تہہ میں اکثر خود مطلبی کا دخل پایا جاتا ہے۔ پس نہایت بے نفسی سے محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے یہ ساری جدوجہد ہو۔ اب چونکہ وہ مومن ہے اور اللہ اور اس کے ملائکہ اور کتب اور رسل اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے۔ تو ضرور ہے کہ اس کے مطابق اس کا عمل ہو تا کہ اس گھاٹی پر چڑھنے کی تکمیل ہو۔ مگر قرآن نے صرف یہی نہیں چاہا کہ وہ خود چڑھے بلکہ دوسروں کو بھی ساتھ چڑھانے کی کوشش کرے۔ اگرچہ گھاٹی پر چڑھنا بڑی ہمت کا کام ہے لیکن ایمان سے جو جرأت اور جوانمردی پیدا ہوتی ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ ساتھ کمزوروں کو بھی پہاڑ پر چڑھانے کی کوشش کرے اسلئے

فرمایا وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمۃ یعنی صبر کی وصیت کرتے ہیں اور رحم کی وصیت کرتے ہیں یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ مومن جس بات کی نصیحت دوسرے کو کرتا ہے وہ پہلے خود کرتا ہے۔ وہ لم تقولون ما لا تفعلون کا مصداق ہرگز نہیں ہوتا کہ جس بات کی نصیحت لوگوں کو کرے وہ خود نہ کرے اور اس طرح خدا کی ناراضگی کا محل بنے۔ پس یہاں جن دو باتوں پر وہ خود عمل کرتا ہے دوسرے لوگوں کو بھی انہی پر عمل کرنے کے لئے نصیحت اور تاکید کرتا ہے اور وہ ہیں صبر اور رحم و ہمدردی اور سچ تو یہ ہے کہ حق اللہ اور حق العباد تمام کے تمام انہی دو باتوں میں ادا ہو جاتے ہیں۔ صبر کے ذریعہ حق اللہ تو یوں ادا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام شرعی اور تقدیری احکام پر صبر اور استقامت سے کام لے یعنی شریعت نے جو اوامر و نواہی بتلائے ہیں ان پر نہایت استقامت کے ساتھ قائم رہے۔ اور اوامر کی تعمیل اور نواہی سے اجتناب کرنے میں کبھی لغزش نہ ہو اور تقدیر کی طرف سے سکھ یا دکھ راحت یا رنج جو کچھ بھی اس پر خدا کی طرف سے آئے اس پر خدا سے راضی رہے اور اس کے ایمان اور توکل میں فرق نہ آئے۔ اور اپنے اخلاقی اصولوں سے ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ جب تک صبر کی یہ شان پیدا نہ ہو انسان کے نفس کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اور صبر کے ذریعہ حق العباد یوں ادا ہوتا ہے کہ مخلوق کے جو حقوق ہیں اُن کی ادائیگی میں کبھی فرق نہ کرے۔ خواہ فریق مقابل اس کے ساتھ کتنا ہی بُرا سلوک کرے مگر وہ اپنے اصولوں کو کبھی ہاتھ سے نہ دے۔ اور اخلاق فاضلہ سے کبھی نہ گرے۔ لوگوں کی ایذا دہی پر صبر سے کام لے اور اپنا فرض اور ڈیوٹی ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہ کرے۔ جب تک اس پر عمل نہ ہو گا اور اسی کی نصیحت دوسروں کو نہ کرے گا قوم ایک متحد اور معزز اور زندہ قوم نہیں بن سکتی۔ مرحمۃ کے ذریعہ حق اللہ تو یوں ادا ہوتا ہے کہ انسان عاجزوں اور بیکسوں کے ساتھ رحم اور ہمدردی کرے جیسا کہ حدیثوں میں آتا ہے۔ کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں بھوکا ہو کر آیا اور تم نے مجھے کھانا نہ دیا۔ اور میں پیاسا ہو کر آیا اور تم نے مجھے پانی نہ دیا۔ میں برہنہ تمہارے پاس آیا تم نے مجھے کپڑا نہ دیا تو بندے عرض کرینگے کہ بار خدایا تیری ذات ان باتوں سے پاک ہے اس کا کیا مطلب ہے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کہ غریب۔ محتاج۔ بھوکے۔ پیاسے۔ ننگے تمہارے پاس آئے تم نے ان پر رحم نہ کیا اُن کا آنا میرا ہی آنا تھا۔ پس عاجزوں غریبوں بیکسوں کے ساتھ ہمدردی اور رحم حق اللہ میں ہی داخل ہے اور مرحمۃ کے ذریعہ حق العباد یوں ادا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کا کوئی فرد ہو دوست ہو یا دشمن۔ امیر ہو یا غریب سب کے ساتھ ہمدردی اور ہر ایک پر اگر وہ کسی مشکل میں گرفتار ہو رحم کرنا۔ غرضکہ صبر اور مرحمت سے حق اللہ اور حق العباد کے تمام پہلو ادا ہو جاتے ہیں۔ پھر حکم ہے کہ ان پر نہ صرف خود عمل کرے بلکہ دوسروں کو بھی انہی پر عامل ہونے کی نصیحت کرے اور ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی پر استقامت دکھاتا اور تقدیری حوادث پر صبر کرتا ہے اور لوگوں کی ایذا دہی پر صبر اور استقامت سے کام لیتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو اسی کا وعظ اور تاکید کرتا ہے یقیناً وہ نفس امارہ کی غلامی سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا۔ کیونکہ وہ اپنی تمام خواہشات اور جذبات پر غالب آگیا۔ پس فک رقبہ کی بلند ترین منزل بھی جو اس نے صبر پر عامل ہو کر طے کر لی۔ اور مرحمت کے ماتحت اگر وہ نہ صرف غرباء و مساکین یتامیٰ اور محتاجوں بلکہ سوسائٹی کے ہر فرد کے ساتھ رحم اور ہمدردی کرتا ہے تو اس سے بڑھ کر مساوات اسلامی کا علمبردار دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اور جس سوسائٹی میں ہر ایک فرد ایک دوسرے کو صبر اور مرحمت کی نصیحت و وصیت کرتے ہیں اس سوسائٹی

سے بڑھ کر متحد اور مضبوط اور معزز اور زندہ اور کوئی سوسائٹی نہیں ہو سکتی۔ پس قرآن نے جس گھاٹی پر چڑھانا چاہا ہے وہ ہے حریت۔ مساوات۔ ایمان۔ صبر۔ ہمدردی کی جن سے بہتر اعمال صالحہ کی کوئی شکل نہیں ہو سکتی۔ پھر نہ صرف خود عامل ہونا بلکہ دوسروں کو بھی انہی امور کی طرف توجہ دلانا یعنے نہ صرف خود اس گھاٹی پر چڑھنا بلکہ دوسروں کو بھی ساتھ چڑھانا اور اس چڑھنے میں ایک دوسرے کی مدد کرنا ضروری قرار دیا۔ کیا انفرادی اور قومی ترقی کے اصول اس سے بہتر سمجھ میں آسکتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۝ یہ لوگ ہیں دائیں جانب والے یا بابرکت جانب والے۔

یعنی ان لوگوں نے وہ راہ اختیار کی جو دائیں جانب کو جاتی تھی یعنی بابرکت تھی جس کا نتیجہ نیک تھا۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۝ اور جو ہماری آیتوں کا انکار کرتے ہیں وہ بائیں جانب والے ہیں۔

یعنی ان لوگوں نے خدا کی ہدایت سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اور وہ راہ اختیار کی جو بائیں جانب کو جاتی تھی یعنی منحوس تھی جس کا نتیجہ بدبختی اور برا تھا۔

عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝ اُن پر آگ ہے بند کر دی ہوئی۔ ع ۱ ۲۰ ۱۵

یعنی آگ میں ڈال کر اُن پر دروازے بند کر دیئے گئے۔ یہ وہی خواہشات کی آگ تھی جو دنیا میں انسان کے ساتھ تھی۔ جو شخص قرآن کی بنائی ہوئی راہ پر جو اونچائی کی طرف جاتی ہے چلنے سے بے پروائی کرتا ہے اور تنزل کی راہ اختیار کرتا ہے تجربہ ہوتا ہے کہ وہ دن بدن خواہشات کی آگ میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے قاعدہ ہے کہ ایک دفعہ دنیا کی حرص دیوا اور خواہشات کی آگ میں انسان گرفتار ہو جائے پھر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے گویا تمناؤں اور خواہشات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ انسان کے نکلنے کے راستے بند کر دیتا ہے۔ مثلاً روپیہ سے محبت ہو جائے اور دن رات اسی کے حصول کی فکر لگی ہوئی ہو تو اس جنون سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے شراب خوری۔ قمار بازی۔ زناکاری۔ مقدمہ بازی وغیرہ وغیرہ مختصر یہ کہ دنیا اور اس کی تمناؤں اور خواہشات کے جس شعبہ میں انسان پھنس جائے پھر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے یہ آگ اور اس میں چاروں طرف سے بند ہو کر گرفتاری کا نقشہ خود انسان کی اپنی شامت اعمال ہے دنیا کی زندگی میں اپنی پیدا کردہ باطنی حالت اُسے آخرت میں ظاہر میں نظر آوے گی۔

سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ | وَهِيَ خَمْسَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۃ الشمس مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ سورۃ البلد میں جس پیغام اور اُسکے پھیلانے کیلئے جدوجہد کے لازمی ہونے کا ذکر کیا تھا اس پیغام کے حامل کا ذکر اس سورت الشمس میں کیا ہے کہ وہ نفس کامل ہے اور وہ اپنے اندر تمام کمالات جمع رکھتا ہے جو ایک نفس کامل میں ہونے چاہئیں اس پیغام کی اتباع میں فلاح اور اسکی مخالفت میں ہلاکت ہے اور ایسے نفوس کاملہ ناقۃ اللہ کا حکم رکھتے ہیں جو انہیں مٹانا چاہتا ہے خود مٹ جاتا ہے

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ○ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ○ گواہ ہے سورج اور اسکی روشنی۔ اور گواہ ہے چاند جب وہ اسکی پیروی کرتا ہے اور اس سے روشنی لیتا ہے

تلی پیروی کرنا ۔ روشنی کی پیروی کی یعنی اس سے لی۔

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ○ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ○ اور گواہ ہے دن جبکہ وہ اسے روشن کرتا ہے اور گواہ ہے رات جب وہ اسے ڈھانک لیتی ہے۔

یعنی دن روشنی کو نمایاں کرتا ہے اور رات روشنی کو ڈھانک لیتی ہے۔

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ○ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ○ اور گواہ ہے آسمان اور اُس کا بنانا اور گواہ ہے زمین اور اس کا بچھانا۔

یعنی آسمان کے بنانے اور زمین کے بچھانے کی غرض وغایت۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○ اور نفس اور اس کی تکمیل۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○ پھر الہام سے بتا دیئے اسکی بدکاری اور اسکے تقویٰ کے راستے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ بیشک وہ فلاح پا گیا جس نے پاکیزگی اور خیرات سے اُسے بڑھایا اور نشوونما دی۔

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ اور نامراد و ناکام رہ گیا وہ جس نے اُسے دبایا۔

آخری دو آیات نے جو جوابِ قسم کے رنگ میں ہیں بتا دیا کہ پہلی چھ آیتوں میں جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے وہ کسی نہ کسی رنگ میں کمیں نفسِ انسانی پر شاہد ہیں (۱) پہلی دو آیات نفس کامل یعنی آنحضرت صلعم کے علم سے کمال کا اظہار کر رہی ہیں یعنی رسول اللہ صلعم سورج کی طرح آسمانی علم اور ہدایت کی روشنی کا سرچشمہ ہیں جن کو تمام عالم کو فیضیاب کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا ہے لیکن جہاں وہ اپنے نور ہدایت وعلم سے سورج کی طرح ایک عالم کو فیضیاب کر رہے ہیں وہاں چاند کی طرح اللہ تعالیٰ کی رضا اور احکام کی کامل فرمانبرداری سے اللہ تعالیٰ سے اس نورِ ہدایت وعلم کو حاصل بھی کر رہے ہیں گویا یہ نور جو لوگوں کو دے رہے ہیں دراصل خدائی نور کا ہی انعکاس ہے۔

پس ایک طرف آپ آسمانی علم دے رہے ہیں تو دوسری طرف لے بھی رہے ہیں علم دے مخلوق کو رہے ہیں اور لے خالق سے رہے ہیں۔ ایک ہی وقت میں معلّم بھی ہیں اور متعلّم بھی (۲) اس کے بعد اگلی دو آیات آپ کے عمل کے کمال کو ظاہر کر رہی ہیں دن سے ہی سورج کی روشنی کے فوائد نظر آتے ہیں اور وہ ایک جدوجہد کو پیدا کرتا ہے جو تمام ترقیات کی جڑ ہے۔ اسی طرح نفس کامل اپنے اعمال سے دن کی طرح جدوجہد کو ایسا نمایاں اور اعلیٰ مقام پر پہنچا کر دکھاتا ہے کہ اس علم کے فوائد صاف نظر آنے لگتے ہیں جو اس نے الٰہی سرچشمہ سے سیکھا تھا اور وہ ان تمام ترقیات کو پالیتا ہے۔ جو جدوجہد کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن دنیوی جدوجہد اپنے اندر ایک بے چینی اور اضطراب کا رنگ رکھتی ہے آج یورپ کو دیکھو کس قدر جدوجہد کا وہ مرکز بنا ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کوئی سکینت اور طمانیت نصیب نہیں بلکہ طبائع میں ایک بیقراری اور بے صبری اور اضطراب کا سمندر موجیں مار رہا ہے شراب خوری، قمار بازی، عیش وطرب کے دن دونے رات چوگنے سامان اُسی بے چینی کو تسکین دینے کے ہی مختلف سامان ہیں۔ مگر باایں ہمہ وہ آگ کسی طرح بجھتی نہیں بلکہ اور زیادہ بھڑکتی ہے لیکن اس کے خلاف نفسِ کامل جہاں جدوجہد کو اپنے کمال تک پہنچاتا ہے وہاں ساتھ ہی اپنے نفس کے اندر وہ سکون اور طمانیت رکھتا ہے جو ہمیں رات اور اس کے ڈھانک لینے میں نظر آتا ہے جس طرح رات اپنے ساتھ ایک سکون اور امن کو لے کر آتی ہے اور تمام بے چینیاں اور اضطراب نیند اور تاریکی کے پردہ کے نیچے آکر طمانیت اور سکینت میں بدل جاتے ہیں اسی طرح نفس کامل اپنے اندر جدوجہد کے ساتھ سکینت وطمانیت قلبی بھی کامل طور پر اپنے اندر رکھتا ہے (۳) اس کے بعد اگلی دو آیات آنحضرت صلعم کے تعلق باللہ اور شفقت علیٰ خلق اللہ کے کمال کو ظاہر کر رہی ہیں یعنی نفس کامل خدا کی فرمانبرداری اور اس کے تعلق کی وجہ سے وہ شان اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے جو آسمان کی ہے۔ یعنی وہ خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری اور رضا کے حصول میں اپنے جذباتِ سفلی اور خواہشات دنیوی سے اتنا بلند ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اخلاق میں اس قدر بلندی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ آسمان بن جاتا ہے وہ اس دنیا کا نہیں رہتا بلکہ آسمانی بن جاتا ہے۔ یہ تعلق باللہ اور انقطاع الی اللہ کا انتہائی مقام ہے دوسری طرف شفقت علی خلق اللہ میں وہ اس قدر فروتنی اور تواضع اور انکسار اور فیاضی اور ایثار سے کام لیتا ہے کہ وہ زمین بن جاتا ہے اس کے حوصلہ اور دل کی وسعت زمین کی طرح وسیع ہوتی ہے۔ اور اس کی فیاضی اور ایثار زمین کی طرح ہر خاص وعام کے لئے نفع بخش ہوتا ہے اور اس کی خاکساری اور تواضع زمین کی خاکساری کا رنگ اپنے اندر رکھتی ہے۔

پس یہاں یہ بتایا کہ جو صفاتِ متضادہ تم عالم کبیر میں دیکھ رہے ہو۔ سورج کا فیض روشنی اور چاند کا اکتساب فیض دن کی جدوجہد اور رات کا سکون، آسمان کی بلندی اور زمین کی وسعت وخاکساری یہ نفس کامل جو عالم صغیر ہے سب اپنے اندر جمع رکھتا ہے اور نفس اور اس کی تکمیل کے اندر یہ تمام امور ایک جگہ جمع نظر آتے ہیں۔ گویہ تمام باتیں اپنے پورے کمال کے ساتھ آنحضرت صلعم میں ہی پائی جاتی ہیں لیکن ہر ایک انسان اپنے اپنے کمال یا استعداد کے مطابق اُن سے حصّہ لیتا ہے علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے ان ذاتی جوہروں اور استعدادوں کی نشوونما کی امداد کے لئے اپنی وحی بھی نازل فرمائی اور خود اپنے علم کامل سے اُسے تقویٰ کے حصول اور فجور کی راہوں سے بچنے کے لئے ہدایت عطا فرمائی تا انسان ٹھوکر نہ کھا دے اور کمال اور ترقی کے اعلیٰ مقام کو پاوے گویا ایک تو فطری استعدادیں خود انسان کے اندر رکھیں اور ایسی رکھیں کہ عالم کبیر میں جو

خوبیاں فرداً فرداً پائی جاتی ہیں وہ نفس انسانی میں ایک ہی جگہ جامع طور پر پائی جاتی ہیں۔ پھر وحی الٰہی سے ان قوتوں اور استعدادوں کی نشوونما کے لئے آبیاری بھی کی تا انسان اپنی ترقی میں نقطۂ کمال پر پہنچ جائے۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلعم کا وجود باجود ان تمام کمالات کا جامع اس پر گواہ ہے کہ قد افلح من زکٰھا یہ جواب قسم ہے یعنی بیشک جس انسان نے پاکیزگی اور خیرات و برکات سے ان استعدادوں کو بڑھایا اور نشوونما دی وہ فلاح پا گیا یعنی دنیا و آخرت میں بامراد اور کامیاب ہو گیا۔ اور وہ ان کمالات کا وارث ہو گیا جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور جس نے ان استعدادوں کو نشوونما نہ دی بلکہ اپنے فسق و فجور سے دبا یا وہ ناکام و نامراد رہ گیا پس محمد رسول اللہ صلعم جو تعلیم لائے ہیں وہ ان تمام انسانی کمالات کے نشوونما کے لئے ہے۔ اور آپ کا وجود باجود خود ان تمام کمالات پر گواہ ہے لہٰذا ایسے نفس کامل کی اتباع میں کامیابی اور مخالفت میں نامرادی اور ہلاکت ہے جیسا کہ ثمود نے اپنے رسول کی مخالفت سے تباہی و ہلاکت کے سوا کچھ نہ پایا۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوٰىهَآ ○ ثمود نے اپنی سرکشی سے حق کو جھٹلایا۔

ثمود قوم حجاز کے شمال میں آباد تھی جس کے تمدن اور قوت و حکومت کا اندازہ اُن آثار سے ہوتا ہے جو آج کھود کھود کے نکالے جا رہے ہیں۔ پتھروں اور چٹانوں میں کھدے ہوئے مکانات اور سنگ سرخ کے شہر جن کی تصویریں ابھی حال ہی میں اخباروں میں شائع ہوئی ہیں ان کی عظمت و شوکت پر گواہ ہیں۔

اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ○ جب ان میں سب سے بڑا بدبخت اُٹھ کھڑا ہوا۔

قوم کے لیڈر جو غلط راہ پر لوگوں کو ڈالتے ہیں ان سے بڑھ کر بدبخت اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہی گمراہ کن لیڈر حق کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ اُن کے کبر اور نخوت پر زد پڑتی ہے۔

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ○ تو اللہ کے رسول نے انہیں کہا اللہ کی اُونٹنی اور اس کا پانی پینا (اس سے تعرض نہ کرنا)

ہمارے علماء کو عجوبہ پسندی نے مجبور کیا کہ وہ اس اونٹنی کے متعلق طرح طرح کے افسانے گھڑیں چنانچہ ایک لغو اور لچر افسانہ یہ گھڑا کہ حضرت صالح کی یہ اونٹنی پتھر میں سے نکلی تھی۔ خدا جانے یہ لچر قصہ کہاں سے لے لیا۔ اس کا قرآن میں تو کہیں ذکر نہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ثمود کی قوم میں یہ دستور تھا کہ بڑے بڑے امرا یا سرداران قوم ایک جانور اپنے نام سے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ وہ جہاں سے چاہے کھائے اور جہاں سے چاہے پیئے اور جہاں چاہے پڑا پھرے کسی انسان کی طاقت نہ تھی کہ اُسے مار ڈالے یا پکڑے یا ہاتھ تک لگائے۔ اس کو مار ڈالنا یا پکڑنا یہ معنے رکھتا تھا کہ جس کا یہ جانور ہے اس کے مالک کی طاقت کی ہمیں کوئی پروا نہیں اور ہم اس کے مقابلہ کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ ایسا کرنے پر اس جانور کا مالک اس کے مارنے پر تیار ہو جاتا تھا اور یا تو اس جانور کو پکڑنے یا مارنے والے کو کما حقہٗ سزا دے کر اپنی طاقت کا اظہار اور ثبوت دیتا تھا یا پھر اسی کوشش میں مارا جاتا تھا اگر زندہ رہا اور سزا نہ دے سکا تو اس کی طاقت کا خاتمہ سمجھا جاتا تھا آج بھی ہندوؤں کے سانڈ چھوڑے ہوتے ہیں

کسی مسلمان کی طاقت نہیں کہ انہیں ہاتھ لگا جائے۔ ایسے موٹے تازے سانڈ اُن کے سامنے پڑے پھرتے ان کا نقصان کرتے پھرتے ہیں لیکن کسی مسلمان کی مجال نہیں کہ انہیں ذبح کرکے کھا جاوے یا اُن کے نقصانات سے بچنے کے لئے اُن کی ٹانگیں توڑ دے یا انہیں پکڑ کر پھاٹک میں دے دے۔ درحقیقت یہ ہندوؤں کی طاقت کا ایک مظاہرہ ہے۔ میں گجرات میں تھا وہاں سائیں کرم الٰہی صاحب ایک مجذوب ہُوا کرتے تھے اُن کا بھی ایک سانڈ پڑا پھرتا تھا۔ ہمارے ہسپتال کے باغ کے گملے توڑ جاتا اور درختوں کو نقصان پہنچا جاتا۔ لیکن باوجود میرے حکم دینے کے کوئی ہسپتال کا نوکر اُس پر ہاتھ نہ ڈالتا تھا صرف اسی خیال سے کہ وہ سائیں صاحب کا سانڈ ہے اور ہمارے ہاتھ لگانے سے خدا جانے ہم پر کیا آفت آجائے گی۔ غرضکہ ثمود قوم میں اظہار طاقت کا یہی نشان تھا۔ اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ معجزہ یا اپنی قدرت نمائی کا اظہار اسی رنگ میں کیا کرتا ہے جو اس قوم میں مسلّم ہوتا ہے تاکہ ان پر پوری طرح حجت تمام ہو سکے حضرت صالح ایک عاجز اور بیکس و بےبس انسان بالمقابل اُن کی قوم ثمود ایک بڑی طاقت و جماعت۔ وہ حضرت صالح کی کیا حقیقت سمجھتے تھے۔ ان کے نو قبیلوں نے حضرت صالح کے قتل کی سازش کی جیسا کہ سورۃ النمل میں ذکر ہے تقاسموا باللّٰه لنبيتنّه واهله انہوں نے قسمیں کھائیں کہ ہم صالح اور اس کے اہل کو رات کے وقت قتل کر دیں گے۔ یہی موقعے نشان نمائی کے ہُوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نشان نمائی اور اظہار قدرت کے لئے ایک اُونٹنی پیش کی اور فرمایا یہ اونٹنی خدا کی اونٹنی ہے اس سے اور اس کے پانی پینے سے کوئی تعرض نہ کرے۔ یعنی اپنی قدرت نمائی کے لئے جو معجزہ دکھانا چاہا وہ وہی تھا جو اس قوم کے مسلّمات کے مطابق تھا۔ اور اس کے اندر لطیف اشارہ یہ تھا کہ رسول کا نفس کامل دراصل خدا کی اونٹنی ہوتا ہے جس پر خدا سوار ہوتا ہے یعنی وہ مہبط تجلیاتِ انوار الٰہیہ ہوتا ہے اس کا چلن پھرنا اٹھنا اور بیٹھنا، بولنا اور کام کرنا سب اسی طرح اپنے مالک کی باگ کے نیچے ہوتا ہے جس طرح اونٹنی کا حرکت و سکون مالک کے اختیار میں ہوتا ہے اور اس کا پانی وہ ہدایات آسمانی چشمے ہیں جو وہ خدا کی طرف سے لاتا ہے جس سے نفس انسانی کی حیات ابدی وابستہ ہے۔ پس جو خدا کے رسول اور اس کی لائی ہوئی ہدایات کو مٹانا چاہتا ہے وہ درحقیقت خدا سے لڑتا ہے چنانچہ اسی لئے ثمود قوم کو اسی رنگ میں سمجھانا چاہا جس میں وہ بہتر سے بہتر طور پر سمجھ سکتے تھے۔ ایک اُونٹنی کو پیش کرکے فرمایا کہ رسول جو حقیقی رنگ میں ناقۃ اللہ ہے اُسے مارنا تو دور رہا تمہارے سامنے ایک جانور اُونٹنی بطور نشان پیش کرتے ہیں یہ خدا کی اُونٹنی قرار دی جاتی ہے تم اسے مار کر دیکھ لو کیا تباہی آتی ہے۔ تو یہ کب ممکن ہے کہ تم خدا کے رسول کو جو حقیقی معنوں میں ناقۃ اللہ ہے مارنا چاہو تو خدا چپ بیٹھا تماشا دیکھا کرے اور تمہیں سزا نہ دے۔

فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا ۝ پھر انہوں نے رسول کو جھٹلایا اور پھر اس اونٹنی کو مار ڈالا۔

ثمود کی قوم بڑی متکبر قوم تھی اُن کی نگاہ میں حضرت صالح کی پیش کردہ اونٹنی طاقتور خدا کی اونٹنی نہ تھی بلکہ صالح جیسے ایک کمزور انسان کی اونٹنی تھی انہوں نے اپنے ملک میں جہاں پانی نہایت کمیاب تھا جوہڑ بنا رکھے تھے جہاں برسات کا پانی جمع رہا کرتا تھا حضرت صالح کی اونٹنی کا پانی پینا وہ اس چیلنج کے بعد کب برداشت کر سکتے تھے انہوں نے تکذیب

کو انتہا پر پہنچا دیا اور اس اُونٹنی کو جسے خدا کی اونٹنی کہہ کے پیش کیا گیا تھا مار ڈالا دوسرے لفظوں میں یہ کہ صالح کے خدا کو چیلنج کیا کہ اگر صالح خدا کی طرف سے ہے اور اگر اسی کی یہ اونٹنی تھی تو کر لے جو مرضی چاہے پس نتیجہ ان کے ملک کے دستور کے مطابق وہی نکلا جو ایک طاقتور ہستی کے ساتھ ٹکر لڑنے میں نکلا کرتا ہے ۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿۱۵﴾ پس ان کے رب نے ان کے گناہ کی وجہ سے ان پر ہلاکت نازل کی اور سب کو مار کے پٹڑا کر دیا ۔

یہ نتیجہ تھا خدا سے لڑنے اور رسول کی تکذیب کرنے کا

ع ۱ ۱۵ ۱۶ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿۱۶﴾ اور وہ اُن کے انجام سے نہیں ڈرتا ۔

وجہ یہ کہ ظالموں کا دنیا سے مٹ جانا مفید ہوا کرتا ہے مضر نہیں ہوتا ۔ ثمود کی مثال دے کر مکہ والوں کو سمجھایا کہ تمہارے نو قبیلے بھی محمد رسول اللہ صلعم کو رات کو قتل کر دینے کی سازش کر رہے ہیں ۔ جیسا کہ حضرت صالح کو قتل کرنے کے لئے نو قبیلوں نے ہی سازش کی تھی ۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ جو نفس کامل رکھتا ہے ایک ناقۃ اللہ ہوتا ہے ۔ جنہوں نے تم سے قبل ناقۃ اللہ کو مار ڈالنا چاہا وہ خود ہلاک ہو گئے پس تم اس ناقۃ اللہ کو ہاتھ نہ لگاؤ ۔ ورنہ ثمود کا سا انجام تمہارا بھی ہو گا ۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ چیلنج آج بھی اسی طرح زندہ چیلنج ہے جیسے پہلے تھا جو لوگ محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کی تعلیم قرآن کو دنیا سے مٹانا چاہتے ہیں وہ انشاء اللہ تعالیٰ خود ہی خائب و خاسر ہو کر مٹ جائیں گے اور جو نفس کامل بھی ہو وہ ناقۃ اللہ ہوتا ہے اس پر حملہ کرنے والا خود ہی اپنی جڑیں کاٹتا ہے کیا خوب حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں ۔

اے آنکہ سوئے من بدویدی بصد تبر ٭ از باغباں بترس کہ من شاخ مثمرم

وَهِيَ إِحْدٰى وَعِشْرُوْنَ اٰيَةً	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	سُوْرَةُ اللَّيْلِ مَكِّيَّةٌ	

سورۃ اللیل کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا ۔ گذشتہ سورۃ الشمس میں اُن کمالات کا ذکر تھا جو نفس انسانی حاصل کر سکتا ہے اور ایسے نفس کامل کی مخالفت سے جو ہلاکت رُونما ہوتی ہے اُس کا بیان تھا ۔ اس سورت میں ذکر ہے کہ ان کمالات کے حصول کے لئے ضرورت ہے اللہ تعالیٰ سے تعلق پکڑنے کی اور وہ حاصل ہوتا ہے ایثار اور تقویٰ سے ۔ فرماتے ہیں :-

وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى ﴿۱﴾ گواہ ہے رات جب وہ ڈھانپ لیتی ہے ۔

وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى ﴿۲﴾ اور گواہ ہے دن جب وہ روشن ہوتا ہے ۔

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ﴿۳﴾ اور گواہ ہے جو اُس نے پیدا کئے نر اور مادہ ۔

إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝۴ بیشک تم لوگوں کی کوشش الگ الگ ہے۔

لہذا نتیجہ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ یہ جوابِ قسم ہے۔ انسانی کوششوں کے اختلاف پر نتائج ایک دوسرے سے مختلف نکلنا ایک حقیقت ہے جس پر دو قسم کی گواہیاں قائم کی ہیں (۱) ایک تو رات اور دن کی (۲) دوسری نر اور مادہ کی۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ جس چیز سے تعلق پکڑو گے اسی کا اثر قبول کرو گے۔ زمین جو گھوم رہی ہے اُس کا جو حصّہ آفتاب سے مُنہ موڑ لیتا ہے اور تاریکی سے تعلق جوڑتا ہے وہ رات کی تاریکی کو اپنے اُوپر وارد کر لیتا ہے اور جو حصّہ آفتاب کی طرف منہ کرتا اور اُس سے تعلق پکڑتا ہے وہ دن کی روشنی سے منوّر ہو جاتا ہے۔ نر اور مادہ کا ذکر کر کے فرمایا کہ جوڑ سے ہی زندگی پیدا ہوتی ہے۔ جب تک نر اور مادہ باہم نہ ملیں کوئی نئی زندگی نہیں پیدا ہوتی۔ اسی طرح نفس انسانی بھی جب تک کسی نر سے نہ ملے کسی نئی زندگی کو حاصل نہیں کرتا۔ نر اثر ڈالتا ہے اور مادہ اثر قبول کرتی ہے۔ اس لئے ہر ایک چیز جو نفس انسانی پر اثر ڈالتی ہے۔ وہ استعارہ کے رنگ میں بمنزلہ نر کے ہے۔ اور نفسِ انسانی بطور مادہ کے۔ جس طرح مادہ ایک گورے انسان کے جوڑ سے سفید بچّہ پیدا کرتی اور کالے انسان کے جوڑ سے ایک سیاہ بچّہ پیدا کرتی ہے اسی طرح جس قسم کے نر سے نفس انسانی جوڑ پکڑے گا اسی قسم کی زندگی اس میں پیدا ہوگی۔ اگر وہ رات کی طرح تاریکی سے تعلق رکھے گا اور شیطان سے جو تاریکی کا منبع ہے جوڑ پیدا کرے گا تو نفس انسانی پر بھی تاریکی چھا جائے گی۔ اور تاریکی کے لوازمات اس میں پیدا ہو جائیں گے اور وہ بیداری کے بجائے غفلت کی نیند۔ سعی اور جدّوجہد کے بجائے سکون اور جمود۔ نیکی و بدی کے امتیاز اور نور کی بجائے گمراہی و ضلالت کی تاریکی کو لے گا اور اگر وہ اللہ تعالیٰ سے جو سرچشمہ ہے تمام انوار آسمانی و روحانی کا تعلق پکڑے گا۔ تو دن کی طرح اُن انوار سے منوّر ہو جائے گا۔ اور روشنی کے لوازمات اس میں پیدا ہو جائیں گے اور وہ ہیں بیداری، سعی اور جدّوجہد، نیکی و بدی کے امتیاز کے ساتھ تقویٰ اور علم ہدایت اور نور۔ پس جو شیطان سے جوڑتا ہے اور ظلمت کو لیتا ہے اس کی سعی اور جو خدا سے جوڑتا ہے اور نور کو لیتا ہے اس کی سعی دونو آپس میں کیسے برابر ہو سکتی ہیں ضرور ہے کہ اُن کے نتائج مختلف ہوں۔ اب ان دونوں تعلقات یا جوڑ کے طریقوں کا ذکر فرماتے ہیں

فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶ پس جو اللہ کی راہ میں دیتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے اور اچھی بات کی تصدیق کرتا ہے

فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى ۝۷ ہم اُسے آسانی کی طرف چلائیں گے۔ یعنی نتائج میں اس کیلئے سہولت اور راحت اور آسانیاں میسّر آئیں گی۔

یہ ہیں طریقے خدا سے تعلق جوڑنے کے۔ سب سے پہلے عطا یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایثار اور قربانیاں مالی ہوں یا جانی یا جس قسم کی بھی ضرورت ہو۔ اور پھر ہے تقویٰ یعنی جو حدود اللہ تعالیٰ نے حق اللہ اور حق العباد کے قائم کر دیئے ہیں اُن کی نگہداشت۔ اس کے بعد صدّق بالحسنیٰ فرمایا۔ الحسنیٰ یعنی اچھی بات سے مراد ہے اسلام۔ یہی وہ الحسنیٰ ہے جو آنحضرت صلعم لائے تھے۔ الحسنیٰ اسے اس لئے کہا کہ وہ سرتاپا خوبی ہی خوبی ہے۔ کوئی عیب یا نقص اس میں نہیں پس الحسنیٰ

کی تصدیق سے مراد ہے اسلام کی تصدیق۔ اسے بعد میں اس لئے رکھا کہ محض منہ سے اسلام کی تصدیق کرنا حقیقی تصدیق نہیں۔ جب تک ایثار اور تقویٰ یعنی عمل سے اپنی تصدیق پر مہر نہ لگا دے۔ پس ایک شخص جب ایثار اور تقویٰ اپنے عمل سے دکھاتا ہے تو اس کی تصدیق اپنے کمال کو پہنچتی ہے اور وہ مستحق ہو اس امر کا کہ کہا جائے کہ اس نے واقعی اسلام کی تصدیق کی۔ فرمایا۔ اگرچہ ایثار اور تقویٰ اپنے اندر مشکلات کا رنگ رکھتے ہیں۔ اور یہ راہ کٹھن معلوم ہوتی ہے لیکن یہی وہ راہ ہے جس کے نتائج میں آسانیاں میسر آتی ہیں بخل کی مشکلات نتائج میں سہولت اور آسانیاں، سکھ اور راحت اپنے اندر مخفی رکھتی ہیں۔

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝۸ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝۹ اور جو شخص بخل کرتا ہے اور پرواہ نہیں کرتا اور اچھی بات کو جھٹلاتا ہے

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝۱۰ پس اسے مشکلات کی طرف چلائیں گے۔

یعنی اگرچہ بظاہر اس راہ میں مشکلات سے انسان بچ جاتا ہے لیکن اس کا نتیجہ عسر اور تنگی مشکلات اور دکھ ہوتا ہے۔

بخل کہتے ہیں اپنے روپے یا اپنی کسی قوت یا چیز کو برمحل نہ خرچ کرنے کو۔ خدا کے رستہ میں خرچ کرنے کی ضرورت ہو اور انسان روپیہ خرچ نہ کرے۔ بظاہر تو وہ قربانی اور ایثار کی کٹھن گھاٹی چڑھنے سے بچ گیا اور اس کے روپے میں کسی قسم کی کمی بھی نہ ہوئی۔ لیکن حقیقت میں یہی وہ راہ ہے جس کا نتیجہ عسر اور تنگی اور دکھ اور مشکلات ہیں کوئی فرد ہو یا قوم جس نے بخل اور استغنا سے کام لیا اور قربانی اور اخلاق فاضلہ کو چھوڑ دیا وہ ہلاک یا ذلیل ہو گئی۔ استغنا سے یہاں ایثار یعنی خدا کے راستہ میں خرچ کرنے سے بے پروائی بھی مراد ہے اور تقویٰ یعنی حدود اللہ کی طرف سے بے پروائی بھی مراد ہے جو حق اللہ اور حق العباد کے لئے قائم کی گئی ہیں پس بخل و استغنیٰ سے مراد ہوا کہ وہ نہ تو ایثار سے کام لیتا ہے اور نہ تقویٰ سے بلکہ دونوں سے بے پروائی اختیار کرتا ہے اس کے بعد فرمایا وکذّب بالحسنیٰ۔ الحسنیٰ یعنی اسلام کی تکذیب کی۔ گویا اسلام کی تکذیب میں اس شخص کو بھی شامل کر لیا جو عمل سے اسلام کو جھٹلاتا ہے اور عمل سے جھٹلانا یہی ہے کہ وہ خدا کی راہ میں ایثار نہیں کرتا اور تقویٰ سے کام نہیں لیتا۔ پس جیسے وہ شخص اسلام کا مکذب ہے جو منہ سے اور عقائد کے رُو سے اسلام کو جھٹلاتا ہے ویسے ہی وہ شخص بھی اسلام کی تکذیب کرتا ہے جو اپنے عمل سے اُسے جھٹلاتا ہے گویا ایسا شخص اسلام کا عملی مکذب ہے۔ فسنیسرہ للعسریٰ۔ فرمایا روپے کو سینہ سے لگا کر اور اپنی من مانی خواہشات کا تتبع کر کے وہ شخص سمجھتا ہے کہ میں بڑا سکھی ہوں اور بڑی آسانی اور راحت کی راہ میں نے اختیار کر لی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے وہ راہ اختیار کی ہے جس کا نتیجہ دُکھ اور تنگی اور عسر اور مشکلات ہیں۔ یہاں وہ لوگ غور کریں جو منہ سے اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود ایثار اور تقویٰ سے کام نہیں لیتے۔ ان کا یہ بخل اور استغنا انہیں اسلام کی تکذیب کے مقام پر کھڑا کر رہا ہے۔

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۝۱۱ اور اُس کا مال اُس کے کام نہ آئیگا جب وہ ہلاک ہوگا۔

بتا دیا کہ بخل درحقیقت ہلاکت کی راہ ہے۔ ایک بخیل جان دے دیتا ہے مگر مال خرچ نہیں کرتا اور سب مال یہیں

چھوڑ جاتا ہے۔ اس کا جمع کردہ مال اُسے ہلاکت سے نہیں بچا سکتا۔ جو قوم ایثار سے کام نہیں لیتی آخر کار ہلاک ہو جاتی ہے پس عقلمند انسان وہ ہے جو یہ سوچے کہ مال کے جمع کرنے سے کیا فائدہ ہوا اگر وہ انسان کو ہلاکت سے نہ بچا سکا۔ وہ مال جو کام نہیں آتا ٹھیکریوں سے بھی بدتر ہے۔ خدا کیلئے ایثار ہی مال کا بہترین مصرف ہے اور انسان کی کامیابیوں کا دروازہ ہے

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ﴿١٢﴾ بیشک رستہ دکھا دینا ہمارا کام ہے۔

یعنی ہم کسی پر زبردستی نہیں کرتے۔ رستہ دکھا دیا ہے۔ خواہ ایثار اور تقویٰ سے اپنے لئے آسانی کی منزل کو پا لو خواہ بخل اور استغنا سے مشکلات اور تنگی کی منزل پر جا پہنچو۔

وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ﴿١٣﴾ اور بیشک آخرت اور دُنیا دونو ہمارے اختیار میں ہیں۔

یعنی جو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں اُن کی آخرت بھی سنور جاتی ہے اور دنیا بھی۔ اگر آخرت اللہ کی ہے تو دنیا میں بھی اُسی کا تصرف ہے۔ پس انسان تقویٰ اور ایثار سے ڈرے نہیں کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ اور اس وسوسہ کو دل سے نکال ڈالے کہ آخرت تو دُور پڑی ہے۔ تقویٰ اور ایثار کرنے سے دنیا میں تکلیف اور تنگی سے ہی سابقہ پڑتا ہے فرمایا یہ غلط ہے تصرف الٰہی سے کوئی مقام اور وقت خالی نہیں۔ اگر آخرت میں اس نے ان کا بدلہ دینا ہے تو دنیا میں بھی وہ ان کا عوض دیئے بغیر چھوڑتا نہیں۔ صحابہ کا نقشہ ہمارے سامنے ہے جنہوں نے ایثار اور تقویٰ کی راہ اختیار کی۔ انہیں خدا نے دنیا میں بھی اس قدر دیا کہ بعض دفعہ صحابہ گھبرا جاتے تھے۔ کہ کہیں سب کچھ اجر ہمیں دنیا ہی میں نہ مل گیا ہو اور آخرت کے لئے کچھ باقی نہ رہا ہو۔ اصحاب صفہ جو مہاجرین کا ایک گروہ تھا جن کا کوئی گھر گھاٹ نہ تھا اور مسجد کے ایک صحن میں ایک چھپر ان کے لئے ڈال دیا گیا تھا۔ وہ فاقوں اور مصائب کی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ انہیں کئی کئی دن کے فاقے گزرتے تھے۔ بعض دفعہ کپڑا نہ ہوتا تھا تو مسجد کی چٹائیاں لپیٹ لیتے تھے کسی صحابی کو ایک چادر جنگل میں پڑی مل گئی تھی تو پھاڑ کر دو آدمیوں نے باندھی۔ پھر خدا نے کس قدر دیا کہ ان میں سے ایک شخص سے کسی نے کچھ گھوڑے مانگے تو فرمانے لگے آج کل مجھ کو تو گھوڑوں کی ضرورت ہے البتہ اتنے سو گھوڑے دے سکتا ہوں (مجھے ٹھیک تعداد یاد نہیں رہی) گویا ضرورت نہ ہوتی تو اس سے بہت زیادہ گھوڑے مستعار دے سکتے تھے۔ اس سے تمول کا اندازہ کر لو۔ حضرت ابوبکر کا ایثار سب سے زیادہ تھا لہٰذا سب سے پہلے ان کو محمد رسول اللہ صلعم کا خلیفہ اور اسلامی سلطنت کا بادشاہ بنا دیا۔ اُن کے خلیفہ ہونے پر تو دُان کے والد کو یقین نہ آتا تھا۔ آنحضرت صلعم کی وفات پر جو تمام عرب میں ہلچل مچ گئی اور بغاوت کی آگ تمام عرب میں بھڑک اُٹھی تو بظاہر اسلام پر سخت نازک وقت آگیا۔ مدینہ منورہ سے کوئی شخص مکہ معظمہ گیا وہاں وہ حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ سے ملا۔ وہ نوّے برس کے بوڑھے تھے بڑے جہاندیدہ اور فہیم انسان۔ ابھی تک اسلام نہ لائے تھے۔ انہوں نے اس مدنی شخص سے دریافت کیا کہ محمدؐ تو وفات پا گئے اب اسلام کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا۔ قَامَ رَجُلٌ ایک مرد کھڑا ہو گیا۔ ابو قحافہ بولے۔ کون کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ابن ابی قحافہ یعنی حضرت ابوبکر۔ ابو قحافہ کو قطعاً

یہ خیال نہ آیا کہ میرا بیٹا۔ پوچھنے لگا۔ کون ابن ابی قحافہ۔ اس نے کہا۔ آپ کا بیٹا۔ بوڑھا ابو قحافہ تو حیرت سے غرق ہو گیا۔ اپنے دونوں گھٹنوں کے درمیان سر ڈال کر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھایا۔ پوچھا وہ بنو ہاشم (جو محمد صلعم کے خاندان کے لوگ تھے) کہاں گئے؟ اس نے کہا۔ سب نے اُن کی بیعت کر لی۔ اس پر پھر وہ بوڑھا غرق ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر پوچھا، "بنو اُمیہ کہاں گئے" (یعنی وہ تو بڑی ہوشیار، سیاست دان اور دولت مند قوم تھی) اس نے کہا سب نے ان کی بیعت کر لی! اس پر پھر وہ بوڑھا غرق ہو گیا۔ پھر سر اٹھایا اور پوچھا کہ "انصار کہاں گئے" یعنی جن کے گھر میں آنحضرت صلعم اور آپ کے رفقا نے پناہ لی تھی۔ اس نے کہا "بایعوہ"۔ سب نے ان کی بیعت کر لی۔ اس پر وہ بوڑھا پھر غرق ہو گیا تھوڑی دیر بعد چونک کر اٹھا اور چلا پڑا۔ الاسلام حقٌ۔ پھر اسلام حق ہے اس قدر موانعات کے ہوتے ہوئے میرے بیٹے کا محمد رسول اللہ صلعم کا جانشین بن جانا! اس سے بڑھ کر اسلام کی صداقت اور حریت و مساوات اور اس کے وعدوں کے برحق ہونے کا ثبوت ممکن نہیں۔ اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے زمانہ میں حج سے فارغ ہو کر واپس ہوئے۔ آپ کے ساتھ لاکھوں انسانوں کا جم غفیر تھا۔ سینکڑوں صحابہ ساتھ تھے۔ مکّہ سے نکل کر تھوڑی دُور پر ایک ببول کا درخت تھا اس کے نیچے آکر کھڑے ہو گئے۔ اُسے غور سے دیکھنا شروع کیا دھوپ بہت سخت تھی۔ اور لوگوں کو دھوپ میں کھڑے رہنے سے سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ آخر ایک صحابی حضرت حذیفہ بن الیمان نے کہا۔ کہ آپ اس درخت میں کیا دیکھ رہے ہیں لوگوں کو تکلیف ہو رہی ہے۔ فرمایا میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہم کیا تھے اور اسلام نے کیا بنا دیا اور کس اوج ترقی پر ہمیں پہنچا دیا۔ ایک زمانہ تھا بچپن میں یہاں میں اونٹ چرایا کرتا تھا اور مجھ سے ایک اونٹ گم ہو گیا تھا میرے باپ نے مجھے اس درخت کے نیچے اس قصور پر خوب مارا تھا۔ ایک تو وہ ہماری حالت تھی اور ایک آج یہ حالت ہے کہ تمام عرب، ایران، روم و شام مصر و افریقہ ہمارے دبدبہ سے کانپتا ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے صرف اسلام کے فیوض و برکات ہیں"۔ غرضیکہ جنہوں نے خدا کی راہ میں ایثار و تقویٰ سے کام لیا خدا نے انہیں آخرت کے علاوہ اس دنیا میں بھی اپنے انعامات سے مالا مال کر دیا پس یہ وسوسہ غلط ہے کہ خدا کے رستہ میں خرچ کر کے انسان مفلس بن جاتا ہے۔ یا تقویٰ سے دنیا کا کاروبار نہیں چلتا۔

حضرت مسیح موعودؑ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

ز بذلِ مال در راہش کسے مفلس نمے گردد   خدا خود می شود ناصر اگر ہمت شود پیدا

امیدِ دین رو اگر داں امیدِ تو روا گردد   ز صد نومیدی و یاس والم رحمت شود پیدا

در انصارِ نبی بنگر کہ چوں شد کار تا دانی   کہ از تائیدِ دین سرچشمۂ دولت شود پیدا

تقویٰ اور ایثار والے انسان کو کبھی اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا۔ آخرت اگر خدا کی ہے تو دنیا بھی اسی کی ہے پس آخرت میں نتائج اگر یقینی ہیں تو دنیا بھی ان نتائج کے مظاہروں سے خالی نہیں رہتی۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿۱۴﴾ پس میں ڈراتا ہوں تم کو اس آگ سے جو شعلے مارتی ہے

لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿۱۵﴾ الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۶﴾ اس میں کوئی داخل نہیں ہوتا مگر بڑا بدبخت جو تکذیب کرتا ہے اور پیٹھ پھیرتا ہے۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿۱۷﴾ الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ اور اس سے بچایا جاتا ہے بڑا تقوی کرنیوالا جو تزکیہ کرتا ہوا اپنا مال دیتا ہے۔

ان آیات میں عُسریٰ اور یسریٰ کی تشریح کر دی ہے جس کا مکمل نظارہ آخرت میں نظر آئے گا۔فرمایا بخل اور استغنا سے کام لینے والا اور اسلام کی دل یا عمل سے تکذیب کرنے والا ایک شعلہ مارنے والی آگ میں داخل ہوگا جو بخل اور استغنا کا نتیجہ ہے۔ اور اس میں داخل ہونے والا بڑا ہی بدبخت ہے۔خدا نے تو اس کو یسریٰ یعنی سہولت اور سکھ کی راہ بتائی تھی لیکن اس بدبخت نے اُسے جھٹلایا۔اور اس سے پیٹھ پھیری اور اپنے ہاتھوں یہ مصیبت سہیڑی اور اس آگ سے وہ شخص بچا لیا جاتا ہے جو بڑا متقی ہے۔بڑے متقی کی تشریح خود ہی فرما دی کہ جو مال اللہ تعالیٰ کے راستہ میں تزکیہ کرتے ہوئے خرچ کرتا ہے۔تزکیہ کہتے ہیں طہارت و پاکیزگی اور خیرات و نیکیوں سے اپنی مخفی استعدادوں اور اخلاق روحانی کو نشوونما دینا۔فرمایا بڑا متقی وہ ہے جس کے دل میں طہارت و پاکیزگی اور سابق بالخیرات بننے کی تڑپ یہاں تک ہے کہ وہ اس کے حصول کے لئے مال جیسی محبوب چیز بھی خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔اور اس میں اس کا مقصد تزکیہ ہوتا ہے اور کسی شہرت اور ریا کو دخل نہیں ہوتا۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ﴿۱۹﴾ اور کسی شخص کے لئے اُس کے پاس نعمت نہیں جس کا بدلہ دیا جائے۔

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾ ہاں اپنے رب بلند و برتر کی رضا چاہنے کے لئے جو خرچ کرے۔

یعنی کسی شخص کے پاس کوئی ایسی نعمت نہیں کہ جس پر وہ بدلہ لینے کا حقدار ہو۔کیونکہ سب کچھ تو خدا کی دی ہوئی نعمتیں ہیں۔غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

پس جب تک خدا کی دی ہوئی نعمتیں خدا کی رضا کے لئے ہی خرچ نہ ہوں وہ کسی بدلہ کی کیسے مستحق ہو سکتی ہیں۔انسان کو جو کچھ عطا ہُوا ہے وہ سب انعامات الٰہیہ ہیں۔دولت، حکومت، عزت، مرتبہ، علم، زندگی یا اعلیٰ استعدادیں سب انعامات الٰہیہ ہیں ان پر فخر کرنا بے معنی بات ہے ان پر کوئی اجر کیسے مترتب ہو سکتا ہے۔ہاں یہ چیزیں اگر خدا کی راہ میں لگائی جائیں اور اس سے مطلب شہرت یا ریا، یا دنیا طلبی یا کسی کے احسان کا معاوضہ نہ ہو بلکہ محض حصول رضائے الٰہی ہو تو پھر یہی چیزیں انسان کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیتی ہیں۔اور اس کے مقصد کو جو حصول رضائے الٰہی تھا بہم پہنچا دیتی ہیں۔اسی لئے فرماتے ہیں :-

ع ۲۱/۱ ۱۷ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾ اور وہ ضرور راضی ہو جائے گا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کو پا کر وہ خوش ہو جائے گا۔جو شخص خدا کی رضا کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے خدا

بھی اس کو راضی کرنے سے فرق نہیں کرتا۔ اوّل تو بندہ کے لئے یہ خوشی کیا کم ہے کہ اس کا رب اُس سے راضی ہو۔ لیکن رضائے الٰہی کے تلاش کرنے والوں کو ان کا رب بطور خود ہر رنگ میں راضی اور خوش کر کے اپنی رضا کا ثبوت دیتا ہے صحابہ سے راضی ہُوا تو دنیا و آخرت میں انہیں بھی راضی کر دیا۔ خوش قسمت اور مبارک ہے وہ جس سے اس کا رب راضی ہو گیا

اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى میں دو لطائف توجہ طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ الاعلیٰ فرما کر اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ اپنے رب کی رضا کے سوا جس کسی کی رضا کو بھی تم تلاش کرو گے وہ مقصود ادنیٰ کی تلاش ہو گی۔ تمہارا رب سب سے اعلیٰ ہے۔ پس جو سب سے اعلیٰ ہے اس کی رضا کو تلاش کرنا سب سے بڑھ کر مقصد اعلیٰ ہے جس کو مدنظر رکھنے سے تم کبھی پست اور ذلیل نہ ہو گے۔ بلکہ علو اور کمال کو حاصل کرو گے۔ احکم الحاکمین اور اپنے رب کی جو سب سے اعلیٰ ہے رضا کو تلاش نہ کرنا اور ادنیٰ واسطوں اور ذرائع کی رضا کو ڈھونڈتے پھرنا پرلے درجہ کی حماقت اور خلافِ توحید ہے

دوسری لطیف بات اس میں یہ نظر آتی ہے کہ مومن کو تلاش محض رضائے الٰہی کی ہوتی ہے۔ جنت بھی اس کی مطلوب نہیں ہوتی اور سچ تو یہ ہے کہ رضائے الٰہی کی تلاش اور اس کا حصول ہی مومن کی جنت ہُوا کرتا ہے۔ باغ اور انہار یہ تو انعامات ہیں جو اس جنت کے لازم حال ہیں جو رضائے الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔ پس مومن کو باغوں اور نہروں کی تلاش نہیں ہوتی بلکہ رضائے الٰہی کی تلاش ہوتی ہے نہریں اور باغ تو جناب الٰہی کی طرف سے اس بندہ کی مہمانی ہے جو رضائے الٰہی کی تلاش میں عمر بھر لگا رہا۔ جیسا کہ فرماتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا۔ کہ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اُن کے لئے جنت فردوس اُترنے کی مہمانی ہے

سُوْرَةُ الضُّحٰى مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | وَهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۃ الضحیٰ کا نزول مکہ معظمہ میں ہُوا۔ یہ ابتدائی زمانہ کی سورت ہے۔ پچھلی سورت اللیل میں بندہ کا خدا سے جوڑ اور اُس کے ایثار اور تقویٰ کا ذکر تھا جس میں للّٰہیت اور اخلاص کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو راضی کر دینے کا وعدہ فرماتا ہے اب اس سورۃ الضحیٰ میں یہ بتاتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم ان تمام اعمال صالحہ اور کمالات کا بےنظیر مجسمہ ہیں اور اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان سے وعدہ فرماتا ہے کہ انہیں راضی فرما دے گا۔ اور ہمیشہ بیش از پیش انعامات کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ گواہ ہے دن کی روشنی اور گواہ ہے رات جب سکون والی ہو۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ تیرے رب نے تجھے چھوڑا نہیں اور نہ وہ ناراض ہوا۔

یہ جوابِ قسم ہے۔ اس آیت میں بڑی بھاری تشفی آنحضرت صلعم کو دی ہے۔ بڑے بڑے نیکوں کو دنیا میں مصائب اور

نازک حالات ایسے پیش آتے رہتے ہیں کہ بعض وقت شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید خدا نے نصرت کرنی چھوڑ دی ہے حضرت عیسیٰ کو جب یہودیوں نے پکڑ کر صلیب پر لٹکا دیا۔ تو انہیں اب سوائے صلیبی موت کے جو توریت کی رُو سے ایک لعنتی موت تھی اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس وقت بے اختیار ان کے زبان سے نکلا۔ ایلی ایلی لما سبقتنی۔ اے خدا اے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ اسی طرح جب آنحضرت صلعم تبلیغ کے لئے طائف تشریف لے گئے تو وہاں کے بدمعاشوں نے پتھر مارتے ہوئے آپ کا پیچھا کیا۔ اور آپ دو تین میل تک بھاگتے چلے گئے۔ اس کے بعد ایک باغ میں ٹھیرے۔ اور وہاں یہی دعا کی کہ اے خدا اگر تو ناراض نہیں ہے تو یہ تمام باتیں میرے لئے آسان ہیں۔ غرضکہ ایسے ایسے خطرناک اور نازک حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ بظاہر ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ خدا نے اپنے رسول کی نصرت چھوڑ دی ہے اور دشمنوں کا استیلا اور غلبہ دیکھ کر شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید خدا ناراض ہو گیا ہے۔ اور اسی لئے دشمنوں کو شرارت اور ایذا دہی سے روکتا نہیں بلکہ انہیں چھوڑ رکھا ہے کہ جو مرضی چاہے وہ کریں۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کی زندگی میں بھی ایسے حالات پیش آئے جیسے یہی طائف والا واقعہ بلکہ آپ کی ساری مکہ کی زندگی ہی ایسے مصائب سے پُر ہے کہ تعجب ہوتا تھا کہ خدا نے دشمنوں کو کیوں اتنی ڈھیل دے رکھی ہے ایسے ہی جنگ اُحد کا واقعہ حدیبیہ کا عہدنامہ۔ ان کے علاوہ چونکہ آنحضرت صلعم زندہ نبی ہیں اور آپ کی نبوت کا دامن قیامت تک دراز ہے۔ اس لئے آپ کی امت اور آپ کے مذہب پر بھی اس قسم کے نازک وقت پیش آنے والے تھے اور پیش آئے۔ اور آج بھی نہایت نازک وقت درپیش ہے کہ دلوں میں شبہ ہونے لگتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نصرت چھوڑ دی ہے۔ انہی مشکلات کا جواب ان ایات میں دیا ہے۔

کسی امر کی نصرت چھوڑ دینے کی وجہ دو ہی ہو سکتی ہیں۔ یا تو اس چیز کی ضرورت باقی نہ رہے اس لئے اس چیز کو ترک کر دیا جائے یا جس کے سپرد وہ چیز ہو اس سے مالک ناراض ہو جائے۔ اور چھین کر دوسرے کو دیدے۔ چنانچہ خدا نے جو تسلی یہاں دی ہے اس میں ان دونوں امور کو مدنظر رکھا ہے۔ فرمایا کہ اسلام پر کوئی سا بھی نازک وقت آئے خواہ تمہاری موجودگی میں یا تمہارے بعد قیامت تک تو یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ خدا نے اسلام کی نصرت اس خیال سے چھوڑ دی ہے کہ اب وہ اس کی ضرورت نہیں سمجھتا یا تم سے ناراض ہو گیا ہے اور اپنی رضا کی راہیں اسلام کے سوا اب کسی اور دین میں رکھ دی ہیں۔ یہاں اسلام کو محمد رسول اللہ صلعم کے مترادف رکھا ہے۔ کیونکہ اسلام کی عدم نصرت درحقیقت محمد رسول اللہ صلعم کی عدم نصرت ہے وجہ یہ کہ آپ کی زندگی کا مقصد ہی فقط اعراسلام کا قائم کرنا تھا۔ پس فرمایا کیسا بھی نازک وقت اسلام پر آئے تم یہ کبھی نہ سمجھنا کہ خدا نے تمہاری نصرت چھوڑ دی ہے یا تم سے ناراض ہو گیا ہے۔ اور اس لئے دشمنوں کو شرارت کا موقعہ دیدیا ہے۔ فرمایا تم پر تمہارے دین پر ایسے نازک حالات خدا کی طرف سے ترکِ نصرت یا ناراضگی کی وجہ سے نہیں آئیں گے بلکہ قانون قدرت کے ماتحت ان حالات کا آنا ضروری ہے۔ تلك الایام نداولها بین الناس۔ ایسے حالات ہر پھر کر لوگوں پر وارد ہوتے رہتے ہیں۔ قانونِ فطرت پر نظر ڈالو۔ جب تک رات کا سکون نہ آئے انسان دوسرے دن کی جدوجہد کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ رات کو دیکھ کر کوئی عقلمند یہ اعتراض نہیں کرتا کہ خدا نے رات کو کیوں بنایا ہے۔ اگر دن ہی دن رہتا تو کس قدر کام ہوتا۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر رات نہ آئے اور اس کے سکون میں انسان کے قویٰ آرام نہ کریں تو انسان دوسرے دن کی نئی جدوجہد کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ پس ہر دن کی نئی جدوجہد سے قبل ضرور ہے کہ رات کا سکون آوے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلعم کے مشن یعنی اسلام کے لئے ہر نئی ترقی اور نئی جدوجہد سے قبل ایسا نازک اور مصائب کا زمانہ آنا لازمی ہے جو آپ کی قوم کی طبائع کو نئی جدوجہد کے لئے تیار کر دے۔ اسی کو مولانا روم نے کیا خوب نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہر بلا کیں قوم را حق دادہ است ؛ زیر آں گنج کرم بنہادہ است

حضرت مجدد وقت مرزا غلام احمد صاحب مسیح موعودؑ فرمایا کرتے تھے۔ کہ ہم تو کفار عرب کے بھی مرہون احسان ہیں۔ وہ اگر طرح طرح کے اعتراضات نہ کرتے اور رنگ رنگ کی مخالفتیں نہ کرتے تو قرآن کریم کے علم و حکمت کے عجائبات اور محمد رسول اللہ صلعم کے اخلاق فاضلہ ہمیں کیسے نظر آتے حضرت مولانا نور الدین مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم کی جس آیت پر بھی دشمن اعتراض کرتا ہے درحقیقت اس کے اندر علم و حکمت کا ایک خزانہ مخفی ہوتا ہے جس پر جب تک اعتراض کا کدال نہ پڑے وہ کیسے باہر نکلے۔ پس جب تک محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے مشن یعنی اسلام پر طرح طرح کے نازک وقت نہ آتے اُس کی ترقی ناممکن تھی۔ ہر حوادث زمانہ ایک نئی ترقی کی راہ کھولنے آتا رہا۔ ہر سکون اور جمود ایک نئی جدوجہد اور ترقی کی تمہید ثابت ہوا۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ خدا کی نصرتوں کا نقشہ اسی وقت پوری طرح نظر آتا ہے جب ایسے نازک اوقات پیش آجائیں۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُولٰى ۝ اور پچھلی حالت یقیناً تیرے لئے پہلی حالت سے بہتر ہے

فرمایا اتنا ہی نہیں کہ اسلام پر نازک وقت آجانے کی وجہ یہ کبھی نہیں ہوگی کہ خدا نے ترکِ نصرت کر دی ہے یا خدا ناراض ہو گیا ہے بلکہ ان حالات کے بعد جو حالت بھی آئے گی وہ تیرے لئے پہلی حالت سے بہتر ہوگی یعنی آپ کا امر ترقی ہی ترقی کرتا چلا جائے گا اور ہر پچھلی گھڑی پہلی گھڑی سے بہتر ہوگی گو درمیان میں ایسے زمانے آجائیں کہ بظاہر ایسا معلوم ہو کہ خدا ناراض ہو گیا ہے۔ اور اس نے اسلام کی نصرت چھوڑ دی ہے لیکن یہ خیال صحیح نہ ہوگا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مسلمانوں کی ایک قوم اخلاقی یا سیاسی اعتبار سے گر جائے اور ہلاک ہو جائے لیکن خدا محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے مشن یعنی اسلام کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ کوئی قوم مسلمان کہلا کر اگر اپنی بدعملی سے خدا کو ناراض کرے گی اور اسلام پر عمل کرنا چھوڑ دے گی تو اس کا مٹ جانا قانونِ قدرت ہے لیکن اسلام نہیں مٹ سکتا۔ ایک قوم مٹے گی تو دوسری قوم اس کی جگہ لے لے گی۔ جیسا کہ دوسری جگہ یستبدل قوماً غیرکم فرمایا ہے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے مشن یعنی اسلام کو خدا کبھی چھوڑ دے بلکہ آپ کا امر برابر ترقی کرتا جائے گا۔ اور ہر گھڑی جو پیچھے آتی ہے وہ آپ کے لئے پہلی حالت سے بہتر حالت لے کر آئے گی۔ یہاں تک کہ دنیا کے لوگ اس حالت پر آجائیں جس پر آنحضرت صلعم دنیا کو لانا چاہتے تھے۔ ہر پچھلی گھڑی میں قیامت بھی شامل ہے جہاں آپ کی حالت اور عظمت اور شان دنیا کی حالت سے بدرجہا بہتر ہوگی۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ اور تیرا رب تجھے اتنا دے گا کہ تو راضی ہو جائیگا۔

یعنی امر اسلام ترقی کرتا چلا جائے گا۔ دنیا میں تو آپ کی رضا یہی تھی کہ دنیا اُس حالت پر آجائے جس پر آپ لانا چاہتے تھے۔ اور قیامت میں آپ کی رضا یہی ہو سکتی ہے کہ آپ دنیا کو مغفرت اور نجات کا وارث دیکھیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ میں راضی نہ ہوں گا جب تک میرا ایک بھی متبع جہنم میں ہو گا۔ پس ان آیات میں علاوہ قیامت کے اس دنیا کے لئے بھی بڑی خوشخبری ہے کہ امر اسلام برابر ترقی کرتا جائے گا۔ اور اگرچہ آج اسلام پر بڑا نازک وقت ہے اور دشمنانِ اسلام چاروں طرف سے اس کے مٹانے کی فکر میں ہیں۔ لیکن خدا کا وعدہ ہے کہ اس رات کے سکون کے بعد آسمانی روشنی کے پھیلنے کا زمانہ آئے گا اور آنحضرت صلعم کی شوکت اور عظمت پہلے سے بھی بڑھ کر دنیا میں ظاہر ہو گی چنانچہ اس کے آثار نظر آرہے ہیں اور اسلامی اصول عیسائی ممالک میں قلوب کو فتح کرتے چلے جارہے ہیں اور برنارڈ شا جیسا دہریہ منش فلسفی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر محمد رسول اللہ صلعم دنیا میں واپس آجائیں تو ان کی ڈکٹیٹر شپ میں ہی دنیا کو اپنی تمام مشکلات سے نجات مل سکتی ہے اور ابھی کیا ہے ابھی تو آغاز ہے انجام کیسا شاندار ہو گا یہ ان آیات سے صاف نظر آرہا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ آنحضرت صلعم کی گذشتہ زندگی کے حالات کو پیش کر کے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ آپ کی دستگیری اللہ تعالیٰ ابتدا سے فرماتا رہا ہے۔ اور اب تو آپ خدا کے رسول ہیں اور خدا کی پناہ اور نصرت کے نیچے ہیں۔ جب آپ رسول نہ تھے اس وقت بھی آپ کی ولادت سے لیکر اب تک خدا نے آپ کی ہمیشہ نصرت و حمایت کی۔ اور ہر مشکل میں آپ کی مدد کی۔ اور ہر حاجت کو پورا کیا اور آپ کو برابر ترقی دیتا گیا اور آپ کی حالت کو پیش از پیش بہتر بناتا گیا تو آئندہ کیوں نہ نصرت و حمایت کا سلسلہ آپ کے ساتھ رہے گا۔ فرماتے ہیں:۔

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝ کیا خدا نے تجھے یتیم نہیں پایا سو پناہ دی۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۝ اور تجھے طالب پایا تو ہدایت دی یا منزل مقصود پر پہنچا دیا۔

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۝ اور تجھے مفلس پایا تو غنی کر دیا۔

قبل اس کے کہ میں ان آیات کی تشریح کروں میں یہ امر بتا دینا چاہتا ہوں کہ وجدك ضالاً فهدی کی تفسیر ہمارے مولویوں نے جو یہ کی ہے کہ خدا نے تجھے گمراہ پایا پس ہدایت دی بالکل غلط ہے۔ ضال کے معنے گمراہ کے بھی ہیں۔ لیکن اس کے معنے کسی امر کی طلب میں سرگرداں اور محبت میں مٹ جانے کے بھی ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسبت آتا ہے انك فی ضلالك القدیم کہ بیشک تو اپنی پرانی محبت میں محو ہے۔ یہاں یوسف کی محبت میں محویت کو ضلال کہا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں آتا ہے۔ ضل الماء فی اللبن۔ پانی دودھ میں غائب ہو گیا۔ البتہ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کیوں ہم یہاں گمراہ کے معنے نہ لیں اور کیوں محبت میں محو اور سرگرداں کے معنے لینے کے لئے ہم مجبور ہیں اس کی وجہ اور دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم میں صریح طور پر آتا ہے ما ضل صاحبکم وما غوی۔ تمہارا صاحب

یعنی حضرت محمد صلعم کبھی گمراہ نہیں ہوا اور کبھی حد سے نہیں بڑھا اور پھر یہاں تک تحدی کی کہ فرمایا قد لبثت فیکم عمراً من قبلہ افلا تعقلون۔ کہ کہ دے میں تم میں اس سے قبل ایک عمر گذار چکا ہوں میری کوئی گمراہی کی بات بتاؤ جس کتاب نے محمد رسول اللہ صلعم کے متعلق یہ اعلان کیا ہو کہ یہ شخص جو دن رات تمہارے درمیان رہتا ہے کبھی گمراہ نہیں ہوا اور ساتھ ہی چیلنج بھی دیا ہو کہ اگر تم کوئی اس کی گمراہی کا امر جانتے ہو تو پیش کرو تو پھر وہی کتاب یہ کس طرح کہہ سکتی ہے کہ "تو گمراہ تھا ہم نے ہدایت دی" لہٰذا یہ معنی قطعاً غلط ہیں۔ معنے صحیح یہی ہیں کہ تو خدا کی تلاش میں سرگرداں تھا یا خدا کی محبت میں محو تھا سو ہم نے تجھے منزل مقصود پر پہنچا دیا یعنی تجھے تیرا محبوب یعنی خدا مل گیا اور تو اس کی رضا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہاں پر آنحضرت صلعم کی تین حالتوں کا ذکر فرمایا ہے ایک تو بچپن کی کہ آپ بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے اور والدین کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اور اللہ کا اپنی حفاظت میں لے لینے کا ثبوت صاف ظاہر ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ آپ تنہا رہ گئے تھے اور ایسی حالت میں اکثر یتیم بچوں کے اخلاق و عادات بگڑ جاتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اخلاق و عادات کی تربیت کا ذمہ خود لیا ہوا تھا کہ بجائے بگڑنے کے ایسے اعلیٰ طریق پر ان کی نشوونما ہوئی کہ تاریخ عالم اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اس کے اسباب جو بھی ہوں مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ پرورش اور تربیت اپنے اندر خارق عادت رنگ رکھتی ہے اور خدا کا ہاتھ اس میں صاف نظر آتا ہے۔ دوسری بات یہ بتائی کہ بت پرستی کے اس مرکز اور جہالت و فسق و فجور کے اس گہوارہ میں جہاں خدا پرستی کی آواز بھی کان میں نہ پڑتی تھی۔ آپ کے دل میں خدا کی تلاش اور اس کی محبت کا پیدا ہونا اور پھر اس کے لئے پہاڑوں کی غاروں میں عبادت و ریاضت کرنا اس قدر حیرت انگیز اور خارق عادت امر ہے کہ صاف جذب الوہیت نظر آتا ہے۔ پھر اس عاشق صادق کو بھٹکتا ہوا نہیں چھوڑا۔ بلکہ خود رہنمائی فرما کر منزل مقصود پر پہنچایا اور اپنے وصال سے اس کی جان کو منور کر دیا۔ بلوغت کے بعد آپ کی باطنی ترقی اور روحانی کمال کا ذکر فرما کر دنیا کی مشکلات کے متعلق ارشاد فرمایا کہ آپ کو مفلس پایا پھر غنی کر دیا یعنی آپ کو فکر معاش سے غنی کر دیا تجارت سے پھر حضرت خدیجہ کے نکاح سے آپ کی مالی حالت کو درست کر کے آپ کو معاش سے اتنی بے فکری پیدا کر دی کہ آپ کی توجہ تعلق باللہ اور شفقت علی خلق اللہ پر کما حقہٗ لگ سکے۔ خوب غور کرو انسان کے لئے تین ہی مشکلات ہو سکتی ہیں جو اگر حل ہو جائیں تو ایسا انسان پرے درجہ کا خوش قسمت گنا جائے گا۔ ایک تو بچپن میں پرورش اور تربیت کا کما حقہ ہونا۔ دوم بلوغت کے بعد اخلاق فاضلہ اور خدا پرستی کا پیدا ہو جانا۔ سوم مالی مشکلات دور ہو کر فارغ البالی کا پیدا ہو جانا۔ آنحضرت صلعم پر تینوں مشکلات بدترین شکل میں وارد ہوئیں۔ آپ بچپن میں یتیم ہو کر بہترین خیر خواہوں سے محروم ہو گئے۔ بلوغت کے بعد مشرکوں اور گمراہوں کی صحبت ملی۔ مالی حالت کی تنگی بے حد تھی کیونکہ کوئی سرمایہ اور جاگیر نہ تھی لیکن تینوں مشکلات کا حل جس طریق پر ہوا۔ کیا اس سے صاف پتہ نہیں لگتا کہ ابتدا سے آپ کی پرورش ربوبیت الٰہی کے آغوش میں ہوئی۔ یتیمی میں آپ کی ایسی پرورش اور تربیت ہوئی جس سے آپ کی استعدادوں اور اخلاق کا بہترین نشوونما ہوتا ہے۔ بلوغت کے بعد سوسائٹی کی حالت کے خلاف آپ کو

توحید و معرفت اور محبت الٰہی میں شغف کا پیدا ہونا اور اس میں کامیابی۔ پھر نہ کوئی سرمایہ نہ جاگیر لیکن مالی مشکلات کا فارغ البالی سے بدلا جانا کیا صاف ثبوت الٰہی نصرت و ربوبیت کا نہیں ہے؟

اللہ تعالیٰ کے ان تین انعامات کا یہ صرف ایک پہلو ہے ان انعامات کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ اس کا باطنی پہلو ہے۔ میں کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ یتیم اُسے کہتے ہیں جو دنیا میں اکیلا ہو جس کا کوئی ساتھی نہ ہو۔ اسی لئے دُرِّ یتیم کے معنے ہوتے ہیں ایسا موتی جس کے ساتھ کا موتی دستیاب نہ ہو سکے۔ پس الم یجدك یتیما فآوٰی میں اس حالت کا ذکر فرمایا کہ آپ دنیا میں خدا کی توحید اور معرفت اور تقویٰ اور نیکی قائم کرنا چاہتے تھے لیکن آپ بے یار و مددگار تھے کوئی آپ کا ساتھی نہ تھا آپ کے دل کی اس تڑپ کے پورا ہونے کا کوئی سامان نہ تھا کہ خدا نے دستگیری فرمائی اور آپ کو منصب نبوت پر کھڑا کر کے اپنی پناہ میں لے لیا اور وہ جو دنیا میں تن تنہا اور بے یار و مددگار تھا اس کی حمایت پر خدا کھڑا ہو گیا۔ ووجدك ضالا فھدیٰ۔ دنیا میں گمراہی کا اس قدر زور تھا کہ آپ کو دنیا میں ہدایت پھیلانے کے لئے کوئی راہ نظر نہ آتی تھی کہ خدا نے آپ کو اپنی وحی کے ذریعہ وہ راہیں دکھا دیں جس سے حق اور ہدایت دنیا میں پھیل سکے اور توحید قائم ہو سکے۔ ووجدك عائلا فاغنیٰ۔ آپ اُمی تھے۔ اَن پڑھ تھے اور اتنے بڑے کام کے لئے بڑے علم و حکمت کی ضرورت تھی۔ فرمایا تو اس معاملہ میں مفلس تھا ہم نے علم و حکمت اور دلائل و براہین سے تجھے مالا مال کر دیا تاکہ تو تمام عقائد باطلہ پر غالب آ سکے۔ قرآن میں دوسری جگہ آتا ہے۔ من یؤتی الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً۔ جسے علم و حکمت دیا گیا اُسے بڑا مال دیا گیا۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت آپ کے ساتھ ہر حال میں رہی۔ پیدائش سے شروع کر کے جو مشکل بھی آپ کے راہ میں آئی اللہ تعالیٰ نے اپنی حمایت اور نصرت کا وہاں ثبوت دیا اور اس کے حل کرنے میں معجز نمائی فرمائی۔ یتیمی آئی تو اپنی ربوبیت کے آغوش میں پرورش اور تربیت فرمائی۔ بلوغت کے بعد توحید و معرفت میں رہنمائی کی ضرورت پیش آئی تو وہاں تمام منازل سلوک طے کرا کے گوہر مقصود کو دامن مراد میں ڈال دیا۔ مالی مشکلات راستہ میں آئیں تو اسے فارغ البالی سے بدل دیا۔ دنیا کی اصلاح کی تڑپ دل میں اٹھی تو اس بیکسی اور تنہائی میں آپ کا ساتھ دیا۔ اور نبوت کے منصب پر سرفراز فرما کر اپنی حمایت میں لے لیا۔ شرک اور گمراہی کے زور کی حالت میں اصلاح اور ہدایت کی راہ نظر نہ آتی تھی تو وحی کے ذریعہ رہنمائی فرمائی اتنے بڑے کام کے لئے بڑے علم اور سرمایہ کی ضرورت تھی اس میں آپ کو علم و حکمت سے مالا مال کر دیا اور ہر قسم کی احتیاج کو غنا سے بدل دیا۔ دیکھو ہر حالت کے بعد جو دوسری حالت آئی وہ پہلے سے بہتر آئی۔ ہر عُسر کے بعد یُسر نے جب صورت دکھائی تو پہلے سے بڑھ بڑھ کر انعامات لئے ہوئے آئی تو پھر آئندہ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین رکھو کہ مشکلات اور مصائب کا آنا تو لازمی امور ہیں یہ تو ضرور آئیں گے۔ لیکن ہر مصیبت اور تنزل کے بعد جو گھڑی آئیگی وہ محمد رسول اللہ صلعم کے لئے بہتر ہوگی۔ اور آپ کا امر ترقی کرتا چلا جائیگا کیونکہ خدا آپ کو کبھی نہ چھوڑے گا اور نہ ناراض ہوگا۔ الغرض جب اللہ تعالیٰ کے اخلاق محبت و وفا کے یہ ہیں تو پھر انسان کو بھی چاہیئے کہ وہ اخلاق الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرے اور اسی رنگ میں رنگین ہو جائے پس جن باتوں کی خدا سے توقع رکھتے ہو۔ اپنی جگہ وہی سلوک دوسروں سے کرو تاکہ مزید انعامات اور افضال الٰہیہ کو جذب کرنے والے ٹھہرو۔ فرماتے ہیں :-

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ پس یتیم پر سختی نہ کر۔

یہ الم یجدك یتیماً فاٰوی کے بالمقابل ہے جو یتیم پر سختی نہیں کرتا بلکہ اس سے نیک سلوک کرتا ہے۔ خدا بھی اس کی تنہائی اور بیکسی میں اس کا ساتھ دیتا ہے اور اسے اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ اور پس سوالی کو نہ ڈانٹ۔

یہ ووجدك ضالاً فھدیٰ کے بالمقابل ہے۔ اس آیت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ضالاً سے مراد محبت الٰہی کا طالب اور ہدایت خلق کی راہ کو پانے کا سائل ہے نہ کہ گمراہ۔ گویا السائل نے ضال کی تفسیر کردی۔ پس جو سوالی کو نہیں ڈانٹتا۔ اللہ تعالیٰ بھی اس کے سوال کو رد نہیں کرتا اور اپنے دربار تک اُسے راہ بخشتا ہے

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝ ع اور اپنے رب کی نعمت کا ذکر کرتا رہ۔

یہ ووجدك عائلاً فاغنیٰ کے بالمقابل ہے۔ جو شخص اپنے رب کی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے اس سے دو فائدے ہیں۔ ایک تو نعمت کے پانے پر شیخی اور تکبر اور خودستائی جو لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہے اس سے انسان بچ جاتا ہے اور انسان کو اپنی حاجتمندی اور اپنے رب کے احسانات کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے جس سے اپنے رب کے ساتھ بندہ کی محبت کا تعلق بڑھتا رہتا ہے دوسرے اپنے جیسے حاجتمندوں سے ہمدردی بڑھتی ہے اور ان کی حاجت برآری کے لئے قلب میں تحریک ہوتی رہتی ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ اخلاق الٰہیہ میں سے جس خلق سے انسان رنگین ہوتا ہے اور مخلوق کو اس سے نفع پہنچاتا ہے اللہ تعالیٰ کا خلق بھی اسی رنگ میں اس کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ مثلاً جو مفلسوں کی حاجت برآری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی حاجت برآری کرتا ہے۔ حدیث شریف میں بھی آتا ہے جسے حالی مرحوم نے منظوم کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر۔ خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

دوسرا فائدہ تحدیث بالنعمۃ کا یہ ہے کہ اگر خدا نے علم و حکمت کی دولت دی ہے تو تحدیث یعنی اس کے ذکر اذکار سے یہ دولت اپنی بھی بڑھتی ہے یعنی علم کی ترقی ہوتی ہے اور دوسرے لوگ بھی علم و حکمت کی دولت سے مالا مال ہوتے چلے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر سننے سے دوسرے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ سے تعلق پکڑنے کا شوق پیدا ہوتا ہے

ان پچھلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے تین اخلاق و احسانات کے بالمقابل انسان سے بھی اسی قسم کے تین اخلاق کے ظہور کا مطالبہ کیا ہے تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کے مزید احسانات اور انعامات کا مورد بنے۔ جب رحمٰن صفت نے بغیر معاوضہ کے اتنے احسانات کئے ہیں تو انسان اپنے ان اخلاق سے اللہ تعالیٰ کی رحیم صفت سے مزید انعامات کیوں نہ حاصل کرے۔ ان تینوں مطلوبہ اخلاق کی تفسیر اوپر ہو چکی۔ لیکن ان میں تین لطائف بھی بطور اشارہ کے موجود ہیں۔ اوّل فاما الیتیم فلا تقھر میں یہ اشارہ موجود ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کو یتیم اور تنہا سمجھ کر سختی نہ کر یہ وہ یتیم ہے جس کی حمایت

پر خدا ہے اسے تنہا نہ سمجھیو کیں اس پہاڑ سے ٹکرا کر تم اپنا سر نہ پھوڑ لینا۔ پھر فاما السائل فلا تنھر میں یہ اشارہ کیا کہ محمد رسول اللہ صلعم تمہاری ہدایت کا سائل ہے۔ خدا کے حضور بھی وہ اسی بات کا سوالی ہے کہ تم ہدایت پا جاؤ اور تم سے بھی اسی بات کا سوالی ہے کہ اپنی اصلاح کر لو پس ایسے سائل کو جو اپنے نفس کے لئے کچھ نہیں مانگتا جو کچھ مانگتا ہے تمہارے اپنے بھلے کے لئے مانگتا ہے۔ نہ جھڑکیو۔ اپنے خیر خواہ کو جھڑکنا کیا معنے رکھتا ہے وہ تو اس لائق ہوتا ہے کہ انسان اس کا احسان مانے اور شکریہ ادا کرے۔ چنانچہ اس کے آگے فاما بنعمة ربك فحدث فرما کر یہ اشارہ فرمایا کہ اس شخص کا وجود اور یہ ہدایت یہ تمہارے لئے لایا ہے یعنی قرآن۔ اللہ تعالیٰ کی بڑی عظیم الشان نعمت ہے اسے شکریہ کے ساتھ قبول کرو اور اس نعمت کا ذکر دوسروں سے بھی کرو تا دوسرے بھی اس سے نفع اٹھاویں۔

سُوْرَةُ الْاِنْشِرَاحِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | وَهِيَ ثَمَانُ اٰيَاتٍ

سورۃ الانشراح کا نزول ابتدائی زمانہ مکہ معظمہ میں ہوا۔ یہ سورۃ الضحیٰ کے تتمہ کے طور پر ہے۔ وہی مضمون چلا چلتا ہے اور اسی وعدہ الٰہی پر زور دیا گیا کہ ہر پیچھے آنے والی گھڑی تیرے لئے پہلی گھڑی سے بہتر ہوگی اور تیرا امر ترقی کرے گا اور تیرا ذکر بلند ہوگا اور اس مستقبل کے لئے ماضی پر غور کرنے کا ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان انعامات پر غور کرو جن کا ظہور خارق عادت طور پر آپ کے لئے ہو چکا ہے۔ پس تسلی رکھو کہ آئندہ بھی ان انعامات کا سلسلہ بند نہیں ہوگا۔ الم یجدك یتیما فاٰوٰی کی طرح اس سورت کو بھی الم نشرح لك صدرك سے شروع کیا ہے یعنی ماضی کو پیش کر کے آئندہ کے لئے دلیل قائم کی ہے انعامات الٰہیہ جاری رہنے کے لئے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿۱﴾ کیا ہم نے تیرے لئے تیرا سینہ نہیں کھول دیا۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ﴿۲﴾ اور تجھ سے تیرا بوجھ اتار دیا جس نے الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴿۳﴾ تیری پیٹھ توڑ رکھی تھی۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿۴﴾ اور ہم نے تیرے ذکر کو تیرے لئے بلند کیا۔

انشراح صدر یعنی سینہ کھولنے سے مراد ہمارے مفسرین نے وہ واقعہ مراد لیا ہے جو آپ کو بچپن میں پیش آیا اور پھر بعد بلوغت بھی پیش آیا اور معراج کے وقت بھی پیش آیا۔ اور وہ ایک کشفی نظارہ تھا جس میں دکھایا گیا تھا کہ آپ کے سینہ کو چیرا گیا اور آپ کے دل کو ہر ایک قسم کی آلائش سے پاک کیا گیا۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ آپ کے قلب کو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک قسم کی آلودگی سے پاک کر دیا تھا اور یہ نظارہ کشفی رنگ میں نظر آیا تو عین مطابق عقل ہے لیکن یہاں نفس مضمون سے اس واقعہ کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ سینے کا انقباض اور انشراح یہ قلب انسانی کی دو حالتیں ہیں۔ جب آدمی کسی بوجھ کو

اپنی طاقت سے زیادہ پاتا ہے اور کسی کام کو اپنی بساط سے بڑھ کر سمجھتا ہے تو اس کے لئے اس کا سینہ تنگی کرتا ہے جسے انقباض کہتے ہیں اور جب وہ اس بوجھ کے اٹھانے میں آسانی محسوس کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں اس کام کو چلا لوں گا اور کام چل پڑتا ہے تو سینہ کھل جاتا ہے اسے انشراح صدر کہتے ہیں۔ نبوت جاری کرنے کے شوقینوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ نبوت کسی کمال کا نام ہے۔ کمال ہوتا تو نبی اس سے کیوں گھبراتے۔ کمال اور انعام کے ملنے پر گھبراہٹ کیا معنی۔ بلکہ حقیقت یہی ہے جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہے کہ نبوت ایک بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ تمام دنیا کی اصلاح کا بوجھ اپنی گردن پر لینا کوئی دل لگی نہیں۔ انسان کے لئے اپنے اعمال اور ان کی اصلاح کا بوجھ ہی کیا کم ہوتا ہے تو خیال کرو کہ ساری دنیا کی اصلاح کا بوجھ جس شخص پر آپڑے اس کا کیا حال ہوگا؟ چنانچہ سورۂ ہود میں جب آنحضرت صلعم کو ارشاد الٰہی ہوا کہ فاستقم کما امرت ومن تاب معك ولا تطغوا کہ کھڑا ہو جا اور قائم ہو جا جیسے تجھے حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی جو توبہ کر کے تیرے ساتھ ہو لئے ہیں اور حد سے نہ بڑھو۔ تو حدیثوں میں لکھا ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی امر الٰہی کے مطابق قائم ہو جانے کے لئے جو تاکید ان آیات میں آئی ہے اس کی وجہ سے آنحضرت صلعم نے اس قدر بوجھ محسوس کیا کہ آپ کے ریش مبارک میں سفید بال آگئے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا شیبتنی هود۔ کہ سورہ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ حضرت موسیٰ کو جب نبوت ملتی ہے تو اس بوجھ سے ایسا گھبراتے ہیں کہ پہلے تو اپنے بھائی ہارون کو اس منصب کے لئے پیش کرتے ہیں اور هوا فصح منى لسانا (یعنی وہ میری نسبت بہت فصیح البیان ہے) کہہ کر اپنی جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ لیکن جب شنوائی نہ ہوئی تو پھر عرض کرتے ہیں کہ رب اشرح لی صدری ویسر لی امری۔ واحلل عقدة من لسانی۔ یفقهوا قولی۔ واجعل لی وزیراً من اهلی۔ هرون اخی۔ کہ اے میرے رب میرے سینہ کو کھول دے اور میرے امر کو یعنی اس نبوت کے کام کو میرے لئے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے کہ لوگ میری بات کو سمجھیں اور متاثر ہوں اور میرا بوجھ بٹانے والا میرے خاندان میں سے بنا دے یعنی میرا بھائی ہارون۔ دیکھ لیجئے نبوت کے بوجھ سے کیسا گھبراتے ہیں اور اسے وزر فرماتے ہیں یعنی بوجھ اور اس بوجھ کو اٹھانے میں اپنے بھائی ہارون کو مدد کے لئے مانگتے ہیں۔ یہی معاملہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے آپ پر جب نبوت کا یہ بوجھ ڈالا گیا تو آپ بھی بہت پریشان ہوئے۔ گھر تشریف لا کر اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ کو فرمایا کہ زملونی زملونی۔ مجھے اڑھا دو مجھے اڑھا دو۔ اور تمام معاملات کا ذکر فرما کر یہ ارشاد کیا کہ خشیت علی نفسی۔ کہ میں ڈرتا ہوں کہ میرا نفس یہ بوجھ برداشت نہ کر سکے گا۔ اس پر حضرت خدیجہ نے بہت تشفی دی اور آپ کے اخلاق فاضلہ کا ذکر کر کے کہا کہ اللہ تعالیٰ ایسے نافع وجود کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ پس یہی وہ بوجھ تھا جس نے آپ کی پیٹھ توڑ رکھی تھی۔ آپ اس کام کو اپنی بساط سے بڑھ کر محسوس کرتے تھے اس لئے کمر ٹوٹی جاتی تھی۔ آپ کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ بگڑی ہوئی دنیا کی میں کس طرح اصلاح کر سکوں گا اور خدا کے سامنے اس ذمہ داری سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکوں گا۔ لیکن انوار الٰہی اور سکینت اور وحی الٰہی کے لگاتار نزول نے آپ کے قلب مبارک کو اطمینان سے بھر دیا اور ہر طرح کے علمی دلائل آپ پر کھل گئے اور دنیا کی اصلاح کی جو فکر آپ کو تھی اس میں الٰہی نصرتوں نے ایسی آسانیاں میسر کر دیں اور ایسی راہیں کھول دیں کہ وہ بوجھ ہلکا ہو گیا اور آپ کا سینہ کھل گیا۔ گویا جو

بوجھ آپ پر رکھا گیا تھا اس کے لئے آپ نے تو کوئی مددگار نہ مانگا تھا لیکن فضل ربی مدد کے لئے شامل حال ہو گیا اور اس بوجھ کے اٹھانے میں مددگار ہو گیا جس سے آپ کا انشراح صدر ہو گیا اور امر نبوت میں آسانی ہو گئی۔ پھر اتنا ہی نہیں کہ آپ کا بوجھ اٹھا لیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذکر خیر کا بھی آوازہ بلند کیا۔ اور وہی شخص جس کو کوئی جانتا بھی نہ تھا اس کی عزت کو ایک عالم سے تسلیم کروا دیا۔ آپ کے ابتدائی زمانہ کے حالات کو پڑھو اور آپ کی تنہائی و گمنامی، بیکسی و بے بسی پر غور کرو۔ اور پھر آپ صلعم کی اس عظمت و شان پر غور کرو جو چند سالوں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ مکہ کا ایک امی ان پڑھ بیکس و بے بس گمنام انسان۔ اور اس شان اور دبدبہ کے مقام پر اللہ تعالیٰ آخر کار اُسے کھڑا کر دیتا ہے کہ شہنشاہ اس کی جوتیوں کو اٹھانا اپنا فخر سمجھتے ہیں جیسا کہ قیصر روم نے لکھا تھا کہ کاش کہ میں آپ کی خدمت میں ہوتا اور آپ کی جوتیوں کے تسمے باندھتا پھر اس امی کو علم و معرفت کا وہ خزانہ بخشتا ہے کہ دنیا کے اہل علم اور صاحب خرد لوگ اس کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرنا اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں علم و حکمت کے وہ زرین اصول قائم کر جاتا ہے کہ بعد میں آنے والے خواہ کتنا ہی اس پر عمارتیں بنائیں لیکن تحقیقات کر کے دیکھو گے تو یہی پاؤ گے کہ بنیادیں اسی امی کے سکھائے ہوئے اصولوں پر کھڑی ہیں بڑے بڑے عارف اور موحد اس شخص کی شاگردی کا دم بھرتے اور اسے اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس

بار نبوت کے اٹھانے کے صلہ میں ملا

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ پس بیشک مشکل کیساتھ آسانی ہے بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے

یہ وہ زریں اصول ہے جو انسان کی ہمت کو بلند اور حوصلہ کو وسیع کر دیتا ہے اور صبر اور استقامت اور جدوجہد کی روح اس کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ یہ وعدۂ الٰہی کہ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے بڑی سے بڑی مصیبت میں انسان کا حوصلہ پست نہیں ہونے دیتا۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ عسر پر الف لگا کر اسے تو خاص کر دیا اور یسر کو نکرہ یعنی عام رکھا تو اس فقرہ کے دہرانے میں جہاں تاکید مدنظر ہے وہاں یہ بھی ساتھ ہی اشارہ ہے کہ دونوں فقروں میں عسر تو وہی ایک ہے کیونکہ الف اس پر لگا ہوا ہے۔ اور یسر دو ہیں۔ گویا ہر ایک مشکل کے بعد دوہری آسانیوں کا وعدہ ہے۔ یعنی مشکل کے بعد جو آسانی آتی ہے وہ اس مشکل سے دوچند ہوتی ہے ان لطائف کے علاوہ اس میں یہ بھی وعدہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آنحضرت صلعم کو پہلی عُسر کے بعد یُسر ملا۔ یعنی نبوت کے بوجھ پڑنے اور اس کی مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ بوجھ اٹھا لیا اور مشکلات آسان کر دیں اور وہ وقت آ گیا کہ آنحضرت صلعم کی عزت مسلّم ہو کر آپ کی تعلیم کو لوگوں نے قبول کر لیا۔ اسی طرح جب بھی آنحضرت صلعم کے دین پر عُسر کی حالت آئے گی اور مشکلات اور مصائب کا زور ہو گا اس کے بعد اسی طرح ویسر بھی آئے گا اور مشکلیں آسانی سے بدل کر محمد رسول اللہ صلعم کی عزت آگے سے بھی زیادہ بلند ہو گی۔ گویا عُسر کے بعد یُسر کے وعدہ کو دہرایا اسی لئے گیا ہے کہ بطور قاعدہ کے یہ امر ہوتا رہے گا کہ آنحضرت صلعم کے دین پر جب بھی عُسر کی حالت آئے گی یُسر اس کے بعد ضرور آئے گا اور آنحضرت صلعم کا ذکر بلند ہو گا۔ آج بھی اسلام پر مصیبت ہے اور طرح طرح کے گندے الزامات اور ناپاک بہتان آنحضرت صلعم پر پادریوں اور آریوں نے لگائے اور گندے سے گندہ لٹریچر پیدا کیا گیا اور اسلامی سلطنتوں کو تباہ کیا گیا اور مسلمانوں کو ذلیل کرنے میں

کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا لیکن خدا کا وعدہ ہے کہ عسر کے بعد یُسر ضرور آئیگا اور محمد رسول اللہ صلعم کا ذکر ضرور بلند ہوگا۔ اور اسکے آثار ہویدا ہیں۔ مَیں تو حضرت مرزا غلام احمد مجدد وقت کی بعثت کی غرض ہی یہی سمجھتا ہوں کہ عسر کے بعد یُسر پیدا ہو۔ اور محمد رسول اللہ صلعم کا ذکر بلند ہو۔ چنانچہ دیکھ لو کہ حضرت مجدد وقت اور آپ کے شاگردوں کے لٹریچر کے ذریعہ سے ہی آج وہ یُسر اپنی شکل دکھانے لگا ہے جو ابھی تو ایک بیج ہے مگر وقت آتا ہے کہ انشاء اللہ تعالےٰ وہ ایک بڑا درخت بن کر نظر آئے گا۔ جیسا کہ حضرت مجدد وقت نے ایک مرتبہ مولانا نورالدین صاحب کے اظہار مایوسی پر فرمایا کہ مولوی صاحب پہلی رات کے چاند کو سوائے تیز نظر رکھنے والے کے اور کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ جب وہ بدر کامل بن کر چمکتا ہے تب ساری دنیا دیکھتی ہے۔ اسی طرح میری نظر نے اسلام کی ترقی کے ہلال کو دیکھ لیا ہے۔ انشاء اللہ وقت آئے گا کہ وہ بدر بن کر چمکے گا اور ایک عالم اسے دیکھے گا۔ اسی خیال کو اس شعر میں بھی ظاہر فرما دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

آ رہی ہے اب تو خوشبو میرے یوسف کی مجھے ؎ گو کہو دیوانہ لیکن میں کروں گا انتظار

یہاں یوسف اسلام کی ترقی کو کہا ہے جس کے لئے آپ حضرت یعقوب کی طرح بیقرار تھے۔ بدقسمتی سے آج کل بعض احمق اپنے آپ کو یوسف موعود قرار دیکر اپنی تعلّی اور حماقت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں گویا حضرت مجدد وقت انہی احمقوں کے لئے بیقرار تھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ حالانکہ انہیں عشق اگر تھا تو ترقی اسلام کا تھا اور اسی کے لئے آپ کی ساری بیقراری تھی۔ چنانچہ اب اللہ تعالےٰ ترقی اسلام کے آثار دکھا رہا ہے اور خود یورپ میں جو اسلام کی تباہی کا خواہاں تھا اسلامی اصول دلوں کو فتح کرتے چلے جا رہے ہیں اور برنارڈ شا جیسے اعلیٰ عقل و فکر کے انسان بول اُٹھے ہیں کہ سَو برس تک یورپ میں اسلام کی روحانی فتح مکمل ہو جائیگی اور محمد رسول اللہ صلعم کی نسبت یہ فتویٰ لگانے لگے ہیں کہ اگر آپ آجائیں اور دنیا کے ڈکٹیٹر بن جائیں تو دنیا کو موجودہ مشکلات سے نجات مل جائے۔ غرضکہ عسر کے بعد یُسر کے آنے کا اور محمد رسول اللہ صلعم کے ذکر کے بلند ہونیکا خدائی وعدہ ہے جو انشاء اللہ پورا ہو کر رہے گا۔

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ پس جب تو فارغ ہو دے تو کام میں لگ جا۔

وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ اور اپنے رب کی طرف رغبت اور توجہ کر۔

عسر کے بعد یُسر کے آنے کو کیسا یقینی ظاہر کیا ہے کہ فرماتے ہیں کہ جب تو فارغ ہوئے یعنی عسر کے بعد یُسر آجاوے تو کام میں لگ جاؤ یا عسر کے بعد یُسر کا آنا ایک یقینی امر ہے لیکن دنیا میں قوموں کے اعمال کیساتھ حالات بدلتے رہتے ہیں، اسلئے یُسر کے آجانے کے بعد اُسکے قائم رکھنے کیلئے بھی کوئی سامان ہونا چاہیئے تھا۔ پس ان آیات میں وہ گُر بھی سکھا دیئے جن سے یُسر کے بعد پھر عسر نہ پیدا ہو۔ عام قاعدہ ہے کہ جب انسان مصائب اور تنگیوں سے نکل کر یسر اور فراخی کو پالیتا ہے، اور تکلیفوں اور پریشانیوں کے بعد حکومت و دولت اور اطمینان کو حاصل کرتا ہے تو پھر وہ تن آسانیوں اور عیش و آرام میں پڑ کر نکما ہو

ہو جاتا ہے۔ اور کام کو چھوڑ دینا اور غفلت اور تن آسانیوں میں پڑ جانا قوم کے تنزّل اور عُسر کی بنیاد ہوا کرتی ہے اسی لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا فرماتے ہیں بلینا بالضراء فصبرنا وبلینا بالسّراء فلم نصبر کہ ہمیں تکلیف سے آزمایا گیا تو ہم نے صبر سے کام لیا لیکن جب آسانیوں اور دولت سے آزمایا گیا تو ہم صبر نہ کر سکے۔ یہ صبر نہ کر سکنے والے بعد میں آنیوالے مسلمان تھے جنہوں نے سلطنت اور دولت پاکر اپنی جدوجہد اور تقوے پر استقامت نہ دکھائی اور آخر کار قوم کو تنزّل کی راہ پر ڈال کر دوبارہ عُسر لانے کے سامان جمع کر دیئے۔ پس ایک نقص جو یُسر میں پیدا ہو جاتا ہے یہ ہے کہ انسان کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور عیش پرستیوں میں پڑ کر نکما ہو جاتا ہے جو تنزل اور عُسر کی بنیاد ہے اور دوسرا نقص جو یُسر میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کو بھول جاتا ہے اور عیش و عشرت میں ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ تنزّل اور عسر کا دوسرا بنیادی پتھر ہے۔ پس خطرہ کی ان دونوں راہوں سے بچنے کے اصُول بتا دیئے کہ جب عُسر کے بعد یُسر ملے اور فراغت نصیب ہو تو نکمے نہ بن جانا بلکہ اس فراغت کا فائدہ اُٹھا کر اور زیادہ کام میں لگو تا کہ بیش از بیش ترقیات اور یُسر کے وارث بنو اور خدا کی یاد میں اور زیادہ لگ جاؤ تا کہ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ دین کی ترقی بھی ہوتی جائے۔ اس طرح تمہاری یُسر کی حالت کبھی زائل نہیں ہو سکتی فارغ البالی اور اطمینان کی حالت میں جو قوم محنت اور کام سے جی نہ چُرائے گی بلکہ فارغ البالی اور امارت سے مزید فائدہ اُٹھا کر اپنے کاموں کو اور ترقی دے گی اور امارت و حکومت کے نشہ میں خدا کو نہیں بھولے گی بلکہ دولت و حکومت سے مزید فائدہ اُٹھا کر خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت و شفقت پر زیادہ توجہ دے گی۔ ایسی قوم یا خاندان یا فرد پر سے یُسر زائل نہیں ہو سکتا۔ اور عُسر کبھی نہیں آسکتا مسلمانوں کا یُسر تبھی زائل ہوا جب انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا اور خدا کو بھول کر ہر قسم کے فسق و فجور میں پڑ گئے۔ یورپ کی قوموں اور ہندوؤں نے صرف ایک گُر لیا ہے اور یُسر کے مالک بنے بیٹھے ہیں یعنی باوجود دولت و حکومت کے وہ لوگ کام سے غافل نہیں ہوئے یورپ کی قوم کی جفاکشی کسی سے مخفی نہیں اسی لئے ان پر یُسر ہے، ہندو لکھپتی کا بیٹا تعلیم حاصل کرنے اور کام کرنے میں کبھی غفلت نہیں کرتا اسی لئے ان پر یُسر ہے مسلمان کے گھر میں روٹی کھانے کو ہو تو انکے پوت پڑھنے لکھنے اور کام کرنے کے نزدیک نہیں پھٹکتے اسی لئے خاندان کے خاندان برباد ہو گئے اور عُسر ان پر چھا گیا۔ اب دوسرا اصول لو کہ خدا کو نہ بھول جانا۔ یورپ خدا کو بھول چکا ہے اسلئے وہاں کے داناؤں کی یہ رائے ہے کہ اگرچہ جفاکشی اور کام کی طرف توجہ نے یُسر کو سنبھالا ہوا ہے لیکن تا بکے خدا کو بھول جانے سے جو دنیا طلبی نفس پرستی اور فسق و فجور کی حالت پیدا ہو گئی ہے اس کا انجام اچھا نہیں یہ عُسر پیدا کر کے رہیگا۔ پس عسر سے بچنے کی راہ یہی ہے کہ انسان فراغت اور راحت یعنی یُسر کی حالت میں کام کو نہ چھوڑ بیٹھے بلکہ دولت و امارت اور فراغت و یُسر سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کام میں زیادہ وقت اور زیادہ توجہ دے تا کہ وہ بیش از بیش ترقیات کا وارث ہو، اور خدا کو نہ بھولے بلکہ فراغت اور یُسر سے فائدہ اُٹھا کر خدا کی طرف زیادہ توجہ کرے اور اس کی مخلوق کی زیادہ خدمت کرے کہ یہ اس کے انعام کا شکریہ بھی ہے اور قوم کی روحانی اور اخلاقی ترقی بھی اسی سے وابستہ ہے پس ایسی قوم پر سے یُسر زائل نہیں ہو سکتا اور دینی و دنیوی ترقیات کا یہی اصل گُر ہے۔ مسلمان اگر اس پر عمل کرتے تو ان کا یُسر کبھی زائل نہ ہوتا۔ اور اگر آج اس پر عمل کرنے لگیں تو عُسر کا یُسر سے بدل جانا ایک یقینی امر ہے۔

سورۃ التین مکیۃ	بسم اللہ الرحمن الرحیم	و ھی ۸ آیات

اس سورت کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ پچھلی سورت الانشراح میں جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ وعدہ فرمایا تھا کہ تیرا ذکر بلند ہوگا اس کی وجہ اس سورت میں بتلائی گئی ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اسکی فطرت میں اعلیٰ سے اعلیٰ قوئی اور استعدادیں رکھی ہیں اور انہیں بہترین حالتِ عدل پر پیدا کیا ہے اور اسکے لئے اگر دلیل کی ضرورت ہو تو ان لوگوں کو دیکھو جنہوں نے حکم الٰہی کے ماتحت اپنے ان فطری قوئی کو نشوونما دیا اور اپنی فطرت صادقہ کو حالت عدل میں رکھکر بلند ہوتے اور وہ وہی ہیں جو منعم علیہ گروہ ہے جن کی راہ صراط مستقیم ہے یعنی انبیاء اور اولیاء اللہ۔ پس جو لوگ خدا کی عطا کردہ قوئی اور استعدادوں کو نشوونما دیتے ہیں وہ اس مقام عالی کو پاتے ہیں کہ انکا ذکر دنیا و آخرت میں بلند کیا جاتا ہے ان میں حضرت عیسیٰ و موسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر یہاں پیش کرکے اشرف المخلوقات ہونے پر استدلال کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:-

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ گواہ ہیں تین یعنی انجیر اور زیتون

وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ گواہ ہے سینا پہاڑ

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ اور گواہ ہے یہ امن والا شہر

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ بیشک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر یعنی بہترین حالت عدل پر پیدا کیا ہے۔

تین۔ انجیر کو کہتے ہیں اور فلسطین میں ایک پہاڑ کا بھی نام ہے۔

طور۔ پہاڑ کو کہتے ہیں۔ سینا اس کا نام ہے۔

بلد الامین۔ امن والا شہر۔ یا ایسا شہر جو امانت حق کو ہمیشہ ادا کرتا رہیگا۔ مراد یہاں مکہ معظمہ ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ طور سینا اور بلد الامین دونوں میں اشارہ اس سرزمین کی طرف ہے جہاں انبیاء کی دعوتوں کا ظہور ہوا۔ اس بناء پر تین و زیتون میں بھی ضرور ہی کسی ایسی ہی سرزمین کی طرف اشارہ ہو جہاں انبیاء کی دعوتوں کا ظہور ہوا ہے۔ اس وقت جبکہ قرآن کریم کا نزول ہوا۔ اور آج بھی جبکہ تمام دنیا کے ملکوں کی طبعی پیداوار ہمارے سامنے موجود ہے انجیر اور زیتون ایک مخصوص پیداوار شام اور فلسطین کی ہے۔ جس کثرت کیساتھ اور جس قدر اعلیٰ درجہ کی یہ دو نو چیزیں یہاں ہوتی ہیں کہیں نہیں ہوتیں۔ پس تین و زیتون کا اشارہ اگر کسی ایسے ملک کی طرف ہو سکتا ہے جہاں انبیاء کی دعوتوں کا ظہور ہوا تو وہ ملک شام اور فلسطین ہے

جہاں کی یہ چیزیں پیداوار ہیں۔ بلکہ بعض محققین کے نزدیک تو تین اور زیتون فلسطین میں دو پہاڑ ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت گاہ اور حضرت عیسیٰؑ کا مقام بعثت ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تین وہی پہاڑ تھا جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے وعظ کیا کرتے تھے جن میں سے وہ مشہور پہاڑی وعظ بھی ہے جسے عیسائی بڑے فخر سے پیش کیا کرتے ہیں جس میں ہے کہ جو تیری ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی پھیر دے یعنی اس میں نہایت انکسار اور فروتنی کی تعلیم تھی۔ اور زیتون حضرت عیسیٰ اور دیگر انبیاءِ بنی اسرائیل کا محبوب پہاڑ تھا جہاں وہ جایا کرتے اور عبادت اور وعظ کیا کرتے تھے۔ ان حالات میں پھر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تین اور زیتون اسی پہاڑ کے حصے تھے جس کا نام توریت کی پیشگوئی میں سعیر رکھا گیا تھا جس میں لکھا ہے کہ "خدا سینا سے نکلا۔ سعیر سے چمکا اور فاران سے ظاہر ہوا اور آتشی شریعت اس کے داہنے ہاتھ میں تھی اور وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا"۔ خدا کا سینا سے نکلنا حضرت موسیٰ کی بعثت کی۔ اور سعیر سے چمکنا حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کی اور ان سب کے بعد فاران سے ظاہر ہونا حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کی بعثت کی کھلی کھلی پیشگوئیاں ہیں۔ فاران مکہ کے گرد کی پہاڑیوں کا نام ہے۔ آتشی شریعت قرآن کریم کی شریعت ہے، اور آنحضرت صلعم فتح مکہ کے وقت جب فاران کی پہاڑیوں پر جلوہ گر ہوئے تو دس ہزار قدوسی یعنی دس ہزار صحابی آپ کے ہمراہ تھے۔

اب رہا یہ امر کہ بجائے نبیوں کا نام لینے کے ان مقامات کا نام کیوں لیا جہاں ان بزرگوں کی وحیوں کا ظہور ہوا، اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ فصاحت و بلاغت کا یہ قاعدہ ہے کہ کلام میں زور پیدا کرنے کیلئے بعض دفعہ ظرف بول کر مظروف مراد لیتے ہیں مثلاً حضرت مجدد وقت نے صاحبزادہ عبداللطیف مرحوم کی شہادت کے وقت جو لکھا تھا کہ "اے کابل کی سرزمین تو خدا کی نظروں سے گر گئی" تو وہاں کابل کی سرزمین سے مراد کابل کے وہ لوگ تھے جنہوں نے اس ظلم عظیم میں حصہ لیا تھا۔ اسی طرح کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

اے بخارا شاد باش و شاد زی ؛ شاہ سویت شادماں آید ہمے

یہاں بخارا سے مراد اہلِ بخارا ہیں۔ اسی طرح یہاں تین۔ زیتون۔ طور سینین۔ بلد الامین چاروں جگہ ظرف بول کر مظروف مراد لیا ہے۔ یعنی ان مقامات پر جو خدا کے نبیوں کا ظہور ہوا اور ان پر خدائی تعلیمیں نازل ہوئیں اور انسانی اخلاقِ فاضلہ کے نمونے دکھائے گئے وہ اس بات پر گواہ ہیں کہ تمام مخلوقات میں سے انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانہ اور بہترین حالت عدل پر پیدا کیا گیا ہے۔ تین اور زیتون میں حضرت عیسیٰ کو جو پیش کیا گیا تو اس لئے کہ جمالی تعلیم اور جمالی اخلاق کا نمونہ پیش کرنے میں حضرت عیسیٰ کو ایک امتیاز خاص حاصل ہے جس سے انسانی اخلاق کا جمالی پہلو پوری طرح واضح اور روشن ہو گیا۔ اور سینا کا پہاڑ وہ ہے جہاں حضرت موسیٰ کو شریعت ملی اور آپ سے اس جلالی تعلیم اور جلالی اخلاق کا ظہور ہوا جس نے انسانی اخلاق کے جلالی پہلو کو اپنی پوری شان سے ظاہر کر کے انسانیت کے شرف کو ظاہر کیا۔ اور بلد الامین یعنی مکہ معظمہ وہ مقام ہے جہاں حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو قرآن جیسی کامل شریعت ملی جو جلال اور جمال دونوں کی جامع ہے یعنی اس میں انجیل کی طرح نہ تو صرف نرمی ہی نرمی ہے اور توریت کی طرح نہ صرف سختی ہی سختی کی تعلیم ہے بلکہ نرمی کے موقعہ پر نرمی اور سختی کے موقعہ پر سختی کی تعلیم دیکر انسان کے اخلاق کے ہر پہلو کی تکمیل کر دی اور حضرت محمد مصطفےٰ صلعم نے دونوں قسم کے اخلاق جلالی و جمالی اپنے نمونہ سے اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانہ پر دکھا کر انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر مہر تکمیل لگا دی۔ پس یہ تینوں مقامات بوجہ اپنے جمالی اور جلالی خدائی تعلیم اور ان کے

مطابق اخلاق فاضلہ کے نمونوں کے اس امر پر گواہ ہیں کہ انسان واقعی تمام مخلوقات سے افضل اور بہترین حالت عدل و اعتدال پر پیدا کیا گیا ہے۔

اس جگہ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ توریت میں جو پیشگوئی ہے کہ "خدا سینا سے نکلا اور سعیر سے چمکا اور فاران سے ظاہر ہوا" اس میں سینا کا ذکر پہلے کیا گیا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ کی بعثت پہلے ہے اور سعیر کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ کیونکہ عیسیٰ کی بعثت بعد میں ہے۔ گویا یہاں زمانہ کے تقدم اور تاخر کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور قرآن کریم میں تین اور زیتون (جو سعیر کا ہی حصہ ہیں) کا ذکر پہلے ہے اور سینا کا ذکر بعد میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالی اخلاق کے ظہور کا زمانہ پہلے تھا جس میں آپ کو حضرت عیسیٰ سے مماثلت تھی اور وہ آپ کا مکی زمانہ تھا۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جلالی اخلاق کے ظہور کا زمانہ بعد میں آیا جس میں آپ کو حضرت موسیٰ سے مماثلت تھی اور وہ آپ کا مدنی زمانہ تھا۔ اس لئے آپ کے جمالی و جلالی اخلاق کو جس ترتیب سے مشابہت و مماثلت حضرت عیسیٰ و حضرت موسیٰ سے تھی اسی ترتیب کو اس سورت میں ملحوظ رکھا گیا گویا کسی نے تین اور زیتون کے جمالی اخلاق کا نظارہ کرنا ہو تو اب مکہ میں کرلو اور سینا کے جلالی اخلاق کا نظارہ کرنا ہو تو مدینہ میں کر لینا۔ یہ ایک پیشگوئی بھی ہوگئی۔ کیونکہ اس سورۃ کا زمانہ نزول مکی ہے حاصل کلام یہ کہ مختلف نبیوں نے مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر علیحدہ علیحدہ اخلاق فاضلہ کے نمونے دکھا کر اگر یہ ثبوت دیا کہ انسان جس خلق میں بھی ترقی کرے وہ اس میں تمام مخلوقات سے سبقت لے جاتا ہے تو محمد رسول اللہ صلعم نے تمام اخلاق فاضلہ کو اپنے نمونہ کے اندر جمع کر کے اس بات پر حجت قائم کر دی کہ انسان نہ صرف ہر ایک خلق میں تمام مخلوق سے سبقت لے جا سکتا ہے بلکہ تمام اخلاق فاضلہ کا جامع بھی ہو سکتا ہے اور اس طرح شرف انسانی اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ کسی شاعر نے آنحضرت صلعم کی تعریف میں کیا خوب کہا ہے ؎

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری ٭ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

تین اور زیتون کی ایک اور تشریح بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ تین کے معنے انجیر اور زیتوں تو مشہور چیز ہے جس کا روغن زیتون دوا کام آتا ہے کھانے کے بھی اور جلانے کے بھی۔ اب ظاہر ہے کہ انجیر اور زیتون نے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر تو کیا گواہی دینی ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ یہاں بوجہ کسی تشبیہ اور مناسبت کے انجیر اور زیتون بجائے اپنے حقیقی معنوں کے مجاز اور استعارہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ توریت میں تمثیلی رنگ میں موسوی نور اور سلسلہ کو انجیر سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ یرمیاہ کا کشف باب ۲۴ میں اس طرح مذکور ہے کہ دو ٹوکریاں انجیروں کی خداوند کی ہیکل کے سامنے دھری تھیں، ایک ٹوکری میں اچھے سے اچھے انجیر تھے۔ ..... اور دوسری ٹوکری میں بڑے سے بڑے انجیر" اور پھر آگے چل کر اچھے انجیروں کو بنی اسرائیل کے اچھے لوگ قرار دیا ہے اور بُرے انجیروں کو بُرے لوگ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشہور انجیر کے درخت پر لعنت کرنے کے واقعہ میں بھی درحقیقت اسی طرف اشارہ ہے دیکھو متی باب ۲۱۔ اور جب صبح کو شہر جانے لگا اسے بھوک لگی۔ تب انجیر کا ایک درخت راہ کے کنارے دیکھ کر اس کے پاس گیا اور جب پتوں کے سوا اس میں کچھ نہ پایا تو کہا اب سے تجھ میں

کبھی پھل نہ لگیں - وہیں انجیر کا درخت سُوکھ گیا۔" اب ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کو انجیر کے درخت سے اس امر کی وجہ سے کیا خفگی ہو سکتی تھی کہ اس میں پھل نہ تھا کیونکہ وہ پھل کا موسم ہی نہ تھا۔ اصل میں یہ ایک مکاشفہ یا تمثیل تھی جسے لفظ پرست انجیل نویسوں نے واقعہ کا رنگ دے دیا۔ انجیر کا درخت سلسلہ بنی اسرائیل کا قائم مقام تھا۔ اس پر پتے تھے پھل نہ تھا یعنی ظاہری طور پر افعال اچھے نظر آتے تھے مگر اخلاص اور حقیقت سے وہ بھی خالی تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے اس پر لعنت پڑی اور وہ درخت آئندہ کے لئے سُوکھ گیا یعنی روحانیت اور نبوت کا سلسلہ اس قوم سے جاتا رہا۔ اسی طرح قرآن میں زیتون کو محمدی سلسلہ سے تشبیہہ دی ہے جیسا کہ سورۃ نور میں نور محمدی کو روغن زیتون سے روشن قرار دے کر اس مشابہت کا ذکر فرمایا ہے۔ پس جہاں انجیر سلسلہ اسرائیلی کے قائم مقام ہوا وہاں زیتون سلسلہ محمدی کا قائم مقام ٹھہرا اور اسی کی وضاحت کے لئے لف و نشر کے طور پر طور سینا اور بلد الامین کا ذکر فرمایا۔ طور سینا وہ جہاں سے سلسلہ موسوی کی ابتداء ہوئی۔ اور بلد الامین یعنی مکہ معظمہ وہ جہاں سلسلہ محمدیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ پس اس سورت میں سلسلہ موسویہ اور سلسلہ محمدیہ کی تاریخ کو متوازی طور پر پیش کر کے انہیں بطور شہادت کے پیش کیا ہے کہ جو تعلیمیں سینا اور مکہ معظمہ میں نازل ہوئیں اور جو اخلاق فاضلہ کے نمونے حضرت موسےٰ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلعم نے دکھلائے اور اپنی امت میں پیدا کر کے دکھائے وہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر گواہ ہیں۔

بہرحال خواہ تین اور زیتون سے مجاز اور استعارہ کے رنگ میں سلسلہ موسویہ اور سلسلہ محمدیہ مراد ہوں یا اس سے مراد فلسطین اور شام کی سرزمین ہو جہاں حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کا ظہور ہوا۔ ہر دو صورت میں ظاہر کرنا یہ مقصود ہے کہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم یعنی انسان اعلیٰ سے اعلیٰ استعداد اور قابلیت اور بہترین حالت عدل و اعتدال پر پیدا کیا گیا ہے اس حقیقت کے اظہار کا مقصد یہ ہے کہ تا انسان اس غلط فہمی سے باہر نکل آوے جس میں وہ انسان کے اعمال کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کو دیکھ کر پڑ گیا تھا۔ اس نے جب اعمال انسانی کو خیر و شر اور عظمت و ذلت دونوں کا مجموعہ دیکھا تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ انسان کی فطرت میں بھی خیر و شر اور عظمت و ذلت دونوں ہیں۔ وہ بوجہ اپنے علم کے نقص کے اپنی صحیح فطرت کو نہ دیکھ سکا کیونکہ وہ اعمال کے ہجوم میں محجوب و مستور ہو گئی تھی، انسان نے اپنے اعمال و افعال کو دیکھا اور ان کے اندر ایک عجیب متضاد اختلاف نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ انسان کے افعال میں نیکی اور بدی دونوں دست و گریباں نظر آتے ہیں اگر ایک طرف اس کے اندر نیکی و شرافت کے لطیف جذبات نظر آتے ہیں تو دوسری طرف درندگی و بہیمیت کی خوفناکی بھی نظر آتی ہے۔ اگر وہ فرشتوں کی طرح محبت و احسان کی آنکھیں رکھتا ہے تو بھیڑیوں اور بچھوؤں کی طرح اس کے پاس حرص و غرض کے پنجے اور خونریزی و سفاکی کے ڈنک بھی ہیں۔ اگر ایک طرف بادشاہوں کے زرنگار تخت اور حکموں اور فرمانروائیوں کی عظمت اور کبریائی نظر آتی ہے جو انسانی عظمت و جلال کی شہادتیں دے رہی ہیں تو انہی کے سامنے غلاموں کی پابزنجیر صفیں بھی دست بستہ کھڑی ہیں جو انسان کو کتے اور بلی سے بھی زیادہ حقیر ثابت کر رہی ہیں کیونکہ نہ تو کتے نے اپنے جیسے کتے کے آگے سر جھکایا اور نہ بلی نے کبھی بلی کو سجدہ کیا اس نے دیکھا کہ یہی انسان حاکم بھی ہے محکوم بھی، ساجد بھی ہے مسجود بھی، عالم بھی ہے جاہل بھی، عاقل بھی ہے ابلہ بھی، نیک بھی ہے بد بھی، اگر شہنشائی کا

تخت حکمرانی کا فرمان، فتحمندی کی تلوار، نیکی کی فرشتگی اور سچائی کی قدوسیت بھی انسان ہی کا حصہ ہیں، تو غلامی کی خاک محکومی کی ذلت، بدی کی شیطنت اور شر کی رذالت بھی اسی میں نظر آتی ہے۔ اگر یہی انسان ہے جو رات کو دروازوں پہ پاسبانی کرتا ہے تاکہ اس کے ہم جنس گھر کے اندر امن سے سوئیں تو پھر یہی انسان ہے کہ دوسری طرف سے آکر مکان میں نقب بھی لگاتا ہے تاکہ اپنے ہم جنسوں کو دکھ اور نقصان پہنچائے، اگر عبادتگاہوں کے اندر فرشتے نہیں ہوتے بلکہ انسان ہی ہوتے ہیں تو ڈاکوؤں کے جتھے کے اندر بھی بھیڑیئے جمع نہیں ہوتے بلکہ آدم کی ہی اولاد ہوتی ہے۔ پس اعمال انسانی کی اس رنگا رنگی اور نور و ظلمت کے اس اختلاط کو دیکھ کر انسان اس دھوکے میں پڑ گیا کہ جس مخلوق کے اعمال کا یہ حال ہے اس کی فطرت کا بھی یہی حال ہوگا، اگر وہ اپنے اعمال کے اندر نیکی و بدی اور عظمت و ذلت دونوں رکھتا ہے تو اس کی فطرت کے اندر بھی نیکی و بدی اور عظمت و ذلت دونوں ہوں گے اس نے اعمال کو دیکھ کر فطرت کے لئے حکم لگانا چاہا اور اس نے افراد کی حالت دیکھکر نوع کا فیصلہ کر دیا۔ اسی غلطی نے اس کے اندر یہ غلط خیال اور غلط عقیدہ پیدا کر دیا کہ ہم صرف بڑائی اور نیکی کے لئے ہی نہیں پیدا ہوئے جیسا کہ بعض افراد ہم میں نظر آتے ہیں بلکہ حقیر ہونے اور برے بننے کے لئے بھی پیدا ہوئے ہیں جیسا کہ اکثر افراد ہم میں نظر آتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیکی اور بڑائی کو ہر ایک انسان کا حصہ نہیں سمجھا گیا بلکہ اسے چند افراد میں محدود سمجھ کر انسان میں ایک مایوس قناعت پیدا ہو گئی۔ اور اس غیر صالح قناعت نے انسان کے اندر سے عزم اور ہمت کو بالکل مردہ کر دیا۔ ایک غلام فرد یا قوم ساری عمر غلامی اور بندگی میں خوشی خوشی گذار دیتی ہے اور کبھی اس کے اندر یہ احساس نہیں پیدا ہوتا کہ ہم بھی ویسے ہی انسان ہیں جیسے ہمارے آقا۔ پھر ہم کیوں صرف بندگی کے لئے ہوں اور یہ کیوں آقائی کے لئے؟ اور ہم کیوں نہ وہ ذرائع اختیار کر کے بڑے بنیں جنہیں ان لوگوں نے جو آج ہمارے آقا بنے ہوئے ہیں اختیار کیا اور بڑے بن گئے، ہزارہا انسان ہیں جو طرح طرح کی بدیوں اور خباثتوں کی گندگیوں میں ڈوبے ہوتے ہیں مگر کبھی نہیں سوچتے کہ نیک و پاک انسان بھی آخر ہمارے ہی طرح انسان ہیں یہ کیوں ہے کہ وہ نیک ہیں اور ہم نیکی کے لئے جنبش نہیں کر سکتے؟ ہر طرح کی مثالیں سامنے لاؤ اور ادنیٰ اور اعلیٰ حالتوں کے اختلاف کے جس قدر پہلو ہو سکتے ہیں سب پہ نظر ڈالتے چلے جاؤ تو صاف نظر آئے گا کہ پستی و ذلت اور بدی و شرارت کی ہر زندگی کے اندر باطل قناعت و بے حسی انسان کی اعلیٰ سے اعلیٰ قوتوں اور استعدادوں کو پامال اور ضائع کر رہی ہے اب قابل غور یہ بات ہے کہ آخر یہ حالت بے حسی اور غیر صالح قناعت کی کیوں پیدا ہوئی۔ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نظر نہیں آئے گا کہ چونکہ انسان کے اعمال اور اس کے ثمرات متضاد اور ملے جلے ہیں۔ اور اکثر حالتوں میں پستی اور بدی کے نمونے زیادہ اور عظمت و نیکی کی مثالیں کم ہیں۔ اس لئے ہر نامرادی کی حالت میں انسان نے نامرادوں پر ہی نظر ڈالی اور ہر برائی کی زندگی میں اس نے بروں کو ہی دیکھا۔ یعنی نامرادوں کو دیکھ کر اپنی نامرادی پہ۔ اور گرے ہوؤں کو دیکھ کر اپنی گری ہوئی حالت پر اور بروں کو دیکھ کر اپنی برائیوں پہ وہ ایک طرح کا استدلال کرنے لگا۔ اور ان سے شہادت لا کر اپنی حالت کو فطری اور لابدی

سمجھنے لگا۔ اس غلط استشہاد نے اسکے اندر غلط قناعت پیدا کر دی۔ اس کے احساس کو فنا کر دیا۔ اس کی طلب بجھ گئی اور وہ اپنی ذلت و برائی کو اصلی اور فطرتی چیز سمجھ کر ایک بناوٹی خوشحالی میں مبتلا ہو گیا ایک غلام کے اندر آقا بننے کا کیوں جوش نہیں اٹھتا؟ اس لئے کہ وہ اپنے جیسے غلاموں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ صرف میرے ہی لئے نہیں ہے بلکہ بہتوں کیلئے ہے اور اس لئے یہ ایک قدرتی چیز ہے جس پر مجھے صبر کر لینا چاہیئے۔ اگر وہ غلاموں کی بجائے آقاؤں پر نظر ڈالتا اور ان سے شہادت لیتا کہ آخر وہ بھی انسان ہی ہیں اور اسی کرۂ ارض پر بستے ہیں تو فوراً اس کا مردہ احساس زندہ ہو جاتا ہے اور اپنی فطرت کے شرف و خیریت کو پالیتا۔ ایک مزدور کیوں اسی میں خوش ہے کہ اٹھارہ گھنٹے کی معاوضہ میں صرف ایک روٹی پائے؟ اس لئے کہ وہ اپنی ادنےٰ حالت کے لئے اپنے ہی جیسی ادنےٰ حالت کے مزدوروں کو دیکھتا اور ان سے استشہاد کرتا ہے اگر وہ اُن سے استشہاد کرتا جن کی وہ مزدوری کرتا ہے تو اس کے اندر بھی عزم و طلب کا ولولہ پیدا ہوتا۔ ایک بد انسان کس طرح برائی میں اپنے اندر تسکین و قناعت پیدا کر لیتا ہے؟ اس لئے کہ وہ بروں کو ہی دیکھتا ہے اور انہیں سے استشہاد کر کے سمجھ لیتا ہے کہ انسان اس لئے بھی بنایا گیا ہے کہ وہ برا بنے کرے جیسا کہ دوسرے بہت سے لوگ بھی کر رہے ہیں تو ایک وہ بھی سہی۔ پس اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ انسان نے فطرت انسانی کی حقیقت اور خیریت و شرف کے سمجھنے میں غلطی کی اسلئے کہ اس نے اعمال انسانی کو خیر و شر اور عظمت و ذلت کا مجموعہ دیکھا پس وہ سمجھا کہ انسان کی فطرت میں بھی خیر اور شر اور عظمت و ذلت دونوں ہیں اس نے غلطی سے اعمال کی راہ سے انسانی فطرت کو دیکھنا چاہا اور افراد کی حالت کو دیکھ کر نوع کو بھی اس پر قیاس کر لیا۔ اس غلط فہمی نے اس کے اندر ایک گمراہ کن قناعت کر دی وہ سمجھنے لگا کہ جب برائی فطرت ہی میں ہے تو نیکی کا نہ ہونا کوئی ایسی چیز نہیں جس پر افسوس کیا جائے اور اس کیلئے کوشش کی جائے۔ اس مہلک غلط فہمی سے انسان کو نکالنے کے لئے جناب الٰہی نے قرآن کریم میں اکثر مقام پر اعلان کیا ہے کہ انسان کی فطرت ہم نے نیک اور صالح پیدا کی ہے اور اسے صرف شرف اور عظمت کیلئے پیدا کیا ہے چنانچہ یہی اعلان اس آیت لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم میں کھلے طور پر کیا گیا ہے کہ انسان کو ہم نے اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانہ اور بہترین حالت عدل پر پیدا کیا ہے اور اس کی فطرت میں خیر اور شرف کو رکھا ہے نہ کہ شر اور رذالت کو۔" چونکہ انسان کو ٹھوکر یہاں سے لگی تھی کہ وہ انسان کی فطرت کو معلوم کرنے کیلئے بُرے انسانوں کو دیکھ کر فطرت کی برائی پر استشہاد کرتا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں ان لوگوں کو پیش کیا جو اپنی فطرت صادقہ کو قائم رکھ کر بلند ہوئے۔ چنانچہ انہی لوگوں کی طرف والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہی وہ جناب الٰہی کے دربار سے انعام یافتہ لوگ ہیں جو دین فطرت کے حامل جن کی راہ صراط مستقیم ہے اور جن کی راہ کی طلب سورۃ فاتحہ میں سکھلائی گئی۔ صراط الذین انعمت علیھم یعنی انکی راہ جن پر خدا نے انعام کیا۔ انہی کو خدا نے انبیاء اور اولیاء اور صدیق اور شہدا اور صالحین کے خطابات سے یاد کیا ہے الغرض اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں انسانی فطرت کے عظمت و شرف اور خیر اور عدل کے لئے ان لوگوں سے استشہاد کیا ہے۔ جنہوں نے اپنی فطرت کو مسخ نہ ہونے دیا۔ اور فطرت صادقہ کو قائم رکھ کر بلند ہوئے بتایا کہ تم گرے ہوؤں کو دیکھ کر اپنی فطرت کو گرا ہوا کیوں سمجھتے ہو؟ ان کو نہیں دیکھتے جو گرنے کی جگہ بلند ہوئے؟ انسان کا نیچے

گرنا فطرت کی برائی کی وجہ سے نہیں ہے۔ اس کی فطرت تو عدل و خیر ہی ہے جیساکہ ان لوگوں کے اعمال اور ثمرات سے ظاہر ہے جنہوں نے فطرت صادقہ کو گرنے یا مسخ ہونے نہیں دیا اور قوائے فطرت اور استعداد باطنی کو صراط مستقیم پر رکھتے ہوئے انسانی شرف اور کمالات و ترقی کے وارث ہوئے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ انسان جب غلط راہ اختیار کرتا ہے اور اپنی فطرت کے عدل و خیر کو ضائع کر دیتا ہے اور اعمال سافلہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو جس طرح اس کی خلقت سب سے اعلیٰ تھی اسی طرح اس کا اکتساب عمل اس کو سب سے زیادہ ادنیٰ بنا دیتا ہے حتیٰ کہ اپنی حقیقت انسانی کو مسخ کر کے بسا اوقات چارپایوں اور درندوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ انسان اس مسخ شدہ حالت کو دیکھ کر غلطی سے سمجھ لیتا ہے کہ یہ فطرت ہے۔ مگر نہیں سمجھتا کہ در اصل یہ فطرت نہیں بلکہ خارج کا کسب و عمل ہے پس اعمال انسانی میں خیر اور شر اور عظمت و تسفل یعنی رذالت و دناءت جو نظر آتا ہے اس میں ایک عقلمند انسان کا فرض ہے کہ تفریق کرے نیکی و عظمت اس کی خلقت ہے اور شر و تسفل اس کی ضلالت عمل اور ضیاع فطرت ہے یہ اس کا عمل ہی ہے جو اسے چارپایوں سے بھی بدتر بنا دیتا ہے چنانچہ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ پھر ہم اسکو لوٹا دیتے ہیں ذلیل سے ذلیل حالت کی طرف۔

یعنی انسان اپنے اعمال بد کی وجہ سے ادنیٰ سے بھی ادنیٰ تر حالت میں گرتا چلا جاتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جو دوسری جگہ مغضوب علیہم اور ضالین کے نام سے یاد کئے گئے ہیں

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سوائے ان کے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں

فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ تو ان کے لئے کبھی نہ منقطع ہونے والا اجر ہے۔

فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا تو اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانے اور مقام خیر و شرف پر کیا تھا لیکن ان فطری قوتی اور استعداد کو نشو و نما دینے اور ان تمام ترقیات روحانی اور کمالات باطنی پر پہنچانے کے لئے جسے خلافت الٰہیہ کے نام سے دوسری جگہ موسوم کیا گیا ہے ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ صراط مستقیم کو بذریعہ اپنے علم تام و کامل کے انسان کو بتلاتا تاکہ وہ اس پر عمل کر کے انعامات الٰہیہ کا وارث ٹھیرتا اور منعم علیہ گروہ میں شامل ہوتا۔ پس انبیاء کے ذریعہ جو وحی نازل فرمائی گئی جس میں سے کامل اور اتم اور اصح ترین شکل میں آج قرآن موجود ہے۔ اس پر ایمان لانا اور اس کے مطابق اعمال صالحہ بجالانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے وہ قوئے فطرت جو بہترین حالت عدل پر واقع اور خیر و شرف کے جامع ہیں ترقی کرتے اور ان اخلاق فاضلہ کے مظہر بنتے ہیں جس سے انسان کی فطرت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے جس طرح ایک بیج کے اندر درخت کے تمام اجزا مخفی ہوتے ہیں اور اس کو بونے اور آبیاری کرنے سے وہ نشو و نما پا کر اپنی صحیح شکل کو دنیا میں ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح انسانی فطرت کی کاشت اور آبیاری بھی وحی الٰہی اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری سے ہوتی ہے اور وہ نشو و نما پا کر ان اخلاق فاضلہ کا اظہار کرتی ہے جس سے انسانی فطرت کے صحیح خد و خال نظر آتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ نے اخلاق

جمالی اور حضرت موسیٰ میں اخلاق جلالی کا ظہور اور حضرت محمد مصطفےٰ صلعم میں جمالی و جلالی دونو قسم کے اخلاق کا کامل اور جامع طور پر ظہور اور موسوی اور محمدی سلسلوں میں ان پاک تعلیمات کے ماتحت ہزارہا اولیاء اور صلحا کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ فطرت انسانی اگر وہ اکتساب شر سے مسخ اور ضائع نہ کر دی جائے تو بالطبع خیر پیدا ہوئی ہے۔ پس انسان کو چاہیئے کہ وہ نمونہ کے لئے بجائے بُرے انسانوں کو دیکھنے کے ان نیک اور صالح انسانوں کو دیکھے جنہوں نے فطرت صادقہ کو قائم رکھ کر ایمان اور اعمال صالحہ سے اس کے قویٰ اور استعدادوں کو صحیح طور پر نشوونما دی اور یہ جان رکھے کہ جس طرح ہر بیج پھل لاتا ہے اسی طرح انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ زہر جب کھایا جائے گا انسان مرے گا اور معصیت جب کبھی کی جائے گی عذاب اس کا نتیجہ ہوگا۔ پس اعمال کی جزا ہی سے تمام نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اگر انسان کے اعمال دین الٰہی کے مطابق ہوں گے جو درحقیقت انسان کی فطرت صالحہ کی مدد اور حفاظت اور اُسے نشوونما دینے کے لئے آتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فطرت صالحہ ضائع نہ ہوگی بلکہ صحیح طور پر نشوونما پاکر انسان کی فطری بڑائی اور نیکی کو ظاہر کرے گی اور اگر غلط راہوں پر پڑ کر فطرت صالحہ کو انسان ضائع کر بیٹھے گا تو پھر اس سے بُرا جانور زمین پر دوسرا کوئی نہ ہوگا کیونکہ جانور اپنی اصل فطرت کو ضائع نہیں کرتا۔ وہ مرت سافل یعنی ادنیٰ ہے۔ لیکن جو انسان اپنی فطرت صالحہ کو ضائع اور مسخ کر بیٹھتا ہے وہ اسفل سافلین یعنی سافلوں سے بھی اسفل ادنیٰ سے بھی ادنیٰ اور بد سے بدتر ہو جاتا ہے، ویسے بھی انسان کو جو قویٰ ملے ہیں وہ چونکہ اپنی استعدادوں میں افضل ترین ہیں اس لئے جس طرح وہ انسان کو نیکی میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام ترقی پر پہنچا سکتے اور تمام مخلوق پر اُسے شرف اور بزرگی میں سبقت لے جانے کا موجب ہو سکتے اور اُسے مسجود ملائکہ بنا سکتے ہیں اسی طرح اگر ان کا استعمال غلط ہو تو بدی میں بھی وہ شدت اور باریکیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ سانپ اور بچھو کی نیش زنی اور شیر اور بھیڑیئے کی درندگی اس کے سامنے گرد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایک یکہ جس کی رفتار نہایت آہستہ ہوتی ہے وہ اگر سیدھے رستہ سے ہٹ کر غلط رستہ پر پڑ جائے تو وہ اس قدر نقصان نہیں پہنچائے گا جس قدر ایک موٹر کار جو تیز رفتار سے چل رہی ہے کیونکہ اس کی تیز رفتاری نقصان کو شدید تر کر دے گی۔ اسی طرح انسانی دماغ اور اس کے قویٰ جو ترقی کے لئے اپنے اندر اعلیٰ سے اعلیٰ استعداد رکھتے ہیں اگر صراط مستقیم سے ہٹ کر غلط رستہ پر پڑ جائیں اور فطرت مسخ ہو کر بدی میں مستغرق ہو جائے تو پھر انسانی استعداد کی وسعت و عظمت غلط رستہ پر پڑ کر اسی قدر نقصان دہ ہو جاتی ہے جس قدر وہ سیدھے رستہ پر چلنے کی حالت میں مفید تھی اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ادنیٰ سے ادنیٰ حالت تنزل پر پہنچ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یورپ کو دیکھ لو۔ اس کی دماغی ترقی جب تک صحیح رستہ پر چلتی ہے کس قدر ایجادات سائنس انسان کے لئے مفید اور راحت بخش سامانوں کے پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہے لیکن وہی دماغی بلند پروازی جب بدی کی طرف مائل ہوتی ہے تو گناہ اور شیطنت میں بھی ایسی ایسی عجیب و غریب اختراعات کا باعث ہو جاتی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔

اس آیت ردد ناہ اسفل سافلین میں انسان کو ادنیٰ سے ادنیٰ حالت کی طرف لوٹانے کے فعل کو اللہ تعالیٰ کا اپنی طرف منسوب کرنا کسی کو غلط فہمی میں نہ ڈالے کیونکہ اس کی وجہ فقط یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ انسانی افعال کے نتائج کو جو خدا کے مقرر کردہ قوانین و اسباب کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں ہمیشہ اپنی طرف منسوب کرتا ہے تا انسان کی نظر

اسباب پر ہی محدود نہ رہے اور وہ اسباب پرست نہ بن جائے اس اصطلاح کے سمجھانے کے لئے میں ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ مثلاً ہم اگر ایک کمرہ کے دروازے بند کرلیں تو خدا کا قانون ہے کہ اس سے اندھیرا پیدا ہو۔ کمرہ کے دروازے بند کرنا سبب ہے اور کمرہ میں اندھیرا ہو جانا اس کا نتیجہ ہے۔ اس واقعہ کو اگر ہم اپنی زبان میں بیان کریں گے تو یوں کہیں گے کہ "جب ہم نے کمرہ کے دروازے بند کر دیئے تو اندھیرا ہو گیا" لیکن جب اسی بات کو اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے محاورہ میں ذکر کرے گا تو یوں فرمائے گا کہ "جب انسان نے کمرہ کے دروازے بند کر لئے تو ہم نے اندھیرا کر دیا" اور آیت زیر بحث کی ترکیب کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ واقعہ اس طرح جناب الٰہی بیان فرمائیں گے کہ "ہم نے انسان کو روشنی کے لئے پیدا کیا تھا پھر ہم اندھیرا کر دیتے ہیں سوائے اس کے جو اپنے کمرہ کے دروازوں کو کھلا رکھے" گویا روشنی کے لئے دروازے کھلے رہنے شرط کے طور پر ہیں اور اندھیرا ہو جانا نتیجہ ہے دروازے بند ہونے کا مگر اسے اللہ تعالیٰ کا اپنی طرف منسوب کرنا محض اس لئے ہے کہ وہ خدا کے قانون کا نتیجہ ہے اسی طرح آیت زیر بحث میں ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے بیشک فطرت انسانی کو اعلیٰ سے اعلیٰ ایمان اور مقام عدل و شرف پر پیدا کیا ہے پھر ہم اسے ادنیٰ سے ادنیٰ حالت پر لوٹا دیتے ہیں سوائے اس کے جو ایمان لاتا اور نیک عمل کرتا ہے" اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ انسان کا شرف اور اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی مشروط ہے اس کے ایمان لانے اور اعمال صالحہ بجالانے سے جو اس کی فطرت صادقہ کی نشوونما کے لئے لابد ہے اور جو اس شرط سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو پھر خدا کا یہ قانون ہے کہ وہ غلط رستہ پر پڑ کر ادنیٰ سے ادنیٰ حالت کی طرف اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے تنزل کر جائے چونکہ یہ خدا کے قانون کا ایک نتیجہ ہے۔ اس لئے جناب الٰہی نے اسے اپنی طرف منسوب کیا تاکہ انسان کی نگاہ قانون اور اسباب پر محدود ہو کر نہ رہ جائے بلکہ قانون اور اسباب کے پردوں میں سے مسبب و مقنن حقیقی نظر آتا رہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جو لوگ اپنی فطرت کو عمل غیر صالح سے ضائع کر دیتے ہیں وہ انسانیت سے گر جاتے ہیں مگر جو لوگ ایمان لاتے اور ایسے اعمال اختیار کرتے ہیں جو صالح ہیں اور اس لئے نور فطرت کو قائم رکھنے والے اور چمکانے اور نشوونما دینے والے ہیں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب انسانیہ پر فائز ہوتے ہیں۔ فلھم اجرٌ غیر ممنون فرما کر بتلایا کہ ایمان لانے والوں اور اعمال صالح بجالانے والوں کا اجر کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ وہ ایسے بیج بو رہے ہیں کہ ان سے جو درخت پیدا ہوگا وہ ہمیشہ پھل دے گا۔ اس کے نتائج حقہ کی برکتیں اور نعمتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی وہ ایک شجرۂ طیبہ ہوگا جس کی جڑ زمین میں اور شاخیں آسمان میں ہوں گی۔ اور جس کا پھل وہ ہمیشہ کھائیں گے۔

یہ امر واضح ہو چکا کہ اس صورت میں بڑا دوراس امر پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرت صالح عطا فرمائی ہے جو اگر اسی اپنی صحیح اعتدال کی حالت پر قائم رہے تو انسان کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی اور شرف کا موجب بنتی ہے اور اس کے لئے ایک جنت پیدا کر دیتی ہے اسی کو قرآن میں دوسری جگہ قالوا بلیٰ سے تعبیر کیا ہے یعنی جب خدا نے انسانی روحوں سے پوچھا کہ الست بربکم کہ کیا میں تمہارا رب نہیں تو روحوں نے جواب دیا کہ بلیٰ بیشک تو ہمارا رب ہے پس یہ انسان کی فطرت اصلی کی تصدیق ہے جو اس کے اندر ودیعت کی گئی ہے اب اگر بلیٰ کی جگہ یعنی تصدیق ربوبیت کے بجائے کوئی انسان انکار کرتا ہے تو پھر یہ اس کی فطرت کی صدا نہیں بلکہ ایک غیر فطری صدا ہے جو کسی خارجی سبب کا نتیجہ ہے اسی

فطرت صالحہ کا نام جو انسان کو خدا کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے قرآن کریم نے دوسری جگہ قلب سلیم رکھا ہے یعنی وہ قلب جو بالکل صحیح وسالم ہو اور اپنی تندرستی اور اعتدال پر قائم ہو کوئی نیا عارضہ اور خارج سے بیماری اسے نہیں لگ گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت فرمایا کہ اذ جاء ربہ بقلب سلیم۔ جبکہ وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم یعنی فطرت صالحہ غیر آلودہ کے ساتھ حاضر ہوئے۔ اب سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم کی یہ فطرت صالحہ وہ تھی جس کو باہر کا کوئی بڑے سے بڑا جلوہ بھی مرغوب نہ کر سکا اور آپ کی فطرت کی روشنی پکار اٹھی کہ انی وجھت وجھی للذی فطر السموٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین کہ بیشک میں نے اعتدال پر قائم ہوتے ہوئے اپنی تمام توجہ اس ذات کی طرف کر دی جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے دین اور وحی کا بڑا کام یہ ہوتا ہے کہ انسان نے اپنی فطرت صالحہ پر صناعی اور خارجی ضلالت کا جو زنگ چڑھا دیا ہوتا ہے اسے دور کر دے جس سے اس کی اصلی روشنی پھر چمک اٹھے اور ازل کا بھولا ہوا سبق پھر یاد آجائے اسی وجہ سے ہدایت الٰہی کو قرآن نے ذکر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ضلالت و کفر کو نسیان کہا۔ ذکر کے معنی حفظ اور یاد کرنے کے ہیں اور شرف اور بزرگی کے ہیں اور نسیان بھولنے کو کہتے ہیں چونکہ انسان اپنی فطرت اصلی کو بھلا دیتا ہے جس کا نتیجہ ضلالت ہوتا ہے اس لئے نسیان یعنی بھلا دینے کا دوسرا نام ضلالت ہوا۔ پس ضلالت نام ہے نسیان کا۔ اور ھدایت فطرت اصلی کے بھلائے ہوئے سبق کو پھر یاد کرا دینے کا نام ہوا اسی لئے اس کو ذکر کہا۔ یعنی بھولی ہوئی چیز کی یاد دہانی۔ اور ذکر کے جو معنے شرف اور بزرگی کے ہیں اس میں یہ اشارہ ہے کہ فطرت کے اس بھولے ہوئے سبق کو یاد کرنے اور اس پر عمل کرنے سے ہی انسانیت کا شرف اور بزرگی مقدر ہے اسی نسیان سے غفلت پیدا ہوتی ہے جسے قرآن کریم نے منتہائے ضلالت قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا اولٰئک کالانعام بل ھم اضل اولٰئک ھم الغٰفلون کہ انکے دل ہیں مگر ان سے سوچنے کا کام نہیں لیتے اور انکی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے اور انکے کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے وہ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو غافل ہیں۔

اسی نسیان کی نسبت دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم اور ان لوگوں کے مانند نہ بنو جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا۔ سو اس نے انہیں ان کے نفسوں کو بھلوا دیا یعنی اس کا خدا کے قانون کے ماتحت نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے نفسوں کو ہی بھول گئے۔ اپنے نفسوں کو بھول جانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی فطرت صالح کو بھول گئے۔ کیونکہ فطرت صالحہ تو وہ تھی جس نے کہا تھا بلیٰ یعنی خدا کی ربوبیت اور اس سے تعلق عبودیت کا اقرار کیا تھا اب اگر کوئی شخص اس خدا کی ربوبیت کے ساتھ اپنے تعلق عبودیت کو بھلا رہا ہے جس کے آگے فطرت اصلی بلیٰ کہہ چکی ہے تو درحقیقت وہ اس تعلق کو نہیں بھلا رہا بلکہ اپنی فطرت کو ہی بھلا رہا ہے

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝ تو کیا چیز تجھے اس کے بعد جزا کے معاملہ میں جھٹلا سکتی ہے۔

یعنی انسان کی فطرت کو اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانہ اور استعداد پر پیدا کرنے کا اعلان کرنے اور اسے اعمال صالحہ سے نشوونما

دے کر انسانیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتبِ شرف و بزرگی کو حاصل کرنے والے منعم علیہ گروہ کو بطور نمونہ اور شہادت پیش کرنے اور اعمال بد سے فطرت کے مسخ ہونے اور انسان کے ادنیٰ سے ادنیٰ حالت تنزل پر گر جانے کی حقیقت کو واضح کر دینے کے بعد پھر اب کوئی چیز نہیں ہو سکتی جو تجھے اعمال کے جزا کے متعلق جھٹلا سکے۔ اعمال کے ان نتائج کو انسان کی حالتِ ترقی و تنزل میں دیکھ کر اعمال کی جزا و سزا سے کون انکار کر سکتا ہے اور کیوں نہ اعمال کی جزا ملے جبکہ اللہ تعالیٰ کی حکومت آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے ایک معمولی حاکم کے قوانین کی فرمانبرداری اور نافرمانی اپنا نتیجہ رکھتی ہے تو اللہ تعالیٰ تو ہر ایک حاکم پر حاکم ہے اس کے قوانین کی فرمانبرداری اور نافرمانی کیوں نہ نتیجہ رکھے گی؟

ع ۱/۸ ۲۰ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝ع کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھکر حاکم نہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آیت الیس اللہ باحکم الحاکمین جب پڑھی جاتی تھی تو صحابہ جواب میں بلیٰ وانا علیٰ ذالک لمن الشاھدین کہا کرتے تھے۔ کہ "بیشک ہم اس پر گواہ ہیں"۔ اور یہ ان کا قول بالکل سچا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکم الحاکمین کی حقیقت کو محض دلائل عقلیہ و نقلیہ پر ہی محدود نہیں رکھا جنہیں اس سورت میں ذکر فرمایا ہے بلکہ آنحضرت صلعم کی زندگی میں بطور حال وارد کر کے اپنی احکم الحکمین کی شان کا اس صفائی سے اظہار فرمایا کہ صحابہ کی زبان سے بے اختیار یہ کلمہ نکل گیا کہ بیشک ہم اس پر گواہ ہیں انہوں نے احکم الحاکمین کے قوانین ہدایت کی عزت اور اطاعت کی اور اس کے رسول صلعم کے اخلاق و اعمال کے نمونہ کی پیروی کر کے اپنی فطرت صالحہ کو جو وحشت و جہالت کے پردوں میں پنہاں تھی صراط مستقیم پر ڈال کر نشوونما دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وحشی و جاہل انسانوں سے مہذب و باخلاق اور اس سے بھی آگے ترقی کر کے باخدا انسان بن گئے اور جنہوں نے اس تذکرہ کی یاددہانی سے فائدہ نہیں اٹھایا اور بدستور نسیان و غفلت میں ڈوبے رہے بلکہ اس تذکرہ کو مٹا ڈالنا چاہا وہ درندگی و بہیمیت میں جانوروں سے بھی نیچے گر گئے اور نہ صرف اُن پر روحانی و اخلاقی موت وارد ہوئی بلکہ ظاہری اور دنیوی رنگ میں بھی انہیں ہلاکت و ذلت کا سامنا ہوا اور اس طرح احکم الحاکمین کی حکومت اور فیصلہ کو صحابہ نے بچشم خود دیکھ لیا اور عین الیقین اور حق الیقین کے مرتبوں پر پہنچ گئے اور آج ہمارے لئے بھی یہ واقعات مشعلِ راہ ہیں۔

سُوْرَۃُ الْعَلَقِ مَکِّیَّۃٌ	بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	ھِیَ تِسْعَ عَشَرَۃَ اٰیَۃً

سورۃ العلق کا زمانہ نزول ابتدائی مکی زمانہ ہے اس کی ابتدائی پانچ آئتیں تو بالاتفاق سب سے پہلی وحی ہے جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوئیں۔ باقی آیات اس سورت کے بعد نازل ہوئیں۔ حضرت نبی کریم صلعم غار حرا میں عبادت میں مصروف تھے۔ جو جبرئیل نازل ہوئے اور کہا اقرأ یعنی پڑھ۔ تو آپ نے فرمایا ما انا بقارئ یعنی میں پڑھنا نہیں جانتا۔ تب اس نے آپ کو خوب زور سے دبایا پھر کہا اقرأ پھر آپ نے وہی فرمایا ما انا بقارئ تین دفعہ اس طرح ہوا تب آپ پڑھنے لگے اور فرشتے نے یہ پانچ آیتیں پڑھیں اور آپ ان کے ساتھ گھر واپس ہوئے اور وحی کا رعب اس قدر آپ پر طاری تھا کہ آپ کے مونڈھے اور گردن کا گوشت پھڑک رہا تھا اور آپ نے حضرت خدیجہ کو فرمایا زملونی زملونی مجھے اڑھا دو مجھے اڑھا دو

اس سورۃ کو سورۃ التین کے بعد رکھنے میں یہ ترتیب مدنظر معلوم ہوتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انسان اس کے قوانین کی اطاعت کرے جس سے اس کی فطرت صالحہ نشوونما پائے۔ اور تمام مخلوقات پر اس کی فضیلت ظاہر ہو اور اس کا احسن تقویم پر ہونا ثابت ہو تو پھر یہ بھی ضرور تھا کہ وہ قوانین ایک کتاب کی صورت میں انسان کو عطا ہوتے۔ چنانچہ وہ قرآن کی شکل میں انسان کو ملتا ہے اسی کتاب کو اب پڑھاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھ جس نے پیدا کیا۔

اقرأ باسم ربك میں ب بائے استعانت ہے۔ یعنی اپنے رب کے نام کے ساتھ مدد مانگ کر پڑھ۔ کس کو پڑھ۔ قرآن کو پڑھ کسی ہدایت کی کتاب کو پڑھنے میں مدد کن امور کے لئے مانگی جاتی ہے سب سے پہلے یہ کہ اس کا صحیح علم نصیب ہو۔ دوم یہ کہ اس پر عمل کی توفیق ملے۔ اگر کتاب کا علم صحیح طور پر حاصل نہ ہوا یا علم تو مل گیا مگر عمل نہ کیا تو اس کتاب کا پڑھنا ہی رائیگاں گیا اس لئے فرمایا اپنے رب سے جس نے انسان کی ربوبیت یعنی اسے اعلیٰ حالت کی طرف ترقی دینے کے لئے یہ کتاب نازل فرمائی ہے۔ مدد مانگ کر پڑھ کہ اس کی ربوبیت نے جہاں یہ کتاب عطا کی ہے وہاں اس کا علم اور اس پر عمل کی توفیق بھی عطا فرمائے گویا قرآن کریم کو شروع کرنے سے قبل جناب الٰہی سے اعانت طلب کرنے کا حکم ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کا علم عطا کرے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ کو ابتدائے قرآن میں رکھا۔ وہاں رب العالمین کے حضور میں ایاك نعبد وایاك نستعین عرض کر کے اعانت ہی طلب کی ہے اور دعا کی ہے اھدنا الصراط المستقیم یعنی قرآن کے فہم اور علم میں ہمیں صراط مستقیم عطا ہو۔ اور عمل کرنے میں بھی اس کی بتائی ہوئی صراط مستقیم سے ہمارا پاؤں نہ ڈگمگائے اور ہم منعم علیہ گروہ کے وارث ٹھیریں لیکن اتنا ہی نہیں ہر سورۃ اور خود سورۂ فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اسی مقصد کے لئے رکھی ہے۔ یہاں بھی ب بائے استعانت ہے اور یہ اسی اقرأ باسم ربك الذی خلق کے حکم کی تعمیل ہے بسم اللہ کے قبل فعل کے محذوف کرنے میں یہ حکمت ہے کہ جب خدا نے یہ آیت نازل فرمائی تو ضرور تھا کہ وہ حکم کے رنگ میں فرماتا اقرأ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ کہ تو پڑھ ساتھ نام اللہ کے جو رحمان اور رحیم ہے۔ لیکن انسان جب پڑھے گا تو وہ کہے گا،

اَقْرَأُ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہ میں پڑھتا ہوں ساتھ نام اللہ کے جو رحمان اور رحیم ہے۔ اس لئے خدا کے اسی آیت کے بولنے اور انسان کے بولنے میں فعل کا صیغہ بدلتا ہے۔ خدا مخاطب کے صیغہ میں ارشاد فرماتا ہے بندہ متکلم کے صیغہ میں اسے پڑھتا ہے۔ اس لئے فعل کو محذوف کر دیا۔ اور صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم رہنے دیا تاکہ اپنے موقعہ و محل کے مناسب حال اس کے دونوں معنے ہو سکیں یعنی "تو پڑھ ساتھ نام اللہ کے" اور "میں پڑھتا ہوں ساتھ نام اللہ کے"۔ الغرض بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جو ہر سورت کے شروع میں ہے تاکہ سورہ فاتحہ کے ابتدا میں بھی ہے جو قرآن کے شروع میں بجائے خود اعانت طلب کرنے کے لئے دعا رکھی گئی ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے قرآن کے پڑھنے میں اعانت طلب کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت جو انسان کے متعلق ہے اس کے دو پہلو ہیں ایک رحمانیت دوسری رحیمیت۔ یعنی اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و رحم سے بغیر انسانی اعمال کے دخل کے انسان کو کمال پر پہنچانے کے لئے پہلے تو کچھ سامان عطا فرماتا ہے یہ رحمانیت ہے اور پھر جب انسان اُن سامانوں کو کام میں لاتا ہے تو پھر اس کے عمل اور سعی پر اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر نتائج مترتب کرتا ہے یہ رحیمیت ہے۔ مثلاً سورج، چاند، ہوا، پانی، بارش، زمین، بیج، ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، دماغ، عقل وغیرہ سب نعمتیں انسان کے لئے محض اپنے فضل و رحم سے مہیا کیں۔ یہ ربوبیت کا وہ پہلو ہے جو رحمانیت کی شکل میں انسان کی مدد کرتا ہے پھر جب انسان محنت کرتا ہے ہل جوتتا ہے بیج ڈالتا ہے غرضیکہ ہاتھ پاؤں ہلاتا اور ان سامانوں سے فائدہ اٹھاتا ہے تو تھوڑے سے بیجوں سے انبار کے انبار غلہ کے وہ اٹھاتا ہے یہ ربوبیت کا دوسرا پہلو ہے جو رحیمیت کی شکل میں انسان کی مدد کرتا ہے پس انسان کے متعلق صفت ربوبیت دو رنگ میں مدد کرتی ہے ایک رحمانیت کے رنگ میں دوسری ربوبیت کے رنگ میں۔ لہٰذا اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں جو اپنے رب کے نام سے مدد مانگنے کا حکم تھا اس کی صحیح صحیح تعمیل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ہوئی یہاں رحمان اور رحیم صفت رب کے دو پہلو ہیں رحمان نے تو انسان کو بغیر اس کے کسی عمل کے قرآن جیسی نعمت عطا فرمائی۔ جیسا کہ قرآن میں ہے الرحمٰن علّم القرآن یعنی رحمان نے قرآن سکھایا تاکہ انسان اس کو سمجھ کر اور اس پر عمل کر کے اپنے کمال کو حاصل کر سکے۔ اور رحیم صفت اس لئے ہے کہ قرآن کے مطابق عمل کرنے پر اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ اجر بخشے جس سے انسان اپنے مقصد پیدائش کو حاصل کرے۔ پس قرآن کو پڑھتے وقت جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی جاتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہی استعانت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت جس نے یہ قرآن ہمیں عطا کیا ہے اپنی رحمانیت سے ہی اب ہمیں اس کا علم اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرماوے اور صفت رحیمیت ان اعمال پر نتائج مترتب کر کے ہمیں اس اعلیٰ سے اعلیٰ کمال پر پہنچا دے جو قرآن کے نازل ہونے کا مقصد ہے

الغرض قرآن کو پڑھنے کا حکم جو دیا تو اس کے ساتھ صفت ربوبیت سے مدد مانگ کر پڑھنے کا حکم دیا تا علم اور عمل کی توفیق ملے لیکن ضرور تھا کہ رب کا تعارف کرایا جائے کہ یہ کون ہے فرمایا الذی خلق یہ وہی ہے جس نے تجھے پیدا کیا۔ یہ فطرت کی آواز ہے ہر ایک انسان خوب سمجھتا ہے کہ میں اپنا خالق آپ نہیں میرا کوئی خالق ہے فرمایا اسی رب کے نام سے مدد مانگ کر پڑھ جس نے ہزار ہا ہزار سامان ربوبیت جمع کر کے تجھے پیدا کیا جس سے تو انکار نہیں کر سکتا۔ (جب تمام آسمان و زمین سورج و چاند ہوا و پانی، غلہ و اناج غرضکہ کل کائنات کے کام کرنے کا نتیجہ فقط انسان کی پیدائش ہے تو ظاہر ہے

کہ پھر انسان کسی بہت ہی بلند مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے) پس اے انسان اپنے خالق کی گذشتہ ربوبیت کو سامنے رکھ اور غور کر ایسے خالق اور رب سے تو اگر تعلق جوڑے گا تو زمانہ آئندہ میں اس کی ربوبیت تجھے کس قدر ترقی اور کمال پر پہنچائے گی۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ پیدا کیا انسان کو تعلق پکڑنے سے۔

علق۔ تعلق پکڑنے کو کہتے ہیں آج سائنس نے بتایا ہے کہ مرد و عورت کا مرکب نطفہ جب قرار پاتا ہے تو سب سے پہلے وہ رحم کو چھیدتا اور اس سے تعلق پکڑ کر لٹک جاتا ہے اسے علقہ کہتے ہیں اور اس تعلق پکڑنے کو علق کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں اے انسان اپنی گذشتہ پیدائش پر جو نقطہ تیرے جسم یا حیوانیت کی پیدائش تھی غور کر کہ مرد و عورت کے مرکب نطفہ نے جب رحم سے تعلق پکڑا تو ماں کے رحم کی ربوبیت سے اس کی وہ نشو و نما ہوئی کہ ایک خوبصورت مکمل انسانی جسم تیار ہو گیا۔ یہ تو ماں کے رحم سے تعلق پکڑنے کا نتیجہ تھا۔ حالانکہ ماں تیرے رب کی صفت ربوبیت کا ایک ادنیٰ سا مظہر ہے تو اگر تو اپنے حقیقی رب کے ساتھ تعلق پکڑے گا۔ اور اس کے رحم اور فضل کی آغوش میں جا پڑے گا تو تیری روحانیت یا دوسرے لفظوں میں تیری انسانیت کا نشو و نما اس کمال کے ساتھ ہو گا کہ تو اکرم ہو جائے گا۔ یعنی تمام مخلوق پر اپنی بزرگی اور شرف سے سبقت لے جائے گا۔ اور تیرا احسن تقویم پر ہونا ہر کس و ناکس کو نظر آجائے گا۔ یہی مطلب حضرت نبی کریم صلعم کے ارشاد کا تھا کہ اللہ کا رحم اور ماں کا رحم نہ صرف تلفظ اور شکل میں بلکہ اپنے فیضان میں بھی مشابہ ہیں جس طرح ماں کے رحم سے تعلق پکڑ کر ایک حقیر نطفہ کیسا خوبصورت انسان بن کر نکلتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے رحم سے تعلق پکڑ کر ایک حقیر انسان انسانیت کے تمام کمالات کو حاصل کر کے اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کا وارث ہو جاتا ہے اسی کو حضرت مجدد وقت مرزا غلام احمد علیہ الرحمۃ مسیح موعود کیا خوب فرماتے ہیں ؎

آں کہ از یک نطفہ انسانے کند   وز دو مُشت تخم بستانے کند
نقطہ را روئے درخشاں مے دہد   سنگ را لعل بدخشاں مے دہد
چوں منے را گر مسیحائے کند،   یا گدائے را شہنشاہے کند
نیست از فضل و عطائے او بعید   کور باشد ہر کہ از انکار دید
ہر کسے چوں مہربانی مے کند   از زمینی آسمانی مے کند
صد ہزاراں نعمتش بخشد ز جُود   مہر و مہ را پیشش آمد در سجود

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ تو پڑھ اور تیرا رب اکرم یعنی سب سے بڑھ کر عزت والا ہے۔

یہاں تاکید کے لئے اقرأ کی تکرار یعنی ہاں ضرور پڑھ۔ تیرا رب سب سے بڑھ کر عزت والا ہے وہ جو علم دے گا اس کا نتیجہ دنیا و آخرت کی عزت ہو گی۔ اس کی تعلیم حقیقی عزت و شرف اپنے اندر رکھتی ہے۔ ناممکن ہے کہ اس تعلیم پر عمل کرنے والا ذلیل ہو اس کی عزت دنیا و آخرت میں مسلم ہو کر رہے گی۔ جو اس تعلیم پر عمل کر کے اپنے رب اکرم کی ربوبیت کے نیچے آ گیا اور اس

سے تعلق پکڑ گیا وہ اکرم اور کرّمنا بنی آدم کا صحیح مصداق بن گیا۔

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ وہ جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔

یہ وہ ذریعہ علم سکھلانے کا ہے جو تحریر کے ذریعہ دنیا میں رائج ہے اور یہ بھی جناب الٰہی کی طرف سے عطیہ ہے کس قدر حیرت ہوتی ہے جب علم طب یہ تحقیقات کر کے دنیا کو سناتا ہے کہ انسانی دماغ میں ایک مرکز ہے جو صرف لکھنے کا ہے۔ گویا جناب الٰہی نے انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی یہ بھی مقدر کر رکھا تھا کہ انسان لکھ کر اپنے علم کو دوسروں تک پہنچائے۔ اگر یہ لکھنے کی استعداد انسان میں نہ ہوتی تو جو کچھ ایک دماغ سوچتا اور غور کرتا اور کسی علمی نتیجہ پر پہنچتا وہ اسی تک یا اس کے ملنے والوں تک محدود رہ جاتا۔ اور اس سے دور رہنے والوں یا بعد کے زمانہ میں آنے والوں تک نہ پہنچتا۔ آج جو ہم سینکڑوں داناؤں، فلسفیوں، ماہرین سائنس اور اہل علم لوگوں کی تصنیفات سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو یہ محض تحریر کی برکت ہے اگر یہ تحریر کی قوت اور اس کا مرکز انسانی دماغ میں نہ ہوتا تو یہ تمام ترقیات علم ظاہر و باطن کی بھی نہ ہوتیں۔ دنیا کے دور دراز ممالک میں پڑے ہوئے دماغوں اور ان کی عقلوں اور معلومات سے فائدہ اٹھانے اور ہزارہا سال کے مشاہدوں اور تجربوں اور انسانی علوم سے جو زمانہ ماضی میں علماء و حکماء دریافت کر گئے۔ نفع حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے قلم یعنی تحریر اور اس کا مرکز دماغ میں جناب الٰہی کا رکھا ہوا ہے پس یہ رب ہی ہے جس نے انسان کی ربوبیت کے لئے قلم کے ذریعہ علم حاصل کرنے کا سامان بہم پہنچایا لیکن قلم کے ان تمام کارناموں کے باوجود انسان کی خود اپنی پیدائش کی غرض و غایت اس کی مخفی استعدادوں اور قوتوں اور روحانی و باطنی گہرائیوں کا دقیق در دقیق علم اور آئندہ اس کے لئے کیا مقدر ہے اور ارتقا کی کن کن منازل سے اس نے آئندہ گزرنا ہے یہ سب کا سب ہمیشہ سے اس کے لئے ایک راز سربستہ اور عقدہ لاینحل رہا ہے اور ان معاملات میں اس کا علم ہمیشہ محتاج تشریح و توضیح رہا ہے۔ یہاں اس کے علم اور فہم کو اپنی لاعلمی کا طوعاً و کرہاً اعتراف کرنا پڑا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان امور میں فلسفیوں نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی اور اس قدر باہم اختلاف کیا کہ "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا" کا مصداق بن گیا۔ اس لئے انسان کو علم سکھانے کے لئے ایک اور ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ نے استعمال فرمایا اور وہ ہے وحی الٰہی۔ یعنی اپنے علم کامل سے انسان کے علم کی کمی کو پورا کیا جس طرح ایک بچہ جب اپنے عقل و فہم سے کسی امر کی تہ کو نہیں پہنچتا تو اس سے زیادہ علم رکھنے والا استاد اپنے علم سے اس کی کمئ علم کو پورا کر دیتا ہے۔ اسی طرح انسان امور باطنی و روحانی اور اسرار غیبیہ اور حالات مستقبل پر محض اپنے کسبی علوم سے چونکہ حاوی ہونے کے قابل نہ تھا اس لئے فوق کل ذی علم علیم خدا نے اپنے علم سے اس کی کمی کو پورا کیا۔ چنانچہ اسی ضرورت وحی اور ضرورت قرآن کو ظاہر کرنے کے لئے ارشاد ہوتا ہے:-

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

یعنی اے انسان تو اس کتاب کو پڑھ اور اپنے رب سے تعلق پکڑ تو دنیا و آخرت میں معزز بن جائے گا۔ یہ وہ ہدایتیں ہیں

جن کو انسان کا اپنا علم احاطہ نہیں کر سکتا تھا۔ بیشک علم کو سکھانے اور پھیلانے اور بڑھانے کا ذریعہ خدا نے قلم کو بنایا ہے لیکن جا اور تمام دنیا کی انسانی اور آسمانی کتابیں جو قلم نے لکھی ہیں اور دنیا میں تجھے مل سکتی ہیں پڑھ لے تجھے ماننا پڑیگا کہ جو کچھ آج قرآن کے ذریعہ تجھے علم سکھایا ہے وہ واقعی ایسا ہے جس کا انسان کو علم نہ تھا۔ نہ انسانی دماغ اپنی کوشش سے وہاں تک پہنچ سکتا تھا اور نہ کسی پہلی آسمانی کتاب میں اس کی وہ تفصیل و تکمیل موجود ہے جو قرآن نے کی ہے پس بلاوجہ تجھے اس قرآن کے پڑھنے کے لئے ہم متکلف نہیں کر رہے ہم نے اس کے ذریعہ تجھے وہ کچھ سکھایا ہے جس کا آج تک انسان کو علم نہ تھا پس اسے پڑھ اور اس پر عمل کر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے رب اکرم سے تعلق پکڑ کر تو دنیا و آخرت میں شرف اور بزرگی کا وارث ہو جائے گا۔

نکتہ۔ یہاں ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ پانچ آیات قرآنی جو سب سے پہلی وحی ہے جو محمد رسول اللہ صلعم پر نازل ہوئی اپنے اندر علم کا زبردست پیغام رکھتی ہے قرآن کے ذریعہ سب سے پہلا حکم جو انسان کو ملا ہے وہ یہی ہے کہ پڑھ اور علم حاصل کر اور جو علم حاصل کرتا ہے اس پر عمل کر۔ پھر قلم اور وحی دونوں کی طرف جو تحصیل علوم کے دو عظیم الشان ذرائع ہیں توجہ دلائی ہے یعنی قلم کے ذریعہ جو بھی اچھی بات لکھی ہوئی ملے اُسے پڑھ اور سیکھ۔ اسی لئے نبی کریم صلعم فرماتے ہیں کہ الحکمۃ ضالۃ المؤمن کہ حکمت تو مومن کا کھویا ہوا مال ہے جہاں سے ملے لے لو۔ اسی طرح وحی یعنی قرآن کو پڑھنے اور اس پر عمل کر کے رب سے تعلق جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ پھر بتایا ہے کہ قلم کے لکھے ہوئے علوم کو اور وحی یعنی قرآن کو پڑھنے اور ان پر عمل کرنے ہی سے انسان کی عزت وابستہ ہے ہمارے مسلمان بھائی جو دن رات عزت کے حصول کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ کاش کہ ان کا عمل ان آیات پر ہوتا تو نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی معزز ہو جاتے۔ جب سے علم کا شوق جاتا رہا اور قرآن کو چھوڑا ذلت سے محروم ہو گئے۔ جب تک ان آیات پر عمل نہ ہوگا حقیقی عزت کا حصول ناممکن ہے۔

كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ ۝ مگر سنو جی انسان کا یہ حال ہے کہ وہ سرکشی کرتا ہے۔

أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰٓ ۝ جب اپنے آپ کو وہ بے نیاز سمجھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن جیسی نعمت عطا ہو رہی ہے تاکہ انسان کا احسن تقویم ہونا ظاہر ہو اور وہ رب سے تعلق پکڑ کر اکرم یعنی دنیا و آخرت میں معزز بن جائے لیکن سرکش انسان اس علم سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے اور اس سے سرکشی اور خلاف ورزی اختیار کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب انسان کے پاس مال و دولت ہو اور کھانے کو دو افراد دنیا کی سوسائٹی میں اسے ظاہری عزت حاصل ہو تو پھر نہ وہ خدا کی ضرورت سمجھتا ہے نہ اس کے کسی حکم کی پروا کرتا ہے بلکہ اپنے اعمال کی ذمہ داری سے بے نیاز ہو کر شوخ اور گستاخ اور ظالم بن جاتا ہے۔ اور خدا کا اور اس کی فرمانبرداری اور اعمال کی بازپرس کا مذاق اڑاتا ہے گویا اس کا غنی ہونا اسے سرکش بنا دیتا ہے۔

إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰٓ ۝ بیشک تیرے رب کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔

یعنی یہ تغافل اور شوخیاں کب تک؟ آخر ایک دن مرنا ہے اور اپنے رب کے حضور لوٹنا ہے اور اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے عقلمند وہ ہے جو خدا کی طرف موت کے ذریعہ زبردستی لوٹائے جانے سے قبل دنیا میں اپنی خوشی اور رضا سے اپنے رب کی طرف رجوع کرے۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی ۙ کیا تو نے اسے دیکھا جو روکتا ہے۔

عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ؕ بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔

مفسرین کہتے ہیں یہ ابوجہل تھا جو محمد رسول اللہ صلعم کو نماز پڑھنے سے روکتا تھا میں کہتا ہوں یہ صحیح ہے لیکن نماز پڑھنے والے بھی ہمیشہ ہوتے ہیں اور روکنے والے بھی ہمیشہ ہوتے ہیں کچھ شک نہیں کہ آیت کا شان نزول کسی خاص واقعہ سے وابستہ ہوتا ہے لیکن جب وہ نازل ہوجاتی ہے تو اس کا مصداق ہر ایک وہ واقعہ ہوجاتا ہے جو اسی قسم کا یا اس سے ملتا جلتا بعد میں پیش آئے مثلاً کسی ایک مقدمہ میں ہائیکورٹ ایک فیصلہ دے دیتی ہے اور وہ فیصلہ کچھ شک نہیں کہ اسی مقدمہ کے متعلق ہوتا ہے لیکن وہ نظیر قائم ہوکر ہمیشہ کے لئے ایک قانون بن جاتا ہے۔ اسی طرح آیت کسی واقعہ پر نازل ہوکر ہمیشہ کے لئے ایک قانون بن جاتی ہے اور وہ واقعہ ایک نظیر بن جاتا ہے۔ جب کبھی اس قسم کا واقعہ یا حالت پیش آئے گی وہ آیت اس پر چسپاں ہوسکے گی۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں انسان کے دو نمونے پیش کئے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑنے کے لئے نماز پڑھتا ہے اور احسن تقویم کا مصداق ہے اور اس کا بہترین نمونہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ محمد رسول اللہ صلعم تھے اور دوسری طرف وہ ہے جو خدا سے تعلق جوڑنے کو اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتا۔ اور اسفل سافلین کا مصداق ہے اور اس کا نہایت صحیح نمونہ ابوجہل تھا اگر بات یہیں تک رہتی تو خیر اپنا اپنا کرنا اپنا اپنا بھرنا۔ جب رب کی طرف لوٹتے تو اپنے اپنے اعمال کے مطابق نتائج بھگتتے۔ لیکن نہیں اسفل سافلین کا مصداق شریر انسان اس قدر گستاخ ہے کہ نہ صرف یہ کہ خود خدا سے تعلق نہیں جوڑتا بلکہ جو بندہ خدا سے تعلق جوڑتا ہے اس کو روکتا اور تنگ کرتا ہے پس اس حالت میں ضروری ہوجاتا ہے کہ ایسے شوخ اور گستاخ اور حق کی مخالفت اور حق پرستوں کے استیصال کرنے والوں کو اس دنیا میں بھی جناب الٰہی کی طرف سے سزا دی جائے۔ غور کرو کہ اس شخص سے بڑھ کر شیطان کون ہوسکتا ہے جو بندہ کو خدا کی عبادت سے روکے اور خدا سے تعلق جوڑنے والے کو تنگ کرے۔ پس ضروری ہے کہ اس شخص کی گوشمالی کی جائے۔ اور اس کے بل کو توڑ کر اسے ذلیل کردیا جائے۔ لیکن شفقت الٰہی سزا دینے سے قبل ہمیشہ نصیحت اور موعظت سے کام لیتی ہے فرماتے ہیں۔

اَرَءَیْتَ اِنْ کَانَ عَلَی الْهُدٰٓی ۙ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ؕ کیا تو نے غور نہیں کیا اگر وہ ہدایت پر ہو۔ یا تقویٰ کا حکم دیتا ہو۔

یہ اس نماز سے روکنے والے گستاخ کو مخاطب کرکے ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا تو نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ جس کو تو روکتا اور مخالفت کرتا ہے اگر وہ ہدایت پر ہو یا تقویٰ کا حکم دیتا ہو۔ یعنی مخالفت کرنے سے قبل تیرا فرض ہے کہ تو دیکھے کہ یہ شخص خود ہدایت

پر ہے یا نہیں اور اگر وہ کوئی تلقین کرتا ہے تو کسی تقویٰ اور نیکی کی تلقین کرتا ہے یا کوئی شرارت اور منصوبہ بازیاں سکھاتا ہے یعنی اس کا اپنا عمل اور حال کیسا ہے اور دوسروں کو اس کی نصیحت اور مقال کیا ہے۔ اگر وہ شخص خود ایک متقی اور صالح انسان ہے اور صحیح راستہ پر ہے اور دوسروں کو اگر تلقین ہے تو تقویٰ کی ہے تو پھر اس کو روکنا کیا معنی رکھتا ہے۔ روکا ہمیشہ جاتا ہے بدی کو اور بدی کی تلقین کو۔ جو شخص خود ہدایت پر ہو اور تقویٰ کا حکم کرتا ہو اسے روکنا کس مذہب اور قاعدہ کی رو سے جائز ہے؟ اس سے کس قدر صفائی سے واضح ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کا کام یا اپنی اصلاح نفس تھی یا لوگوں کی اصلاح۔ اور بس۔

اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ کیا تو نے غور نہیں کیا اگر وہ حق کو جھٹلاتا اور پیٹھ پھیرتا ہے۔

یہ محمد رسول اللہ صلعم اور ہر ایک حق پرست کو خطاب کر کے ارشاد ہے گویا یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں دو نو کھڑے ہیں ایک طرف احسن تقویم کا مصداق نماز پڑھنے اور خدا سے جوڑنے والا جس کا بہترین مصداق محمد رسول اللہ صلعم ہیں۔ اور دوسری طرف اسفل سافلین کا مصداق نماز سے اور خدا سے تعلق پیدا کرنے سے روکنے والا جس کا صحیح مصداق ابوجہل تھا۔ پہلے اس روکنے والے کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ بھلا غور تو کر جسے تو روکتا ہے اگر وہ ہدایت پر ہو اور تقویٰ کا حکم کرتا ہو تو پھر تیرا کیا حال؟ اور اب خدا سے تعلق جوڑنے والے کو خطاب ہوتا ہے کہ غور تو کر اگر تو حق اور ہدایت پر ہے اور لوگوں کو تقویٰ کا حکم کرتا ہے تو پھر یہ شخص جو تجھے روکتا ہے حق کی تکذیب کرتا اور تقویٰ اور ہدایت سے منہ موڑتا اور پیٹھ پھیرتا ہے لہذا تجھے پھر اس کی کیا پروا ہونی چاہیئے؟ میں تو آج بھی یہی کہتا ہوں کہ کسی راستباز اور اس کے مخالفین کے لئے یہ فیصلہ کی بہترین راہ ہے کسی حامد کی مخالفت سے قبل ایک انسان کا فرض ہے کہ دیکھے کہ وہ کسی ہدایت پر ہے یا نہیں یعنی جو اس کے عقائد اور اعمال ہیں وہ ہدایت پر مبنی ہیں یا نہیں۔ دوسرے اس کی تعلیم اور تلقین تقویٰ کی ہے یا نہیں۔ اگر یہ دونو امور ہیں تو پھر اسے روکنے کا اور اس کی مخالفت کرنے کے لئے کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ دوسری طرف اس حامد یا اس کی جماعت کا یہ فرض ہے کہ جب وہ ہدایت اور تقویٰ پر ہے تو پھر کسی کی مخالفت کی کیا پروا ہونی چاہیئے کیونکہ پھر وہ حق کی تکذیب ہے اور حق پرست انسان کو اس کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ حق کی تکذیب کرنے والے انسان کی نسبت ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۝ کیا وہ جانتا نہیں کہ اللہ دیکھتا ہے۔

یعنی اس کے اعمال خدا سے مخفی نہیں۔ اس کی شرارت اور تکذیب اور حق کی مخالفت اور سرکشی خدا کی نظروں میں ہے

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ۝ وہ سُن رکھے اگر وہ باز نہیں آیا تو ہم اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹیں گے.....

یعنی ذلیل کر دیں گے اور ہلاکت کے گڑھے میں پھینک دیں گے۔

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ جھوٹی خطا کار پیشانی۔ (یعنی جھوٹے خطا کار لوگوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے)

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۙ پس چاہیئے کہ وہ اپنے اہل مجلس اور ہم نشینوں کو بلالے۔

یعنی اپنی امداد کے لئے اپنے ساتھیوں کو بلالے تاکہ خدا کی طرف سے جو ذلت و ہلاکت کی سزا اس پر وارد ہونی ہے اس سے بچ جائے۔

سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۙ ہم بھی بہادروں کو بلالیں گے۔

مطلب سزا دینے والوں سے ہے۔ جو ملائکہ شداد و غلاظ بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اسلام کے وہ بہادر بھی ہو سکتے ہیں جن کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ مخالفوں کو سزا دلادے وہ خدا کے ہی بہادر کہلائیں گے۔

جنگ بدر میں یہ نظارہ ایسا صاف نظر آیا اور یہ پیشگوئی اس صفائی سے پوری ہوئی کہ انسان حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ ابوجہل باوجود اس سمجھانے کے باز نہیں آیا۔ اور حق کی مخالفت کو انتہا تک پہنچا دیا۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلعم مکہ سے بھی ہجرت کر گئے تب بھی وہ باز نہ آیا اور حق کے استیصال کے لئے اپنے کل ہم نشینوں کو لے کر مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ بدر کے مقام پر مقابلہ ہوا لیکن خدا نے وہ ذلت اور ہلاکت کی مار اس پر ماری کہ مقام صد عبرت ہے وہ اسی طرح جس طرح خدا نے فرمایا تھا پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا گیا اور نہایت ذلت کے ساتھ دوسرے مقتولوں کے ساتھ ایک گڑھے میں پھینک دیا گیا اور گھسیٹنے والے اور پھینکنے والے وہ بہادر تھے جن میں بوڑھے بھی تھے پندرہ پندرہ برس کے بچے بھی تھے جنہیں نہ فن حرب سے واقفیت۔ نہ اسلحہ پاس۔ چھوٹے چھوٹے برچھے لیکر صرف ۳۱۳ کی تعداد میں آئے تھے۔ لیکن بہادری کا تمغہ تو خدا کی سرکار سے مل چکا تھا وہ بہادری دکھائی اور ان حق کے دشمنوں کو ذلت اور ہلاکت کا وہ مزہ چکھایا کہ غور کرنے والوں کے لئے اس میں درس صد عبرت ہے اور مومنوں کے لئے موجب ازدیاد ایمان ہے اسی لئے خدا کے دشمن کو تہدید کر کے اور اسے اس کے انجام کی خبر دے کر آنحضرت صلعم کو اور آپ کی وساطت سے ہر ایک مومن کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:-

كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ اس کی بات ہرگز نہ مان۔ اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔ ع ١ ١٩ ٢١ السجدة

(سجدہ کا سے مراد ایک تو خود سجدہ ہے دوسرے نماز ہے۔ تیسرے جناب الٰہی کی فرمانبرداری) یعنی وہ جو نماز سے اور خدا سے تعلق جوڑنے سے روکتا ہے تو ہرگز اس کی بات نہ مان اور نماز پڑھ اور سجدہ کر اور خدا کی فرمانبرداری میں لگا رہ۔ تو خدا کا مقرب بن جائے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا و آخرت میں معزز بن جائے گا یہاں معمولی دنیا کے فانی حکام کے تقرب کے لئے انسان کیا کچھ پاپڑ نہیں بیلتا۔ تو پھر اندازہ کرو اس عزت اور راحت کا جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور

عبادت کے ذریعہ قرب الٰہی کو پاکر انسان کو حاصل ہوسکتی ہے۔ نماز مظاہرۂ فرمانبرداری اور ذریعۂ استعانت ہے جس استعانت کے لئے شروع سورت میں تاکید کی تھی آخر سورت میں اس استعانت کی مکمل شکل نماز کو بتلایا۔ اسی لئے سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی کیونکہ استعانت کی وہی تو دعا ہے۔ نماز میں سجدہ اظہار عبودیت اور اقرار فرمانبرداری کی بہترین شکل ہے۔ اس سے بڑھ کر تذلل اور عاجزی اور فرمانبرداری کا اظہار اور کیا ہوگا کہ سر مالک کی چوکھٹ پر بندہ رکھ دے اور خدا کا قرب ملتا ہے عاجزی اور فرمانبرداری سے۔ اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ نماز میں سجدہ کے وقت بندہ اپنے رب سے سب وقتوں سے زیادہ قریب ہوتا ہے پس چاہیئے کہ سجدہ میں بہت دعا کرے کہ وہ قرب اور قبولیت کا وقت ہے ہمارے نبی کریم صلعم تو بڑی باریک فہم رکھتے تھے۔ یہاں سجدہ کا حکم سن کر فوراً سجدہ کر دیا کرتے تھے تاکہ فرمانبرداری کے اقرار میں دیر نہ ہو۔ ایسا ہی ہم سب کو چاہیئے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ قرآن حکیم کی ہر سورت کا ایک موضوع ہوتا ہے اور اول سے لیکر آخر تک وہ سورت اسی پر مبنی ہوتی ہے جس قدر اور مطالب درمیان میں آتے ہیں وہ سب کے سب اسی ایک موضوع اصلی کے ناگزیر ضروری اطراف بحث و تعلیم ہوتے ہیں پس قرآن کی تمام آیات باہم مربوط و مسلسل ہیں اور ایک نظم و اسلوب حقیقی کے ساتھ سلسلۂ بیان بتدریج اجمال سے تفصیل۔ دعوے سے دلیل اور تعلیم سے امثال و نظائر کی طرف بڑھتا اور کھلتا جاتا ہے اسی کو قرآن کریم نے "تصریف آیات" سے جا بجا تعبیر کیا ہے۔ ان ترتیب آیات میں ایک کمال یہ بھی نظر آتا ہے کہ سورت کا ابتدا اور انتہا ایسا باہم تطبیق کھاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اسی سورت کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت سے اعانت طلب کر کے قرآن کو پڑھنے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ انسان کی ساری عزت اپنے رب سے تعلق پکڑنے میں ہے آخر سورت میں اسی استعانت کی مکمل شکل نماز کو قرار دیا۔ اور بتلایا کہ نماز کے ذریعہ اگر اعانت طلب کر کے اس کتاب قرآن کو پڑھتے اور اس کے احکام کی فرمانبرداری کرتے رہو گے تو خدا کا قرب حاصل کر لوگے اور اس سے تعلق پکڑ کے دنیا و آخرت میں عزت کی زندگی پانے والے بنو گے ؎

سُوْرَةُ الْقَدْرِ مَكِّيَّةٌ	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	وَهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

سورۃ القدر کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا پچھلی سورت میں ذکر تھا نزول قرآن کا اور اسے پڑھنے اور اس کا علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کی توفیق ملنے کے لئے اعانت طلب کرنے کا اور نماز پڑھنے کا۔ اس سورۃ القدر میں ذکر ہے کہ نزول قرآن کا زمانہ بڑا بابرکت ہے۔ اس میں عبادات اور نیکیاں اور جد و جہد جو ثواب رکھتی ہیں وہ دوسرے زمانوں میں ممکن نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۚ ۖ ہم نے اسے لیلۃ القدر میں اتارا۔

انزلناہ میں ضمیر قرآن کی طرف ہے یعنی ہم نے قرآن کو اتارا لیلۃ القدر میں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن۔ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر کی رات رمضان میں ہے۔ آنحضرت صلعم کے ارشاد کے مطابق وہ رات رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہے یعنی ۲۱-۲۳-۲۵-۲۷-۲۹ تاریخ کی راتوں میں سے ایک رات ہے۔ پھر یہ بھی روایت ہے کہ رمضان کی ۲۵-۲۷-۲۹ تاریخ کی راتوں میں سے ایک رات ہے۔ لیلۃ القدر اُسے اس لئے کہا ہے کہ وہ بڑی عزت اور تعظیم کی رات ہے جس کی بڑی قدر انسان کو کرنی چاہیئے۔ اور اس میں شک ہی کیا ہو سکتا ہے کہ جس رات میں قرآن جیسی عظیم الشان نعمت اور بے نظیر کتاب ہدایت دنیا میں نازل ہوئی اس کی انسان جتنی بھی عزت اور قدر کرے کم ہے نزول قرآن کی وجہ سے ہی اُسے یہ شرف حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ نے نزول قرآن کی یادگار کے طور پر آئندہ بھی اس رات کو ہمیشہ کے لئے معزز اور بابرکت قرار دیدیا کہ ہر سال جب بھی وہ رات آوے گی اللہ تعالیٰ اس رات میں اپنی برکتوں اور رحمتوں کا ہر ایک دروازہ بندوں کے لئے کھول دے گا۔ گویا ہر سال نزول قرآن کی یادگار قائم کردی اور صرف کہنے کو یادگار نہیں رکھی بلکہ جس طرح نزولِ قرآن والی رات کو جناب الٰہی کا دریائے رحمت جوش میں تھا اور قرآن جیسی نعمت بندوں کو عطا ہوئی تھی۔ اسی طرح ہر سال اس شب میں رحمتوں اور روحانی برکتوں اور نعمتوں کا نزول ان قلوب پر ہوگا جو ان کے حصول کے لئے سعی اور جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ یہاں بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ سارا قرآن تو ایک رات میں نازل نہیں ہوا اس کا ہمارے بعض مولوی یہ جواب دیتے ہیں کہ اس رات پہلے آسمان پر سارا قرآن نازل ہو گیا تھا میری سمجھ میں اس سے بڑھ کر کچھ جواب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ صاف بات ہے کہ قرآن کا لفظ ساری کتاب قرآن پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کی کسی آیت یا کسی حصہ پر بھی بولا جاتا ہے اذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ۔ جب قرآن پڑھا جائے تو اُسے توجہ سے سنو۔ یہاں سارا قرآن مراد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ قرآن کا کوئی سا حصہ یا ایک آیت بھی پڑھی جائے تو اُسے غور سے سننے کا حکم ہے پس نزول قرآن سے یہ مفہوم لینا ضروری نہیں کہ سارا قرآن ہی نازل ہوا اگر ایک آیت بھی نازل ہوگی تو وہ بھی نزول قرآن کہلائے گا۔ ویسے تو قرآن کا زمانۂ نزول ۲۳ سال پر محیط ہے اور قرآن کی آیات مختلف مواقع پر نازل ہوتی رہیں لیکن نزول قرآن کی رات وہی قرار پائے گی جس رات میں پہلی مرتبہ آیات قرآنی کا نزول ہوا وجہ یہ کہ اس سے قبل قرآن دنیا میں موجود نہ تھا پس جس رات کو پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا آیات نازل ہوئیں تو اسی رات کی نسبت یہ کہا جائے گا کہ آج قرآن دنیا میں نازل ہوا اور ضرور ہے کہ ایسی رات بڑی بابرکت رات قرار پائے جس میں خدا کی بہترین اور سب سے بابرکت اور عظیم الشان نعمت کا نزول شروع ہوا۔

وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ اور تو نے کیا سمجھا کہ لیلۃ القدر کیا ہے۔

یہ اس کی عظمت اور اہمیت ظاہر کرنے کے لئے طرز بیان ہے

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

یعنی اس میں عبادت کرنا اور نیکیاں کرنا ہزار مہینے کی عبادت اور نیکیوں سے بڑھ کر ثواب رکھتا ہے۔ یہاں ہزار کا لفظ تکثیر کے لئے ہے یعنی بہت ہی بڑا ثواب رکھتا ہے۔ لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم رمضان میں بہت خیرات کرتے اور راتوں کو بہت عبادت کرتے تھے۔ بالخصوص آخری عشرہ رمضان میں تو عبادت کو کمال پر پہنچا دیتے تھے۔ آپ پچھلی رات کو گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے یعنی دو دو رکعتیں علیحدہ علیحدہ پانچ دفعہ پڑھتے تھے۔ اور پھر ایک رکعت علیحدہ پڑھ کر ساری رکعتوں کو طاق کر دیتے تھے یعنی گیارہ پوری کر دیتے تھے اسی کو وتر کہتے ہیں یہ جو لوگوں میں عشا کی نماز کے بعد وتر تین رکعت پڑھتے ہیں یہ دراصل پچھلی رات کی نماز کو پہلی شب میں پڑھ لیا جاتا ہے اس خیال سے کہ لوگ پچھلی رات کو بہت کم اٹھتے اور نماز پڑھتے ہیں ورنہ اصل وقت اس کا پچھلی شب ہے۔ اور وتر آخری ایک رکعت کا نام ہے جو باقی کی رکعتوں کو طاق کر دیتی ہے اسے علیحدہ ہی پڑھنا چاہیئے کیونکہ رسول اللہ صلعم کا یہی طریق تھا۔ اگر دو رکعت پڑھ کر ایک رکعت وتر کی پڑھ لی تو وہ تین وتر ہو گئے اور چار رکعت پڑھ کر ایک رکعت وتر کی پڑھ لی تو پانچ رکعت وتر کی ہو گئیں۔ اسی طرح چھ رکعتوں کے بعد ایک رکعت وتر کی پڑھو گے تو وہ سات رکعتیں وتر کی ہو گئیں اگر آٹھ کے بعد پڑھو گے تو نو رکعتیں وتر کی ہو گئیں اگر دس رکعتوں کے بعد ایک رکعت وتر کی پڑھو گے تو وہ گیارہ رکعت وتر کی ہو گئیں۔ آنحضرت صلعم اسی طرح گیارہ رکعتیں وتر کی پڑھتے تھے اسے نماز تہجد بھی کہتے ہیں اس وجہ سے کہ تہجد کے معنے نیند سے جاگنے کے ہیں۔ پس جو نماز سونے کے بعد جاگ کر انسان پڑھے گا وہ تہجد کہلائے گی۔ اسی لئے اگر ساری رات انسان نہ سوئے اور نماز پڑھتا ہے تو وہ شریعت کی اصطلاح میں تہجد نہیں کہلائے گی۔ پس پچھلی شب کی گیارہ رکعتیں جو آنحضرت صلعم پڑھا کرتے تھے وہ تہجد اس لئے کہلاتی ہیں کہ آپ نیند سے جاگ کر اٹھتے اور پڑھتے تھے اور وتر اس لئے کہلاتی ہیں کہ وہ تعداد میں طاق تھیں اور رمضان میں اسی نماز کو تراویح بھی کہتے ہیں۔ وجہ یہ کہ دو دو یا چار چار رکعتوں کے بعد آرام اور راحت کرنے کی اجازت ہے پس راحت کی وجہ سے تراویح کہلائی۔ پس رمضان میں جو تراویح پڑھی جاتی ہے یہ وتر یا تہجد سے کوئی علیحدہ نماز نہیں وہی نماز ہے۔ آسانی کی خاطر بجائے پچھلی شب کے پہلی شب میں پڑھ لیتے ہیں۔ اور یہ جو بیس رکعتیں تراویح اور تین رکعت وتر ملا کر ۲۳ رکعتیں پڑھتے ہیں یہ مسنون نہیں ہے۔ رمضان کی رات میں لوگ مسجد میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے حضرت عمر خلیفہ تھے اُدھر سے گذرے۔ پوچھا کہ کیا کر رہے ہیں بتایا کہ کچھ بھی نہیں باتیں ہو رہی ہیں آپ نے ایک قرآن کے حافظ کو کہا کہ ان لوگوں کو جمع کر کے بیس رکعتیں نماز نفل پڑھاؤ اور ان میں قرآن سناؤ اس طرح یہ طریق رائج ہو گیا ورنہ آنحضرت صلعم اور صحابہ کی یہ سنت نہیں حضرت عائشہؓ نے ایک مرتبہ آنحضرت صلعم سے پوچھا کہ اگر میں لیلۃ القدر کو پاؤں جو بڑی قبولیت کی رات ہے تو اس رات کیا دعا مانگوں۔ آپ نے فرمایا یہ دعا کرنا کہ اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ۔ اے اللہ بے شک تو نہایت عفو کرنے والا ہے اور عفو کرنے کو پسند کرتا ہے۔ پس مجھے بھی عفو کر دے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ اس میں فرشتے اور روح اپنے رب کے اذن سے ہر امر خیر و برکت کیلئے اترتے ہیں۔

سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ سلامتی۔ یہ فجر کے طلوع تک ہے۔

ع ۲۲

یہاں بعض لوگوں نے من کل امر سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دنیا کا حساب کتاب اور انتظام اس رات کو ہو جاتا ہے یہ صحیح نہیں۔ کُل کا لفظ نسبتی ہے اس کا اطلاق موقعہ و محل کے لحاظ سے صرف ان امور پر بھی ہوتا ہے جو معرض بحث میں ہوں۔ ہم اُردو میں بھی اس طرح بولتے ہیں مثلاً کسی دعوت کے موقعہ پر اگر یوں کہیں گے کہ کل آدمی آگئے تو اس کے معنے یہ نہیں کہ ساری دنیا کے آدمی آگئے۔ بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ وہ آدمی جو مدعو تھے سب آگئے۔ اسی طرح سورۃ ہود میں حضرت نوح کو حکم ہوتا ہے وقلنا احمل فیھا من کل زوجین اثنین اور ہم نے کہا۔ کہ اس کشتی میں کل یعنی ہر ایک میں سے جوڑا جوڑا دو دو چڑھالو۔ اس سے یہ مراد لینا کہ کل دنیا کے جانوروں میں سے جوڑا جوڑا چڑھالو۔ نہایت لغو بات ہے بلکہ مراد یہی تھا کہ وہ جانور جن کی تمہیں ضرورت ہے ان میں سے ہر ایک میں سے جوڑا جوڑا چڑھالو۔ اسی طرح یہاں من کل امر سے مراد یہ نہیں کہ سارے دنیا کے کام بلکہ مراد ہے ہر ایک روحانی برکت و نعمت جو ایک ایسی قابل قدر رات کے مناسب حال ہے جس میں قرآن نازل ہوا تھا۔ الروح سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو کلام الٰہی لے کر قلوب پر نازل ہوتے ہیں جن سے روحانی زندگی نصیب ہوتی ہے اسی لئے انہیں الروح کہا گیا۔ سلام کے معنے ہیں ہر خوف کے امر سے سلامتی یعنی جو امور اس رات میں نازل ہوتے ہیں۔ ان میں انسان کی سلامتی مد نظر ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کو دیکھ لو جو لیلۃ القدر میں نازل ہوا اس میں انسان کے لئے سلامتی کا پیغام ہے۔ اس کا مقصد وحید ہی یہ ہے۔ کہ انسان ہر قسم کے گناہ اور دکھ شر اور مصیبت سے بچ کر سلامتی کا وارث ہو۔ اسی طرح جو شخص بھی اس رات سے فائدہ اٹھائے گا اور عبادت اور جدوجہد کے ذریعہ اس رات اپنے قلب کو اس قابل بنائے گا کہ اس پر عالم روحانی کے تاثرات پڑ سکیں تو ضروری ہے کہ ملائکہ اور رُوح یعنی مکالمات الٰہیہ اور برکات روحانی کا نزول اس کے قلب پر اس شان سے ہو کہ اس کی روح گناہوں کے جکڑ بند سے نکل کر سلامتی کی وارث ہو جائے۔ اور دکھوں کا خاتمہ ہو کر ہمیشہ کی سلامتی کا انعام اسے مل جائے۔ میں نے جو یہاں کہا ہے کہ جو شخص اپنے قلب کو اس قابل بنائے گا کہ اس پر عالم روحانی کا اثر پڑ سکے۔ اسی کے قلب پر ملائکہ اور روح کا نزول ہوگا۔ یعنی وہی اس روحانی زندگی کا وارث بنے گا جو اس رات میں انسان کے لئے مقدر ہے۔ تو یہ بالکل سچ ہے ملائکہ اور روح جو کلام الٰہی اور برکات روحانی لے کر نازل ہوتے ہیں ان کا نزول ہمیشہ قلب پر ہوتا ہے جیسا کہ خود نزولِ قرآن کی نسبت ارشاد ہوتا ہے کہ قل مَن کان عدوًا لجبریل فانہٗ نزلہٗ علیٰ قلبک باذن اللہ۔ کہہ دے جو دشمن جبریل کا ہے ہوا کرے۔ یہ قرآن اس نے نازل کیا ہے۔ خدا کے حکم سے تیرے قلب پر۔ پس تمام روحانی خیر و برکت اور کلام الٰہی کا نزول جو ملائکہ اور روح لیکر نازل ہوتے ہیں وہ قلب انسانی پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وہی قلوب انسانی ہو سکتے ہیں جن کا تعلق نیکیوں کے محرک ملائکہ اور روح سے ہو اور جن قلوب کے دروازے ان روحانی مہمانوں کے لئے کھلے ہوئے ہوں لیکن جن لوگوں کے قلوب کے دروازے روحانی عالم کے لئے بند ہوں بلکہ شیاطین کا ان پر تسلط ہو تو ان میں فرشتے کس طرح داخل ہو سکتے ہیں۔ پس ایسے لوگ اگر ان برکات روحانی اور نعمائے آسمانی سے محروم رہیں تو یہ ان کا قصور ہے ھی حتّٰی مطلع الفجر کے ایک تو یہی معنے ہیں کہ اس رات کی برکات کا نزول صبح ہونے تک ممتد رہتا ہے دوسرا مطلب

یہ بھی ہے کہ ان سلامتی اور برکات کا نزول قلب انسان پر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ قلب سے گناہ کی ظلمتیں کافور ہوکر آسمانی روشنی اس کی جگہ لے لیتی ہے

قرآن کا ظاہر بھی ہے اور بطن بھی ہے جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے۔ لیلۃ القدر کے ظاہر معنے تو یہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے یعنی رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے ایک رات جس میں قرآن نازل ہؤا۔ لیکن اس کا بطن یہ ہے کہ لیلۃ القدر وہ زمانہ نبوی صلعم ہے جس میں قرآن نازل ہؤا۔ اسے لیلہ یعنی رات اس لئے کہا کہ ضلالت وکفر کی ظلمت تمام دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ اور القدر یعنی قابل عزت اس لئے کہا کہ اس میں قرآن جیسی عظیم الشان ہدایت آسمانی اور کتاب الٰہی کا نزول ہؤا اور محمد رسول اللہ صلعم جیسے عظیم الشان ہادی کی بعثت ہوئی۔ اس میں کیا شک ہے کہ آپ کا زمانہ خیر من الف شھر یعنی خیر و برکت میں ہزارہا مہینوں سے بڑھ کر تھا اور تمام زمانوں پر فوقیت رکھتا تھا۔ آپ کے زمانہ کی عبادات اور خدمات دینیہ جو ثواب رکھتی تھیں بعد میں آنیوالے زمانہ میں وہ ثواب نہیں مل سکتا۔ خود آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو آج خدا کی راہ میں ایک مٹھی جو دیتا ہے اس کا ثواب بعد کے زمانہ میں اُحد پہاڑ کے برابر سونا دینے سے بھی بڑھ کر ہوگا۔ وجہ یہ کہ ضرورت کے وقت تھوڑی سی امداد بہت زیادہ موجب ثواب ہوتی ہے اس بہت بڑی امداد سے جو بعد میں اُس وقت پیش کی جائے۔ جب اس کی ضرورت باقی نہ رہے۔ مثلاً ایک غریب مفلس کو چند روپے دیدینے یا ایک بھوکے نادار کو روکھی روٹی کھلانا بہت زیادہ موجب ثواب ہے۔ بہ نسبت اسی آدمی کو ہزارہا روپے پیش کرنے کے جب وہ خود دولت مند ہو چکا ہے [illegible] کو پلاؤ پیش کرنے سے۔ آنحضرت صلعم کے وقت میں اسلام کو جو مصائب درپیش تھے۔ اور مالی اور جانی قربانیوں کی جس قدر اس وقت ضرورت تھی وہ حدِ بیان سے باہر ہے پس جنہوں نے ایسے نازک وقت میں اسلام کے لئے مال اور جان سے امداد کی۔ اور اس قدر دکھوں اور تکالیف کے باوجود خدا کے دروازے کو نہیں چھوڑا۔ ان کی عبادت اور قربانیوں کے ثواب کو وہ لوگ کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ جو بعد میں آئے جب اسلام دنیا میں ایک کامیاب مذہب اور مسلمان دولت اور حکومت کے وارث بن چکے تھے۔ حضور صلعم کا زمانہ وہ وقت تھا جب ملائکہ اور روح کا نزول دنیا میں ہو رہا تھا ایک طرف قرآن اتر رہا تھا دوسری طرف مومنوں کی طبائع میں ایک روحانی زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ ہر قربانی اور ایثار پر نصرت اور تائید کے لئے ملائکہ کا نزول، ایمان کی تازگی، روح اور قلب کی زندگی کا سلسلہ جاری تھا اور ان تمام خطرات کے اندر دنیا کی سلامتی کا راز مخفی تھا۔ یہاں تک کہ گمراہی اور کفر کی ظلمت دور ہوگئی اور ہدایت کا نور تمام عالم پر چھا گیا۔

ہزار مہینوں میں ایک لطیف اشارہ بھی مخفی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہزار مہینے کے ترا سی ۸۳ سال تقریباً بنتے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ دین کی تجدید کے لئے ہر صدی کے سر پر مجدد آئے گا۔ چونکہ ہر مجدد آنحضرت صلعم کا خلیفہ ہوتا ہے اس لئے بروزی اور ظلی رنگ میں اس کا زمانہ بھی آنحضرت صلعم کے زمانہ کا ظل اور ایک نسبت اس کے ساتھ رکھتا ہے۔ اور صدی کے سو سال میں سے اس کا زمانہ صدی کے باقی سالوں پر وہی فوقیت رکھتا ہے جو آنحضرت صلعم کا زمانہ تمام زمانوں پر فوقیت رکھتا ہے گویا صدی میں ۱۷ سال تو مجدد کے زمانہ کی اوسط قرار دیا اور باقی ترا سی سال

وہ زمانہ ہے جو مجدّد سے خالی ہوتا ہے۔ خدا کی شان ہے کہ ہمارے صدی کے مجدّد اور مسیح موعود حضرت مرزا غلام احمد علیہ الرحمۃ کا زمانہ دعوٰی الہام کا تو تیس سال تک پہنچتا ہے لیکن مسیح موعود کے دعوٰی کا زمانہ پورے سترہ سال بنتا ہے چونکہ مجدد کا زمانہ بھی دین کی مصائب کا زمانہ ہوتا ہے اور اس میں خدمتِ دین کی از بس ضرورت ہوتی ہے اس لئے اس زمانہ میں بھی عبادت اور اعمال خیر کا ثواب اسی نسبت سے زیادہ ہوتا ہے جس قدر مالی اور جانی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج مجدد صدی چہاردہم کا زمانہ چونکہ دین اسلام پر طرح طرح کے حملوں اور خطروں کا زمانہ ہے اور مذاہب باطلہ کا ہجوم ہے اور بیدینی اور گمراہی کی رات چاروں طرف چھائی ہوئی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے ملائکہ اور کلام کا نزول بھی اسی نسبت سے ایسے زور اور قوت کے ساتھ ہوا کہ اور کسی مجدّد کے وقت نہ ہوا تھا اور ایسے ایسے معارف قرآنیہ اور حقائق لدنیہ کا نزول ہوا جو اور کسی مجدّد کے زمانہ میں نہ ہوا تھا اور جس قدر ثواب اس زمانہ میں عبادت اور قربانیوں کا ہے وہ بعد کے زمانہ میں نصیب نہ ہوگا۔ جب ضلالت کی رات ختم ہو جائیگی اور ہدایت کا آفتاب مغرب سے طلوع ہو کر تمام دنیا پر چمک اٹھے گا۔ خود حضرت نبی کریم صلعم موجودہ زمانہ کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں جناب الٰہی میں خلوص کا ایک سجدہ سالہا سال کی عبادت سے بڑھ کر ثواب رکھے گا۔ پس ایسی بیدینی کے زمانہ میں دین کو دنیا پر مقدم کرنا اور اسلام پر ایسا نازک وقت آجانے پر مالی و جانی قربانیاں اور اس دہریت کے زمانہ میں خدا کی عبادت جس قدر ثواب رکھتا ہے وہ بعد میں آنے والے لوگوں کو نصیب نہ ہوگا جب اسلام کے لئے کسی قربانی کی ضرورت نہ رہے گی اور خدا کی توحید و معرفت دنیا میں پھیل جائے گی آج اس فاقہ مستی اور ناداری کی حالت میں جو تھوڑا سا چندہ خدا کے دین کی راہ میں ثواب رکھتا ہے اُسے ہزاروں روپے کے وہ چندے نہیں پہنچ سکتے جو بعد میں اگر کوئی دولت مند قوم مسلمان ہو گئی اور خادم دین بن گئی اسوقت پیش کئے جائیں گے پس خوش قسمت ہے وہ جو اس وقت کو غنیمت سمجھتا ہے اور اس لیلۃ القدر میں خدا کو یاد کرتا اور اس کی راہ میں قربانیاں کرتا ہے کیونکہ یہ زمانہ اعمال کے نتائج کے لحاظ سے بڑی فوقیت اور فضیلت کا زمانہ ہے۔ خود حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں ؎

اگر یاران کنوں بر غربتِ اسلام رحم آرید
بہ اصحابِ نبیؐ نزدِ خدا نسبت شود پیدا

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ مَكِّيَّةٌ	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	وَهِيَ ثَمَانِ اٰيَاتٍ

سورۃ البینہ کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ گذشتہ سورت میں قرآن کے نزول کا ذکر تھا کہ وہ دنیا کے لئے سلامتی کا پیغام ہے۔ اس سورۃ البینہ میں بتایا ہے کہ دنیا کی حالت گمراہی کی اس قدر ترقی کر گئی تھی کہ جب تک خدا کی طرف سے بینہ نہ آتی اور قرآن نازل نہ ہوتا دنیا کو ہدایت ہونی ناممکن تھی۔ فرماتے ہیں:-

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ

وہ لوگ جو اہل کتاب میں سے کافر ہوئے اور مشرک لوگ آزاد ہونے والے یعنی کفر و شرک کو چھوڑنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل نہ آجاتی۔

یہاں الذین کفروا من اھل الکتاب میں کفر سے مراد ان کے اپنے اعمال کفریہ اور شرک ہیں یعنی وہ اہل کتاب جو بوجہ اپنے اعمالِ کفر و شرک کے کافر کہلانے کے مستحق ہو گئے تھے المشرکین سے مراد کفار تھے جو اہل کتاب نہ تھے اور بت پرست تھے۔ البینۃ سے مراد خدا کا رسول ہے جیسا کہ اگلی آیت میں خود ہی صاف صاف فرما دیا ہے خدا کے رسول کو بینہ یعنی کھلی دلیل اس لئے فرمایا کہ رسول بوجہ اپنی پاکیزہ زندگی اعلیٰ تعلیم اور نشانات سماوی کے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایک بین دلیل ہوتا ہے۔ اور اس کے آنے سے ایمان قلوب میں مستحکم ہو کر انسان کو گناہوں سے نجات مل جاتی ہے۔ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ زمانہ کی حالت کفر و شرک اور فسق و فجور کی وجہ سے اس قدر گر گئی تھی کہ جو بت پرست تھے وہ تو خیر گمراہی کے گڑھے میں پڑے ہی ہوئے تھے خود اہل کتاب جو الہامی کتب کے وارث تھے کفر و شرک میں اس قدر مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ بجائے خود کافر کہلانے کے مستحق ٹھیر گئے تھے۔ پس جو خود گمراہ تھے انہوں نے دوسروں کی رہبری کیا کرنی تھی۔ ایسی حالت میں دنیا کو گناہ کی غلامی سے آزاد کروانے کی کوئی صورت نہ تھی سوائے اس کے کہ خدا کا رسول آتا جو ان پر پاک صحیفے پڑھتا۔ کیونکہ کوئی معمولی واعظ انہیں گناہ کی گندگی سے اب نکال نہ سکتا تھا اور یہ امر تاریخی طور پر ثابت شدہ ہے کہ اہل کتاب کے مشہور دو گروہوں یعنی یہودیوں اور عیسائیوں نے جزیرہ نمائے عرب کو شرک سے پاک کرنے کے لئے صدیوں تک زور لگایا مگر ان کی ساری کوششوں کا نتیجہ ملک عرب کی اعتقادی اور اخلاقی حالت پر اتنا بھی نہ ہوا جتنا سمندر کی سطح پر ایک ہلکی لہر کا اثر ہوتا ہے یہ وہ بات ہے جو خود سر ولیم میور نے لکھی ہے لیکن فقط اتنا ہی نہیں بلکہ دنیا میں جس جس قوم میں بھی کتاب آئی تھی سب کی حالت اسی طرح ہی گئی گذری ہو چکی تھی اور جب وہ سب لوگ خود طرح طرح کی ناپاکیوں میں مبتلا تھے تو وہ دوسروں کو کیونکر ناپاکیوں سے نکال سکتے تھے جو خود ایک نجات دہندہ کے محتاج تھے وہ دوسروں کو گناہ کی غلامی سے کس طرح نجات دلا سکتے تھے پس زمانہ کی یہ حالت پکار پکار کر کسی آسمانی مصلح یعنی رسول کی ضرورت کا اعلان کر رہی تھی۔ جو اپنے وجود صفاتی اور قوت روحانی اور نشانات سماویہ سے لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے ایمان کو زندہ کرے اور گناہوں کی غلامی سے نجات دلا کر عقائد

حقہ اور تقویٰ و طہارت کو قائم کرے۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ اللہ کی طرف سے رسول جو پاک صحیفے پڑھتا ہے

فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ جن میں مضبوط کتابیں ہیں ہ

پچھلی آیت میں جو البینہ فرمایا تھا رسول اس سے بدل ہے یعنی وہ البینہ کیا ہے اللہ کا رسول۔ وجہ یہ کہ رسول خدا کی ہستی پر ایک بیّن دلیل ہوتا ہے اور ایسی دلیل جس سے خدا پر ایمان تازہ ہو کر انسان کو گناہوں سے نجات طبعاتی ہے۔ یہاں رسول سے مراد بالخصوص آنحضرت صلعم ہیں۔ نکرہ کا صیغہ تعظیم کے لئے ہے۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ زمانہ کی حالت اس قدر گناہ اور شرک سے گندی ہو چکی تھی کہ وقت آگیا تھا کہ وہ عظیم الشان رسول جو کل نبیوں کا موعود تھا آکر دنیا کی اصلاح کرتا۔ اس کا وجود۔ اس کی زندگی جو خوارق و نشانات سماویہ سے پُر تھی۔ اور نصرت الٰہیہ کے مظاہرے جو اس کے ساتھ تھے بجائے خود اللہ تعالیٰ پر ایمان زندہ کرنے کے لئے کافی تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے علاوہ مزید برآں یہ بھی ہے کہ وہ رسول پاک صحیفے پڑھتا ہے۔ پاک ان کو اس لئے کہا گیا کہ وہ ہر ایک قسم کی گندی تعلیموں اور آلائشوں سے پاک تھے۔ جن کو پہلی الہامی کتب میں لوگوں نے اپنی طرف سے ملا دیا تھا۔ پس وہ رسول آیا ہے اور ہر ایک آمیزش سے پاک خالص اور پاکیزہ خدائی ہدایتیں اور تعلیم لے کر آیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی تعلیم لوگوں کو بھی گناہوں سے پاک کرتی ہے اور تقویٰ و طہارت ان میں پیدا کرتی ہے۔ فیھا کتب قیمہ سے مراد ہے کہ اس میں یعنی قرآن میں وہ تعلیم ساری کی ساری جمع کر دی گئی ہے۔ جو دنیا میں ہمیشہ قائم رہنے کے قابل ابدی صداقتوں کا حکم رکھتی ہے گویا جہاں اس رسول کی تعلیم ہر قسم کی انسانی ملاوٹ اور آمیزش سے پاک ہے وہاں وہ تمام ابدی صداقتیں اور کامل ہدایتیں جن کا قائم رہنا ضروری ہے خواہ وہ پہلی کتب سماوی میں تھیں یا کہیں اور تھیں یا ابھی نازل نہیں ہوئی تھیں اور انسان کے لئے ضروری تھیں وہ سب کی سب اس تعلیم اور کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں جو وہ لایا ہے۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا اور انہوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی تفرقہ نہیں کیا مگر

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ اس کے بعد کہ انکے پاس کھلی دلیل آگئی۔

البینہ سے یہاں بھی وہی رسول مراد ہے جو اپنے ساتھ کھلے کھلے دلائل اور نشانات سماویہ لایا تھا۔ تفرقہ سے مراد یہ ہے کہ ایمان لانے میں تفرقہ کیا ایک تو اس طرح کہ بعض نے مانا اور بعض نے نہ مانا۔ اور دوسرے اس طرح کہ یہ لوگ پہلے رسولوں اور کتابوں کو تو مانتے چلے آئے تھے لیکن اس رسول اور کتاب کو باوجود اس کے بینہ ہونے کے نہ مانا اور اس طرح رسولوں پر ایمان لانے میں فرق کیا۔ اور سچ پوچھو تو انہوں نے اس انکار سے درحقیقت اس پاکیزہ تعلیم کا

انکار کیا جو ان کے ہاں بھی مسلم تھی اور اس منہاج نبوت سے تفرقہ کیا جس پر اس سے قبل یہ اپنے رسولوں کو مانا کرتے تھے حالانکہ یہ رسول اس قدر دلائل اور نشانات اپنے ساتھ رکھتا ہے کہ البینہ کے خطاب کا مستحق ہے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ اور انہیں کوئی حکم نہیں دیا گیا مگر یہی کہ وہ اللہ کی عبادت کریں

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ اس کے لئے دین اور فرمانبرداری کو خالص کرتے ہوئے۔

حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ راست رو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔

وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝ اور یہی مضبوط دین ہے۔

مطلب یہ کہ آخر ایمان نہ لانے کی کیا وجہ تھی کیا قرآن کی تعلیم اور اگلے نبیوں کی تعلیم میں کچھ فرق تھا ہرگز نہیں بلکہ نبیوں کی اسی تعلیم کو قرآن کے ذریعہ زندہ اور مکمل کر دیا تھا وہی توحید اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی تعلیم تھی عبادت ہو یا اعمال ہوں سب میں خدا کی رضا اور فرمانبرداری اور اخلاص مدنظر رکھنے کا حکم تھا اور حنیف یعنی راست رو ہونے کا حکم تھا یعنی افراط و تفریط سے پاک ہو کر ہر ایک جذبہ اور قوت کو اپنے صحیح مقام اور اعتدال پر رکھنے کا حکم تھا اور یہ باتیں نہیں حاصل ہو سکتیں جب تک اللہ تعالیٰ سے تعلق نہ ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان نماز کو قائم کرے تاکہ تعظیم لامر اللہ دل پر مستولی ہو اور زکوٰۃ دے تاکہ شفقت علی خلق اللہ کی عادت پڑے اور رب راضی ہو۔ یہی وہ مضبوط دین ہے جس کی سب انبیاء تعلیم دیتے آئے ہیں اور یہی محمد رسول اللہ صلعم پیش کر رہے ہیں۔ بلکہ فیہا کتب قیمہ فرما کر بتلایا کہ تمام دنیا کے نبیوں کی تعلیم کو جامع اور مکمل شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ پس اس دین سے تفرقہ کرنے کی کوئی وجہ قابل قبول نہیں ہو سکتی

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ بیشک وہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا اور مشرک لوگ

فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ دوزخ کے آگ میں ہونگے اسی میں رہیں گے وہ بدترین مخلوق ہیں۔

یہاں وہ اہل کتاب اور مشرکین مراد ہیں جنہوں نے البینہ یعنی رسول کو نہ مانا اور انکار کیا۔ گویا شروع سورت میں لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین منفکین میں وہ اہل کتاب اور مشرکین مراد تھے جنہیں ان کے اعمال کفریہ اور شرک کی وجہ سے کافر کہا گیا تھا لیکن وہ البینہ یعنی رسول کے آجانے پر اس پر ایمان لا کر کفر اور شرک سے آزاد ہو گئے اور مومنین میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد وما تفرق الذین اوتوا الکتاب میں ان اہل

کتاب کا ذکر کیا جنہوں نے نہ مانا اور تفرقہ کیا۔ اب اس آیت میں انہی اہل کتاب کو جنہوں نے تفرقہ کیا اور محمد رسول اللہ صلعم کو نہ مانا اور تیز مشرکین کو جنہوں نے آپ کا انکار کیا عذاب دینے کا ذکر فرمایا۔ گویا پہلی جگہ آغاز سورت میں جو کفروا من اھل الکتاب فرمایا تھا۔ تو ان عقائد و اعمال کفریہ کی وجہ سے فرمایا تھا جو ان میں اسلام سے قبل پیدا ہو چکے تھے اس کفر سے نکالنے اور آزاد کرنے کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجا مگر اب جو کفروا من اھل الکتاب اس آیت میں فرمایا یہ اس بینہ یعنی رسول کے آنے کے بعد اس کی رسالت کا کفر ہے۔ پس چونکہ اب حجت تمام ہو چکی اس لئے یہ لوگ اب مستحق سزا ٹھہرے اور اسی لئے انہیں شر البریہ فرمایا یعنی بدترین مخلوق جو خدا کے رسول اور بینات کے آجانے پر بھی فائدہ نہ اٹھائے بلکہ کفر و شرک میں پہلے سے بھی زیادہ ترقی کرتا چلا جائے اس کے بدترین مخلوق ہونے میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یقیناً اپنے اعمال کی وجہ سے اسفل سافلین کو پہنچ چکا ہے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۙ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں

أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ وہ بہترین مخلوق ہیں۔

جیسا کہ سورۃ التین میں ذکر ہو چکا ہے کہ انسان احسن تقویم پر پیدا کیا گیا ہے اگر وہ ایمان نہ لائے اور اچھے عمل نہ کرے تو اسفل سافلین کو پہنچ جاتا ہے لیکن اگر ایمان اور اعمال صالحہ بجالائے تو اشرف المخلوقات ٹھہرتا ہے یہی یہاں فرمایا۔ کہ ایمان اور اعمال صالحہ کے حامل دنیا کی بہترین مخلوق ہیں۔ یہاں ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ اس سے قبل کی آیت الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین فی نار جھنم خلدین فیھا اولئک ھم شر البریۃ اور موجودہ آیت ان الذین امنوا وعملوا الصلحت اولئک ھم خیر البریۃ۔ دونوں ایک دوسرے کے متوازی ہیں ایک میں تو بینہ کے انکار کرنے والوں کا ذکر ہے جنہیں شر البریہ فرمایا اور دوسری میں بینہ پر ایمان لانے والوں کا ذکر ہے۔ انہیں خیر البریہ فرمایا پہلی آیت میں شر البریہ فرمانے سے قبل کفر کرنے والوں کی سزا کا ذکر فرمایا۔ لیکن دوسری آیت میں خیر البریہ فرمانے سے قبل ان کی جزا کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس کا ذکر بعد میں اگلی آیات میں کیا ہے یہاں یہ ضرور کیا ہے کہ اس آیت میں ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ ہی خیر البریہ فرما دیا۔ اس امتیاز کی وجہ یہ ہے کہ کافر کی سزا جب ظاہر ہوتی ہے تب پتہ لگتا ہے کہ وہ درحقیقت شر البریہ یعنی بدترین مخلوق ہے اس سے قبل اکثر اوقات پتہ نہیں لگتا مثلاً بہت سے شریف معزز افسر بددیانت ہوتے ہیں اور پتہ نہیں لگتا۔ البتہ جب بددیانتی کھلتی ہے اور سزا ملتی ہے تب ان کی شرافت اور عزت خاک میں مل کر ان کا بدترین مخلوق ہونا نظر آجاتا ہے پس کافر کے بدترین مخلوق ثابت ہونے کے لئے اس کے اعمال کے نتائج کا ظہور ضروری ہوتا ہے اس لئے ان کی سزا کا ذکر کر کے پھر شر البریہ فرمایا۔ مگر ایمان لانے والا اور نیک عمل کرنے والا مومن متقی اپنے اعمال سے ہی بہترین مخلوق نظر آنے لگتا ہے اس کے بہترین مخلوق ہونے کے ثبوت کے لئے کسی نتیجہ کے انتظار کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اس لئے ایمان اور

اعمال صالحہ کا ذکر کرتے ہی خیر البریہ فرما دیا۔ گویا ایمان اور عمل صالحہ والا انسان بجائے خود ایک بہترین مخلوق ہے خواہ اس کے ایمان اور اعمال کا کوئی نتیجہ ابھی نکلا ہے یا نہیں کیونکہ ایمان اور اعمال صالحہ بجائے خود ایسی چیزیں ہیں کہ اُن کو اختیار کرنے والا بہترین مخلوق بن جاتا ہے اس کا یہی نتیجہ بجائے خود کس قدر عظیم الشان ہے لیکن اتنا ہی نہیں جناب الٰہی کے حضور میں اس کی جزا بھی بڑی شاندار ہے فرماتے ہیں:-

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ ان کا بدلہ اُن کے رب کے ہاں ہمیشگی کے باغ ہیں جنکے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ اُنمیں رہیں گے۔

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے

ایمان کا تمثل باغ کی شکل میں اور اعمال صالحہ کا تمثل انہار کی شکل میں ہوگا جس طرح نہروں سے باغ سرسبز رہتا ہے اسی طرح اعمال صالحہ ایمان کو تازہ رکھتے ہیں ان سب کے ساتھ پھر ہمیشگی کی خوشخبری اس انعام کی تکمیل کرتی ہے آریوں کے مکتی خانے کی طرح نہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد پرمیشر کسی گناہ کے بدلہ میں جسے وہ شروع سے ہی مخفی رکھ لیتا ہے نکال باہر کرتا ہے جو عیش یا آرام فانی ہے وہ بے لطف اور ایک دھوکہ ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں کوئی راحت سچی راحت نہیں اور کوئی خوشی سچی خوشی نہیں جب تک وہ پائدار نہ ہو۔ پس اسی خوشخبری کی تکمیل یہاں ان نعماء کی ہمیشگی سے کی ہے جہنم کے متعلق تو صرف خالدین فیہا فرمایا تھا کہ وہ اس میں رہیں گے۔ وہاں ہمیشگی کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ اپنے اعمال کی سزا بھگت کر لوگ جہنم سے آخر کار نکل جائیں گے۔ لیکن جنت کی نسبت خالدین فیہا کے ساتھ ابدا کا لفظ بڑھایا۔ اور پھر اس لمبی مدت کو جنّٰتُ عدن فرما کر صاف کر دیا کہ وہ مدت ہمیشگی کے رنگ میں ہوگی اور یہ رب کی بخشش ہے کیونکہ جو بندہ اپنی تمام عمر اپنے عمل سے اپنے رب کو راضی رکھنے کی فکر میں رہا خواہ وہ شرعی احکام یعنی اوامر و نواہی تھے جن کی فرمانبرداری سے وہ اپنے رب کو راضی کرتا رہا یا تقدیری احکام دکھ اور سکھ تھے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر تقدیر کے رنگ میں نزول کرتے رہے اور وہ ان حالات میں اپنے رب کی تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اور اس کی تقدیر سے راضی رہ کر اپنے رب کی رضا کو ڈھونڈتا رہا تو ایسی صورت میں یہ عین انصاف ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو جائے اور بالمقابل اسے اپنے دائمی انعامات سے راضی فرمائے اور وہ ایک تو اس طرح ہوگا کہ دنیا میں جو بندہ نے احکام شرعی کی فرمانبرداری سے اپنے رب کو راضی رکھنے کی کوشش کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود رب اپنے بندہ سے راضی ہوگا اور ظاہر ہے کہ ایک بندہ کے لئے اپنے مالک کی رضا کو حاصل کر لینے سے بڑھ کر کوئی خوشی اور کامیابی نہیں ہو سکتی اور دوسرے اس طرح ہوگا کہ دنیا میں اپنے رب کی تقدیر سے جو ہر حالت میں بندہ راضی رہا تھا بلکہ اس کی رضا کے لئے وہ اپنی رضا اور تمناؤں کو قربان کرتا رہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ

اپنے اس بندہ کو راضی کرے گا۔ اس سے بڑھ کر انعام متصور نہیں ہو سکتا۔ وہ رب العالمین، مالک الملک، احکم الحاکمین جس بندہ سے راضی ہو جائے اور نہ صرف اسی قدر بلکہ وہ اپنے اس بندہ کو راضی کرنے کا سامان بھی کرے اس سے بڑھ کر غریب نوازی، بندہ نوازی، ذرہ نوازی ممکن ہی نہیں۔ بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست اور جو بندہ یا جماعت اس مقام کو حاصل کرے جیسے کہ صحابہ نے حاصل کیا اُن سے بڑھ کر خوش قسمت اور کوئی نہیں۔

ع ۸ ۲۳

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝ یہ اس کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔

ایمان کا نتیجہ خشیت اور خشیت کا نتیجہ عمل صالح ہے اور عمل صالح سے رب راضی ہوتا ہے رب کی خشیت یعنی خدا سے ڈر کا یہ مطلب نہیں جیسا کسی درندے کا ڈر ہوتا ہے کہ پھاڑ کھائے گا یا جابر حاکم کا ڈر ہوتا ہے کہ کیا کریں صاحب! حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ حکم نہ مانیں گے تو مار پڑے گی۔ نہیں۔ بلکہ خشیٰ ربہ فرما کر بتلایا کہ رب کا ڈر در حقیقت خدا کی ربوبیت کے منقطع ہو جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ انسان کے اپنے نفع اور ترقی و کمال کے منقطع ہو جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ گویا خدا سے ڈرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی اپنے بڑے مہربان اور شفیق مربی کے فیوض سے منقطع ہو جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ ہر ایک انسان نفع اور ترقی و کمال کا خواہاں ہوتا ہے اور جس شخص سے اسے یہ چیزیں میسر آتی ہیں اس کو خوش کرنے کی وہ ہمیشہ فکر میں رہتا ہے اور اس کی ناراضگی سے وہ ہمیشہ ڈرتا رہتا ہے مبادا کہ وہ ناراض ہو جائے اور وہ انعامات اور منافع منقطع ہو جائیں جس سے وہ بہرہ یاب تھا یا آئندہ مستفیض ہونے کی توقع تھی پس اسی کا نام خشیت ہے یہ خشیت ہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے رب کو راضی رکھنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اسی لئے فرمایا جو اپنے رب سے ڈرتا ہے وہ اسے راضی رکھنے کی فکر میں لگا رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ کہ اس کا رب اس سے راضی ہو جاتا ہے اور بالمقابل اپنے بندہ کو راضی کر دیتا ہے

نوٹ ۔ اس سورت کے شروع میں دنیا کی تمام قوموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک اہل کتاب دوسرے مشرکین۔ اہل کتاب وہ جو کسی الہامی کتاب رکھنے کے مدعی تھے۔ مشرکین وہ جن کے پاس کوئی الہامی کتاب موجود نہ تھی اگرچہ لکل امۃ رسول کے مطابق ہر قوم میں رسول آچکا تھا۔ لیکن بعض قوموں نے تو اپنی الہامی کتاب کو خواہ وہ محرف و مبدل ہی سہی باقی رکھا تھا اور الہامی کتاب کے مدعی تھے وہ تو اہل کتاب کہلائے اور دوسرے جن میں الہامی تعلیم ایسی مٹ چکی تھی کہ ہاتھ پلّے کچھ باقی نہ رہا تھا اور طرح طرح کے قومی رواج اور اوہام باطلہ اور شرک میں گرفتار ہو گئے تھے وہ مشرکین کہلائے یہ دونو اصطلاحیں قرآن کی ہیں۔ پس اس سورت کے ابتدا ہی میں سب سے پہلے یہ بتلایا کہ دنیا کو کیوں محمد رسول اللہ صلعم کی ضرورت تھی۔ فرمایا کہ دنیا میں اگر اہل کتاب تھے تو وہ بھی اور مشرکین تھے تو وہ بھی سب کے سب عقائد و اعمال کفریہ اور شرک میں اس طرح گرفتار ہو چکے تھے۔ کہ اس سے نکلنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی سوائے اس کے کہ خدا کا وہ عظیم الشان رسول آجاتا جو کل نبیوں کا موعود تھا اور قرآن جیسی جامع کتاب آجاتی یہ ایک حقیقت تھی جو جیسے اس وقت سچ تھی جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت ہوئی تھی ویسے ہی آج بھی سچ ہے دنیا کے کل مذاہب کو دیکھ لو۔ کوئی مذہب انسان کو سچی توحید اور صراط مستقیم پر قائم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان کی شکلیں خود مسخ ہو چکی ہیں۔ اور ان کی اصلی تعلیمیں خود مٹ چکی ہیں ایک اسلام ہی ہے

جس سے دنیا کی تمام قوموں کی نجات وابستہ ہے۔ بہت سے مذاہب تو ایسے ہیں جن کی شکلیں مسخ ہو کر کچھ کی کچھ بن گئی ہیں مثلاً ہندو مذہب، بدھ مذہب، عیسائی مذہب، مجوسیوں کا مذہب، سکھ مذہب یہ مذہب نہیں ہیں بلکہ شرک کے گھوارے ہیں۔ ان کے پجاری جتنا انہیں بناتے ہیں اتنا ہی ان کی شکلیں اور بگڑتی چلی جاتی ہیں۔ برہمو سماج یا دیو سماج کسی مذہب کا نام نہیں بلکہ لامذہبی کی مختلف شکلیں ہیں۔ رہ گیا یہودیوں کا مذہب وہ غریب اس قدر مختص القوم اور مختص الزمان اور مختص المکان اصول اپنے اندر رکھتا ہے کہ خود اس مذہب کے پیرو اب ان پر عامل نہیں رہ سکے اور یہ سب کے سب لوگ رفتہ رفتہ اسلام کے اصولوں کو اپنے اندر جذب کر رہے ہیں وجہ یہ کہ جس جس طرح مشکلات قومی و اقتصادی، تمدنی و معاشرتی پیش آتی جاتی ہیں ان کو اپنے اصول بدلنے پڑتے ہیں اور جس اصول کو اپنے نجات کے لئے ضروری سمجھ کر اپنے واسطے تجویز کرتے ہیں وہ اصول اسلام کا ہوتا ہے دیکھ لو دنیا مار کھا کر انہی اصولوں کی طرف آرہی ہے جن کے متعلق اس سورت میں فرمایا تھا کہ ان کے بغیر نجات نہیں مل سکتی اور جس کی خاطر البینہ یعنی محمد رسول اللہ صلعم اور قرآن کو بھیجا گیا تھا جس طرح آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل اس بینہ کی ضرورت تھی ویسے ہی آج بھی گمراہی میں گرفتار دنیا کے لئے اس کی ضرورت ہے اور اس کے بغیر شرک اور بداعمالیوں سے نجات ممکن نہیں جو اس کا انکار کرتا ہے وہ درحقیقت تمام نبیوں کی متفقہ تعلیم و ہدایات کا انکار کرتا ہے کیونکہ دنیا میں اب صرف اسلام ہی ہے جو تمام نبیوں کی حقیقی تعلیمات کا سچا اور جامع نمائندہ ہے باقی جو مذاہب ہیں ان میں نبیوں کی تعلیمات اپنی اصلی شکل میں نہیں رہیں اس لئے نجات حقیقی اب اسلام ہی میں ہے ولا غیرہٗ

سورۃ الزلزال مکیۃ	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	وھی ثمان اٰیات

سورۃ الزلزال کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا جس انقلاب عظیم کا ذکر پچھلی سورۃ البینہ میں کیا ہے جو رسول کی آمد سے وابستہ تھا وہ بغیر کسی زلزلہ کے نہیں آسکتا تھا جب تک ملک میں ہلا چلی اور جنگ و جدل اور طرح طرح کے مصائب کے زلزلے نہ آویں صدیوں کا جمود کس طرح دور ہو سکتا تھا اس سورۃ الزلزال میں اسی زلزلہ کا ذکر ہے کچھ شک نہیں کہ اس سے قیامت کا زلزلہ بھی مراد ہے لیکن جیسا کہ میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ نبی کے زمانہ میں قیامت کے انقلاب کا ایک نمونہ چھوٹے پیمانہ پر دکھایا جاتا ہے اور نیکوں کو نیک اور بدوں کو بد بدلہ اسی دنیا میں دے کر قیامت کے وجود پر دلیل قائم کی جاتی ہے پس اس زلزلہ کا ذکر بھی یہاں مدنظر ہے جو اسی دنیا میں محمد رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں ملک عرب پر اس زور اور قوت کے ساتھ آیا اور جو نتائج اس سے پیدا ہوئے وہ اس قدر شاندار تھے کہ گویا قیامت کبریٰ میں جو زلزلہ مقدر ہے اس کا نقشہ ایک حد تک آنکھوں کے سامنے کھینچ گیا۔ چنانچہ جو تشریحات اس زلزلہ کی یہاں بیان فرمائی ہیں وہ دونوں پر لگتی ہیں یعنی اس زلزلہ پر بھی جو محمد رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں ملک عرب پر آیا اور اس پر بھی جو قیامت کبریٰ میں مقدر ہے اس لئے میں یہاں دونوں زلزلوں پر انشاء اللہ ان علامات کو لگاؤں گا کہ

دکھاتا ہوں۔ وباللہ التوفیق:-

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ جب زمین ہلائی جائیگی اپنا ہلایا جانا { الارض۔ ملک عرب کی سرزمین۔ یا کل دنیا

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ اور زمین اپنے بوجھ یا دفینے یا خزانے باہر نکال پھینکے گی۔

اثقالھا کے معنے ہیں ما فی جوفھا او اسرارھا (رازی) یعنی جو اس کے اندر پیٹ میں تھا یا اسرار مخفی تھے۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ اور انسان (حیرت) سے بول اُٹھے گا اسے کیا ہو گیا۔

زلزالھا سے مراد ہے اس قدر زلازل کہ ان سے انسان کے قلب میں جنبش پیدا ہو اور یہی دراصل زلازل کا مقصد تھا قاعدہ ہے کہ جب تک مصائب اور مشکلات کے زلازل اس قدر تواتر سے نہ پڑیں کہ صدیوں کا جمود دور ہو سکے۔ اور سالہا سال کی مردگی میں حرکت پیدا ہو سکے۔ تب تک کسی زلزلہ کا کوئی فائدہ نہیں جس طرح نہایت غفلت کی نیند میں سوئے ہوئے آدمی کو جب تک بار بار جھنجھوڑا نہ جائے وہ جاگتا ہی نہیں اور بعض دفعہ جاگتا ہے تو پھر سو جاتا ہے اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے بار بار ہلایا اور جھنجھوڑا جائے اسی طرح غفلت اور جمود میں پڑی ہوئی قوم کو جب تک بار بار جھنجھوڑا اور ہلایا نہ جائے وہ جاگتی ہی نہیں اس کی مردگی میں جان ہی نہیں پڑتی۔ اسی قسم کے زلزلہ کے متعلق حضرت مجدد وقت مرزا غلام احمد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:-

الزلازل جنبشے دہ خطرتِ اغیار را ⁂ تا مگر آیند ترساں سوئے آں ایوانِ تو

گر زمین زیر و زبر گردد ندارم ہیچ غم ⁂ غم ہمیں دارم کہ کم گردد رہِ رخشانِ تو

چشمۂ رحمت روان کن در لباسِ زلزلہ ⁂ تا بکے سوزد بہ غم ایں بندۂ گریانِ تو

پس یہاں جب اس انقلاب عظیم کا ذکر فرمانے لگے جو اسلام نے دنیا میں آ کر پیدا کیا تو فرمایا کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ عرب کی زمین ہلائی جائے۔ ایسا ہلایا جائے تاکہ لوگوں کے دلوں میں جنبش پیدا ہو جائے اللہ اللہ رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہ طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہیں انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں بائیکاٹ کئے جاتے ہیں ایک وادی میں قید کر دیئے جاتے ہیں جلا وطن کئے جاتے ہیں۔ بعض بکریوں کی طرح ذبح کئے جاتے ہیں غرضکہ فتنہ اور مصیبت کی کوئی شکل نہیں جس میں وہ نہیں ڈالے جاتے۔ لیکن جناب الٰہی کا ارشاد ہوتا ہے کہ ابھی کیا ہے ابھی تو یہ زمین ایسی ہلائی جائے گی جو ہلائے جانے کا حق ہے چنانچہ بعد میں ہجرت اور جنگوں کی شکل میں ایسی قیامت خیز مصائب کا سامنا ہوا جس سے نہ صرف سارا ملک عرب ہل گیا بلکہ وہ قلوب بھی ہل گئے جو پتھر سے بھی زیادہ سخت تھے اور آخر کار حق کے آگے سر بسجود ہو گئے حیرت ہو جاتی ہے کہ آخر اس قدر زلازل اور ہلا چلی کی ضرورت کیا ہے فرماتے ہیں جب تک زلزلے نہ آئیں زمین اپنے خزانے نہیں اگلتی کیسی پتہ کی بات ارشاد فرمائی ہے آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد دنیا کے سائنس دان اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

کہ زمین میں جس قدر معدنیات کی کانیں ہیں اور بیش قیمت دفینے ہیں یہ سب زلزلوں کے ذریعہ سے زمین کے شکم میں سے باہر سطح پر آئے ہیں اور آتے ہیں اگر زلزلے نہ آویں تو دنیا ان تمام قیمتی معدنیات اور قسم قسم کی بیش قیمت دھاتوں اور کیمیائی اشیاء سے محروم ہو جائے اسی حقیقت کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے کہ جس طرح زلزلے نہ آویں تو زمین کے خزانے باہر نہیں نکل سکتے۔ اسی طرح مصائب اور فتن کے زلزلے نہ آویں تو قوم یا افراد کی فطرت کے مخفی خزانے کس طرح باہر نکلیں۔ یعنی ان کی باطنی استعدادیں کس طرح ظاہر ہوں اور نشوونما پائیں اور اخلاق فاضلہ کا ظہور کس طرح ہو۔ عرب کی قوم ایک مخفی خزانہ تھی وہ بظاہر اپنی وحشت و بربریت کی وجہ سے لوگوں کی نگاہ سے مخفی تھی دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ ایک خزانہ تھی جو وحشت و بربریت میں مدفون پڑا تھا۔ اسلام کے آنے پر ایسے ایسے زلازل اور ابتلاؤں میں سے اُسے گزرنا پڑا کہ اس کے مخفی جوہر پردۂ اخفا سے معرض ظہور میں آگئے۔ اگر صحابہ کرام طرح طرح کے مصائب اور زلازل میں نہ ڈالے جاتے تو ہم ان کے صبر و استقامت، شجاعت و بسالت جانی و مالی قربانیوں اور ایمان اور اخلاق فاضلہ کے بے نظیر نمونے کہاں سے دیکھتے۔ ہجرت نہ ہوتی۔ جنگیں نہ ہوتی تو یہ بے نظیر قربانیاں جو آج مسلمانوں کے لئے جائے فخر ہیں کہاں سے نظر آتیں۔ حضرت نبی کریم صلعم اور صحابہ کرام کی زندگیوں پر نظر ڈالو ہر مصیبت جو آتی ہے اور ہر ابتلا جو آکر پڑتا ہے اس پاک جماعت کے اخلاق فاضلہ اور اعلیٰ جوہر کو اس طرح چمکا کر دکھاتا ہے کہ آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں آنحضرت صلعم کی وفات پر اگر عرب میں ارتداد اور بغاوت کا زلزلہ نہ آتا تو حضرت ابوبکر کے کمالات کا نظارہ کس طرح نظر آتا۔ اگر ایران اور روم کی فوجیں مسلمانوں کو کچل ڈالنے کا تہیہ نہ کرتیں تو حضرت عمرؓ کی شان کس طرح نظر آتی۔ اگر ایران اور روم کی لاتعداد فوجیں مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کو فنا کرنے کے لئے ہر طرف سے حملہ آور نہ ہوتیں تو حضرت خالد کے کارناموں کے گیت کون گاتا۔ اگر ساری مسیحی دنیا اور یورپ بیت المقدس کو فتح کرنے کے لئے نہ چڑھ کر آتا تو سلطان صلاح الدین کو کون جانتا۔ اگر روس سلطنت ٹرکی کو پامال کرنے کا سامان نہ کرتا تو غازی پاشا اور عثمان پاشا کو کون یاد کرتا اگر ٹرکی پر زلزلوں کا انتہائی حملہ نہ ہوتا تو انور پاشا اور مصطفےٰ کمال پاشا کی عزت کہاں سے ہوتی۔ اسی طرح اگر اسلام پر عیسائیت اور آریہ سماج اور دہریت اور تمام مذاہب باطلہ کا حملہ نہ ہوتا تو حضرت مرزا غلام احمد علیہ الرحمۃ کے مجدد اعظم ہونے کی شان کہاں سے نظر آتی اور حضرت مولانا نورالدین مرحوم، مولانا محمد علی صاحب اور خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم کو کون جانتا۔ پس یہ زلزلے ہی ہوتے ہیں جن سے انسان کے اندر کے مخفی خزانے ظاہر ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا نورالدین مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ جب تک کسی آیت پر اعتراض کا زلزلہ نہ آوے اس کے اندر کے مخفی معارف و حقائق کے خزانے باہر نہیں آتے الغرض یہاں فرمایا کہ وہ انقلاب جو اسلام اس سرزمین پر لانے والا ہے وہ ایک بڑے عظیم الشان زلزلہ کو چاہتا ہے تاکہ اس قوم کی مخفی استعدادیں اور جوہر باہر نکل آویں اور یہ مردے جو کفر اور ضلالت کی زمین میں مدفون ہیں باہر نکل پڑیں اور اس وقت یہ نظارہ ایسا عجیب اور شاندار نظر آئے گا کہ انسان حیرت سے کہہ اٹھے گا کہ اس زمین کو کیا ہو گیا دیکھ لو وہی وحشت اور بربریت اور شرک اور گمراہی کی تاریک سرزمین یکایک تہذیب اور تقویٰ توحید اور ہدایت کے نور سے معمور ہو جاتی ہے اور صدیوں کے مردے زندہ ہو کر علم اور ہدایت، تہذیب اور حقیقی زندگی کا علم ہاتھ میں لے کر باہر نکل پڑتے ہیں اور دنیا کو معرفت و حکمت کی دولت سے مالا مال کر دیتے ہیں چنانچہ شہنشاہ ایران مسلمانوں کے سفیروں کے سامنے جو تقریر کرتا ہے

اس کا خلاصہ فردوسی نے کیسے خوبصورت لفظوں میں بیان کیا ہے کس حیرت سے وہ کہتا ہے ؎

زشیر شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسید است کار

کہ تاج کیاں را کند آرزو تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

یعنی اونٹ کا دودھ پینے والے گوہ کھانے والے عربوں کو اب یہاں تک جرأت ہوگئی ہے کہ ایران کے کیانی تاج و سلطنت کی وہ آرزو کرتے ہیں اے آسمان تجھ پر تف ہے" یہ قال الانسان مالھا کی بہترین تفسیر تھی جو اس کی زبان سے نکلی اور وہ کیا۔ یورپین عیسائی مورخین کو ماننا پڑا ہے کہ جو انقلاب عظیم قرآن نے چند سالوں میں عرب میں پیدا کر کے دکھا دیا وہ دنیا کی تاریخ میں بے نظیر اور ہر ایک عقلمند انسان کی آنکھوں میں حیرت انگیز ہے اسی کو حالی مرحوم اپنی مسدس میں اس طرح باندھتے ہیں ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی ❊ عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

نئی ایک لگن سب کے دل میں لگا دی ❊ ایک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے !

کہ گونج اٹھے دشت و جبل نام حق سے

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ اس دن زمین اپنی خبریں خود بیان کرے گی۔

تحدث زبان حال سے بیان کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ یہ ابو مسلم کا قول ہے جو تفسیر کبیر میں موجود ہے۔

بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝ اس لئے کہ تیرے رب نے اس کے فائدہ کے لئے وحی کی تھی۔

یہاں لھا میں ل انتفاع کے لئے ہے یعنی زمین کے فائدہ کے لئے خدا نے قرآن کی وحی کی تھی فرماتے ہیں جو قرآن کے ذریعہ سے انقلاب آنے والا ہے۔ وہ نہ صرف ایک عالم کو حیرت میں ڈال دے گا بلکہ قرآن کے خادموں کی ترقی و کمال اور علم و تہذیب کے آثار سے زمین اس طرح معمور ہو جائے گی کہ زمین کا چپہ چپہ گویا منہ سے بول اٹھے گا کہ واقعی قرآن کی وحی جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھی وہ دنیا کے لئے کس قدر مفید تھی عرب اور عراق، روم و شام، مصر و اسپین مراکش و الجیریا، ایران اور ہندوستان غرضکہ جہاں بھی اسلام کا نور پہنچا وہاں آج بھی اس اعلیٰ تہذیب و تمدن اور سیاست اور کلچر کے آثار زبانِ حال سے بول رہے ہیں۔ کہ قرآن کی وحی نے دنیا کو کس قدر نفع پہنچایا۔ حالی کی نصف مسدس گویا اسی تحدث اخبارھا کی تشریح ہے جس میں سے ایک دو بند غرض کرتا ہوں ؎

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے ❊ مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے

مجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے ❊ وہ اجڑا ہوا کوئی فرجا کے دیکھے

جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا

کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

پھر یہیں تک بس نہیں بلکہ یورپ کی آج جس قدر ترقیات ہیں کیا یہ صحیح نہیں کہ اس کی بنیادیں اسی اسلامی تہذیب اور علم پر کھڑی کی گئی ہیں جو اسپین اور فلسطین کی وساطت سے یورپ میں پہنچا اسی کو حالی نے کہا ہے ؎

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

گستالی بان مشہور فرانسیسی محقق کی کتاب تمدن عرب پڑھو اس نے دکھایا ہے کہ دنیا کی آج تمام ترقیاتِ علم و تہذیب اسی علم و تہذیب پر مبنی ہے جو مسلمان عربوں کے ذریعہ سے یورپ میں پہنچی۔ پھر کیا زمین کا ذرہ ذرہ اس امر پر رطب اللسان نہیں ہے کہ قرآن کی وحی نے دنیا کو کس قدر نفع پہنچایا اور جو زلزلہ اس وقت ملک عرب پر آیا تھا اُس نے کس قدر عظیم الشان انقلاب دنیا میں پیدا کیا جس کا نفع قیامت تک بھی منقطع ہونے والا نہیں۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا ۙ اس دن لوگ الگ الگ ہو کر یا مختلف حالتوں میں نکلیں گے۔

لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ○ تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ○ تو جو کوئی ایک ذرہ کے برابر بھی نیکی کرتا ہے اسے دیکھ لیگا۔

وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ○ اور جو کوئی ایک ذرہ کے برابر بھی بدی کرتا ہے اُسے دیکھ لے گا۔ ع ۱ ۸ ۲۴

اعمالھم۔ وہ عمل جو انہوں نے کئے یا وہ عمل جو انہوں نے کرنے ہیں جیسا کہ فجورھا و تقوٰھا میں نفس کے فجور اور نفس کے تقویٰ سے مراد وہ فجور اور تقویٰ ہے جو آئندہ اس نفس سے سرزد ہونے والے تھے۔

فرمایا جب وہ انقلاب عظیم وقوع میں آجائے گا تو اعمال کا نتیجہ بھی نظر آجائے گا اور ان نتائج اعمال کو دیکھنے کے لئے جو لوگ اپنی اپنی جگہ سے نکل پڑیں گے اور جمع ہوں گے ان کی حالتیں مختلف اور الگ الگ ہوں گی ان حالتوں کو حضرت مجدد وقت نے ایک شعر میں کیا خوب بیان کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

پیشگوئی کا جب انجام ہویدا ہوگا ٭ کوئی پا جائے گا عزت کوئی رسوا ہوگا۔

چنانچہ جب مکہ فتح ہوتا ہے اور اس انقلاب عظیم کا پہلا نتیجہ نکلتا ہے تو ایک طرف وہ ظالم کفارِ مکہ ہیں جو نہایت ذلت اور مغلوبیت کی حالت میں کھڑے ہیں اور دوسری طرف مظلوم صحابہ کی قوم کھڑی ہے جو آج عزت اور غلبہ کی وارث ہے جنہوں نے نیکی کو اختیار کیا تھا آج وہ بھی اس کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں۔ اور جنہوں نے بدی کو اپنا شعار بنایا تھا آج وہ بھی اس کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں نیکی اور بدی کی اس جنگ میں جس نے جتنا بھی حصہ لیا آخر اسی کے مقدار کے مطابق نتائج بھی

ویسے ہی بھگتے۔ دنیا میں نیکی و بدی کے نتائج کا یہ نقشہ اس بات پہ دلیل ہے کہ نتائج اعمال برحق ہیں اور آخر کار ایک دن آئیگا جب اعمال پوری طرح اپنے نتائج ظاہر کریں گے۔ اور چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی اپنا نتیجہ ظاہر کرے گا کسی نے ایک ذرہ کے برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ بھی اپنا نتیجہ ظاہر کر دے گی اور کسی نے ایک ذرہ کے برابر بھی بدی کی ہوگی وہ بھی اپنا نتیجہ ظاہر کر دیگی۔ وہ دن بھی ایک بہت بڑے قیامت کے زلزلے کے بعد ظاہر ہوگا جس سے تمام زمین تہ و بالا ہو کر ایک نئے عالم کی بنیاد پڑے گی۔ اور اس زمین اور عالم کے دفینے اور مخفی طاقتیں اور اسرار ظاہر ہو کر ایسا انقلاب رونما ہوگا۔ کہ انسان اس وقت حیرت سے کہے گا۔ کہ اس زمین کو کیا ہو گیا۔ گویا جن عجائبات کا ظہور اس وقت ہو گا وہ اس قدر محیر العقول ہو گا کہ انسان کی تعجب کی انتہا نہ رہے گی اس دن یہ زمین جو کچھ اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے اُسے بیان کر دے گی خدا کی شان ہے آج نئی تحقیقات ہمیں وہی بتاتی ہے۔ جو آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے قرآن نے کہا تھا اور وہ یہ کہ انسان کا کوئی قول اور فعل ضائع نہیں جاتا۔ بلکہ وہ فضائے کائنات میں محفوظ ہوتا چلا جاتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح آج ہم آوازوں کو گراموفون کے ریکارڈوں کے ذریعہ محفوظ کر لیتے ہیں اور انسان کی حرکتوں اور افعال کو سینما کے فلم میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ سائنسدان اس کوشش میں ہیں کہ صحیفۂ فطرت کے ان ریکارڈوں کو پڑھ لیں وہ کہتے ہیں کہ اگر اس میں کامیابی ہو گئی تو دنیا کی تاریخ میں ایک انقلاب عظیم آجائے گا اور مؤرخین کا جھوٹ سچ سب کھل جائے گا اور تاریخ کا ہر ایک کیرکٹر بولتا اور عمل کرتا نظر آجائے گا۔ اُپسن مرحوم نے جو ایک انگریز نومسلم تھا اور مسلم آؤٹ لک اور لائٹ کا ایڈیٹر بھی رہ چکا ہے اس مسئلہ پر کیا خوب نکتہ لکھا تھا کہ جس روز صحیفہ فطرت کے ریکارڈ پڑھے جائیں گے اس روز عیسائیت کا خاتمہ ہے۔ کیونکہ مسیح کی خدائی کی کہانیوں اور آسمان پر زندہ چڑھنے کے افسانہ کا پول اُس دن کھل جائے گا اور تثلیث اور کفارہ اپنا بستر گول کر کے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے خیر تو جناب الٰہی یہاں فرماتے ہیں کہ جب قیامت کا انقلاب عظیم واقع ہو گا تو اس دن کے زلزلوں اور ہلاچلی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس عالم کے اسرار اور مخفی قوتوں کے ظاہر ہو جانے سے ایک حیرت انگیز تبدیلی کائنات پر آجائے گی۔ جس سے انسان حیران رہ جائے گا اس روز اس عالم کے وہ ریکارڈ جو صحیفۂ فطرت میں محفوظ ہیں سنے اور دیکھے جائیں گے اور حکم الٰہی کے ساؤنڈ بکس کے ماتحت یہ ریکارڈ بولے گا اور اعمال کے فلم کا نظارہ نظر آئے گا اس وقت پتہ لگے گا کہ قرآن کی وحی کس قدر مفید تھی جس نے اس دن کے لئے انسان کو خبردار کرنا چاہا تھا اور اس صراط مستقیم پر چلانا چاہا تھا جس پر چل کر اس افشائے راز کے دن شرمندگی نہ اٹھانی پڑے اس دن لوگ جمع ہوں گے تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ لیکن حالتیں مختلف ہوں گی جنہوں نے نیکیاں کی ہیں۔ ان کے لئے وہ خوشی کا دن ہو گا وہ اس فلم کے ہیرو ہوں گے لیکن جنہوں نے بدیاں کی ہیں یا جن کے دل میں چور ہو گا وہ پریشان اور حیران ہوں گے کیونکہ ان کے پوشیدہ اعمال جنہیں وہ ساری دنیا سے مخفی رکھا کرتے تھے اس دن سامنے برملا نظر آئیں گے ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر رسوائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ بڑے بڑے مہذب اور بظاہر شریف لوگوں کی اندرونی خیانتوں اور گندگیوں کا اظہار اس دن نتائج کے پردہ پر ہو گا۔ ان کے اپنے اعمال انہیں دکھائے جائیں گے۔ وہ اگر نیکیاں

کر چکے ہیں تو اسی طرح نیکیاں کرتے نظر آئیں گے۔ بدیاں کی تھیں تو اسی طرح بدیاں کرتے نظر آئینگے اور ذرہ کے برابر بھی نیکی کی ہوگی۔ تو وہ بھی نظر آجائے گی۔ اور ذرہ کے برابر بدی کی ہوگی تو وہ بھی نظر آجائیگی۔ کیونکہ یہ سب محفوظ تھا۔ بدمعاش سے بدمعاش انسان کی ضمیر بھی اس بات کو برداشت نہیں کرسکتی کہ اس کی بدمعاشیوں کا نقشہ خود اسے بھی دکھایا جاوے پس کس قدر نازک اور خطرناک وہ گھڑی ہوگی جس وقت یہ نظارہ لوگوں کو دکھایا جائے گا۔ اگر اس گھڑی پر ایمان ہو تو پھر انسان بدی نہیں کرسکتا۔

یہاں یہ اعتراض صحیح نہیں کہ جب سارے اعمال ہی نظر آجائیں گے تو پھر توبہ و استغفار کا کیا فائدہ ہوا میں کہتا ہوں توبہ و استغفار بجائے خود ایک خیر اور نیکی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان گناہوں کو جس سے استغفار اور توبہ کی گئی ہے معاف کردے اور انہیں اپنی مغفرت کے نیچے ڈھانپ لے پس اگر وہ توبہ قبول اور استغفار مستجاب ہوگی تو ضرور ہے کہ وہ بھی اعمال کے فلم پر نظر آوے اور اعمالِ بد اور استغفار کا تعلق باہمی اسی طرح نظر آسکتا ہے کہ ایسے اعمالِ بد جو معاف ہو چکے ہیں مغفرت کی چادر میں ڈھنپے ہوئے نظر آئیں اور انسان ان کے افشا کی رسوائی سے بچ جاوے اور اُسے صرف وہی جانے گا جس سے اس کا ارتکاب ہوا تھا یا وہ جانتا ہوگا جس نے مغفرت اور عفو کی چادر میں اسے ڈھانپ لیا ہے اور اس میں غفاری و ستاری کی وہ شان نظر آئے گی کہ بندہ اپنے رب کی اس غریب نوازی اور کرم گستری پر جس قدر بھی شکر کرے اور جبین نیاز کو اس کے آستانہ پر رگڑے کم ہے۔

اگر اعمال کو دیکھنے سے مراد ان کے نتائج ظاہر ہونے کو لیا جائے تب بھی ٹھیک ہے ہر ایک عمل اپنا نتیجہ ضرور رکھے گا۔ بڑا عمل اگر بڑے نتائج کو پیدا کرے گا تو چھوٹے عمل چھوٹے نتائج کو یعنی کوئی عمل بغیر نتیجہ کے نہیں رہ سکتا۔ البتہ وہ بدی جو مغفرت کے نیچے آچکی اور توبہ کے پانی سے دھوئی جاچکی اس کا نتیجہ عفو اور مغفرت کی شکل میں ہی ظاہر ہوسکتا ہے۔ کیونکہ مغفرت کے معنے ہی یہ ہیں کہ بدی کے بدنتائج سے حفاظت اور آئندہ بدی میں مبتلا ہونے سے حفاظت۔

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | وَهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۃ العادیات کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ پچھلی سورت الزلزال میں ایک انقلاب عظیم کی پیشگوئی فرمائی تھی اس سورت العادیات میں یہ بتلایا ہے کہ وہ انقلاب منحصر ہے تمہاری جدوجہد پر۔ جب تک ایک قوم اپنی جدوجہد کو کمال پر نہیں پہنچا دیتی دنیا میں عظیم الشان محیر العقول انقلابات ظہور پذیر نہیں ہوا کرتے اس جدوجہد پر گھوڑے کی جدوجہد کو بطور نظیر اور گواہ کے پیش کرکے انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے غیرت دلائی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝ گواہ ہیں (گھوڑے) ہانپتے ہوئے دوڑنے والے۔

فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۝ پھر گواہ ہیں (سم) مار کر آگ نکالنے والے۔

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝ پھر گاہ ہیں صبح ہوتے ہوتے دشمنوں پر چھاپا جا مارنے والے۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝ پھر وہ اس کے ساتھ گرد بلند کرتے ہیں۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝ پھر وہ اس کے ساتھ دشمن کی جماعت میں جا گھستے ہیں۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ بیشک انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

عربوں کے لئے گھوڑے کی جدوجہد سے بڑھ کر اور کوئی مثال موثر نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ عرب میں گھوڑا بہت محبوب تھا اور وہ تھا بھی قابل محبت۔ کیونکہ عرب کے گھوڑے کی اپنے مالک کے ساتھ وفاداری اور فرمانبرداری اور جدوجہد مشہور ہے اور جو مثال یہاں پیش کی ہے وہ عربوں کے تو روز پیش نظر تھی۔ لیکن آج ہماری آنکھوں میں بھی اس نقشہ سے جو یہاں پیش ہوا ہے بہتر نقشہ فرمانبرداری اور وفاداری کا متصور نہیں ہوسکتا۔ یہاں سمجھانا یہ مقصود ہے کہ اگر تم اپنے گھوڑے کو دیکھو کہ وہ اپنے مالک کے حکم کی جو اس کی ادنیٰ ربوبیت کرتا ہے یعنی کھلاتا پلاتا پرورش کرتا ہے کس طرح فرمانبرداری کرتا ہے وہ کس طرح مالک کے اشاروں پر دوڑتا ہے اس کی باگ اس کے مالک کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ اسے جدھر چاہے لے جائے جتنا چاہے تیز چلائے لیکن اس کی فرمانبرداری اور وفاداری ایسی کامل ہوتی ہے کہ اُسے اپنے مالک کے حکم اور اشاروں پر چل پڑنے اور دوڑنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔ (۱) جب مالک اس سے کام لینا چاہتا ہے تو وہ اس کے حکم اور اشارہ پر دوڑتا ہے اور نہ صرف دوڑتا ہے بلکہ ہانپتا ہوا بھی دوڑتا ہے۔ ہانپنا دراصل فطرت کی طرف سے اس خطرہ کا اعلان ہوتا ہے کہ جدوجہد اور سعی کی مقدار اب اس قدر بڑھ گئی ہے کہ دل اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ اور اگر کچھ عرصہ اور یہی دوڑ دھوپ جاری رہی تو دل فیل ہوکر موت واقع ہوجائے گی۔ چنانچہ بہت سے لوگ یا جانور دوڑتے دوڑتے گرے ہیں اور مرگئے ہیں۔ لیکن گھوڑا مالک کے اشارہ کے ماتحت ہانپتا ہوا بھی دوڑتا چلا جاتا ہے۔ ہانپنے سے اس کے اعضا اور قویٰ ہلاکت کے خطرہ کا اعلان کررہے ہیں مگر اس کی وفاداری اور فرمانبرداری کی شان یہی ہے کہ وہ اپنی موت کی بھی پروا نہیں کرتا اور مالک کے حکم کے ماتحت اپنی جدوجہد کو جاری رکھتا ہے یہ تو ہوا اندازہ جدوجہد کی سرگرمی کا۔ (۲) اب رستہ کی کیفیت کا اندازہ کیجئے اس دوڑ دھوپ میں اگر راستہ آسان اور نرم ہو جس میں کوئی تکلیف نہ ہو تب بھی ایک بات ہے لیکن گھوڑے کو اس کا مالک ایک سخت اور پتھریلے راستہ پر ڈال دیتا ہے اور پتھر بھی ایسے سنگ خارا کہ پاؤں کو توڑ ڈالتے ہیں اور ٹاپ پڑتی ہے تو چنگاریاں نکلتی ہیں لیکن وہ گھوڑا یہاں بھی مالک کے حکم سے سرتابی نہیں کرتا بلکہ اس رستہ پر فوراً پڑ لیتا ہے اور اپنی جدوجہد کو اس شان سے جاری رکھتا اور اس رستہ کو اس طرح پامال کرتا ہے کہ اس کا جہاں سم بھی پڑتا ہے۔ اس

قوت اور زور سے پڑتا ہے کہ چنگاریاں نکلتی ہیں (۳) جدوجہد کی سرگرمی اور رستہ کی مشکلات کا تو اندازہ ہو چکا۔ اب وقت کی مشکلات کا اندازہ کیجئے۔ دنیا میں دن کام کے لئے اور رات آرام کے لئے بنی ہے دن بھر کتنا ہی کام کیا جائے تھکا ماندہ انسان یا جانور رات کو اپنے تھان پر آرام کرے اور سو رہے تو دوسرے دن کی جدوجہد کے لئے تازہ دم ہو جاتا ہے لیکن گھوڑے کا کیا حال ہے فرماتے ہیں مالک کو اگر ضرورت ہے کہ رات کو جو آرام کا وقت ہے اس سے کام لے کیونکہ رات بھر کی دوڑ کے بعد صبح ہی صبح اس نے غنیم کی فوج پر چھاپا مارنا ہے تو اس وقت گھوڑا اس امر کی قطعاً پروا نہیں کرتا کہ یہ کیا بے وقت کی دوڑ دھوپ ہے وہ اپنے مالک کے حکم کے آگے نہ دن دیکھتا ہے نہ رات اپنے آرام اور نیند کو پرے پھینک کر مالک کے اشارے پر چل پڑتا ہے۔ اور سنگلاخ اور پتھریلے مشکلات سے بھرے راستہ پر دوڑتا ہے اور ہانپتا ہوا جان کو خطرہ میں ڈال کر دوڑتا ہے۔ اور تمام رات بغیر کسی آرام کے دوڑتا ہوا صبح ہوتے ہوتے منزل مقصود پر پہنچ کر غنیم پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ فرماتے جایئے۔ تین مشکلات کا ذکر ہو چکا (۱) جدوجہد کو جاری رکھنے میں ناقابل برداشت مشقت اور مشکلات جس میں جان تک کا خطرہ ہے (۲) رستہ کی مشکلات (۳) وقت کی مشکلات۔ یہاں دکھایا ہے کہ گھوڑا اپنے مالک کے حکم کے آگے تینوں قسم کی مشکلات کی کوئی پروا نہیں کرتا اور حکم کی فرمانبرداری کو سب پر مقدم رکھتا ہے اس قسم کی جدوجہد کے وقت دو اور چیزیں روک ہوتی ہیں۔ ایک تو پیچھے کی فکر دوسرا آگے کا اندیشہ۔ یعنی پیچھے کیا چھوڑ چلا ہوں اور آگے جا کر کس چیز سے سابقہ پڑنا ہے سو یہاں بتایا کہ اس معاملہ میں گھوڑے کی جرأت اور دلیری قابل تقلید ہے (۱) وہ مالک کے حکم کے آگے چلتا ہے اور قطعاً پیچھے کا اس کو کوئی فکر نہیں۔ اس کے پیچھے اگر کچھ نظر آتا ہے تو اس کی دوڑ دھوپ سے جو غبار بلند ہوتا ہے وہی نظر آتا ہے جو زبان حال سے اس کی جدوجہد کے کمال کا اظہار کر رہا ہوتا ہے باقی کچھ بھی نہیں گھوڑے کو مالک کے حکم کی فرمانبرداری سے غرض ہے پیچھے کیا ہوگا اس کی کوئی فکر نہیں (۲) اسی طرح آگے کیا پیش آئے گا اس کی بھی اُسے مطلق پروا نہیں ساری رات ہانپ ہانپ کر دوڑنے کے بعد رستہ کے پتھروں سے چنگاریاں نکالنے کے بعد راتوں رات فاصلہ طے کرنے کے بعد صبح کوئی آرام کی منزل نصیب نہیں کوئی کھانا دانہ تازہ دم کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ سامنے غنیم کا لشکر کھڑا ہے حملہ کرنا اور اس کے اندر گھسنا گویا موت کے منہ میں داخل ہونا ہے گھوڑے کو اپنے مالک کے حکم کے آگے اس امر سے بھی ذرا تامل نہیں وہ اپنے مالک کے حکم کی فرمانبرداری میں دشمنوں کے اندر موت کے منہ میں گھس جاتا ہے اور ذرا پروا نہیں کرتا یہ ہے انتہا فرمانبرداری اور وفاداری کی! میں ذہن نشین کرنے کے لئے مختصر طور پر پھر دہرا دیتا ہوں کسی جدوجہد کے لئے پانچ قسم کی مشکلات ہوتی ہیں (۱) ایک تو خود اس جدوجہد کا اپنی بساط اور وسعت سے زیادہ نظر آنا اور اس لئے اس میں ہلاکت یا نقصان کا اندیشہ (۲) جس راہ سے وہ کام کرنا ہے اس میں مشکلات کا نظر آنا (۳) وقت کی مشکلات۔ یعنی وقت کا اس کام کے لئے موزوں نظر نہ آنا اور اس وجہ سے اس میں مشکلات کا پیدا ہونا (۴) پیچھے کی فکر کہ آخر ہمارے پیچھے کیا ہوگا ہمارے ورثہ وغیرہ کی کون خبر لے گا (۵) آگے کا اندیشہ یعنی اس ساری جدوجہد کے بعد جس منزل مقصود کو حاصل کرنا ہے اس میں اپنا کوئی آرام اور فائدہ نظر نہ آنا۔ بلکہ منزل مقصود کا بجائے خود مشکلات اور مصائب

میں گھرا ہُوا بلکہ موت کا مترادف نظر آنا یہ پانچ مشکلات ہیں جو انسان کی ہمت کو توڑ دیتی اور جدوجہد کو ختم کر دیتی ہیں لیکن یہاں گھوڑے کی نظیر پیش کر کے فرماتے ہیں کہ اُسے اپنے مالک کے حکم کے آگے ان پانچوں مشکلات کی پروا نہیں ہوتی اپنے مالک کی فرمانبرداری اس کا دین و ایمان ہے۔ وہ ہانپتا ہُوا جان پر کھیلتا ہُوا بھی دوڑتا ہے اس کے اعضا اور قویٰ ہانپنے سے اس کے جان کے خطرہ کا اعلان کرتے رہتے ہیں مگر وہ ذرا بھر بھی پروا نہیں کرتا۔ رستہ کی مشکلات اس کی سرگرمی کو اور تیز کر دیتی ہیں وہ اس قوت کے ساتھ انہیں پامال کرتا ہے کہ اس کی ٹاپوں سے چنگاریاں نکلتی ہیں وہ وقت کی مشکلات کی قطعاً پروا نہیں کرتا وہ اپنے تمام آرام و آسائش کو پرے پھینک کر رات کی تاریکی میں دوڑتا اور صبح ہوتے ہوتے مقام مقصود کو حاصل کر لیتا ہے اس نے اس طرح اپنے آپ کو مالک کی ربوبیت کے نیچے رکھا ہُوا ہے کہ مالک کے حکم کے آگے کسی جہاد پر چلتا ہے۔ تو پیچھے کی کوئی فکر نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ قدرت خود اس کی جدوجہد کے نشان کو گرد کی شکل میں بلند کرتی اور دکھاتی ہے اسے آگے منزل مقصود کی قطعاً کوئی پروا نہیں کہ وہاں آرام ملے گا یا کوئی نفع حاصل ہو گا بلکہ وہاں پہنچ کر اگر غنیم کی فوج ہیں یا دوسرے لفظوں میں موت کے منہ میں گھس جانے کا حکم ملتا ہے تو وہ خوشی خوشی اس کی تعمیل کرتا ہے۔ فرمایا گھوڑے کی تو یہ فرمانبرداری اور وفاداری اور اپنے پالنے والے کی یہ شکرگذاری اور اس کے بالمقابل انسان کی یہ ناشکری کہ وہ اپنے رب کے لئے ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت جو انسان کے ساتھ ہے وہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے جو انسان کی اپنے گھوڑے کے ساتھ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک معمولی ادنیٰ اور ناقص ربوبیت ہے۔ اور خدا کی ربوبیت ایک کامل ربوبیت ہے کہ انسان کی ایک ایک چیز اور اس کا ایک ایک ذرہ ہر آن اس کی ربوبیت کا محتاج ہے۔ لیکن انسان کا ناشکرا پن ملاحظہ ہو کہ اس کا رب جب کسی جدوجہد کا حکم دیتا ہے تو (۱) وہ سب سے پہلے تو اپنے نفس کی خیر مناتا ہے اور چیخنا چلانا شروع کر دیتا ہے کہ ہائے ہائے یہ کام میری بساط سے بڑھ کر ہے اس میں مجھے فلاں فلاں نقصان کا اندیشہ ہے آخر جان تو نہیں دے دینی (۲) پھر خیر اگر اس کے لئے تیار ہُوا تو رستہ کی مشکلات کی وجہ سے ہمت ہار دی کوئی مشکل یا سختی نظر آئی اور یہ حضرت بیٹھ گئے کہ صاحب ہم نے اس رستہ پر چل کر اپنے پاؤں نہیں توڑوانے (۳) اور کچھ نہیں تو وقت کا رونا لیکر بیٹھ گئے کہ صاحب اس کام کا یہ وقت نہیں آخر مصلحت وقت بھی تو کوئی چیز ہے ہمیں فرصت ہی نہیں ہوتی کہ ادھر توجہ دیں۔ ہمیں دوسرے کاموں میں اس قدر مصروفیت ہے کہ تھک جاتے ہیں آخر آرام کی بھی تو انسان کو ضرورت ہے مطلب یہ کہ وہ کام کوئی نہیں کرتا جس سے آرام میں خلل پڑے (۴) پھر یہ بھی رونا لیکر بیٹھ گئے کہ صاحب کیا کریں بال بچے دار آدمی ہیں ہم اس کام میں لگ جائیں تو اہل و عیال کو پیچھے کون سنبھالے گا کھیتی باڑی کو کون دیکھے گا۔ دوکان پر کون بیٹھے گا وغیرہ وغیرہ (۵) پھر یہ بھی پہلے سے شرطیں منوانے لگتے ہیں کہ اس کام میں اگر کامیابی ہوئی تو ہمیں کیا نفع ہو گا کوئی نمبرداری، مال، شہرت، حکومت میں حصہ ملے گا یا نہیں۔ اگر ہم مر گئے تو کامیابی کا ہمیں کیا فائدہ ہو گا غرضکہ خوئے بدرا بہانہ بسیار۔ مگر دنیا میں کوئی انقلاب نہیں ظہور پذیر ہو سکتا۔ جب تک انسان جدوجہد کا سبق گھوڑے سے نہ لے۔ چاہیئے کہ اس کی باگ اپنے مالک رب العالمین کے ہاتھ ہو اور جب بھی اپنے مالک کے اشارے پر اس کی جدوجہد

کا آغاز ہو تو اس شان سے ہو کہ (۱) اس جدوجہد سے اگرچہ اس کا نفس گھبراتا ہو اور بار بار اسے ہلاکت اور نقصان کا خطرہ بھی پیش کرتا ہو بلکہ اس کے اعزا اور اقربا بھی اسے خیر خواہی کے رنگ میں سمجھاتے ہوں کہ کیوں مفت اپنی جان و مال اور عزت خطرہ میں ڈال رکھی ہے لیکن وہ اپنے مالک کے حکم کے آگے کسی ایسے خطرہ اور نصیحت اور وسوسہ کی پروا نہ کرے اور باوجود طرح طرح کے خطروں اور اندیشوں کے اپنی جدوجہد کو جاری رکھے (۲) پھر جس رستہ پر اس کا مالک ڈال دے اس میں سختیاں اور مشکلات اگر پیش آویں تو قطعاً ان کی اسے پروا نہ ہو بلکہ رستہ کی مشکلات اس کی جدوجہد کی سرگرمی کو اور تیز کر دینے والی ہوں اور وہ اس قوت اور زور کے ساتھ ان مشکلات کو پامال کرتا اور ان سختیوں کو ٹھکراتا چلا جائے کہ دیکھنے والا جو سمجھتا تھا کہ یہ مشکلات اس کے جدوجہد کے پاؤں کو توڑ کر اسے ہمیشہ کے لئے بٹھا دیں گی وہ اس میں اس کے استقامت کے قدموں کی مضبوطی اور اس آگ کی چنگاریوں کو محسوس کرے جو اللہ تعالیٰ کے عشق کے بغیر پیدا نہیں ہوتیں اور وہ اس بات کو دیکھ لے کہ مشکلات کے وقت مومن کی سرگرمی میں اضافہ ہو جاتا ہے (۳) پھر وقت اور نا وقت کی مالک کے حکم کے آگے پروا نہ ہو۔ جب مالک کا حکم ہو تو اپنے آرام و آسائش اور نیند اور غفلت کو پرے پھینک کر اٹھ کھڑا ہو۔ اور اگرچہ وقت کیسا ہی مشکل کا ہو اور زمانہ کیسا ہی نامساعدت کرے وہ ہر ایک تاریکی میں سے گذر جائے اور نہ ہارے اور نہ تھکا ماندہ ہو یہاں تک کہ منزل مقصود کو پالے (۴) پھر مالک کی ربوبیت پر ایمان کا یہ عالم ہو کہ پیچھے کی فکر نہ ہو۔ یہاں معمولی معمولی بادشاہوں کے ملازم سپاہی جنگ میں مارے جاتے ہیں تو گورنمنٹ ان کے پسماندگاں کی فکر خود کرتی ہے۔ اور انہیں پنشن اور جاگیر سے سرفراز کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ جیسے رب کے حکم کے آگے اپنے آپ کو مٹا دینے والوں کو اس بات کا فکر ہو نا کہ ہائے پیچھے کیا ہو گا سخت نقص ایمان کا ہے۔ پس چاہیئے کہ وہ اپنے رب کی ربوبیت پر ایمان رکھے اور اپنا سب کچھ اس کی راہ میں قربان کر دے۔ مال، جان، وقت، عزت، شہرت، سب اس کے حکم کے ماتحت جدوجہد میں قربان کر دے اور ایسا بے نظیر نمونہ ایثار اور قربانی اور سعی اور جدوجہد کا چھوڑ جائے کہ آنے والی نسلیں اس جدوجہد کے آثار کو دیکھ کر سبق حاصل کریں اور اس نمونے کے پیچھے چھوڑ جانے کا بھی وہ خود متمنی نہیں ہوتا بلکہ قدرت کا قانون یہی ہے کہ جدوجہد کے آثار کو وہ خود دنیا میں بلند کر کے دکھاتی ہے (۵) آئندہ کے متعلق بھی اس کے نفس میں کوئی تمنا۔ بڑائی یا شہرت و ناموری یا حکومت اور فرمانروائی یا آرام و آسائش اور عیش و عشرت کی نہ ہو۔ بلکہ انجام میں اگر موت قبول کرنے کا بھی حکم مالک کا ہو اور بجائے آرام اور نفع کے خطرناک مشکلات اور مصائب کو سر پر اٹھا لینے کا حکم ہو تو خوشی سے اٹھا لے اور اس وقت کڑکڑانا شروع نہ کر دے کہ ہمیں اتنی کوشش اور جدوجہد کے بعد کیا ملا۔ کیونکہ اس ساری جدوجہد میں کوئی اپنے نفس یا ذات کا نفع اسے مدنظر تھا بلکہ محض اپنے رب کی فرمانبرداری مقصود خاطر تھی گویا شروع میں جو کچھ پاس تھا وہ قربان کر کے چلا اور اب آخر میں آکر اپنے آپ کو قربان کر دیا اپنے رب کی فرمانبرداری اور شکر گذاری کا یہ انتہائی مقام ہے۔ صحابہ کرام نے جدوجہد کی ان تمام منازل و مراحل کو چونکہ طے کر لیا اس لئے وہ انقلاب عظیم بھی وقوع میں آگیا جو دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے ہم بھی آج دنیا میں کوئی روحانی انقلاب پیدا نہیں کر سکتے۔ جب تک جدوجہد کی ان پانچوں

منازل کو طے نہ کرلیں یعنی (۱) نفس کی مشقت (۲) رستہ کی مشکلات (۳) وقت کی مشکلات (۴) پیچھے کیا چھوڑا (۵) آگے کیا پیش آیا۔ ان پانچوں امتحانوں میں جب تک پاس نہ ہولے اور اپنے رب کے حکم کی فرمانبرداری اور شکر گزاری کا پورا پورا حق ادا نہ کرے تب تک کوئی جماعت دنیا میں کسی انقلاب عظیم کو پیدا نہیں کر سکتی۔ فرمایا وہ انسان ناشکرا ہے جو اپنے رب کے احکام کی فرمانبرداری میں جدوجہد کی یہ پانچ منزلیں طے کرنے سے جی چراتا ہے اس کے اس ناشکرے پن پر دلیل بھی دیتے ہیں فرماتے ہیں:-

وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ ۝ اور وہ یقیناً اس پر گواہ ہے } یعنی اپنے ناشکرے پن پر وہ خود ہی گواہ ہے۔ کس طرح؟ اس طرح سن لو

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝ اور بیشک مال کی محبت میں بڑا ہی سخت ہے } یعنی مال کی محبت اسے حد درجہ کی ہے۔

کیسی خوبصورت دلیل دی ہے۔ فرمایا انسان یہ عذر نہ کرے کہ آپ نے جدوجہد کی جن پانچ منزلوں کا ذکر کیا ہے وہ ہماری بساط اور وسعت سے بڑھ کر ہے بس ہم سے وہ کام تو نہ لیں جسے ہم کر نہیں سکتے فرمایا یہ مال کا پیارا مال کی خاطر انہی پانچ منزلوں کو نہایت ذوق و شوق سے طے کیا کرتا ہے اسے پیسہ دو، روپیہ دکھاؤ، مال کا لالچ دو، یہ اس کی خاطر بڑے سے بڑا بوجھ اٹھائے گا۔ پہاڑ کو کاٹے گا۔ دریا میں کود پڑے گا۔ آگ میں۔ تلواروں میں، توپوں کے منہ میں گھس جائے گا۔ کتنا ہی مشکل کام ہو جسے اس کا نفس اٹھا بھی نہ سکے۔ برداشت بھی نہ کر سکے۔ اس کی صحت برباد ہو جائے، جان خطرہ میں پڑ جائے۔ مگر پیسہ کا عشق سب کچھ کروائے گا رستہ کتنا ہی مشکل ہو سر بفلک پہاڑ کی چوٹیوں پر سے برفوں میں سے گذرنا ہو۔ آدھی رات کو طوفانی دریا میں سے پار ہونا ہو۔ کالے کوسوں جانا ہو سمندر میں تیرنا ہو۔ ہوا میں اڑنا ہو۔ دنیا کے سرے کو ہاتھ لگانا ہو پیسہ دو سب کچھ کرے گا۔ روپیہ دکھاؤ یہ نہ رات دیکھے گا نہ دن۔ کیسا آرام اور کس کی آسائش اور کہاں کی نیند۔ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر رات بھر جاگے گا۔ فیس دے دو یہ رات بھر تیمارداری میں جاگے گا۔ چند ٹکے دو وہ رات بھر پہرہ دے گا۔ چوروں سے لڑے گا ڈاکو کے ہاتھوں سر کٹوائے گا کرایہ کی امید پر وہ سردی کی پچھلی رات میں ٹانگے چلائے گا۔ اجرت کی امید پر راتوں اٹھ کر چکی پیسے گا۔ کولہو چلائے گا رس نکالے گا۔ ہتھوڑا چلائے گا۔ ہل جوتے گا۔ غرضکہ پیسے کی خاطر سارے آرام و آسائش بالائے طاق دھر دے گا۔ چند ٹکوں کی خاطر وہ دشمن سے لڑنے افریقہ۔ امریکہ، یورپ چلا جائے گا اور اس وقت اُسے پیچھے کا مطلق خیال نہ ہوگا۔ نہ بیوی بچے اس امر میں روک ہوں گے نہ اور کوئی پیچھے کی فکر۔ روپے کی خاطر وہ افریقہ جائے گا وہاں جا کر خواہ اُسے شیر پھاڑے یا اژدھا نگل جائے یا وہاں کی خطرناک بیماریوں کی نذر ہو جائے۔ پیسے کی خاطر وہ یورپ جائیگا وہ خندقوں میں سردی اور بھوک سے مرنا قبول کرے گا توپ کے ۴۲ من کے گولوں کی مار برداشت کرے گا۔ پردیس میں موت قبول کرے گا اپنی لاش چیل کوؤں کو کھلائے گا غرضکہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائے گا کیوں؟ اس لئے کہ وہ مال سے محبت کرتا ہے اور نہایت سخت محبت کرتا ہے اس لئے اس کی خاطر وہ ہر ایک قربانی کیلئے تیار ہو جاتا ہے

اور جدوجہد کی پانچوں منزلوں کو اس ذوق وشوق سے طے کرتا ہے گویا وہ بجائے خود اس میں ایک لذت حاصل کر رہا ہے مال ملتا جاتا ہو تو انسان صبح سے شام اور شام سے صبح کر دے گا۔ اور کیا مجال ہے کہ تکان اس کے پاس پھٹک جائے کھانے پینے سونے کسی کی بھی پروا نہیں آخر مال کی محبت اور اس کے لئے جدوجہد میں لذت حاصل ہونے کا راز کیا ہے۔ یہی کہ انسان جانتا ہے کہ مال اس کی ربوبیت کرتا ہے یعنی پرورش کرتا اور اس کی حاجتوں کو پورا کرتا ہے اسی لئے وہ اس قدر محبوب ہے تو ثابت ہوا کہ درحقیقت مال کی ربوبیت نے اسے اس قدر انسان کا محبوب بنا رکھا ہے۔ لیکن ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ حقیقی رب تو اللہ تعالیٰ ہے اور مال محض ایک ذریعۂ ربوبیت ہے۔ بہت دفعہ ہوتا ہے کہ مال رکھا رہتا ہے اور انسان کی جان ہلاک اور عزت برباد ہو جاتی ہے روپیہ پاس رکھا ہوتا ہے اور طرح طرح کی نعمتیں موجود ہوتی ہیں اور ایک ذیابیطس کا بیمار یا کسی اور مرض میں گرفتار سب سے محروم ہوتا ہے دولت ہوتی ہے مگر اولاد نہیں ہوتی یا سب سے پیارا عزیز مر جاتا ہے اور زندگی تلخ کر جاتا ہے اور مال رکھا رہتا ہے اور انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ لوگوں میں اپنے ایک عزیز کی بداعمالی یا کسی عزیز کی کرتوت سے ناک کٹ جاتی ہے اور بعض دفعہ باوجود مال و دولت کے ایک کتے کے برابر بھی اس کی عزت نہیں ہوتی۔ غرضکہ دولت ربوبیت کاملہ نہیں کر سکتی۔ ربوبیت کے مختلف ذرائع میں سے وہ بھی ایک ذریعہ ہے پس ربوبیت کاملہ کا اصلی مخزن خود رب العالمین ہے جس کی ربوبیت حقیقی اور کامل ہے پس کس قدر نادانی ہے کہ ربوبیت کے ایک ذریعہ کے حصول کی خاطر جدوجہد کی تمام منازل خوشی خوشی طے کی جائیں لیکن رب حقیقی کی خاطر ان میں سے ایک بھی طے کرنے میں ہزار بہانے اور لاکھ عذر پیش کر دیئے جائیں پس انہ علیٰ ذٰلک لشھید میں انسان کی گواہی اپنے خلاف یہی ہے کہ وہ مال سے جو ایک ذریعۂ ربوبیت ہے محبت کرتا ہے اور یہ محبت اس کی ربوبیت ناقصہ کی وجہ سے ہے جو مال سے حاصل ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ رب حقیقی سے جو ربوبیت کاملہ کا مظہر ہے اس سے بڑھ کر محبت نہ کی جائے اگر ربوبیت ہی وجہ محبت ہے تو رب حقیقی سے تو مال سے بہت بڑھ چڑھ کر بدرجۂ اولیٰ محبت ہونی چاہیئے اور اس کی خاطر جو بھی قربانی کی جائے اور اس کی فرمانبرداری میں جو بھی محنت اور جدوجہد کرنی پڑے وہ مال کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ ہونی چاہیئے۔ لیکن برخلاف اس کے انسان اپنے رب کی فرمانبرداری میں اگر جدوجہد سے کام لینا پڑ جائے تو حیل وحجت کرنے لگ جاتا ہے۔ حالانکہ مال کی خاطر سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہو جاتا ہے تو سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ وہ اپنے رب کا سخت ناشکرگذار ہے

أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ۝ تو کیا وہ جانتا نہیں جب وہ جو قبروں میں ہے باہر نکالا جائے گا۔

وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۝ اور جو سینوں میں ہے ظاہر کیا جائے گا۔

إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ ۝ ع یقیناً ان کا رب آج اُن سے باخبر ہے۔

ع ۱ ۱۱ ۲۵

کیا خوب فرمایا ہے بتاتے ہیں کہ جس مال کی محبت کی خاطر انسان اس قدر مشقت برداشت کرتا اور قربانیاں کرتا ہے وہ تو سب دنیا میں رہ جائے گا اور یہ خود مر کر قبر میں جا پڑے گا مرنے کے بعد یہ مال کچھ کام نہ آئے گا بلکہ مرنے کے بعد جو زندگی آتی ہے اور جو حقیقی اور دائمی زندگی ہے اس دن یہ راز جو آج قبروں میں مدفون ہیں اور اعمال جو مخفی ہیں ظاہر ہو جائیں گے اور جو نیتیں اور جو ارادے سینوں یا دلوں میں پوشیدہ ہیں وہ بھی سامنے آجائیں گے اس دن نظر آجائے گا۔ کہ یہ جسم جس کی پرورش کی خاطر مال کے حصول کے لئے اس قدر جدوجہد تھی وہ تو قبروں میں گل سڑ گیا اور اصل چیز جو باقی رہنے والی تھی وہ وہ تھی جو سینوں میں تھی یعنی محبت الٰہی اور حصول رضائے الٰہی کی تڑپ اور اعمال کے وہ تاثرات جو قلب انسانی پر پڑتے اور اس کی نئی زندگی کو بناتے ہیں۔ اس دن پتہ لگے گا۔ کہ ان کا رب جس کی ناشکری کا انسان مرتکب ہوتا رہا کس قدر ان کی نیتوں اور دلوں کے راز سے باخبر تھا۔ اس کے سامنے اس دن کوئی حیلہ بہانہ عذر چل نہ سکے گا۔ کیونکہ دل کا کوئی بھید اس سے مخفی نہیں۔ البتہ آج انسان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے جو اس دن اُٹھ جائیگا اور اللہ تعالیٰ کے اسم خبیر کی تجلی کا ظہور اس قدر مکمل ہوگا کہ ہر ایک انسان کو پتہ لگ جائیگا کہ اس کا کوئی قول و فعل اللہ تعالیٰ کی صفت خبیر سے مخفی نہیں اور اسی لئے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ بھی اس دن صحیح اور کامل ہوگا۔ یعنی نیکوں کو نیکی کا اور بدوں کو بدی کا جو کچھ بھی بدلہ ملے گا وہ عین انصاف پر مبنی ہوگا۔ کیونکہ علم کامل ہی سے انصاف کامل ہو سکتا ہے۔ پس روپے کی محبت کو دل میں رکھنے والا اور خدا کی محبت کو دل میں رکھنے والا اس دن برابر نہیں ہو سکتے۔ جس دن روپے کی ربوبیت پر بھروسہ کیا اور اس کی محبت کو دل میں جگہ دی اس دن وہ روپیہ ربوبیت کے لئے وہاں موجود نہ ہوگا۔ البتہ جس نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر بھروسہ کیا اور اس کی محبت کو دل میں جگہ دی اس دن وہ محبت وہاں نظر آئے گی اور وہ ربوبیت کا ملہ بھی موجود ہوگی جسے اس نے محبوب بنایا تھا اور جس کی دستگیری کے بغیر ہر ایک زندگی اس دن عذاب ہو جائے گی دنیا میں دیکھ لو لوگ ملازمت کے زمانہ میں بینک میں روپیہ جمع کرتے رہتے ہیں کہ عمر کے آخری حصہ میں ہمارے کام آئیگا اور روپیہ جمع نہ ہو تو تکلیف کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن یہ روپیہ جتنا بھی ہو یہاں ہی رہ جاتا ہے کیونکہ اس کی ربوبیت ناقصہ اسی دنیا تک ہی محدود ہے۔ مرنے کے بعد بینک کا روپیہ کام نہیں آسکتا۔ لیکن جس کا اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ پر بھروسہ ہے اور اس کی فرمانبرداری سے اعمال صالحہ کی دولت کو اپنے رب کے خزانہ میں جمع کرتا ہے وہ دولت مرنے کے بعد کام آئے گی گویا یوں سمجھو کہ جس طرح روپیہ ایک ذریعہ ربوبیت ہے مگر وہ فقط اس جسم کی ربوبیت کا ذریعہ ہے جو قبر میں مدفون ہو کر فنا ہو جائے گا اور اس کی ربوبیت بھی اسی عالم تک محدود۔ اسی طرح اپنے رب کی فرمانبرداری میں جو اعمال صالحہ انسان بجا لاتا ہے اور جدوجہد اور قربانیاں کرتا ہے وہ بھی ذریعہ ربوبیت ہے مگر اس کی ربوبیت انسان کی اس زندگی کے لئے ہے جو آج سینوں میں پنہاں ہے مگر ایک دن آئے گا کہ یہ راز آشکارا ہوں گے اور سینوں میں جو پنہاں ہیں وہ باہر نکلیں گے۔ اس دن وہ ذریعۂ ربوبیت انسان کے کام آئے گا اور دائمی طور پر انسان کے ساتھ رہے گا اور اُخروی زندگی میں جو حقیقی اور دائمی زندگی ہے اعلیٰ کمالات پر پہنچانے کا موجب ہوگا۔

یاد ہے جس طرح دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کرنے کے لئے جد و جہد کی مذکورہ بالا پانچ منازل کو طے کرنا پڑتا ہے اسی طرح انسان کے اپنے نفس میں بھی انقلاب پیدا کرنے کیلئے انہی پانچ منازل جد و جہد سے گذرنا پڑتا ہے (۱) خدا کی فرمانبرداری میں اپنے نفس کو مشقت میں ڈالنا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد بالقرآن یا جہاد بالسیف جیسی بھی حالت ہو باوجود نفس کی حیل و حجت کے نہ چھوڑے۔ اور مخلوق پر شفقت میں کسی قربانی سے نہ ڈرے (۲) رستہ میں جو بھی مشکلات آئیں دکھ سکھ ہر حال میں اس کا قدم خدا کی وفاداری میں آگے ہی بڑھے پیچھے نہ ہٹے (۳) راتوں کو خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں جاگے اور کیسا سخت وقت بھی آوے اپنے اعلیٰ اصولوں کو نہ چھوڑے (۴) قربانیوں اور ایثار کے وقت خدا کی ربوبیت پر پورا ایمان ہو اور پیچھے کا فکر نہ ہو (۵) اپنی قربانیوں میں مدنظر نفس کی آسائش یا شہرت یا بڑائی اور وجاہت و حکومت کا حصول نہ ہو بلکہ خدا کی رضا کے حصول کے لئے انجام کار موت بھی قبول کرنی پڑے تو اس پر شکوہ نہ کرے بلکہ خوشی خوشی اسے قبول کر کے اپنے اخلاص اور محبت الٰہی اور فرمانبرداری اور شکر گذاری کا انتہائی ثبوت دیدے۔ ایسے شخص کے نفس پر پھر ایسا انقلاب وارد ہوتا ہے کہ وہ ایک نئی زندگی کا وارث ہوتا ہے اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں فنا ہو کر خود محبوبیت الٰہی کے مقام پر جا پہنچتا ہے۔

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ القارعہ کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا جس انقلاب عظیم کا ذکر سورۃ الزلزال میں کیا تھا اور جس کے لئے جد و جہد کرنے کے واسطے سورۃ العادیات میں ہدایات دی تھیں۔ اس کے ظہور کے بعد کفار کی جو حالت ہونیوالی تھی اس کا ذکر اس سورۃ القارعہ میں کیا ہے اس سورت میں اس بات کا نقشہ کھینچا ہے کہ اسلام کے غلبہ کے بعد کفار کی حالت ان پتنگوں کی ہوگی جو شمع اسلام پر حملے کر کے اپنے پَر اور بازو جلا بیٹھے ہوں اور بوجہ ذلت اور ضعف و مسکنت کے زمین پر رینگ رہے ہوں فرماتے ہیں:-

اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ کھٹکھٹانے والی۔ اور کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی؟

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ اور تو نے کیا سمجھا کہ وہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی؟

یہ سخت تاکید اور اہمیت جتلانے کے لئے طرز کلام ہے

القارعہ کے اصل معنے ہیں کھٹکھٹانے والی۔ اصطلاح میں سخت مصیبت کو کہتے ہیں یا سریہ یعنی جنگ کو بھی کہتے ہیں۔ قیامت کا نام بھی القارعہ ہے میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ قرآن کریم میں قیامت کے مختلف

نام آتے ہیں۔ القیمۃ۔ الآخرۃ۔ الساعۃ۔ الحاقۃ۔ الطامۃ۔ الصاخۃ۔ الآزفۃ۔ القارعۃ وغیرہ وغیرہ۔ اور جس موقعہ پر جو نام استعمال کیا گیا ہے اس نام دیئے جانے میں وہاں ایک خاص غرض مدنظر ہوتی ہے اور قیامت کی ایک خاص شان کو بتلانا مقصود خاطر ہوتا ہے جس پر اس نام کے لغوی معنے دلالت کرتے ہیں۔ یہاں بھی القارعۃ قیامت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس نام میں ایک خاص غرض مدنظر ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ قیامت کا دن جس دن تمام عالم پر انقلاب عظیم آئے گا اور نیکوں کو نیک اور بدوں کو بد بدلہ ملے گا۔ اُسے دور مت سمجھو وہ گھڑی تمہارے دروازہ پر کھڑی دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جو چیز دروازہ کھٹکھٹا رہی ہو اس کی موجودگی اور قرب میں کوئی شک ہی باقی نہیں رہتا۔ مطلب یہ کہ اس انقلاب کا ایک نقشہ محمد رسول اللہ صلعم کی زندگی میں تمہارے سامنے آئے جاتا ہے۔ جس دن نیکوں کو عزت اور بدوں کو ذلت نصیب ہوگی۔ پس قیامت دور نہیں بلکہ دروازہ پر کھڑی ہے اور اس بڑی قیامت کا نقشہ چھوٹے پیمانہ پر ابھی نظر آیا جاتا ہے جس میں مخالفین منکرین کی جو ذلت کی حالت ہوگی اس کا ذکر یوں فرماتے ہیں:۔

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۝ لا جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں یا پروانہ چیونٹیوں کی طرح ہوں گے۔

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ ۝ اور پہاڑ دھنی ہوئی اُون کی طرح ہوں گے۔

قیامت میں تو نقشہ اپنی جس خاص شان سے ظاہر ہوگا اس کا کامل علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے لیکن جس نقشہ کے جلد ظہور پذیر ہونے کا اشارہ اوپر کیا تھا وہ محمد رسول اللہ صلعم کی زندگی میں اس شان سے ظاہر ہوا کہ اصل قیامت پر شک وشبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ فرمایا جو لوگ اسلام کے نور پر حملے کر رہے ہیں اس خدائی شمع سے ان کے پروبازو اسی طرح جل جائیں گے جس طرح دنیوی شمع سے پروانوں یا پردار چیونٹیوں کے پروبازو جل جاتے ہیں اور وہ نہایت ضعف اور کمزوری ذلت اور بیچارگی کی حالت میں زمین پر پڑے رینگتے رہتے ہیں جو لوگ آج یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکٰفرون۔ کا مصداق ہیں اور خدا کے نور کو منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں۔ سن رکھیں کہ اس نور پر حملہ کرنے سے اس نور کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہاں ان کے پروبازو یعنی وہ تمام اسباب اور قوی جن کے بل پر یہ اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں جل جائیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ انتہائی ذلت اور مسکنت اور ضعف اور بے چارگی کے ساتھ زمین پر رینگنے والے کیڑوں کے مانند اس حالت پر پہنچ جائیں گے کہ جو چاہے انہیں پیروں کے نیچے مسل دے اور تمام مشکلات کے پہاڑ جو اسلام کی ترقی میں روک بنے ہوئے ہیں دھنی ہوئی اُون کی طرح اڑ جائیں گے۔ عرب کے اکابر اپنے آپ کو فخر سے جبال یعنی پہاڑ کہا کرتے تھے اور اس سے مقصد اُن کا اپنی عظمت اور کبریائی کا اظہار ہوتا تھا اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ کفار کے بڑے بڑے اکابر اور لیڈر جو آج اپنے آپ کو جبال یعنی مضبوطی و استحکام میں پہاڑ کہتے ہیں اس طرح ہلاک ہو جائیں گے اور مٹ جائیں گے جس طرح اُون کو دھن کر اڑا دیا جائے۔ غرضکہ کفار کی ذلت اور بیچارگی اور ہلاکت کی اس میں بہترین

تصویر کھینچ دی ہے جو اس انقلاب عظیم کے وقت ہونیوالی تھی جو ان کے دروازہ پر کھڑا کھٹکھٹا رہا تھا اور واقعات نے حرف بہ حرف اس کی سچائی پر مہر لگا دی۔ محمد رسول اللہ صلعم کی زندگی میں کفار کی یہ حالت من وعن دنیا کے پیش نظر ہوگئی اور نیکوں کو نیک اور بدوں کو بد بدلہ اس صفائی سے ملا کہ اعمال اور ان کے نتائج پر شک وشبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ آخرت پر اس طرح استدلال فرما کے اب تنبیہ فرماتے ہیں کہ اپنی اعمال کی ذمہ داریوں کا خیال رکھو کہ انہی پر اگلی زندگی کا سکھ اور خوشی اور دکھ اور رنج منحصر ہے نیکی کے وزن کا بڑھنا سکھ کی زندگی اور بدی کے وزن کا بڑھنا دکھ کی زندگی پیدا کردے گا۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ پس جسکے اعمال نیک کے تول بھاری ہونگے وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا۔

یعنی جس کے اعمالِ نیک وزن میں اعمالِ بد سے بڑھ جائیں گے گویا نیکی کا حصہ بدی پر غالب ہوجائیگا، اس کی آنے والی زندگی ایک خوشی کی زندگی ہوگی جسے جنت کہا جاتا ہے۔ گویا جنت کیا ہے ایک خوشی کی زندگی ہے جو آخرت میں انسان کو عطا ہوگی اور وہ اعمالِ نیک کا نتیجہ ہوگی لیکن اس شرط پر کہ اعمالِ نیک کا وزن اعمالِ بد سے بڑھ جائے اور نیکی کا حصہ بدی پر غالب ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے علماء نے اعمال کے وزن کو بھی کسی ٹھوس چیز مثلاً لکڑی کے وزن کی طرح سمجھ لیا۔ اور ایسا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ عام طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ قیامت میں کوئی بڑا سا ترازو لکڑی تولنے والا بلکہ غالباً اس سے بھی بڑا کھڑا کیا جائیگا اور لکڑی کی طرح اعمال بھی اس پر تلیں گے حالانکہ موٹی بات ہے کہ جس قسم کی جو چیز ہوتی ہے اسی قسم کا میزان اس کے تولنے یا ناپنے کا ہوتا ہے۔ ٹھوس چیز کے تولنے کے لئے ترازو۔ سونے چاندی کے تولنے کے لئے کانٹا۔ پانی کا وزن معلوم کرنے کے لئے پیمانہ الگ الگ قسم کا ہوتا ہے۔ ہوا کا وزن ناپنے کے لئے بیرومیٹر ایک اور ہی قسم کا میزان ہے۔ حرارت کو ناپنے کے لئے ایک الگ ہی قسم کا میزان ہے جسے تھرمامیٹر کہتے ہیں۔ بجلی کے میزان کا نام والٹ میٹر ہے جو ایک جداہی چیز ہے۔ حساب میں ہندسوں کا میزان کچھ اور ہی رنگ رکھتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب اعمال مادی چیز نہیں تو ان کے ناپنے اور اندازہ کرنے کے لئے جو میزان ہوگا وہ مادی چیز کے ترازو کی طرح تو قطعاً نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ان کے وزن اور اندازہ کا طریق ان کے حسب حال جداہی ہوگا جس کی تفصیل کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے اعمال کا وزن کیا جانا تو برحق اور ضروری ہے کیونکہ اگلی زندگی کا رنج وراحت اس پر منحصر ہے۔ لیکن اسے لکڑی تولنے کے ترازو کی طرح سمجھنا غلطی ہے اس میزان کی ماہیت کا صحیح علم جناب الٰہی کو ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن حدیث سے تو وہ کچھ حساب کی سی میزان معلوم ہوتی ہے جیسا کہ آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ بڑا بدقسمت وہ ہے جس کی اکائیاں اس کی دہائیوں سے بڑھ جائیں یعنی بدی جو انسان کرتا ہے وہ تو ایک کی ایک ہی لکھی جاتی ہے اور نیکی جو کرتا ہے وہ ایک کی دس لکھی جاتی ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ من جاء بالحسنة فله عشر امثالها ومن جاء بالسيئة فلا يجزى الا مثلها توجب انسان نے بدی ایک کی تو وہ ایک لکھی گئی اور نیکی ایک کی تو دس لکھی گئیں تو اس قدر رعایت کے باوجود

بھی اگر کسی کی اکائیاں اس کی دہائیوں سے بڑھ جائیں یعنی بدی کا وزن نیکیوں سے بڑھ جائے تو فرمائیے اس سے بڑھ کر بدقسمت اور کون ہوگا۔

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۙ اور جس کے نیک اعمال کے تول ہلکے ہونگے تو اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا۔

نیک اعمال کے تول ہلکا ہونے یعنی بدی کا نیکی پر غالب ہونے کی صورت میں ٹھکانہ ہاویہ ہوگا۔ ھاویہ ایسے گڑھے کو کہتے ہیں جس کی گہرائی کی کوئی انتہا نہ ہو۔ یہاں مراد دوزخ ہے اسے ہاویہ کا نام دینے میں ایک خاص اشارہ بھی مدنظر ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا مادہ ہوا ہے جس کے معنی ہیں خواہشات نفسانی یا عقل و فہم کا جاتے رہنا۔ پس اس نام میں اشارہ یہ ہے کہ ہاویہ نتیجہ ہے ہوا و ہوس کا۔ اس گڑھے کی گہرائی کی انتہا اس لئے نہیں کہ انسان کی ہوا و ہوس کی بھی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ اور اس کے ہیجان کے وقت انسان کی عقل و فہم زائل ہو جاتی ہے مثلاً حرص یا شہوت یا غضب یا حسد کی حالت میں انسان ایسی ایسی بیہودہ اور قبیح حرکتیں کر گزرتا ہے کہ بعد میں جب عقل برجا ہوتی ہے تو انہیں یاد کر کے بھی شرم آتی ہے اور انسان پچھتاتا ہے اور خواہشات کے گڑھے میں جب انسان گرتا ہے تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اور ہوا و ہوس کبھی ختم ہی نہیں ہونے میں آتی۔ گویا اس گڑھے کی تہ ہی نہیں جو گرتا ہے وہ گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے ؎

چشم تنگ مرد دنیا دار را ٭ یا قناعت پر کند یا خاک گور

پس ہاویہ کی گہرائی کی اگر کوئی انتہا نہیں تو اسی لئے کہ انسان کی ہوا و ہوس کی بھی کوئی انتہا نہیں اُسے اُم اس لئے فرمایا کہ جس طرح ماں اپنے بچہ کو گود میں رکھتی ہے اسی طرح یہ گڑھا انسان کو گود میں لے گا انسان دنیا میں دن رات ہوا و ہوس کی گود میں اس طرح کھیلتا اور خوش ہوتا رہتا ہے جیسے بچہ ماں کی گود میں کھیلتا اور خوش ہوتا ہے تو نتائج کے وقت وہی ہوا و ہوس کا گڑھا اگر ماں کی طرح گود میں لئے ہوئے نظر آئے تو عین مطابق اعمال ہوگا لیکن اس روز اس ماں کی گود کی اصل حقیقت نظر آ جائے گی۔

ع ۱۱ ۲۶ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۙ نَارٌ حَامِيَةٌ ۙ ع اور تو کیا سمجھا وہ کیا ہے وہ جلتی ہوئی آگ ہے۔

فرمایا سمجھے وہ ہاویہ کیا ہے جسے دنیا میں اماں کی گود سمجھا کئے اور خوش ہوتے رہے وہ جلتی ہوئی آگ ہے یہی خواہشات و جذبات ہوا و ہوس کی آگ! دنیا میں بھی جو اس آگ میں پڑتا ہے پیچھے ہی پیچھے جاتا اور کبھی اسے ٹھنڈک و سکینت اور طمانیت نصیب نہیں ہوتی تو آخرت میں اگر انسان آگ کی گود میں اپنے آپ کو پا دے تو کوئی محل تعجب نہیں۔ صرف احساس کا فرق ہے۔ آخرت میں جو احساس ہوگا وہ تیز اور صحیح ہوگا۔ اُمّہ میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ اگرچہ وہ آگ کا گڑھا ہے اور وہ گود ایک آگ کی

گود ہے۔ لیکن جس طرح ماں ہمیشہ اپنے بچہ کی خیرخواہ ہوتی ہے خواہ اس کی اصلاح کے لئے کبھی اسے مارنا یا سزا دینا پڑے اسی طرح اس آگ کی گود میں جلنے میں بھی مقصد انسان کی اصلاح ہی ہے۔ بیشک اپنی خواہشات کی آگ میں جسے انسان نے خود جلایا تھا وہ جلایا جا رہا ہوگا۔ لیکن اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ہوا و ہوس کے جراثیم ہلاک ہو جائیں اور خواہشات و جذبات کی گندگیاں جل کر خاکستر ہو جائیں اور نیز یہ آگ جسے انسان نے خود بھڑکایا تھا اپنے بھڑکانے والے محرکات کو ہی جلا کر ہمیشہ کے لئے بجھ جاوے اور انسان عذاب سے نجات پا جاوے۔ جس طرح جو لکڑیاں آگ کو جلانے کا موجب ہوتی ہیں وہی جل جائیں تو آگ بجھ جاتی ہے۔ اسی طرح وہ جذبات و خواہشات جو آگ کو بھڑکاتی رہی ہیں جب اس آگ کی جلن کو محسوس کریں گی اور عذاب کو بھگتیں گی تو ان پر موت وارد ہو جائے گی۔ دنیا میں بھی بعض اوقات سزا کے وقت انسان کو ہوش آجاتی ہے اور وہ اپنی بداعمالیوں پر پچھتاتا اور تائب ہو جاتا ہے لیکن دنیا کی سزائیں چونکہ مکمل اصلاح کا رنگ اپنے اندر نہیں رکھتیں اس لئے ممکن ہے ان کے ذریعہ اصلاح نہ ہو لیکن آخرت کی سزا چونکہ مکمل اصلاحی رنگ اپنے اندر رکھتی ہوگی اس لئے اس کا نتیجہ جو اصلاح ہوگی وہ پوری پوری ہوگی وہ آگ کی طرح ہر ایک محرکِ بدی کو جلا دے گی اور یہی مقصود دوزخ کا تھا کہ انسان کے اندر کے تمام بدی کے محرکات جل جاویں اور اس کی اصلاح پوری طرح ہو جاوے۔

وَهِيَ ثَمَانِ اٰيَاتٍ	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ التکاثر کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ جس انقلاب کا ذکر سورۃ القارعۃ میں فرمایا وہ اجتماعی رنگ میں تو قیامت سے وابستہ ہے جس کا نمونہ چھوٹے پیمانہ پر آنحضرت صلعم کی زندگی میں بھی رونما ہوا۔ لیکن اس سورۃ التکاثر میں یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ انقلاب فرداً فرداً علیحدہ علیحدہ ہر ایک انسان پر بھی اس کی موت کے وقت وارد ہوتا ہے گویا وہ الگ الگ ہر ایک فرد کے دروازہ کو بھی کھٹکھٹاتا رہتا ہے لیکن دنیا کی خاطر تگ و دو اور مال و عزت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش انسان کو غافل کئے رکھتی ہیں۔ عقلمند وہ ہے جو اس وقت کو بھول نہ جائے اور اس انقلاب کے لئے تیار رہے۔ فرماتے ہیں:۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ کثرت کی خواہش تمہیں غافل کئے رکھتی ہے یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچتے ہو۔

تکاثر کہتے ہیں کثرتِ مال و عزت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش کو۔ آج اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مشرق ہو یا مغرب اس ایک تکاثر نے تمام عالم پر ایک ایسا غفلت کا پردہ ڈال رکھا ہے کہ موت یاد ہی نہیں رہی۔ اور خدا اور اس کے حضور میں اعمال کی جوابدہی کا مطلق کوئی خیال ہی نہیں اور اگلی زندگی کا واہمہ بھی انسان کے قلب میں نہیں گذرتا۔ یہاں تک کہ موت آجاتی ہے اور حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے اور وہ انقلاب جو ہر ایک انسان کے لئے مقدر ہے وارد ہو جاتا ہے اور جس نے غفلت میں عمر گذار دی اسے اپنے اعمال کے بدلہ میں اس جہنم سے واسطہ پڑ جاتا ہے

جسے وہ تکاثر کی خاطر جذبات وخواہشات کی ہر طرح کی غلامی کر کے اپنے ہاتھوں آپ تیار کرتا رہا۔ اسی لئے ارشاد ہوتا ہے:۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ اچھی طرح سُن رکھو تم کو پتہ لگ جائیگا پھر اچھی طرح سُن رکھو تم کو پتہ لگ جائیگا

یعنی اپنی غفلت کے انجام کا پتہ لگ جائے گا۔ اور اس وقت اپنی اس غفلت پر پچتاؤ گے۔ یہاں کلا سوف تعلمون کے کلمہ کو دہرایا ہے کچھ شک نہیں کہ آنحضرت صلعم کے وقت میں جن لوگوں نے مال اور عزت کی کثرت میں آگے بڑھنے کی خواہشات میں محصور رہ کر اپنی غفلت سے آنحضرت صلعم کے پیغام پر کان نہیں دھرا۔ انہوں نے اپنی اس غفلت کا انجام اس دنیا میں بھی ذلت اور ہلاکت، ناکامی اور نامرادی کی شکل میں دیکھا اور مرنے کے بعد بھی دیکھا اور سوف تعلمون کا وعید ان کے لئے اس دنیا میں بھی پورا ہوا۔ گویا کلا سوف تعلمون کی تکرار لفظاً بھی ان کے حق میں پوری ہوئی۔ لیکن عام طور پر چونکہ دنیا میں اپنی غفلت کا انجام نظر نہیں آتا اور آدمی اس تکاثر کے چکر میں ہی اگلے جہان پہنچ جاتا ہے اس لئے کلا سوف تعلمون کی تکرار کا اصل مقصد تاکید اور اس کی اہمیت کا جتلانا ہے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ قرآن کے ذریعہ اگلی زندگی کا اور اعمال کے نتائج کا علم دے رہا ہے۔ اور دلائل وبراہین سے اس کو اس قدر مدلل اور معقول شکل میں پیش کر رہا ہے کہ یقین کے درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ لیکن تم دنیا کی مال وعزت کی کثرت کی خواہش میں غفلت میں ڈوبے ہوئے ہو۔ اس لئے نہ سنتے ہو نہ پروا کرتے ہو۔ لیکن وقت آجائے گا کہ تم کو ان سب چیزوں کا ایسی اچھی طرح پتہ لگے گا کہ آنکھوں سے دیکھ لوگے مگر اس وقت چیتنا اور ہوشیار ہونا بیفائدہ ہوگا

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝ سُن رکھو اگر تم یا کاش کہ تم علم یقین کے ساتھ جان لیتے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝ تو تم ضرور دوزخ کو دیکھ لیتے۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝ پھر تم اُسے ضرور یقین کی آنکھ کے ساتھ دیکھو گے۔

قرآن کریم نے یقین کے تین مراتب قائم کئے ہیں (۱) پہلا مرتبہ یقین کا دلائل علمی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اسے علم الیقین فرمایا۔ (۲) دوسرا مرتبہ یقین کا مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے جسے عین الیقین فرمایا (۳) تیسرا مرتبہ یقین کا اس چیز کے اندر داخل ہونے یا ان حالات کے اپنے اوپر وارد ہو جانے سے حاصل ہوتا ہے اسے حق الیقین فرمایا۔ جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں آتا ہے وانہ لحق الیقین۔ یقین کے تینوں مراتب سمجھنے کے لئے آگ کی مثال بہت خوب ہے کسی دور جگہ پر اگر دھواں اٹھ رہا ہو تو وہ دلیل ہوتا ہے اس امر پر کہ وہاں ضرور آگ ہے۔ یہ علم الیقین ہے۔ پھر انسان اگر اس جگہ چلا جائے اور آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے تو عین الیقین کہلائے گا۔ پھر اگر خود اس کے اندر داخل ہو جائے تو وہ حالت اس پر وارد ہو کر کامل طور پر بتا دے گی کہ یہ آگ ہے اسے حق الیقین کہا جائے گا۔

یہاں فرماتے ہیں کہ قرآن کے ذریعہ ہم نے اعمال کی جزاء وسزا پر اس قدر دلائل علمی جمع کر دیئے ہیں کہ اس کے متعلق علم الیقین پیدا کر دیا ہے۔ گویا دوزخ کی آگ کا دھواں تمہیں اس دنیا میں دکھا دیا ہے تاکہ تم اس آگ سے بچو اگر انسان قرآن کے پیدا کردہ علم الیقین سے فائدہ اٹھاتا تو اس تکاثر یعنی دن رات دنیا کے مال اور جاہ وعزت وشہرت کی لگاتار تڑپ اور خواہش کے ساتھ اعمال کی جزاء وسزا کی طرف سے غفلت کے اندر جحیم یعنی آگ کو سلگتا دیکھتا جو انسان کے تمام اخلاق فاضلہ اور اعلیٰ خوبیوں کو جلا کر خاک سیاہ کئے ڈال رہی ہے۔ مگر جو شخص اس علم الیقین سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور اسی تکاثر اور غفلت میں پڑا ہوا دنیا سے گذر جاتا ہے تو پھر لازمی بات ہے کہ وہ آگے چل کر اس جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ جو عین الیقین کی حالت ہوگی۔ مگر اس وقت جہنم کا دیکھنا کچھ فائدہ نہ دے گا کیونکہ عین الیقین کے بعد تو اعمال کی جزا ہی ہے۔ عمل کا موقعہ کوئی نہیں۔ علم الیقین جو قرآن کے ذریعہ تمہیں اس دنیا میں دیا جا رہا ہے یہ اصلاح کیلئے ہے تاکہ انسان اس علم اور یقین سے فائدہ اٹھا کر سنبھل جائے اور اپنی اصلاح کر لے لیکن جس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا اور اسی تکاثر اور غفلت میں دنیا سے گذر گیا تو وہ اس جہنم کو جسے قرآن دنیا میں علم الیقین کے رنگ میں دکھا رہا تھا اور انسان نے اس کی پروانہ کی تھی آگے چل کر عین الیقین کے رنگ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ لیکن اس وقت کا دیکھنا اور یقین کچھ فائدہ نہ دے گا کیونکہ وہ وقت عمل کی اصلاح کا نہیں بلکہ جواب دہی کا ہے۔ جس میں اگر کامیابی نہ ہوئی تو جہنم میں داخلہ حق الیقین کے مقام پر پہنچا دے گا۔

ع ۱ ۸ ۲۷ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝ پھر ضرور تم سے اُس دن نعمتوں کے متعلق سوال ہوگا۔

فرماتے ہیں دوزخ کو حق الیقین کے رنگ میں وارد ہونے یعنی اس میں داخلہ سے قبل ضرور ہے کہ انسان سے ان نعمتوں کی نسبت بازپرس ہو جو اُسے دنیا میں اس لئے دی گئی تھیں کہ ان کا صحیح استعمال کر کے ان سے اپنے لئے اگلی زندگی کے واسطے جنت تیار کر لے اس میں وہ تمام قویٰ اور استعدادیں۔ اخلاق اور علم عقل اور فراست، احساسات اور جذبات، دولت اور حکومت، ضمیر اور الہامی کتب ہیں جو انسان کی ہدایت ترقیات اور کمالات کے لئے اسے دنیا میں عطا ہوئی تھیں یہ سب نعمائے آلیہ تھیں جن سے اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کے ماتحت انسان کام لیتا تو یہی نعمتیں اس کے لئے جنت کے دروازے تھے جن سے وہ اپنی جنت میں جا داخل ہوتا۔ یہی اس کے قویٰ جو غلط استعمال سے جہنم بناتے رہے صحیح استعمال سے جنت بناتے۔ یہی دولت اور حکومت جس کے تکاثر نے غفلت کا پردہ ڈالے رکھا اگر خدا کی رضا جوئی کے لئے کمائی اور خرچ کی جاتی تو انسان کو کمالات اور ترقیات ظاہری و باطنی کا وارث بنا دیتی۔ یہی عقل وفراست جو اپنے غلط استعمال سے نفسانی جذبات کی خاطر مخلوق کو تکلیف اور ذلت کا نشانہ بنانے میں مشغول رہی۔ اگر صحیح رستہ پر پڑتی اور مخلوق کو نفع پہنچانے میں صرف ہوتی تو جنت کے دروازے کھول دیتی یہی حواس خمسہ جو اپنے غلط استعمال سے جہنم کے انگارے سمیٹتے رہے۔ اگر اُن سے خدا کی مرضی کے ماتحت کام لیا جاتا

تو جنت کے پھول چُنتے۔ غرضکہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو نعمتیں تو ہر رنگ میں عطا فرمائی تھیں تاکہ وہ ان سے کام لے کر اپنے لئے جنت بنا لے۔ یہاں تک کہ الہامی کتب مثلاً قرآن جیسی عظیم الشان نعمت بھی عطا فرمائی تھی جس نے اگلے جہان کے نتائج کو علم الیقین تک پہنچا کر دکھا دیا تھا۔ لیکن انسان نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اور ان کے غلط استعمال سے اپنے لئے جہنم ہی بنایا۔ پس قرآن کے پیش کردہ علم الیقین سے جب اپنی غفلت کی وجہ سے فائدہ نہ اٹھایا تو آج وہی نعمتیں باز پرس کے نیچے ہیں کہ آخر ان سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا گیا بلکہ ان کی ناشکری اور غلط استعمال سے دنیا میں فتنہ و فساد ظلم اور گناہ کی آگ اور آخرت میں اپنے لئے جہنم کی آگ بھڑکاتے رہے یہاں تک کہ خدا کی عطا کردہ ہدایات کو بھی پسِ پشت پھینکے رکھا۔ تو اب ضروری ہے کہ ان نعمتوں کے غلط استعمال کی باز پُرس ہو۔ اور اگر اس میں انسان پورا نہ اترے تو اس کی سزا بھگتے اور جس جہنم کو بھلائے رکھا تھا بلکہ اُسے تکاثر اور غفلت سے خود بناتا رہا تھا اور جس کے متعلق خدا کی طرف سے علم الیقین آجانے پر بھی پروانہ کی تھی۔ اور جسے عین الیقین کے رنگ میں آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اسے اب حق الیقین کی طرح چکھے اور اس میں داخل ہو کر اس نتیجہ کو بھگتے جو ان نعمتوں کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔ پس نعمتوں کی فراوانی اور کثرت پر فخر کرنا حماقت ہے بلکہ درحقیقت یہ ذمہ داری کو بڑھانے والی چیز ہے جسے جس قدر نعمتیں زیادہ دی گئی ہیں اُتنا ہی وہ زیادہ باز پُرس کے نیچے ہے۔ ایک اندھا آنکھوں کی نعمت کی جوابدہی سے بچا ہُوا ہے جس میں ایک آنکھوں والا مبتلا ہے۔ دولت والے کو جو اپنی دولت کی نسبت باز پُرس ہو گی وہ ایک مفلس کو نہیں ہو گی۔ ایک حکومت والے کے ذمہ جس قدر جوابدہیاں ہیں وہ دوسرے کو نہیں۔ کسی نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بارہ سال کے بعد خواب میں دیکھا کہ نہائے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ دریافت کرنے پر فرمایا کہ اب حساب سے فارغ ہُوا ہوں۔ ایک مرتبہ حضرت عثمان سے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ سامنے جو دھوپ میں پتھر پڑا ہے اس پر کھڑے ہو کر ذرا مجھے بتاؤ کہ رات تم نے کیا کھایا تھا۔ وہ متمول آدمی تھے رات کئی قسم کے کھانے کھائے تھے پتھر پر کھڑے ہو کر سوچ سوچ کر بتاتے رہے یہ بھی خیال تھا کہ رسول اللہ صلعم کے سامنے کہیں غلط بیانی نہ ہو جائے اس لئے بہت سوچ سوچ کر بتایا۔ اتنے عرصہ میں پاؤں جل اُٹھے۔ اُن کے بعد حضرت علیؓ سے پوچھا انہوں نے پتھر پر جا کر فقط اتنا کہا کہ رات میں بھوکا سویا تھا اور چلے آئے۔ جتنا یہ تھا کہ جتنی زیادہ نعمتیں ہوں اُتنا ہی انسان زیادہ باز پرس کے نیچے ہے اور اُتنا ہی حساب دینے میں زیادہ تکلیف ہے لیکن یاد رہے یہ فقط دنیا کے افلاس اور تمول کا فلسفہ حل کرنے کے لئے ارشاد ہے یعنی قدرت کی طرف سے کسی شخص کو نعمتوں کی کمی اس کی ترقی روحانی میں حارج نہیں بلکہ بہت سی باز پُرس سے اُسے بچا لینے کا موجب ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان دنیا میں سعی اور محنت نہ کرے اور روپیہ نہ کمائے یا حکومت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے بلکہ ضرور دولت کمائے اور حکومت بھی حاصل کرے کیونکہ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ کا مقصد سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ انسان دنیا میں بھی ترقی اور حسنات سے حصہ لے اور آخرت میں بھی اور یہ بھی سچ ہے کہ انسان دولت

اور حکومت کی حالت میں بعض ایسی ایسی اعلیٰ درجہ کی نیکیاں کر سکتا اور فیض پہنچا سکتا ہے جو دوسری حالت میں نہیں کر سکتا۔ اسی لئے مال کو قرآن نے فضلِ رب بھی قرار دیا ہے۔ لیکن اسی مال کو جو خدا کی رضا کے ماتحت خرچ ہو پس جس بات سے منع کیا ہے وہ تکاثر اور اس سے غفلت کا پیدا ہونا ہے جس سے انسان اصل مقصدِ پیدائشِ انسانی کو جو اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ ہیں بھول جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں اسے محض مال و دولت اور عزت و وجاہت دنیوی کے حصول میں اگر انسان خرچ کرتا ہے اور اس کی بڑھوتی کی خواہش اس کی زندگی کا مقصود بن جائے اور ان تمام ترقیات و کمالاتِ روحانی سے غافل ہو جائے جس کے لئے انسان پیدا ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا اس نے غلط استعمال کیا پس ضرور ہے کہ اس کا نتیجہ جہنم وہ بھگتے اور در حقیقت ایسی حالت میں انسان کے اندر خود وہ آگ بھڑکتی ہے کہ جو تمام دنیا کی دولت پا لینے پر بھی سرد نہیں ہو سکتی۔ پس یہی وہ حالت ہے جس کے پیدا ہونے سے قرآن نے روکا ہے ہاں اگر وہ خدا کی نعمتوں کا صحیح استعمال کرے اور اس حالت میں اگر وہ مال کمائے جو بجائے خود ایک نعمت ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں خرچ کرے یعنی ان نعماء کا صحیح استعمال کرے اور اپنا مقصدِ زندگی کسی حالت میں بھی نہ بھولے اور اعمال کے نتائج سے کبھی غافل نہ ہو تو یہی نعمتیں اس کے لئے جنت پیدا کر دیں گی

وَهِيَ ثَلٰثُ اٰيَاتٍ	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ العصر کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ یہ وہ سورت ہے جسے صحابہ نے ایسا مضبوط پلے باندھا تھا کہ کوئی دو صحابی جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے جب تک وہ اس سورت کو نہ پڑھ لیتے اور ایک دوسرے کو سنا نہ لیتے وجہ یہ کہ اس سورت میں انسان کی زندگی کا ملخص چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر سارا قرآن نہ بھی ہوتا تو بھی لوگوں کے لئے یہ ایک سورت ہی کافی تھی۔ سورۃ التکاثر میں بتایا تھا کہ تکاثر یعنی مال اور عزت کی کثرت کی خواہش میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کو انسان اس قدر عزیز رکھتا ہے کہ خدا اور نتائج اعمال کو بھی بھول جاتا ہے اس سورت میں بتایا کہ ایسا تکاثر جو نتائج اعمال سے غافل کر دے در حقیقت خسران ہے اس خسران سے بچنا چاہتے ہو تو اس تکاثر کو کوئی زندگی کا مقصد نہ بناؤ۔ بلکہ ایمان اور اعمال صالحہ اور تبلیغِ حق و صبر کو اپنا مقصدِ زندگی بناؤ یہ وہ عزت اور دولت ہے جس میں نفع ہی نفع ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ وقت گواہ ہے کہ انسان نقصان میں ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں

ع ۳ ۱ ۲۸

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ ع

اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں۔
اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں۔

العصر کے معنے ہیں زمانہ، وقت یا گذرتا ہوا وقت۔

کتنی لطیف شہادت وقت کی پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں وقت تو گذرا چلا جا رہا ہے جو لمحہ بھی گذرتا ہے انسان گھاٹے میں آتا چلا جاتا ہے۔ وجہ یہ کہ انسان کو عمر کا ایک محدود زمانہ عطا کیا گیا ہے کہ اس میں انسان جو کچھ کما سکتا ہے کمالے خواہ نیکیاں کما کر آخرت کے لئے جنت بنالے۔ خواہ بدیوں یا غفلت میں وقت گنوا کر اس عطیہ الٰہی یعنی وقت کو ضائع کر دے اور اپنی اُخروی زندگی برباد کرلے گویا سب سے بیش قیمت جو چیز ہے وہ وقت ہے اس کا ایک ایک لمحہ آئندہ زندگی کی خوشی اور آرام کا بنیادی پتھر ہے اور حالت یہ ہے کہ وہ گذرا چلا جا رہا ہے۔ جو لمحہ گذر گیا وہ پھر واپس نہیں آتا۔ اگر کسی مفید کام میں صرف ہو گیا تو وہ ایک خزانہ ہے اور اگر اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور وہ یونہی ضائع ہو گیا تو گھاٹا صریح نظر آ رہا ہے۔ دنیا کے کاموں کو دیکھ لو جس نے وقت کی قدر نہ کی اس کے گھاٹے میں آجانے میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ انسان کی عمر کے ہر آنے والے لمحہ کی آرام وخوشی اور تکلیف گذرے ہوئے وقت کے مفید یا غیر مفید کام میں صرف ہونے کا نتیجہ ہوا کرتی ہے امتحان کے لئے ایک میعاد وقت کی مقرر ہوتی ہے۔ جس طالب علم نے اس وقت مقررہ کے اندر محنت کی اور اپنے وقت کو ضائع نہ کیا وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور جو کھیلتا اور وقت کو ضائع کرتا رہا وہ ناکام اور گھاٹے میں رہتا ہے۔ آج یورپ نے اس چیز کی قدر پہچانی ہے وہ کس طرح وقت کی قدر کرتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس لئے دنیوی زندگی میں وہ کس قدر کامیاب قوم ہے۔ پس کامیابی اور نقصان سے بچنے کا راز ہی یہ ہے کہ وقت کو مفید کام میں صرف کرے اور ضائع نہ جانے دے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عمر کا ایک محدود وقت عطا فرمایا ہے جو گھڑی بھی بغیر کسی مفید کام میں صرف ہوئے گذر گئی وہ گھاٹا دے گئی۔ نادان انسان ہر سال اپنی سالگرہ مناتا اور خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میری عمر کا ایک اور سال بڑھ گیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایک سال گھٹ گیا۔ کیا خوب کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ کرتا ہے منادی: خالق نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹا دی

پس جس کا اعمال مفید کاموں میں صرف ہوا وہ کامیاب ہے۔ اور جس نے وقت کو ضائع کیا وہ صریح گھاٹے میں ہے۔ گویا یہ ایک برف کی تجارت ہے جو برف بک گئی وہ نفع دے گئی جو نہ بکی وہ گل گئی اور گھاٹا دے گئی۔ اسی طرح جو لمحہ مفید کام میں صرف ہو گیا نفع دے گیا۔ جو مفید کام میں صرف نہ ہوا گل گیا اور گھاٹا دے گیا۔ پس انسان کی موجودہ زندگی جب کسی آئندہ زندگی کی تمہید ہے تو اس زندگی کا ہر لمحہ اگر آئندہ زندگی کے اعلیٰ اور بہتر بنانے میں کام نہ آیا تو گھاٹا دے گا۔ اسی لئے فرمایا کہ وقت گذر رہا ہے اور اپنے گذر جانے سے انسان کو گھاٹے میں ڈال رہا ہے۔ سوائے اس کے کہ انسان ایمان لائے اور نیک اعمال کرے اور تبلیغِ حق اور تبلیغِ صبر کرے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا چھوڑ دے جب ترکِ دنیا کر دی تو عمل ہی نہ رہا۔ دنیا میں رہنے، محنت وسعی کرنے، دولت کمانے

دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں ہی اعمال کا ظہور ہوتا ہے خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے۔ تو پھر ترکِ دُنیا یا رہبانیت سے تو ان اعمال ہی سے انسان محروم ہو جاتا ہے جن سے انسان کی تکمیلِ اخلاق ہوتی ہے۔ پس یہاں ترکِ دنیا کا مطلب نہیں بلکہ دین یا دوسرے لفظوں میں ایمان اور اعمالِ صالحہ نام ہے اُن اصولوں کو ماننے اور ان پر عمل کرنے کا جن پر چلنے سے دنیا کو یعنی حق اللہ و حق العباد کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ادا کیا جائے۔ وہ وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور بالخصوص محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ انسان کو سکھائے۔ ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ لازم ملزوم کی طرح ہیں محض کسی صداقت کو ماننے سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک اس کے مطابق عمل نہ کیا جائے مثلاً یہ ایک صداقت ہے کہ پانی سے پیاس بجھتی ہے روٹی کھانے سے بھوک دُور ہو جاتی ہے میگنیشیا پینے سے دست آتے ہیں لیکن جب تک پانی نہ پیا جائے محض پانی کو پیاس بجھانے والا مان لینے سے پیاس نہیں بجھ سکتی روٹی کو جب تک کھایا نہ جائے گا بھوک دُور نہیں ہوگی۔ میگنیشیا کو جب تک پیا نہیں جائے گا دست نہیں آئیں گے۔ محض ان کے خواص کو مان لینے سے وہ اپنا اثر نہیں دکھا سکتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ، ملائکہ، کتب، رسل، یوم آخر پر ایمان لانے کا مقصد محض ان چیزوں کے مان لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ان اصولوں کے مطابق عمل نہ ہو جو ان چیزوں پر ایمان لانے میں پیش نظر ہیں۔ پس اگر کچھ صداقتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت اور اگلی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ضروری سمجھا۔ اور انسان کو محض اپنی رحمانیت سے اپنے رسولوں کے ذریعہ سکھایا تو پھر ان صداقتوں کو جہاں ماننا ضروری ہے وہاں ان کے مطابق عمل کرنا بھی ضروری ہے پس یہ تو ہُوا ایمان اور اعمال صالحہ جس سے انسان کے اپنے نفس کی تہذیب اور تکمیل ہوتی ہے لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد فقط نفس ہی نہیں کہ وہ فقط اپنے ہی نفس کی اصلاح کرے بلکہ اس کا ایک مقصد اجتماعی بھی ہے یعنی دوسروں کے نفس کی اصلاح کی بھی اسے فکر ہونی چاہیئے ورنہ گھاٹا باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے وصیّت کرنا حق کی اور وصیّت کرنا صبر کی۔ وصیت کے معنے ہیں ایسی نصیحت کرنا جس میں تاکید مدنظر ہو اسی لئے مرتے ہوئے بھی جو کچھ نصیحت اور ہدایت کی جاتی ہے وہ بھی وصیت کہلاتی ہے پس ایک مسلمان کا جو حق و صداقت پر ایمان لایا ہے اور اس کے مطابق عمل صالحہ بجا لاتا ہے فرض ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی جن سے اس کا تعلق پڑتا ہے اُس حق و صداقت کو پہنچائے جس پر وہ خود ایمان لایا ہے اور صبر کی وصیت کرے۔

صبر۔ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے شرعی اور تقدیری احکام پر استقامت کو۔ یعنی شریعت میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں ان کے اوامر پر عمل کرنے اور نواہی سے اجتناب کرنے میں استقامت دکھانا اور تقدیری امور جو ہیں یعنی دُکھ اور سکھ۔ ان میں سے جو حالت بھی اس پر وارد ہو اس میں امور شرعی پر قائم رہنا اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے راضی رہنا۔ پس جہاں مومن کا فرض ہے کہ وہ حق کو دوسروں تک پہنچائے وہاں یہ بھی فرض ہے کہ مخاطب کو صبر کی بھی نصیحت کرے۔ یعنی نصیحت کرے کہ حق قبول کرنے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اور مخالفتیں ہوتی ہیں ان سے نہ گھبرائے اور صبر سے برداشت کرے اور حق سے کسی صورت میں بھی نہ ہٹے۔ اور

جن صداقتوں کو قبول کیا ہے ان پر عمل کرتا ہے اور اس میں ایسی استقامت دکھائے کہ تکلیف یا راحت دُکھ یا سُکھ غرضکہ کوئی حالت بھی وارد ہو اس کا قدم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری سے نہ ہٹے۔

اب یہ امر بھی سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ قرآن میں فرمایا ہے کہ لم تقولون مالا تفعلون۔ کہ وہ بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں۔ پس مومن جو کچھ کسی دوسرے کو کہے گا وہ پہلے خود کرے گا۔ اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں جو دوسروں کو وصیت کرنے کا حکم دیا ہے اس میں تواصوا بالحق کو امنوا کے مقابل میں رکھا ہے اور تواصوا بالصبر کو عملوا الصلحٰت کے مقابل میں رکھا ہے تواصوا بالحق کو امنوا کے مقابل رکھنے میں یہ اشارہ ہے کہ مومن جو دوسروں کو حق کے قبول کرنے کی وصیت کرتا ہے۔ تو وہ خود ناحق کو کس طرح قبول کر سکتا ہے پس امنوا کے معنے ہوئے حق پر ایمان لانے والا یعنی ایمان کہتے ہی ہیں کسی سچائی اور حق و صداقت کے قبول کرنے کو۔ ناحق اور جھوٹے عقیدوں کو ماننا قرآن کی اصطلاح میں ایمان نہیں کہلا سکتا۔ ہر ایک گندی اور مشرکانہ اور جھوٹی بات کو مان لینا اور اس کا نام ایمان رکھنا قرآن کے صریح خلاف ہے۔ پس مومن کا کام ہے کہ وہ خود بھی حق کو مانتا ہے اور دوسروں کو بھی حق پر ایمان لانے کی وصیت کرتا ہے اسی طرح مومن صبر کی کسی کو نصیحت نہیں کر سکتا جب تک وہ خود بھی اس پر عامل نہ ہو۔ اس لئے تواصوا بالصبر کو عملوا الصلحٰت کے مقابل پر رکھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ صبر اور اعمال صالحہ ایک دوسرے سے جدا نہیں اسی لئے ایک کی جگہ دوسرے کو استعمال کیا تا ایک دوسرے کے ساتھ تلازم ملزوم ہونے کی اہمیت واضح ہو جائے کسی عمل صالح پر نفع مرتب نہیں ہو سکتا جب تک اس پر استقامت نہ ہو۔ اگر ایک شخص تیس برس نماز پڑھے اور بعد میں چھوڑ دے یا تمام عمر سچ بولے اور مرنے سے قبل ایک سال جھوٹ بولنا شروع کر دے اور تمام عمر ملازمت میں دیانت داری کرے اور پنشن سے قبل رشوت لینے لگے یا عمر بھر مسلمان رہے اور مرنے سے پہلے مرتد ہو جائے تو بہ وجہ استقامت نہ ہونے کے اس کے اعمال صالحہ ضائع ہو گئے۔ ایک جھوٹ بولنے والے کی اس لئے خوبی نہیں کی جا سکتی کہ وہ آج سے ایک سال قبل سچ بولا کرتا تھا کسی بددیانت رشوت خور کے ساتھ رعایت نہیں کی جا سکتی کہ وہ آج سے دو سال قبل بہت دیانت دار آدمی تھا ایک شرابی سے اس لئے رعایت نہیں کی جا سکتی کہ آج سے ایک سال قبل تک اس نے تمام عمر شراب نہیں چکھی تھی۔ اسی کو حضرت نبی کریم صلعم نے فرمایا تھا کہ ایک شخص نیکیاں کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ بہشت کا دروازہ اس سے ایک بالشت کے فاصلہ پر رہ جاتا ہے اور وہاں سے وہ یکایک جہنم میں جا گرتا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ اعمال صالحہ پر استقامت نہ ہونے کی وجہ سے وہ پھل جو ملنا تھا اس سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کنواں کھودتا ہے تیس فٹ کھود کر چھوڑ دیتا ہے۔ ممکن ہے دو فٹ اور کھودتا تو پانی نکل آتا۔ اب اس کی تیس فٹ کھودنے کی محنت ضائع گئی کیونکہ اس نے اپنے فعل میں استقامت نہیں دکھائی اسی لئے صوفیا نے کہا ہے کہ الاستقامت فوق الکرامت کہ استقامت کرامت سے بھی بڑھ کر ہے حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ جو ایک بڑے باکمال ولی گذرے ہیں اُن کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا سال بھر ان کی خدمت میں رہا۔ آخر ایک دن کہنے لگا

کہ صاحب ہم تو آپ کی ولایت کی بڑی شہرت سن کر آئے تھے ہم نے تو آپ میں کوئی کرامت اور معجزہ نہ دیکھا فرمانے لگے کہ "سال بھر میں تو نے میرا کوئی قول و فعل قرآن و سنت کے خلاف دیکھا؟" کہنے لگا کہ "نہیں" فرمایا: "اس سے بڑھ کر کرامت اور کیا مانگتا ہے" اور یہی سچ ہے اعمال صالحہ پر استقامت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو منزل مقصود پر پہنچاتی ہے۔ پس اس سورت شریف میں جو صبر کو اعمال صالحہ کے مقابل میں رکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی عمل صالح ہی نہیں کہلا سکتا جو ایک وقت تک کر کے پھر چھوڑ دیا جائے یا کوئی مصیبت آ پڑے تو اس سے انحراف کر لیا جائے۔ پس مومن کا کام ہے کہ وہ جن صداقتوں پر ایمان لاتا ہے ان کے مطابق عمل بھی کرتا ہے اور اس شان سے عمل کرتا ہے کہ خواہ کوئی حالت بھی دکھ یا سکھ کی اس پر وارد ہو وہ کسی صورت میں بھی اس سے باز نہیں آتا۔ تب اس مقام پر وہ عمل حقیقی معنوں میں عمل صالح کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اور اعلیٰ اور کامل نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے اسی قسم کے اعمال کو جہاں ایک طرف اعمال صالحہ کہا ہے تو دوسری طرف الصبر کہا ہے گویا اعمال صالحہ اور استقامت و صبر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے بلکہ لازم و ملزوم ہیں۔ اور اسی قسم کے اعمال صالحہ یا صبر کی ایک مومن دوسروں کو وصیت کرتا ہے۔

خلاصہ مطلب یہ کہ اس سورت میں مومن کے دو قسم کے فرائض بتائے ہیں جن کے بجالانے سے وہ گھاٹے سے بچ سکتا ہے اور سچی عزت و دولت کا وارث ہو سکتا ہے اور وہ ہیں (۱) ایک تو نفسی یعنی اپنی نفس کی اصلاح اور (۲) دوسرے ہیں اجتماعی یعنی دوسروں کی اصلاح۔ جب تک یہ دونوں قسم کے فرائض ادا نہ ہوں مومن اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہوتا۔ پھر ان دونو قسم کے فرائض میں سے ہر ایک میں دو دو امور ضروری قرار دیئے ہیں ملے اپنے نفس کی اصلاح کے لئے ضروری قرار دیا۔ (۱) حق پر ایمان لانا (۲) اور اس حق کے مطابق اعمال بجالانا اور ان پر استقامت دکھانا اسی طرح دوسروں کی اصلاح کے لئے بھی انہی دو امور کی تبلیغ کو ضروری قرار دیا ہے یعنی ایک (۱) حق پر ایمان لانے کی نصیحت کرنا (۲) دوسرے اس حق کے مطابق اعمال بجالانے میں استقامت دکھانے کی نصیحت کرنا۔ گویا مومن خود بھی حق کو قبول کرتا اور اپنے عمل سے اس پر قائم ہو جاتا ہے اور دوسرے کو بھی حق کے قبول کرنے اور اپنے عمل سے اس پر قائم ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے کو بھی حق کے قبول کرنے اور اپنے عمل سے اس پر قائم ہو جانے کی تبلیغ کرتا ہے تب وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہوتا اور اپنے مقصد زندگی کو پا لیتا ہے اور خسران سے بچ کر نفع کا وارث ٹھیرتا ہے اور یہی وہ عزت و دولت ہے جس کے لئے ہر مومن کو کوشش کرنی چاہیئے اور جس میں نفع ہی نفع ہے خسران نہیں۔

العصر میں اشارہ حضرت نبی کریم صلعم کے زمانہ کی طرف بھی ہے کہ یہ خاص زمانہ جامع اور خلاصہ ہے تمام زمانوں کا۔ اور نمونہ اور ماڈل ہے اس امر کا کہ وقت کو پہچاننے والے اور اس سے نفع اٹھانے والے کس طرح اپنے مقصد زندگی کو پا لیتے اور دنیا و آخرت کے خسران سے بچ جاتے ہیں اور وقت کو نہ پہچاننے والے اور اسے ضائع کر دینے والے کس طرح دنیا و آخرت کے خسران کے وارث ٹھیرتے ہیں۔ دیکھ لو اس

خاص زمانہ میں ایک طرف وہ قوم نظر آتی ہے جو اس حق کو قبول کرتی ہے جو محمد رسول اللہ صلعم دنیا میں لائے تھے اور پھر اس کے مطابق عمل کرتی اور اس طرح اس پر قائم ہو جاتی ہے کہ اس سے کوئی مصیبت اور ایذا دہی انہیں ہٹا نہیں سکتی پھر اتنا ہی نہیں دوسروں کو اس حق کے قبول کرنے اور اس پر اپنے عملوں کے ساتھ قائم ہو جانے کی تلقین اور تبلیغ کو وہ اپنا فرض سمجھ کر اس کے لئے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ دیکھ لو وہ قوم جس طرح اپنے مقصدِ زندگی کو حاصل کر لیتی اور دنیوی و اخروی کامیابی اور نفع کی وارث ٹھیرتی ہے کیا دنیا میں اس کی کوئی نظیر ہے؟ اس کے بالمقابل وہ جماعت بھی نظر آتی ہے جس نے اس حق کو قبول نہ کیا اور وقت کو نہ پہچانا۔ بلکہ اس حق کی اشاعت و تبلیغ میں ہارج ہوئی اس نے جس طرح دنیا و آخرت میں نقصان اٹھایا وہ بھی بے نظیر ہے اور اس وقت پر کیا منحصر ہے آج مسلمانوں کی قوم ہے جو اگرچہ ایمان لانے کی مدعی ہے لیکن نہ تو خود اس پر عامل اور قائم ہے اور نہ دوسروں کو اس کی وصیت کرتی ہے وہ اگر دنیا میں گھاٹے پر گھاٹا اٹھا رہی ہے تو کیا عین قرآن کی وعید کے مطابق نہیں ہے؟ اور کیا یہ سورت اُن مسلمانوں کے لئے تازیانہ نہیں ہے جو مسلمان کہلا کر عمل نہیں کرتے۔ اور لغویات میں اپنی عمر ضائع کرتے ہیں یا خود تو عمل کرتے ہیں لیکن دوسروں کو اس حق کی تبلیغ کرنے سے غفلت کرتے ہیں کیا وہ اس خسران سے بچ جائیں گے جس سے اس سورت میں ڈرایا گیا ہے۔ آج وہ جماعت جو اس حق کو نہ صرف خود قبول کرتی اور اس کے مطابق عمل کرتی ہے بلکہ دوسروں کو بھی اس حق کی تبلیغ کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے اور اس سورت کی منشا کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے گھاٹے میں ہے یا وہ جو ان کی مخالفت کرنے اور انہیں مٹانے پر ادھار کھائے بیٹھی ہے خوش قسمت وہ جو وقت کو پہچانتا ہے اور اس کی قدر کرتا ہے اور بدقسمت وہ جو اس وقت کو نہیں پہچانتا اور قدر نہیں کرتا۔ حضرت مجدد وقت کیا صحیح فرماتے ہیں ؎

خدمتِ دیں کا تو کھو بیٹھے ہو بغض و کیں سے وقت
اب نہ جائیں ہاتھ سے لوگو یہ پچتانے کے دن

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | وَهِيَ تِسْعُ اٰيَاتٍ

سورۃ الھمزۃ کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ دنیا کے مال اور عزت کی کثرت کے لئے ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش میں اس قدر انہماک سے کہ نتائج اعمال سے بھی انسان غافل ہو جائے سورۃ التکاثر میں منع فرما کر سورہ العصر میں بتلایا کہ انسان کا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ وہ ایمان اور اعمال صالحہ پر خود بھی قائم ہو جائے۔ اور دوسروں کو بھی اس پر قائم کرنے کی کوشش کرے تب تو وہ گھاٹے سے بچے گا ورنہ صرف دنیا کی عزت اور مال میں بڑھ جانا انسان کو حقیقی نقصان اور گھاٹے سے بچا نہیں سکتا۔ انسان بالطبع نفع کا خواہشمند اور بڑائی کا متمنی ہے۔ اس کے حصول کی راہ یہی ہے کہ انسان ایمان و اعمال صالحہ پر خود بھی قائم ہو اور دوسروں

کو بھی قائم کرنے کی کوشش کرے اور کسی حالت میں بھی ان اخلاق فاضلہ سے نہ ہٹے جن پر ایمان و اعمال صالحہ قائم کرتے ہیں گویا اخلاق فاضلہ اور خیر خواہی و ہمدردی خلائق انسانی بزرگی اور حقیقی نفع کا اصل راز ہیں لیکن وہ لوگ جو تکاثر کی خاطر تتبع اعمال سے غافل ہو جاتے ہیں وہ اپنا نفع اور بڑائی اسی میں دیکھتے ہیں کہ بجائے اپنے اندر ایمان و عمل صالح سے اخلاق فاضلہ پیدا کرنے کے بہت سی دولت جمع کریں۔ اور اس کے لئے خواہ کیسے ہی اخلاق ذمیمہ طمع اور بخل کے ان میں پیدا ہوں پروا نہ کریں کیونکہ ان کی نگاہ میں روپیہ ہی بڑائی کی دلیل ہے اور دوسروں کی اصلاح میں وہ اپنی بڑائی نہیں دیکھتے بلکہ ان کی عیب شماری میں اپنی بڑائی سمجھتے ہیں وہ ایمان اور اعمال صالحہ سے اخلاق فاضلہ میں دوسروں سے سبقت لے جا کر اپنے اندر وجہ بزرگی پیدا کرنا نہیں چاہتے بلکہ دوسروں کی تحقیر کر کے اپنی بڑائی کو دکھانا چاہتے ہیں وہ لوگوں میں اگر کوئی کمزوری یا عیب دیکھتے ہیں تو ان کے اندر ہمدردی و خیر خواہی کا پاک جذبہ نہیں پیدا ہوتا جس کے ماتحت وہ ان کی اصلاح کی کوشش کرتے بلکہ ان کے اندر حسد اور تکبر کا ناپاک جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ عیب شماری اور طعن و تشنیع سے اپنے دل کو خوش کرتے اور اپنی بڑائی کو ظاہر کرتے ہیں فرماتے ہیں یہ راہ حقیقی بزرگی اور بڑائی اور نفع کے حصول کی نہیں بلکہ ہلاکت اور لعنت کی راہ ہے جس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ افسوس اور ہلاکت ہے ہر عیب لگانے والے اور طعن کرنے والے کیلئے۔

الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ جو مال کو جمع کرتا ہے اور اسے گنتا رہتا ہے۔

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ رکھے گا۔

ھمزۃ کے معنے ہیں پیٹھ پیچھے عیب لگانے والا۔ اس میں عیب شماریاں، غیبت، بہتان، چغلخوری وغیرہ سب شامل ہیں

لمزہ کے معنے ہیں منہ پر عیب لگانے والا۔ اس میں طعن و تشنیع آوازے کسنا غرضکہ تحقیر کے تمام طریق شامل ہیں پیٹھ پیچھے کسی کی عیب شماری اس کی تحقیر کے لئے ہوتی ہے۔ لیکن جب اپنے تکبر اور بڑائی کا خیال زیادہ ترقی کر جاتا ہے تو پھر منہ پر بھی طعن و تشنیع سے ایسا آدمی فرق نہیں کرتا۔ فرمایا ایسا آدمی جس کی نظر اپنے عیوب اور ان کی اصلاح پر نہیں بلکہ دوسروں کے عیوب پر رہتی ہے اصلاح کی خاطر نہیں بلکہ عیب شماری اور طعن و تشنیع کی خاطر ایک طرف تو وہ دوسروں کی عزت اس ذلیل طریق سے خاک میں ملانے کی کوشش کرتا ہے اور دوسری طرف اپنی عزت کو اخلاق فاضلہ سے نہیں بلکہ محض دولت جمع کر لینے سے بلند کرنا چاہتا ہے جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ وہ حسد اور طمع و بخل جیسے اخلاق ذمیمہ کو اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے اسے اپنی حالت پر ماتم کرنا چاہیئے کیونکہ درحقیقت

وہ ہلاک ہوگیا۔ اس کی زندگی ایک لعنتی زندگی ہے۔ عدّدہ کے معنے ہیں اُسے گنتا رہتا ہے یعنی وہ اسی خیال میں رہتا ہے۔ کہ کسی طرح یہ مال بڑھتا ہی چلا جائے۔ خرچ نہ ہو مال کے ذریعہ جو ایک انسان نیکی کما سکتا ہے یعنی خدا کی راہ میں اور مخلوق کی خیر خواہی اور ہمدردی میں خرچ کر کے جو نفع اور ثواب حاصل ہو سکتا ہے وہ بدقسمت اس سے بھی محروم ہے یاد رہے کہ مال جو انسان کو محبوب ہے وہ اسی لئے ہے کہ اس سے اس کی اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں لیکن جس کے پاس مال ہو اور وہ اسے نہ اپنی ضروریات پر خرچ کرے اور نہ دوسروں کی ضروریات پر۔ تو اس صورت میں وہ کمایا ہُوا مال ٹھیکریوں اور کنکریوں سے بھی بدتر ہے یحسب ان مالہ اخلدہ یہ اس کے حال سے بطور نتیجہ استنباط کیا ہے یعنی روپیہ کو بُرے بھلے ہر طریق سے کما کر سینہ سے جو لگائے بیٹھا ہے تو اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ احمق سمجھ رہا ہے کہ یہ روپیہ اسے ہمیشہ رکھے گا۔ کچھ شک نہیں کہ ہمیشہ باقی رہنے کی تمنا تو انسان کی فطرت میں اپنی صحت کے درست رکھنے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے روپے کے کمانے اور دوسروں کے ساتھ فیاضی و نیکی کرنے میں روپیہ خرچ کرنے وغیرہ وغیرہ میں اگر کوئی مخفی تڑپ اور خواہش انسان کے سینے کے اندر نظر آتی ہے تو وہ یہی ہے کہ اس کی زندگی کو قیام اور دوام حاصل ہو فرمایا ہمیشگی کا راز تو انسان کے ایمان و اعمال صالحہ یعنی اخلاق فاضلہ میں مضمر ہے روپیہ کمایا تھا تو اس سے ہمیشگی کا مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا کہ خدا کی رضا اور منشاء کے ماتحت اُسے اپنے اوپر اور دوسری مخلوق پر خرچ کرتا۔ لیکن یہ شخص جو بوجہ بخل کے اپنے مال کو خرچ کرنا جانتا ہی نہیں اور بہت سے روپے کو ہی اپنی بڑائی کا معیار سمجھتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی حماقت سے یہ شخص سمجھتا ہے کہ محض روپیہ اسے ہمیشہ رکھے گا۔ کیونکہ اگر اسے یہ خیال ہو کہ میں نے آخر مرنا ہے اور اس دولت کو اسی دنیا میں چھوڑ جانا ہے تو پھر ضرور تھا کہ وہ اپنی ضروریات پر بھی خرچ کرتا۔ اور خدا کی راہ میں مخلوق کی ہمدردی و خیر خواہی میں بھی خرچ کرتا۔ کیونکہ یہی طریق ہے جس سے دنیا میں بھی انسان کے سر پر بقائے دوام کا تاج رکھا جاتا ہے اور آخرت میں بھی ابدی جنتی زندگی نصیب ہوتی ہے ایک دفعہ ایک بہت بخیل متمول شخص فوت ہُوا۔ مرنے سے قبل وہ تمام دولت خدا کی راہ میں دے گیا ایک ظریف نے مذاق سے کہا کہ دولت کی محبت اب بھی نہ گئی جیتے جی اپنے سینہ سے لگائے رہا۔ جب اس دنیا سے چلنے لگا تو حسرت ہوئی کہ ساری دولت یہیں چھوڑے جاتا ہوں اگلے جہان میں ساتھ لے جانے کی کوئی صورت نہ تھی سوائے اس کے کہ سب کچھ خدا کی راہ میں دے جاتا۔ لہٰذا خدا کی راہ میں سب کچھ دے کر ساری دولت ساتھ لیتا گیا"۔ الغرض مال اگر کسی صورت میں نفع دے سکتا ہے تو اسی صورت میں کہ خدا کی منشا کے مطابق وہ اپنی یا دوسروں کی ضروریات پر خرچ کیا جائے۔ پس جس قدر خلود یعنی ہمیشگی انسان کو مال کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے وہ اس کے برمحل خرچ میں مضمر ہے خواہ وہ دنیا کے لئے ہو یا آخرت کے لئے۔ لیکن جو شخص مال کو خرچ ہی نہیں کرتا اور دن رات اس کی بڑھوتی کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے تو سوائے اس کے کیا سمجھا جائے کہ وہ سمجھتا ہے کہ نہ میں مروں گا اور نہ یہ مال کبھی مجھ سے الگ ہوگا اور یہ سونے چاندی کے ٹکڑے ہی میری زندگی اور ہمیشگی کا موجب ہیں۔

كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ صلے ہرگز نہیں وہ ضرور حطمہ میں پھینکا جائے گا۔

حطمہ کے معنے ہیں توڑ دینے والی۔ یہ دوزخ کا نام ہے۔ فرمایا یہ حسد اور بخل کا مجسمہ ایک دن اسی طرح حسد اور بخل کی آگ میں جلتا ہوا دنیا کا سب مال و دولت اور جھوٹی عزت چھوڑ چھاڑ اگلے جہان میں اپنے عملوں کے نتائج بھگت رہا ہوگا۔ وہاں اپنے آپ کو اس دوزخ میں پائے گا جس کا ایک نام حطمہ بھی ہے یعنی توڑ دینے والی۔

وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ اور تجھے کیا خبر ہے کہ حطمہ کیا ہے۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوقَدَةُ ۝ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْـِٔدَةِ ۝ اللہ کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں پر اطلاع پاتی ہے یا دلوں پر طلوع یا روشن ہوتی ہے۔

إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝ ع وہ بڑے بڑے ستونوں (کی شکل) میں انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی یا اُن پر بند کر دی جائیگی۔ ع ۱ ۹ ۲۹

حطمہ کے لغوی معنی تو ہیں توڑ دینے والی اور یہاں اس کی تصویر جناب الٰہی نے یوں کھینچی ہے کہ وہ ایک آگ ہے جو اللہ تعالیٰ کی جلائی ہوئی ہے اللہ کی جلائی ہوئی اس لئے کہا کہ وہ خدا کے قانون کے ماتحت بطور نتیجہ روشن ہوئی ہے پھر بتلایا کہ تطلع علی الافئدۃ تو وہ آگ دلوں پر روشن ہوتی ہے یا دلوں پر اطلاع پاتی ہے یعنی اسے انسان کا قلب محسوس کرتا ہے اور اس آگ اور جہنم کا مرکز انسان کا قلب ہوتا ہے گویا آخرت میں دوزخ کی آگ اسی آگ کا ظہور ہوگا جو دنیا میں انسان کے قلب کے اندر روشن ہوتی ہے کیا بلحاظ اس کے کہ اعمال کا تعلق بلحاظ نیت اور ارادے وغیرہ کے قلب سے ہی ہوتا ہے جو انسان کے لئے بطور مرکز کے ہے (جیسا کہ حضرت نبی کریم صلعم فرماتے ہیں کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے یعنی قلب اگر وہ حالت اصلاح میں ہو تو سارا جسم حالت اصلاح میں ہوتا ہے اور اس میں فساد ہو تو سارے جسم میں فساد پیدا ہو جاتا ہے) اور کیا بلحاظ اس کے کہ جو شخص جذبات کا غلام ہو اور اس کے قلب میں حسد اور غضب اور شہوت اور طمع اور بخل وغیرہ کے جذبات موجزن ہوں وہ ایک ایسی آگ میں مبتلا ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اُسے سرد نہیں کر سکتی پس جو شخص خود تو ہر ایک خوبی و اخلاق فاضلہ سے بے نصیب ہے لیکن دوسروں کی غیب شماری اور طعن و تشنیع میں لگا رہتا ہے ظاہر ہے کہ اس کے قلب کے اندر حسد کی آگ جل رہی ہے جس کے ماتحت وہ لوگوں کی خوبی یا عزت کو دیکھ نہیں سکتا اور اپنے زبان کے حملوں سے ان کو توڑنا چاہتا ہے پس ضرور تھا کہ اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ اس کی جھوٹی شیخی اور ناحق کی بڑائی کو توڑ دیتا خواہ دنیا میں توڑ دے خواہ آخرت میں اس لحاظ سے اس عذاب کا نام حطمہ رکھا۔ یعنی توڑ دینے والی اور ضروری تھا کہ حسد کی آگ جو اس کے دل میں موجزن ہے آخرت میں آگ کی شکل میں اسے گھیرے۔ دنیا میں بھی جو شخص دولت کے جمع کرنے میں طمع اور بخل کے جذبات میں گھرا ہوا ہوتا ہے ایک آگ ہوتی ہے جو اس کے قلب میں جل رہی ہوتی ہے اور جو کسی طرح

ٹھنڈی ہونے میں آتی ہی نہیں آخرت میں یہی آگ متمثل نظر آئے گی۔ گویا وہی آگ جو حسد اور طمع و بخل کے اخلاق رذیلہ میں گھرا ہوا انسان دنیا میں ہر وقت قلب کے اندر محسوس کرتا ہے وہ آخرت میں اس کے گرد نظر آئے گی گرد اس لئے کہ جس طرح دنیا میں ایک حاسد اور بخیل انسان یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اچھی چیز کسی دوسرے کو ملے بلکہ وہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی لئے جمع کر لینا چاہتا ہے اور دوسروں کو اس سے محروم رکھنا چاہتا ہے تو ضرور تھا کہ ان تمناؤں اور خواہشات کی آگ بھی اس کے گرد سمٹ کر آرہتی اور لمبے ستونوں میں اس لئے کہ اس کی خواہشات ہمیشہ بڑھتی اور پھیلتی ہی رہتی تھیں پس وہ آگ جو اس کے دل سے شروع ہوئی تھی انسان کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی تمناؤں اور خواہشات کی وجہ سے جن میں وہ تمام عمر گھرا رہا اگر آخرت میں لمبے لمبے ستونوں میں اُسے گھیرے ہوئے نظر آوے تو کیا یہ اس کے اپنے ہاتھوں کی کرتوت اور عین سزا بالمثل نہ ہوگی؟ پس جناب الٰہی بتانا چاہتے ہیں کہ اے حاسد اور بخیل انسان تو اپنے گرد کیا سمیٹ رہا ہے۔ عزت اور دولت نہیں بلکہ آگ سمیٹ رہا ہے جس کی چنگاری تیرے دل سے ہی نکلی تھی تو سمیٹ لے نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی میں بند ہو کر رہ جائے گا۔ دنیا میں بھی دیکھ لو اس دنیا طلبی کی آگ میں جو پڑا وہ اس میں بند ہو کر رہ گیا پھر اس سے نکلنا نصیب ہی نہیں ہوتا الّا ان یشاء اللہ۔ حضرت مولانا نور الدین مرحوم ریاست جموں و کشمیر کی ملازمت کے زمانہ میں بھی قرآن سنا یا اور پڑھایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بہت سے نوجوانوں کو اپنے پاس سے خوراک اور پوشاک دے کر اپنے پاس رکھتے اور قرآن پڑھاتے تھے تاکہ کسی طرح قرآن کا علم انہیں نصیب ہو اور یہ کچھ خدمتِ دین کر سکیں۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک تعلیم یافتہ پنجابی نوجوان کشمیر میں حضرت مولانا سے قرآن پڑھا کرتا تھا۔ مولانا اس کا سارا خرچ دیتے تھے۔ ابھی تھوڑا ہی قرآن پڑھا تھا کہ فیروز پور میں اسے ایک فرم کی طرف سے ملازمت مل گئی۔ اس نے مولوی صاحب سے درخواست کی کہ مجھے اس ملازمت کی اجازت دی جاوے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ وقت کو غنیمت سمجھو اور قرآن پڑھ لو۔ ملازمت کا کیا ہے پھر مل جائے گی۔ کہنے لگا کہ نہیں اس وقت یہ ملازمت مجھے اچھی نظر آرہی ہے میں قرآن کا مطالعہ جاری رکھوں گا اور وقتاً فوقتاً آپ سے استصواب کرتا رہوں گا مولوی صاحب نے اسکی مرضی دیکھ کر اجازت دیدی اتفاق سے مولوی صاحب بھی کشمیر سے جموں آرہے تھے دونو صاحب ایک ہی ٹانگہ پر راولپنڈی کو روانہ ہوئے۔ رستہ میں ایک جگہ ٹھہر کر وضو کیا ظہر کی نماز پڑھی وہ نوجوان قرآن کو جزدان میں رکھکر ہر وقت گردن میں حمائل رکھتا تھا۔ اس نے وضو کیلئے حمائل گلے سے اُتار کر درخت پر ٹانگ دی نماز کے بعد اسے حمائل درخت سے اتارنی یاد نہ رہی ٹانگہ پر چڑھ گئے کئی میل جب نکل آئے تو مولوی صاحب کو خیال آیا دریافت کیا کہ وہ حمائل کہاں ہے وہ نوجوان کہنے لگا افوہ وہ تو وہیں رہ گئی مولوی صاحب نے فرمایا "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ قرآن آپ سے گیا" کہنے لگا کہ نہیں ہو مولوی صاحب آپ بھی کیا فرماتے ہیں میں راولپنڈی پہنچتے ہی نیا قرآن خرید لوں گا" راولپنڈی پہنچے۔ ریل پر چڑھے رستہ میں مولوی صاحب نے پوچھا کہ قرآن خرید لیا؟ کہنے لگا۔ افوہ مولوی صاحب خیال ہی نہ رہا" مولوی صاحب نے فرمایا کہ "مجھے تو ایسا ہی نظر آتا ہے کہ قرآن آپ سے گیا" کہنے لگا مولوی صاحب آپ بھی بعض وقت توہمات کے ماتحت باتیں کہنے لگتے ہیں بات ہی کیا ہے میں فیروز پور پہنچتے ہی نیا قرآن خرید لونگا۔ خیر وزیر آباد کے اسٹیشن پر جدائی ہوگئی اس کے بعد اس نے کبھی کوئی خط مولوی صاحب کو نہ لکھا کئی سال کے بعد مولوی صاحب جو فیروز پور گئے تو پتہ پوچھتے ہوئے اس کی دوکان پر بھی پہنچے۔ دیکھا کہ دوکان بڑی رونق پر ہے اور سینکڑوں وی پی پارسل بندھ رہے ہیں اور جا رہے ہیں اور

روپیہ پانی کی طرح بہا چلا آ رہا ہے وہ مولوی صاحب سے بڑے تپاک سے ملا۔ اس نے بتلایا کہ کس طرح وہ ایک کامیاب تاجر ثابت ہوا ہے یہاں تک کہ اس نے وہ ساری فرم ہی خرید لی ہے اور اب تو وہ اس کا مالک ہے مولوی صاحب نے پوچھا کہ چلو اللہ نے بڑا افضل کیا مگر یہ تو بتاؤ وہ قرآن آپ نے خرید لیا تھا؟ اس پر وہ شرمندہ ہو گیا کہنے لگا" مولوی صاحب اس قدر کام میں انہماک رہا ہے کہ قرآن خریدنے کا خیال ہی دل سے نکل گیا" مولوی صاحب نے فرمایا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ" قرآن اب آپ سے رخصت ہو گیا" پس یہ حقیقت ہے کہ دنیا طلبی کی آگ میں جو گھر گیا پھر دنیا میں بھی اس آگ سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے تو چہ جائیکہ آخرت میں۔ وہاں جو آگ نظر آئے گی آخر انہی جذبات نفسانی کا تمثل ہوگا جن کا مرکز قلب انسانی ہے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی مثنوی میں اسی مضمون کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں اشعار تو مجھے بھول گئے۔ مگر ان کا مفہوم مجھے یاد ہے۔ لکھتے ہیں کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ آخرت میں جنتی لوگ جب جہنم پر سے پل صراط پر سے گذر کر جنت میں داخل ہوں گے تو وہ دریافت کریں گے کہ ہم نے تو سنا تھا کہ جنتی لوگ جہنم پر سے گذریں گے لیکن ہم نے تو رستہ میں کوئی جہنم نہیں دیکھا۔ ملائکہ کہیں گے کہ رستہ میں تم نے کچھ باغ دیکھے تھے؟ جنتی کہیں گے کہ ہاں چار باغ دیکھے تھے جو نہایت سرسبز تھے ملائکہ کہیں گے کہ وہی جہنم تھا جنتی حیرت سے کہیں گے کہ ہم نے تو سنا تھا کہ وہ آگ ہوگی۔ پھر جہنم باغ کی شکل میں کیسے نظر آیا۔ ملائکہ کہیں گے کہ جہنم آگ کی شکل میں دوزخیوں کے لئے ہے جنہوں نے دنیا میں اپنے جذبات کی آگ کو اپنی بد اعتقادیوں اور بد اعمالیوں کے ایندھن سے بھڑکایا۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے دنیا میں ان جذبات کو قابو میں رکھا۔ اور صراط مستقیم پر چلایا ان کے یہی جذبات باغ اور جنت پیدا کرنے کا موجب ہو گئے۔ پس تمہیں وہ جہنم کی آگ کی شکل میں کیسے نظر آتا بلکہ ضرور تھا کہ وہ باغوں کی شکل میں نظر آتا۔ چار باغ چار جذبات کو قابو میں رکھنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور وہ ہیں حرص اور شہوت، غضب اور حسد۔ وہ تمہارے لئے باغ ہیں مگر دوزخیوں کے لئے آگ ہیں۔

پل صراط پر سے گذرنے میں بھی یہی راز نہاں ہے وہ کیا ہے وہ یہی صراط مستقیم ہے جو قرآن کے ذریعہ اہل دنیا کو پیش کی گئی اور وہ صراط مستقیم کیا ہے انہی جذبات انسانی کو اعتدال پر قائم رکھنا اور افراط و تفریط سے بچانا جس نے اعتدال کو قائم رکھا وہ اس صراط مستقیم پر سے گذر گیا اور جہنم میں گرنے سے بچ گیا۔ اور جس نے افراط و تفریط سے کام لیا اور اس کا توازن درست نہ رہا وہ جہنم میں گر پڑا۔ جس طرح سرکس میں جو شخص تار پر چلتا ہے اس میں ساری حکمت ہی یہ ہوتی ہے کہ تار پر چلنے والا اپنی نظر سامنے کسی چیز پر گاڑ دیتا ہے اور جسم کا توازن ٹھیک رکھنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح پل صراط پر سے گذرنے پر جس کی نسبت آیا ہے کہ وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے اعتدال میں ذرا سا فرق آجانے سے افراط و تفریط کا ارتکاب ہو کر صراط مستقیم سے نیچے گر جانے کا اندیشہ رہتا ہے اور جب صراط مستقیم سے انسان گرتا ہے تو نیچے سوائے جہنم کے کچھ نہیں پس جو شخص اس صراط مستقیم پر جو بال سے باریک ہے چلنا چاہتا ہے چاہیئے کہ وہ نظر اپنی جناب باری پر گاڑ دے یعنی اسی کی فرمانبرداری ہر وقت اس کے مدنظر ہو اور اسی کی رضا کے ماتحت اپنے نظام باطنی یعنی جذبات کو توازن پر رکھے یعنی افراط و تفریط سے بچا کر اعتدال پر رکھے۔ ایسا شخص یقیناً صراط مستقیم پر سے کامیابی کے ساتھ گذرے گا اور منعم علیہ گروہ میں جا ملے گا اور اس کے جذبات جہنم کی بجائے جنت پیدا کریں گے

سُوْرَۃُ الْفِیْلِ مَکِّیَّۃٌ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَھِیَ خَمْسُ اٰیَاتٍ

سورۃ الفیل کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ سورۃ الھمزہ میں اُن لوگوں کے لئے ہلاکت بتلائی تھی جو دوسروں کی عیب شماری اور تحقیر کرتے ہیں اور محض مال کے جمع کرنے کو بڑائی کا نشان سمجھتے ہیں۔ اس سورت میں یہ بتلایا ہے کہ ان متکبروں کا انجام خود سوچ لو جن کا معیار بڑائی کا صرف دنیا کا مال ہے اور جو اپنی زبانوں اور ہاتھوں سے اس شخص کے قلب کو تکلیف پہنچاتے ہیں جس کا قلب خدا کا گھر ہے یعنی محمد رسول اللہ صلعم کے قلب کو طرح طرح سے ایذا دیتے ہیں اُن کی آنکھوں کے سامنے کعبہ موجود تھا جسے وہ خدا کا گھر مانتے تھے۔ اس کی طرف توجہ دلا کر اس واقعہ کو یاد دلایا ہے جب ابرہہ بادشاہ یمن ہاتھی لے کر کعبہ ڈھانے آیا تھا اور خود ہلاک اور برباد ہو گیا تھا اور مقصد اس واقعہ کو یاد دلانے سے یہ بتانا تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم کا قلب بھی یقیناً خدا کا گھر ہے بلکہ ہر مومن کا قلب خدا کا گھر ہوتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں آسمان و زمین میں نہیں سماتا مگر مومن کے قلب میں سما جاتا ہوں اسی حدیث کو مولانا روم اپنی مثنوی میں کس خوبصورتی سے منظوم کرتے ہیں فرماتے ہیں ؎

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است — من نگنجم ہیچ در بالا و پست!

در دل مومن بگنجم اے عجب — گر مرا خواہی دراں دلہا طلب

حضرت سید عبد القادر جیلانیؒ فرماتے ہیں ؎

بے حجابانہ درآ از در کاشانۂ ما — کہ کسے نیست بجز درد تو در خانۂ ما

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ فرماتے ہیں ؎

مرا در دل بجز از دوست چیزے در نمی گنجد — بخلوت خانۂ سلطاں کسے دیگر نمے گنجد

درون قصر دل دارم یکے شاہے کہ گر گاہے — اگر بیروں زند خیمہ بہ بحر و بر نمے گنجد

حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعودؑ فرماتے ہیں ؎

گرچہ منسوبم کند کس سوئے الحاد و ضلال — چوں دل احمدؐ نمی بینم دگر عرش عظیم

اور یہی سچ ہے انسان کے دل میں اگر خدا اتر آئے تو اس سے بڑھ کر کون خانۂ خدا ہو سکتا ہے اور محمد رسول اللہ صلعم سے بڑھ کر کس کے دل میں خدا بسے گا جن کے متعلق خود کفار عرب کہہ اُٹھے تھے کہ عَشِقَ مُحَمَّدٌ رَبَّہٗ۔ کہ محمد اپنے رب پر عاشق ہو گیا ہے خود یورپین مورخین نے مانا ہے کہ محمد (صلعم) کے دل میں تو خدا ایسا بسا تھا کہ انہیں ہر چیز میں خدا ہی نظر آتا تھا۔ اگر کسی چیز کو یا بستی کو خوشحال دیکھتے تھے تو بول اٹھتے تھے کہ اس نے میرے رب کو راضی کیا ہے۔ اس لئے خوشحال ہے اگر کسی چیز کو برباد اور کسی بستی کو تباہ دیکھتے تھے تو کہا اٹھتے تھے کہ میرے رب کو اس نے ناراض کیا اس لئے برباد ہو گئی غرضکہ ہر رنگ میں انہیں خدا کا ہی ہاتھ نظر آتا تھا یہ دشمنوں کی گواہی ہے پس اس سورۃ الفیل میں یہ بتایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کے قلب پر جو خدا کا گھر ہے جو لوگ حملے کرتے اور اس کے بنائے ہوئے ۔۔۔۔۔

خدا کے گھروں (یعنی مومنوں کے قلوب) کو ڈھانے کی اور انہیں ہلاک کرنے اور اسلام کو مٹانے کی تجویزیں کرتے ہیں اُن کا وہی انجام جناب الٰہی سے مقدر ہے جو اصحاب الفیل کا ہوا جو خانۂ خدا کعبہ کو ڈھانے آئے تھے اسی کو مولانا روم فرماتے ہیں ؎

تا دلِ مردِ خدا نا یدبدرد ❊ ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد

ارشاد ہوتا ہے:۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ۝ کیا تو نے نہیں دیکھا یا غور نہیں کیا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔

أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۝ کیا اُس نے ان کی تدبیر کو برباد نہیں کر دیا۔

وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝ اور ان پر جھُنڈ کے جھُنڈ پرندے بھیجے۔

ابابیل کے معنے ہیں ڈار کی ڈار۔ جھنڈ کے جھنڈ۔ کسی خاص پرندہ کا نام نہیں۔

تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۝ جو انہیں کنکر کی پتھریوں سے مارتے تھے یا انہیں سخت پتھروں پر مارتے تھے۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝ سو انہیں کھائے ہوئے بھُس کی طرح کر دیا۔ ۱ع۵

اصحاب الفیل کا واقعہ مشہور تاریخی واقعہ ہے۔ ابرہہ یمن کا عیسائی بادشاہ تھا جو حبش کے بادشاہ کا باجگزار تھا اس نے صنعا اپنے دار السلطنت میں ایک عظیم الشان گرجا بنوایا جس کی غرض یہ تھی کہ اہل عرب بجائے خانہ کعبہ میں جمع ہونے کے اس گرجے میں جمع ہوا کریں اور اس طرح انہیں آہستہ آہستہ عیسائی بنا لیا جائے مگر چونکہ اہل عرب نے ابرہہ کے اس گرجے کی پروا نہ کی تو اس نے خانہ کعبہ کو ڈھا دینے کا ارادہ کیا کہ جب یہ گھر جو تمام عرب کا مرجع بنا ہوا ہے مٹ جائے گا تو لوگ پھر خود بخود اس گرجے کی طرف رجوع کریں گے اور یہ واقعہ باتفاق مورخین اسی سال کا ہے جس سال آنحضرت صلعم کی ولادت مبارک ہوئی اس لئے اس سال کا نام عرب میں عام الفیل ہو گیا اور اس لشکر کا نام اصحاب الفیل پڑ گیا اور یہ اس ہاتھی کی وجہ سے ہوا جو لشکر کے ساتھ تھا۔ اور جس کا نام محمود تھا اور بعض کے نزدیک کئی ہاتھی تھے اور ابرہہ کا ہاتھی محمود نامی تھا اور یہ ہاتھی وہ اسلئے لایا تھا کہ ان ہاتھیوں سے خانہ کعبہ کو گراؤں گا۔ جب یہ لوگ مکّہ کے قریب پہنچے تو انہوں نے عبد المطلب کے جو آنحضرت صلعم کے دادا تھے کچھ اونٹ پکڑ لئے۔ عبد المطلب نے ابرہہ سے واپس طلب کئے۔ ابرہہ نے تعجب سے کہا کہ تم اپنے اونٹ مانگتے ہو اور خانہ کعبہ کی نسبت کچھ طلب نہیں کرتے جسے میں ڈھانے آیا ہوں۔ عبد المطلب نے کہا میں تو اونٹوں کا مالک ہوں اس لئے انہیں طلب کرتا ہوں خانہ کعبہ کا بھی ایک مالک اور رب ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ الغرض ان لوگوں کے لشکر کی کثرت اور ہاتھیوں کی دھوم دھام

کو دیکھ کر اور ان کے مقابلہ کی اپنے اندر سکت نہ پاکر جناب عبدالمطلب نے مکہ کو اہالیٔ مکہ سے خالی کر دیا اور قریب کی پہاڑیوں پر چلے گئے۔ چلتے ہوئے کعبہ کی دروازہ کی کنڈی کو پکڑ کر کہا "ہمیں کوئی فکر نہیں انسان اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے سو تو خود اے رب اپنے گھر کی حفاظت کر۔ ان کی صلیب اور ان کی طاقت تیری طاقت پر کبھی غالب نہیں آسکتی" چنانچہ قبل اس کے کہ ابرہہ خانہ کعبہ تک پہنچ سکے۔ اس کے لشکر میں تباہی پھیل گئی۔ تباہی کس طرح پھیلی مفسرین عام طور پر تو یہی لکھتے ہیں کہ پرند جھنڈوں کے جھنڈ اس لشکر پر آئے اور ہر ایک کی چونچ میں ایک سنگریزہ اور دو دو سنگریزے پنجوں میں تھے اور وہ سنگریزہ جس شخص پر گرتا تھا اسے ہلاک کر دیتا تھا لیکن عکرمہ کا قول ہے کہ جس پر سنگریزہ گرتا تھا اسے چیچک نکل آتی تھی (تفسیر رازی) ایسی ہی روایت ابن کثیر نے یعقوب سے بیان کی ہے اور چونکہ احادیث صحیحہ میں اس کے بارہ میں کوئی تصریح نہیں اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ پرند جو جھنڈ کے جھنڈ آئے ان کے چونچ یا پنجوں سے جو مٹی یا سنگریزے گرے ان میں چیچک کا زہریلا جراثیم تھے جن کی وجہ سے لشکر میں چیچک پھوٹ پڑی اور ایسی مری پڑی کہ وہ لشکر تباہ ہو گیا اور خود ابرہہ چیچک سے بیمار ہو کر واپس یمن گیا اور وہاں سخت ناکامی کی حالت میں مر گیا اور وہ ہاتھی بھی فنا ہو گئے ہندوستان کے لوگ چیچک کی تباہی کا اندازہ آجکل نہیں لگا سکتے کیونکہ چیچک کے ٹیکہ نے اس وبا کو ہندوستان سے قریباً معدوم ہی کر دیا ہے لیکن اس کا اندازہ وہاں لگتا ہے جہاں چیچک کا ٹیکہ رائج نہ ہو۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں میں برٹش ایسٹ افریقہ گیا تھا وہاں جنگلیوں میں چیچک کا ٹیکہ اس وقت تک رائج نہ ہوا تھا۔ وہاں چیچک کی وبا پڑی تو ایسا قیامت خیز نظارہ نظر آیا کہ دل ہل گئے۔ جنگل ان حبشیوں کی لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔ ایسی خطرناک وبا کہ سینکڑوں آدمی چند دنوں میں ہلاک ہو گئے۔ جناب الٰہی جب ایک کام کرنا چاہتے ہیں تو عجیب و غریب طریق سے اس کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں۔ اور انسان کی حفاظت کی ساری تدبیریں خاک میں مل جاتی ہیں۔ دہلی کے ایک راجہ نے خواب میں دیکھا کہ اس کی موت سانپ کے ڈسنے سے واقع ہو گی اس نے ایک چکنے پتھر کی لاٹ بنوائی جس کے اوپر وہ سویا کرتا تھا اور اس چکنے پتھر پر سانپ نہ چڑھ سکتا تھا ایک دن وہ سویا ہوا تھا ایک چیل سانپ لے کر اڑی۔ وہ اس کے پنجوں سے چھٹا اور راجہ پر گرا۔ اور اسے ڈسا اور راجہ مر گیا۔ جن دنوں میں گجرات میں تھا شہر میں سخت طاعون پڑی۔ چوہے شہر میں بے حساب مرتے تھے ہم نے اپنے گھر کے سب چوہے مار دیئے۔ بل سب بند کر دیئے اور اپنی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہسپتال میں ایک درخت تھا جس پر چیل نے گھونسلا بنایا ہوا تھا وہ روز طاعون سے مرے ہوئے چوہے لا کر اپنے بچوں کو کھلایا کرتی تھی اس کو بارہا مارنا چاہا مگر وہ قابو نہ آتی تھی۔ آخر ایک دن طاعون سے مرا ہوا چوہا ہمارے صحن میں پھینک گئی۔ ہمارے لئے تو اس کا خطرہ بم کے گولہ سے کیا کم تھا اسے جلایا دوسرے دن پھر ایک چوہا پھینک گئی آخر سمجھ آگئی کہ اس میں اشارہ یہ ہے۔ کہ اسباب پر بھروسہ کر کے خدا کو بھول گئے ہو بیشک اسباب سے کام لو لیکن بھروسہ اللہ پر کرو۔ جب تک حفاظت الٰہی نہ ہو انسان بچ نہیں سکتا۔ چنانچہ بہت استغفار کی۔ دعا کی خدا کی شان۔ غالباً اسی شام کو چیل قابو آگئی اور ماری گئی۔ دوسرے دن اس کا دوسرا جوڑا بھی مارا گیا غرضکہ جناب الٰہی کی حفاظت نہ ہو تو انسان بچ نہیں سکتا۔ اصحاب الفیل پر پرندے اڑتے ہوئے آئے اغلب ہے کہ کسی دلدل

میں جو جراثیم سے بھری ہو بیٹھ کر اُڑے ہوں۔ ان کے پنجوں میں وہ سوکھی ہوئی کیچڑ لگی ہو جو ابرہہ کے لشکر پر گری۔ اور چیچک کے پھیلنے کا موجب ہو گئی۔ کنکر کے گرنے سے فوراً موت واقع ہو جائے یا وہ کنکر آخر کار موت کا باعث بن جائے بات تو ایک ہی ہے۔ دونوں امور ایک ہی بات کو ظاہر کرتے ہیں یعنی یہ کہ جناب الٰہی اس لشکر کو غارت کرنا چاہتے تھے اور کمزور اور ایک مشتِ پر پرندوں کے ذریعہ ان کو غارت کر دیا جو کنکریاں ان کے پنجوں سے گریں ان کے لگتے ہی موت ہوئی تو یا ان سے چیچک پھیل کر موت ہوئی تو ہر دو صورت میں وہ کمزور پرندے ان کی موت کا باعث ہوئے۔ پس جو خدا کمزور پرندوں سے ایک اتنے بڑے زبردست لشکر کو فنا کرا سکتا ہے وہ محمد رسول اللہ صلعم کی کمزور جماعت سے .. کفار مکہ کی زبردست جمعیت کو کیوں نہیں تباہ کرا سکتا۔ ضرور کرا سکتا ہے اور واقعات نے بتلا دیا کہ یہ پیشگوئی سچی تھی کس طرح صحابہ کی کمزور جماعت کے ذریعہ سے کفار مکہ کی زبردست فوجوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا اور کعبۂ اسلام اور وہ خدا کے گھر جو محمد رسول اللہ صلعم نے ہر مومن کے دل میں بنا دیئے تھے اور کعبہ کی طرح اُن کو ہر قسم کے بتوں سے پاک کر دیا تھا کس طرح جناب الٰہی نے بچا لئے۔ اس میں یہ سبق ہے کہ جب بھی کوئی قوم محمد رسول اللہ صلعم کے بنا کردہ خانۂ خدا یعنی اسلام کو اور ان مسلمانوں کو جنکے دلوں میں خدا کی توحید اور اسلام گھر کر چکا ہے مٹانا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اس وقت اسی طرح حفاظت کرے گا جس طرح اصحاب الفیل کے مقابلہ میں کی تھی۔ اسی کی طرف ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر اشارہ کرتا ہے ؎

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے ۔ آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بالخصوص پادریوں عیسائیوں کے مقابلہ میں جو یمن کے عیسائی بادشاہ ابرہہ کی طرح گرجے اور کلیسا کو فروغ دینے اور اپنی پولیٹیکل طاقت بڑھانے کی خاطر اسلام کو تباہ کرنے اور توحید الٰہی کو برباد کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں کمزور مسلمانوں کے ہاتھوں سے جن کے دلوں میں خدا بستا ہو گا اسی طرح اسلام کی اللہ تعالیٰ نصرت فرمائے گا جس طرح اصحاب الفیل کے مقابلہ میں نصرت فرمائی تھی کیونکہ اس خانہ خدا یعنی اسلام اور توحید الٰہی کا محافظ خود خدا ہے وہ جن کمزور ہستیوں سے چاہے کام لے لے۔ آج جو ہاتھی یہ عیسائی پادری لئے پھرتے ہیں وہ طرح طرح کے اعتراضات ہیں جن سے وہ مسلمانوں کے قلوب پر حملہ آور ہو رہے اور اُن کے دلوں سے خدا کے گھر کو مٹانے اور بجائے خدا کے دنیا کو کعبۂ مقصود بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جیسا کہ ایک دفعہ پادری عماد الدین نے لکھا تھا کہ "ہم اگر مسلمانوں کو عیسائی نہ بنا سکے تو اسلام پر اعتراضوں کے ذریعہ اُن کو مسلمان بھی نہ رہنے دیں گے"۔ لیکن خدا نے مسیح موعودؑ اور ان کی چھوٹی سی جماعت کو پرندوں کی طرح ایسا ان پر بھیجا جس نے اپنے لٹریچر کے آسمانی سنگریزوں سے ان کے اعتراضوں کے ہاتھیوں کو فنا کر دیا۔ بلکہ ان کے ان آسمانی سنگریزوں سے مسیحیت میں وہ مری پڑی۔ کہ وہ مذہب ہی اب دنیا سے رخصت ہو رہا ہے اور خود یورپ کے بڑے بڑے پادری اب تثلیث اور کفارہ سے بیزار ہوتے چلے جاتے ہیں اور کسر صلیب کا نظارہ اب اہل دانش سے پوشیدہ نہیں رہا۔ اس حدیث شریف کا بھی یہی مطلب ہے جس میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم نے رویا میں دیکھا کہ کعبہ کا طواف دجال بھی کر رہا ہے اور مسیح موعود بھی کر رہا ہے اور جس کی تعبیر محدثین نے یہ کی ہے کہ کعبہ کے گرد دجال کا گھومنا ایسا ہے جیسے کسی مکان کے گرد چور گھومتا ہے۔

جو چاہتا ہے کہ مکان میں نقب زنی اور چوری کرے۔ اور مسیح موعود کا گھومنا اس کے گرد ایسا ہے جیسے کسی مکان کے گرد چوکیدار حفاظت کے لئے گھومتا ہے اس کا مقصد ہوتا ہے کہ اگر کوئی چور ہو تو اسے پکڑے اور سزا دلوائے۔ پس عیسائی پوادر کا فتنہ جسے دجال کا نام دیا گیا ہے اور جو کعبہ کے گرد گھوم رہا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کی عمارت کو کسی طرح نقصان پہنچا دے اور اس کے خزانہ کو لوٹ لے اور اس کے لوگوں کو اپنے ساتھ لے جائے اور مسیح موعودؑ کے کعبہ کے گرد گھومنے کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کی عمارت کی حفاظت کرے۔ اور دجال کی کارستانیوں سے بفضلہٖ تعالیٰ بچائے۔

حضرت مولانا نورالدین مرحوم ارسل علیھم طیرًا ابابیل کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ یہ عرب کا ایک محاورہ ہے ان کے ہاں کسی پر پرندے بھیجنا معنے رکھتا ہے "اسے تباہ کرنا" عرب کے جاہلیت کے اشعار میں ان کے شعرا بڑے فخر سے شعروں میں کہا کرتے تھے کہ ہمارے لشکروں کے ساتھ ساتھ پرندے چلتے ہیں جیسا کہ نابغہ کا شعر ہے اذا ما غدا بالجیش حلّق فوقہ۔ عصائب طیر تہتدی بعصائب۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے لشکر ایسے فاتح ہیں کہ جب وہ اپنے لشکر کے ساتھ نکلتا ہے تو اسکے اوپر پرندوں کے جھنڈ حلقہ باندھ لیتے ہیں اور جدھر لشکر چلتے ہیں ادھر وہ بھی چلتے ہیں۔ پرندے ساتھ چلنے کا محاورہ یہاں سے لیا گیا ہے کہ جہاں لاشیں ہوتی ہیں وہاں مردار خور پرندے کثرت سے جمع ہو جاتے ہیں میں نے تو دیکھا ہے کہ کہیں کوئی بیل یا گھوڑا مر جائے اور لوگ اسے پھینکنے جائیں تو گدھ اور مردار خور پرندے جھنڈ کے جھنڈ انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں جہاں لوگوں نے پیٹھ پھیری اور انہوں نے لاشہ کو کھانا شروع کر دیا اور ان کی نظر ایسی تیز اور فطرت ایسی حساس ہوتی ہے کہ اگر کوئی لشکر فاتح ہو اور جگہ جگہ خونریزی کرتا ہوا چلا جاتا ہو تو یہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ساتھ دیا کرتے ہیں اسی کو جاہلیت کے شعرا بڑے فخر سے بیان کیا کرتے تھے۔ پس جب یہ فرمایا کہ ہم نے ان کی تدبیروں کو برباد کر دیا اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ ہم نے جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ ان کو ہلاک کر دیا اور ان کی لاشیں کھانے کے لئے پرندے جمع ہو گئے۔ ہمارے ہاں بھی اردو میں ایسا ہی ایک محاورہ ہے کہ ان کے لاشے چیل کوؤں سے کھلوا دیئے۔ ایک موت تو عزت کی موت ہوتی ہے جس میں موتی کے ورثا لاشہ کو بڑی عزت سے دفن کرتے ہیں اور ایک ایسی بے بسی اور بے عزتی کی موت ہوتی ہے کہ کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا اور لاشے چیل کوّے کھا جاتے ہیں۔ بائیبل میں یاجوج ماجوج کے متعلق بھی ایسے ہی الفاظ میں ہلاکت کی پیشگوئی کی ہے" تو اسرائیل کے پہاڑوں پر گر جائے گا تو اور تیرا سارا لشکر اس گروہ سمیت جو تیرے ساتھ ہے اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک کے لئے دوں گا" (حزقی ایل ۳۹-۴) پس اس سورت میں بھی یہی بتلانا مقصود ہے کہ وہ جو بڑے زعم اور دعووں کے ساتھ خانہ خدا کو ڈھانے آئے تھے ایسی بے کسی اور بے عزتی کی خبر تناک موت سے ہلاک ہوئے کہ ان کے لاشوں کو پرندوں نے کھایا ترمیھم بحجارۃ من سجیل کے معنے حضرت مولانا نورالدین مرحوم یہ کیا کرتے تھے کہ ان کی لاشوں کو سخت پتھروں پر مارتے تھے تاکہ ان کا گوشت ہڈی سے الگ ہو جائے اور وہ اسے کھا سکیں چنانچہ فجعلھم کعصف ماکول میں ماکول کا لفظ جس کے معنے ہیں "کھایا ہوا" بتاتا ہے کہ ان کا لاشوں کو پتھروں

پر مارنا کھانے کی غرض سے تھا ان پرندوں نے اس طرح کھایا کہ بیابان میں کھائے ہوئے بھس کی طرح نظر آنے لگے۔ ہڈیوں کے پنجر جو میدانوں میں پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا منظر اسی قسم کا عبرتناک اور بھیانک ہوتا ہے ایک دفعہ میں نے کھیوڑہ میں دیکھا کہ ایک لاشہ کو بہت سے گدھ نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں جب گوشت ہڈی سے جدا نہ ہوتا تھا تو وہ اسے پتھروں پر مارتے تھے جس سے گوشت ہڈیوں سے جدا ہو جاتا تھا مجھے اس وقت ترمیہم بحجارۃ من سجیل کی آیت یاد آ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں پرندوں کے گوشت کھانے کو اس تفصیل سے جو بیان فرمایا ہے تو اس کا ایک مقصد تو اس لشکر کے عبرتناک انجام کو ذہن نشین کرنا تھا۔ اور دوسرا مقصد مکہ والوں کو اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو جتلانا تھا۔ کہ جس طرح اصحاب الفیل کا لشکر ہلاک ہوا تھا اور چیچک کی وبا سے مری ہوئی لاشوں سے جنگل پٹا پڑا تھا ظاہر ہے کہ ان کے سڑنے اور متعفن ہونے سے مکہ کی آب و ہوا کس قدر خراب ہو جاتی جو مکہ کے لوگوں کی صحت کو تباہ کر دیتی بلکہ مکہ میں وبا پھیل جانے کا غالب احتمالی تھا اور تعفن اور بدبو سے زندگی دشوار ہو جاتی پس ایسے موقعہ پر ہزارہا پرندوں کا آکر نعشوں کا گوشت کھا کر صرف ہڈیاں چھوڑ جانا مکہ والوں پر جناب الٰہی کا احسان عظیم تھا کہ تعفن اور بدبو اور وبا اور خرابیٔ آب و ہوا سے بچ گئے پس مکہ والوں پر نہ صرف یہ احسان ہوا کہ کعبہ کو اور ان کی جانوں اور مال کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بچا لیا۔ اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کر دیا بلکہ دشمنوں کی ہلاکت کے بعد جو تعفن اور وبا پھوٹنے کا اندیشہ تھا اس سے بھی بچا لیا گیا گویا وہی پرندے جو دشمنوں کی ہلاکت کا نشان تھے ان کی نعشیں کھا کر صاف کر جانے کی وجہ سے مکہ والوں کے لئے موجب رحمت ثابت ہوئے۔ پس یہ دوہری رحمت اور نصرت اور عنایت تھی جو مکہ والوں کے حال پر ہوئی۔ بغداد کو جب ہلاکو خاں نے فتح کر لیا تو اس طرح مسلمانوں کا قتل عام کیا جو دنیا کی تاریخ میں غالباً بے نظیر ہے ان بت پرست تاتاریوں نے لاکھوں مسلمان تہ تیغ کر دیئے۔ عورتوں اور بچوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں میں روند دیا۔ شہزادوں کو زندہ دیواروں میں چنوا دیا۔ لیکن بعد میں اس تعفن سے جو نعشوں سے پیدا ہوا اس کے لشکر میں ایسی وبا پڑی کہ اس کی فوج کے ہزارہا تاتاری ہلاک ہو گئے۔ اور اسے شہر چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ پس اہل مکہ پر کس قدر احسان تھا کہ اس قسم کی مصیبت سے انہیں اللہ نے بچا لیا پس آج بھی مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنے قلب کو خدا کا گھر اور توحید کا مخزن بنائیں اور اسلام کی حفاظت کے لئے کھڑے ہو جائیں تو اس خانۂ خدا کو جو ڈھانے اٹھے گا اور کعبۂ اسلام کو جو مٹانا چاہے گا اس کا وہی انجام ہو گا جو اس سورت میں کعبہ شکنی کا ارادہ کرنے والوں کا بتایا ہے جیسا کہ واصل مرحوم فرماتے ہیں ؎

کعبہ ڈھانے کو جو آئیگا کوئی فیلوں سے — کارزنیلن تجھے دیدینگے ابابیلوں سے

سُوْرَۃُ الْقُرَیْشِ مَکِّیَّۃٌ	بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○	وَّھِیَ اَرْبَعُ اٰیٰتٍ

سورۃ القریش مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ سورۃ الفیل میں ان لوگوں کا ذکر تھا جنہوں نے خدا کے گھر پر حملہ کیا اور تباہ ہو گئے اس سورۃ القریش میں ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے خدا کے گھر کی تولیت کی اور نتیجہ یہ ہؤا کہ امن میں آ گئے اور رزق سے بھی بے فکری ہو گئی۔ ارشاد ہوتا ہے :-

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ○ اٖلٰفِھِمْ رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ○ ۲ قریش کیلئے اکٹھا رکھنے کو ان کیلئے جاڑے اور گرمی کے سفروں کی اکٹھا رکھنے کو

فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ ○ ۳ پس چاہیئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں۔ اس گھر میں اشارہ خانہ کعبہ کی طرف ہے جسکے متولی قریش تھے۔

۱ ع ۴ ۳۱ اَلَّذِیْٓ اَطْعَمَھُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ ○ ۴ جس نے انکو بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے ان کو امن دیا۔

قریش ہمارے نبی کریم صلعم کے قبیلہ کا نام ہے مکہ میں کھیتی باڑی تو کوئی تھی نہیں۔ خشک پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک غیر ذی زرع وادی تھی۔ ان لوگوں کا گذارہ تجارت پر تھا ملک شام مکہ سے شمال کی طرف ہے اور ٹھنڈا ملک ہے ملک یمن مکہ سے جنوب کی طرف ہے اور گرم ملک ہے قریش سردیوں میں یمن میں تجارت کے لئے جاتے تھے اور گرمیوں میں شام میں تجارت کے لئے جاتے تھے۔ یہ لوگ کعبہ کے متولی تھے۔ اس لئے تمام عرب ان کا ادب کرتا تھا ملک میں چاروں طرف لوٹ مار جنگ و جدل مچا رہتا تھا مگر خانہ کعبہ کے ادب کی وجہ سے مکہ میں ہر طرح کا امن رہتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ لوگ جب تجارت کے لئے باہر جاتے تو کوئی ان کا مانع اور مزاحم نہ ہوتا بلکہ بیت اللہ کا مجاور سمجھ کر ان کی خدمتیں کرتے۔ جیساکہ آجکل بھی مکہ یا مدینہ سے کوئی عرب صاحب ہندوستان تشریف لے آویں تو لوگ ان کی خدمت کرنے کو اچھا سمجھتے ہیں پس اس سورت میں اس احسان عظیم کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے قریش پر کر رکھا تھا کسی قوم کی زندگی کے لئے دو امور کی ضرورت ہؤا کرتی ہے تمدن اور تجارت پھر ان دونو امور کے لئے ضرورت ہؤا کرتی ہے دو باتوں کی۔ رزق مہیا کرنے کے اسباب۔ اور امن (۱) کسی قوم میں تمدن نہیں پیدا ہو سکتا۔ یعنی اس کے مختلف افراد باہم مل کر نہیں رہ سکتے جب تک امن نہ ہو اور پیٹ بھرنے کا سامان میسّر نہ ہو۔ اگر کسی شہر میں امن نہ ہو تو نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ جائیں گے اسی طرح امن تو ہو لیکن پیٹ بھرنے کا سامان نہ ہو تو لوگ محنت مزدوری ملازمت وغیرہ کی تلاش میں گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں بلکہ بعض دفعہ ملک چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ مسرّت شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

بوقتِ لقمہ خوردن اے مسرّت گفت بہائم ۔ کہ روزی می کند آخر جُدا یاران ہمدم را

(۲) اسی طرح کسی قوم کی تجارت فروغ نہیں پا سکتی جب تک وہ برابر نہ چلے۔ خواہ سردی ہو یا گرمی کوئی موسم یا امر مزاحم نہ ہو۔ تاجر کو تو نفع اسی صورت میں ہوتا ہے کہ اس کا مال برابر تجارت میں لگا رہے ایک ملک میں کوئی چیز بیچی وہاں سے

مال خریدا دوسرے ملک میں جا بیچا۔ وہاں سے مال خریدا تو پھر پہلے ملک میں لا بیچا۔ اس طرح اگر تجارت کا چکر لگا رہے تو نفع ہی نفع ہے اور اگر درمیان میں روک پڑ جائے اور مال پڑا رہے تو روپے کے آٹھ آنے نہیں رہتے نقصان ہی نقصان ہے۔ پس جب تک کہ تجارت کا سلسلہ لگاتار نہ چلا چلے تجارت نفع بخش کس طرح ہو دوسری ضرورت تجارت کے لئے یہ ہے کہ رستے پُرامن ہوں ورنہ تجارت کے لئے سفر نہیں کیا جا سکتا۔

اب قریش کی حالت پر غور کرو کہ آباد ایسے مقام پر ہیں جہاں کوئی پیداوار نہیں۔ ملک ایسا ہے جہاں کوئی امن نہیں۔ رستے ہیں تو پُرخطر ان حالات میں اس قوم کے تمدن اور تجارت کی کوئی صورت نہ تھی اب احسان الٰہی ملاحظہ ہو کہ مکہ میں خدا کا گھر کعبہ کے موجود ہونے کی وجہ سے یہ مقام ان کے لئے پُرامن کر دیا۔ ملک عرب میں لوٹ مار جنگ و جدل ہوا کرے مگر یہ لوگ مزہ سے امن و امان کے ساتھ بس رہے ہیں کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا۔ تجارت کے لئے ایک طرف ملک شام ہے تو دوسری طرف ملک یمن۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد۔ ایک جگہ گرمی میں مال بیچو تو دوسری جگہ سردی میں۔ گرم ملک کی اشیا سرد ملک میں لے جاؤ۔ سرد ملک کی اشیا گرم ملک میں بیچو۔ غرضکہ تجارت کا سلسلہ ٹوٹ نہیں سکتا عرب جیسا خطرناک ملک جہاں قبائل ایک دوسرے کو لوٹ لینے سے ذرا بھی تامل نہ کرتے تھے مگر قریش کے لئے اس کے رستے بالکل پُرامن۔ بے خطر جہاں چاہیں مال تجارت لے جائیں اسی احسان عظیم کا ان آیات میں تذکرہ ہے۔ لایلاف قریش کا تمدن قائم کرنے کا ذکر ہے کہ قریش کو اکٹھا رکھنے یعنی اس کے افراد کے باہم مل کے رہنے کے لئے۔ اور الفھم رحلۃ الشتآء والصیف میں قریش کی تجارت کا تسلسل قائم رکھنے کا ذکر ہے کہ ان کے جاڑے اور گرمی کے سفر تجارت کو اکٹھا رکھنے* کے لئے۔ اللہ تعالیٰ نے کیا کیا؟ یہاں اللہ تعالیٰ کا جو فعل بھی ہے وہ محذوف ہے اس محذوف فعل کو معلوم کرنے کے لئے لوگوں کو مشکلات پیش آئی ہیں بعض نے تو لِ (لام) تعجب کا بنایا ہے لیکن تعجب کی ایزادی کے باوجود وہ فعل پھر بھی نہ معلوم ہوا۔ اس لئے اکثر مفسرین اسی طرف گئے ہیں کہ خدا کا فعل یہ ہے کہ اصحاب الفیل سے کعبہ کو بچایا۔ لیکن اوّل تو اس طرح یہ سورت پھر نامکمل ٹھیر جاتی ہے بلکہ سورۃ الفیل کے بغیر اس کی حیثیت ایک ناتمام فقرہ کی رہ جاتی ہے۔ دوم قریش کے افراد کو اکٹھا رکھنے اور تجارت کو اکٹھا رکھنے کے لئے اصحاب الفیل کا مارا جانا آپس میں کسی گہرے تعلق کو نہیں بتاتا میری سمجھ میں بات صاف ہے اسی صورت میں خدا کا فعل جو یہاں محذوف ہے آگے چل کر موجود ہے جسے قریش کو باہم اکٹھا رکھنے اور ان کی تجارت کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے بطور احسان جتلایا ہے اور وہ ہے اطعمھم من جوع وآمنھم من خوف کہ پیٹ بھرنے کا سامان بھی مہیا کر دیا۔ اور خوف سے بھی امن عطا فرمایا۔ اگر یہ دو باتیں نہ ہوتیں۔ تو نہ قریش کا تمدن ہوتا نہ ان کی تجارت نہ وہ امن سے اکٹھے مل کر مکہ میں رہ سکتے۔ نہ تجارت کے تسلسل سے ان کے پیٹ بھرنے کا سامان ہوتا پس سارا فقرہ یوں ہوگا کہ لایلاف قریش الفھم رحلۃ الشتآء والصیف اطعمھم من جوع وآمنھم من خوف اس فقرہ کو اس جگہ حذف کرنے کی ضرورت یوں ہوئی کہ رب البیت کی عبادت کرنیکی وجہ اور ضرورت بتلانے کے وقت بھی انہی دو باتوں کو پیش کیا جانا ضروری تھا۔ اس لئے فصاحتِ بیان کا تقاضہ تھا کہ پہلی جگہ یہ فقرہ حذف کر کے اسے دوسری جگہ نمایاں کیا جاتا تاکہ عبادت کی طرف طبائع مائل ہوتیں۔ پہلی جگہ تو دو نوقسم کا ایلاف بجائے خود متقاضی

* یعنی جاری رکھنے

اس امر کا ہے کہ یہ دونو باتیں اس کے ساتھ موجود ہوں ورنہ ایلاف یعنی تمدن و تجارت کا وجود ہی نہیں ہو سکتا پس اس جگہ ان کے کھلم کھلا ذکر کے بغیر بھی ایلاف کے ساتھ یہ بطور لازم و ملزوم کے محذوف ماننی پڑیں گی اس لئے وہاں اتنی ضرورت نہ تھی جتنی دوسری جگہ پس تکرار سے بچنے کے لئے اس فقرہ کو پہلی جگہ محذوف کر دیا گیا۔

اب بات صاف ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنا احسان عظیم جتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کے باہم مل کر رہنے یعنی تمدن کے لئے اور ان کے سردی اور گرمی کی تجارت کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے ایک تو ان کے رزق کا سامان ایسا بہم پہنچایا کہ ان کی بھوک اور احتیاج جاتی رہی۔ دوسرے ہر ایک قسم کے خوف سے امن بخشا بھوک تو یوں گئی کہ حج کے ذریعہ ان کی واقفیت اور شناسائی بڑھتی تجارت کو فروغ ہوتا اور دونو طرف دو ملک اس طرح قدرت نے لاڈلے تھے کہ گرمی میں اگر ایک ملک میں تجارت کرتے تو سردی میں دوسرے ملک میں۔ اس طرح تجارت اور منافع کا سلسلہ ٹوٹتا نہ تھا۔ اور ان کا تمدن ترقی کرتا تھا۔ اور امن کا یہ حال تھا کہ سارا عرب جنگ و جدل اور لوٹ مار سے تباہ حال تھا لیکن یہ امن امان سے مکہ میں بستے تھے۔ تجارتوں کے لئے باہر جاتے اور بے خوف و خطر مال تجارت لے کر سفر کرتے اور کوئی ان کا مزاحم نہ ہوتا۔ پس ایسے بے آب و گیاہ مقام اور ایسے پُر خوف و خطر ملک میں پیٹ بھرنے کا یہ سامان اور ہر قسم کے خوف سے یہ امن کس قدر احسان اس رب کریم کا تھا پس اگر محسن سے الفت پیدا ہونا فطرت انسانی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ قریش کے دلوں میں اُس ربِ محسن کی الفت پیدا نہ ہو۔ کوئی شخص بھی اگر ایسی عنایت اور مہربانی کسی قوم کے ساتھ کرے کہ اس کے افراد کو باہم امن و امان کے ساتھ اکٹھے رہنے کا انتظام کر دے اور ان کے لئے رزق بہم پہنچنے کے واسطے اس طرح سامان مہیا کر دے کہ انہیں تجارت میں کوئی چیز مزاحم نہ ہو اور تجارت کے لئے آنے جانے میں کوئی خطرہ باقی نہ رہے تو لازمی اور یقینی بات ہے کہ ایسے محسن کی الفت اس قوم کے دل میں گھر کر جائے گی اور وہ اسکی فرمانبرداری کرنے کو اپنے لئے فخر سمجھیں گے اور اس سے تعلقات زیادہ بڑھانے میں کوشش بیش از پیش کریں گے تاکہ اس کی عنایات سے اور بھی زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ پس یہاں لایلاف قریش میں ایلاف سے اگرچہ قریش کا باہم اکٹھا رکھنا یعنی ان کا تمدن ہی مراد ہے لیکن اس میں اشارہ یہ بھی ہے کہ یہ احسانات قریش کے لئے اپنے رب محسن سے الفت پیدا کرنے کا باعث ہونا چاہئیں اور مزید تعلق بڑھانے کے لئے انہیں غور کرنا چاہیئے کہ اس احسان الٰہی کے وجوہات کیا ہیں اس کے لئے فلیعبدوا رب ھذا البیت فرما کر بتلایا کہ درحقیقت یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس گھر یعنی کعبہ کی ربوبیت کا۔ ان کے شہر میں خدا کا گھر کعبہ موجود تھا اور یہ لوگ کعبہ کے متولی تھے۔ ربوبیت خدا کے گھر کی ہوتی تھی۔ نفع یہ اٹھاتے تھے اللہ تعالیٰ کا منشا تھا کہ کعبہ میں امن و امان ہو اور وہ آباد رہے لہٰذا جو قوم اس کی متولی تھی وہ اس امن و امان سے فائدہ اٹھاتی تھی اور اس کی خدمت اور آباد رکھنے کے صلہ میں اس عزت کی وارث ٹھیر گئی تھی جس کی وجہ سے وہ جہاں جاتے تھے کوئی ان کا مزاحم نہ ہوتا تھا۔ حج کے موسم میں تمام عرب جمع ہوتا تھا ان کی تجارت چلتی تھی۔ شناسائی اور واقفیت بڑھتی تھی۔ اس کی وجہ سے ملک ملک کی تجارت کا حال معلوم ہوتا تھا موقعہ کی چیزیں لیکر یہ وہاں جاتے اور نفع اٹھاتے اور بے خوف و خطر آتے جاتے غرضکہ خدا کے اس گھر کی تولیت کی وجہ سے خدا نے بے آب و گیاہ وادی میں رزق بھی خوب دے رکھا تھا

اور پر خوف و خطر ملک میں امن و امان بھی بخشا ہوا تھا۔ فرمایا دیکھو اللہ تعالیٰ اپنے گھر کی ربوبیت کس طرح کرتا ہے پس چاہیئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کرو۔ اور اسے اپنا رب اس طرح بناؤ کہ اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود و مطلوب نہ ہو اور وہ تمہارے دل میں بس جائے۔ پس جب تمہارا دل بھی خدا کا گھر بن جائے گا تو تمہارے دل کے بیت اللہ کی بھی اسی طرح ربوبیت ہوگی جس طرح کعبہ کی جو بیت اللہ ہے ربوبیت ہوتی ہے۔ ربوبیت تمہارے قلب کی ہوگی جو خدا کا گھر ہوگا اور نفع تمہارے قویٰ اور نفس اٹھائیں گے جو اس کے متولی کی حیثیت رکھتے ہیں ایک طرف غذائے روحانی یعنی علم و معرفت سے مالا مال ہو جاؤ گے دوسری طرف شیاطین کے حملوں سے محفوظ ہو جاؤ گے علم و حکمت کی تلاش میں اگر سرد و گرم ممالک میں جاؤ گے تو وہاں بھی تم شیطان کے حملوں سے محفوظ رہو گے۔ اور تمہارا ایمان اور تقویٰ امن میں رہے گا۔ بلکہ بالمقابل تمہارا علم اور معرفت ترقی کرے گی اور روحانی نفع حاصل کرنے والے بنو گے۔

الغرض سورۃ الفیل میں تو یہ بتایا تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہ کو ہلاک کرنے کی کوشش دراصل خدا کے گھر کو ڈھانے کی کوشش ہے کیونکہ ان کے قلوب میں خدا بستا ہے پس جو لوگ ان کے ہلاک کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں ان کا انجام بھی اصحاب الفیل کی طرح ہلاکت اور ذلت ہے۔ اب اس سورۃ القریش میں بتلایا کہ جن کے قلوب خدا کا گھر بن چکے ہیں یعنی محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہ وہ چونکہ خدا کے گھر کے متولی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے قریش کی طرح رزق سے مالا مال کئے جائیں گے۔ اور ہر قسم کے خوف سے امن میں رہیں گے۔ کفار لاکھ ان کو محصور کریں۔ بائیکاٹ کریں، جلاوطن کریں قتل کرنے کی تدبیریں کریں لیکن جن کے دلوں میں خدا بستا ہے ان میں کا ہر ایک درحقیقت ایک بیت اللہ کا متولی ہے تو جب مکہ کے قریش باوجود کفر و شرک کے اس ظاہری بیت اللہ کی محض تولیت کی وجہ سے رزق اور امن سے بہرہ اندوز ہیں تو وہ جو رب کعبہ کے فرمانبردار اور پجاری ہیں اور بجائے خود ہر ایک ان میں کا اپنے اندر ایک بیت اللہ رکھتا ہے جس کا وہ متولی ہے۔ کیوں نہ ان کا رب انہیں ظاہری و باطنی رزق سے مالا مال کر دے اور ہر قسم کے ظاہری و باطنی خوف سے انہیں امن بخشے۔ اور ایسا ہی ہوا اور یہ پیش گوئی جو ان آیات میں مضمر ہے حرف بحرف پوری ہوئی۔ آنحضرت صلعم اور صحابہ کو جو رزق ظاہری و باطنی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا اور کس قدر سخت خوف و خطر کی حالت کو امن سے بدلا وہ تاریخ عالم میں بے نظیر ہے وہ رب ھٰذا البیت کے سچے پجاری تھے۔ اگر آج ہم بھی اس پر عامل ہوں اور ہمارا دل خدا کا گھر بن جائے تو ہمیں نہ جسمانی رزق کی کمی رہے نہ روحانی کی۔ ہمیں نہ ظاہری شیاطین سے کوئی خوف باقی رہے نہ باطنی شیاطین سے۔ ہم حکمت اور علم کی تلاش میں یورپ جائیں یا امریکہ۔ ایشیا میں ہوں یا افریقہ میں ہمیں کوئی وسوسۂ شیطانی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ بلکہ جیسے جیسے مختلف علوم سے واسطہ پڑے گا اور مشاہدہ اور تجربہ بڑھے گا اس کے ساتھ ساتھ ایمان بھی بڑھے گا اور علم اور معرفت میں ترقی ہوگی۔ ہاں ضرورت ہے کہ ہمارا دل خدا کا گھر ہو تا وہ رب البیت ہماری ربوبیت کرے۔ ہم روز کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کھڑے ہوتے ہیں اور رب کعبہ کی عبادت کرتے ہیں لیکن اس میں اس اشارۂ غیبی کو نہیں سمجھتے کہ نماز تو رب البیت کو اپنے دل کے اندر لینے کی اور دل کو کعبہ کی طرح بیت اللہ بنانے کی کوشش کا ایک کامیاب طریق ہے۔

رب البیت کو جس طرح مسلمانوں میں صاحب معرفت اہلِ حال لوگوں نے اپنا معبود بنایا ان حالات کو اگر پڑھا جائے تو بے اختیار روح وجد کر اٹھتی ہے ایک مرتبہ حضرت رابعہ بصری رحمتہ اللہ علیہا حج کو چلیں جب کعبہ ایک منزل رہ گیا تو آپ نے حالت کشف میں کعبہ کو اپنی طرف آتے دیکھا کعبہ نے کہا کہ بہت دور سے آپ میرے لئے تشریف لائی ہیں اسلئے میں آپکے استقبال کو آیا ہوں" حضرت رابعہ بولیں کہ "میں تو تیرے لئے نہیں آئی میں تو تیرے رب کے لئے آئی ہوں" یعنی کعبہ کیلئے نہیں آئی ہوں بلکہ رب کعبہ کیلئے آئی ہوں"۔ کتنا عظیم الشان توحید اور معرفت کا مقام ہے کہ روح وجد کر اٹھتی ہے اور رب ہذا البیت کو معبود بنانیکا وہ نقشہ پیش نظر ہو جاتا ہے کہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ ہم سب کو نصیب کرے

وَهِيَ سَبْعُ اٰيٰتٍ	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ

اس سورت کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ سورۃ القریش میں فرمایا تھا۔ کہ رب کعبہ کو اپنا معبود بناؤ اور دلوں کو خدا کا گھر بنا کر کعبہ کی طرح اس کی ربوبیت سے فائدہ اٹھاؤ۔ اب اس سورت الماعون میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اس رب کے دل میں سمانے کے لئے تین شرطیں ہیں۔ یعنی رب کعبہ جن دلوں کو اپنا مسکن بناتا ہے ان دلوں میں تین چیزیں ہونی ضروری ہیں تب وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے رب کا تخت اس میں بچھے (۱) ایک تو اس کی مخلوق کے لئے شفقت اور ہمدردی (۲) دوم خود اس کی محبت اور توحید کا غلبہ ہر چیز پر (۳) سوم دلوں میں وسعت اور فیاضی۔ کیونکہ وہ خدا ان قلوب سے نفرت کرتا ہے جن میں اس کی مخلوق سے شفقت اور ہمدردی نہیں وہ اس قلب میں داخل نہیں ہوتا جس میں غیر بستا ہو۔ وہ ان قلوب میں سما نہیں سکتا جو تنگ ہوں کیونکہ وہ خدا جو زمین و آسمان میں نہیں سماتا انہی قلوب میں سما سکتا ہے جو اپنی وسعت میں زمین و آسمان سے بھی بڑھ کر ہوں پس جن دلوں میں یہ تین باتیں نہیں ان میں خدا نہیں سماتا۔ ایسے لوگوں کا دعویٰ دینداری بالکل بے معنی۔ ان کا نمازیں پڑھنا بالکل بیکار۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ○ کیا تو نے اس شخص کے حال پر غور کیا جو دین کو جھٹلاتا ہے۔

یہاں دین کو جھٹلانے سے مراد عمل سے دین کو جھٹلانا ہے کہ منہ سے تو دعویٰ دینداری کا ہے لیکن درحقیقت اپنے عمل سے وہ اپنی دینداری کو جھٹلاتا ہے۔ اس کے اعمال اس کے دینداری کے دعویٰ کو جھٹلاتے ہیں۔

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ○ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ○ اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔

یہاں دین کی پہلی شرط شفقت علیٰ خلق اللہ بتائی۔ بتایا کہ اس دل میں خدا نہیں اترتا جس میں اس کی مخلوق سے

ہمدردی نہیں۔ جائے غور ہے کہ حق العباد کو اس قدر اللہ تعالیٰ نے اہمیت دی ہے کہ حق اللہ سے پہلے حق العباد کو لیا۔ اور اپنی توحید اور محبت یعنی تعظیم لامر اللہ سے پہلے شفقت علی خلق اللہ کو رکھا۔ دنیا میں ہر ایک شخص اپنے حقوق ٹھونک بجا کر خود لے لیتا ہے نہ دو قوم مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا ہے اور انسان کو چار و ناچار ان کے حقوق دینے پڑتے ہیں لیکن سوسائٹی میں دو طبقے ایسے بھی ہیں جو اپنا حق لینے کے قابل نہیں ہوتے اس لئے ان کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ ہمدردی کے لئے یہاں تاکید فرما کر مومن کو حق العباد کی ادائیگی کے اس مقام پر لانا چاہا ہے جہاں وہ نہ صرف مجبوراً لوگوں کے حقوق دیتا ہے بلکہ دل کی خوشی سے شفقت علی خلق اللہ کے رنگ سے رنگین ہو کر ان لوگوں کے حقوق کے لئے بھی ہر ایک قسم کے ایثار اور قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے جو بوجہ اپنی عاجزی اور بے چارگی کے خود اپنے حقوق لینے کے ناقابل ہیں اور وہ دو طبقے ہیں۔ یتامیٰ اور مساکین۔ جیسا کہ میں اس سے قبل کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ یتیم اسے کہتے ہیں جو دنیا میں تنہا رہ گیا ہو اس حالت میں کہ ابھی وہ اس قابل نہیں ہوا تھا کہ اپنی روزی خود کما سکے اور اپنی حفاظت خود کر سکے۔ مثلاً ایک بچہ جس کا باپ یا سرپرست مر گیا۔ یا ایک عورت جس کا شوہر یا سرپرست مر گیا۔ اور وہ ابھی اس قابل نہیں ہیں کہ اپنی روزی خود کما سکیں یا اپنی حفاظت خود کر سکیں اور مسکین وہ ہے جو اپنی روزی خود کمانے اور اپنی حفاظت خود کرنے کے قابل ہے لیکن کسی وجہ سے وہ ذرائع ضائع ہو گئے جن کے ذریعہ وہ اپنی روزی کماتا اور اپنی حفاظت کرتا تھا۔ مثلاً کوئی محنتی تھا اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا کوئی صنعت و حرفت کا پیشہ کرتا تھا اندھا ہو گیا کوئی تجارت کرتا تھا دوالیہ ہو گیا۔ کوئی ملازم تھا ملازمت چھوٹ گئی وغیرہ وغیرہ۔ دین اسلام نے ہر ایک مسلمان کی یہ ڈیوٹی رکھی تھی کہ اپنی قوم کے یتامیٰ اور مساکین کو وہ نہ صرف سنبھالے بلکہ باہم مل کر انہیں اس قدر ابھارے کہ وہ سوسائٹی کے مفید اور برابر کے کارآمد ممبر بن جائیں یتیم کو دھکے دینے کے یہ معنی نہیں کہ یتیم روٹی مانگنے آیا تھا اسے دھکے دیکر نکال دیا یہ بالکل غلط ہے بھیک مانگنا اسلام کے اصول کے خلاف ہے آنحضرت صلعم نے فرمایا مت مانگو خواہ وہ مانگنا اپنے باپ سے ہی کیوں نہ ہو۔ پھر فرمایا کہ سوال کرنے والے کے چہرہ پر قیامت کے دن گوشت نہ ہوگا۔ ایک دفعہ حضرت خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اونٹ پر سوار جا رہے تھے۔ ہاتھ سے کوڑا گر گیا آپ نے اونٹ بٹھا کر کوڑا اٹھایا ایک شخص پاس کھڑا تھا اس نے عرض کیا کہ حضرت مجھے فرماتے تو میں اٹھا دیتا فرمایا "سوال کرنا پڑتا تھا"۔ گویا سوال کرنے سے بہتر ہے کہ اونٹ بٹھا کر انسان خود کوڑا اٹھا لے۔ غرضکہ یتیموں اور مسکینوں کا بھیک مانگتے پھرنا اسلامی اصول کے خلاف ہے یہ اپنی قوم کو ذلیل کرنے کے مترادف ہے پس یتیم کو دھکے دینے کے یہ معنی ہیں کہ ان کے حقوق کی پروا نہیں کرتا بلکہ ان کے حقوق غصب کر جاتا ہے خواہ وہ بحیثیت رشتہ دار کے ان کے رشتہ میں سے حقوق غصب کئے جائے اور خواہ بحیثیت مسلم سوسائٹی کے ایک ممبر ہونے کے اپنی قوم کے یتیموں کے حقوق غصب کر جائے اور اس غصب کی شکل یہ ہے کہ وہ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کیلئے اپنے مال اور وقت میں سے حصہ نہیں نکالتا گویا یہ یتیم کا ایک حق ہے جو خدا کی طرف سے مسلم سوسائٹی کے ہر ایک فرد پر فرض ہے اور جس کے ادا کئے بغیر وہ خدا کی نگاہ میں ایک غاصب اور یتیم کو دھکے دینے والا ٹھہرتا ہے۔ اور اس کا دعوائے دینداری ایک جھوٹا دعویٰ ہے اسی طرح مسکین کے متعلق فرمایا کہ وہ شخص دین کو جھٹلاتا ہے جو مسکین کے کھانے اور روزی کے انتظام کیلئے ترغیب و تحریک اور کوشش نہیں کرتا یہاں یہ نہیں فرمایا کہ وہ مسکین کو کھانا نہیں کھلاتا

کو مسکین کو کھانا کھلانا بھی بجائے خود ایک نیکی کا کام ہے لیکن کھانا کوئی کب تک کسی کو کھلا سکتا ہے اور نہ اس طرح کمیں عمریں کٹتی ہیں اور نہ وہ مسکین اس طرح سوسائٹی کا کوئی مفید ممبر بن سکتا ہے۔ اس لئے یہاں اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مساکین کی روزی اور بہتری کے لئے آپس میں ترغیب و تحریک کر کے ایسی سبیل اختیار کرو جس سے وہ اپنی روزی مہیا کر سکیں۔ مثلاً کوئی انجمن بنا کے بیت المال کے ذریعہ روپیہ جمع کر کے اس سے قرض حسنہ انہیں تجارت کیلئے دیا جائے یا بے روزگاروں کی ملازمت کا کوئی انتظام کیا جائے یا ان کے لئے کوئی کام نکالا جائے جہاں وہ مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال سکیں یا اگر اپاہج ہیں تو ان کے لئے کوئی محتاج خانہ کھولا جائے جہاں وہ حسب استطاعت کچھ کام کریں اور ان کو اجرت اتنی دی جائے جس سے ان کی روزی چل سکے۔ الغرض وہ شخص دین کو جھٹلاتا ہے جو اپنی سوسائٹی کے یتیموں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے کوشش نہیں کرتا۔ اور اس طرح ان کے حقوق کو جو خدا کی طرف سے ہر ایک مسلمان پر فرض ہے دھکے دیتا ہے اور نہ ہی اپنی سوسائٹی کے مساکین کی روزی مہیا کرنے اور ان کی حالت کو ابھارنے کے لئے آپس میں تحریک اور کوشش کرتا ہے۔ غرضکہ حق العباد اور شفقت علی خلق اللہ کو دین کی پہلی شق قرار دی اور یہ پہلی شرط ہے جس کے بغیر خدا کسی دل کو اپنا مسکن نہیں بناتا۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ پس افسوس یا ہلاکت ہے نمازیوں پر وہ جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔

الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ جو ریا یعنی دکھاوا کرتے ہیں۔

وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝ اور خیرات سے روکتے ہیں یا دریغ کرتے ہیں۔

ع ۱ ۷ ۳۲

ماعون۔ گھر کی چھوٹی چھوٹی چیزیں اور سامان کو عاریتاً استعمال کے لئے دوسروں کو دینا۔ زکوٰۃ بھی ماعون میں شامل ہے۔ اب یہاں دوسری شرط پیش ہوتی ہے جو خدا کو دل میں بسانے کے لئے ضروری ہے اور جس کے بغیر دین کی دوسری شق تعظیم لامر اللہ کی پوری نہیں ہوتی اور حق اللہ ادا نہیں ہوتا۔ فرمایا افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ اور ریا یعنی دکھاوا کرتے ہیں۔ نماز سے غفلت کے تین طریق ہیں۔ (۱) ایک تو اُسے باقاعدہ نہ پڑھنا اور اس کے ارکان ٹھیک طرح ادا نہ کرنا (۲) دوسرے جو کچھ پڑھنا بغیر سمجھے طوطے کی طرح پڑھ جانا۔ دل کہیں خیال کہیں۔ منہ سے الفاظ بڑبڑا دیئے اور قصہ ختم کیا (۳) اور تیسرے یہ کہ نماز کا جو مقصد ہے تقویٰ اور بُری باتوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچنا اور دل میں نرمی اور خدا کا خوف پیدا ہو کر خدا کی مخلوق سے شفقت اور یتامیٰ اور مساکین سے ہمدردی کرنا جس کا ذکر ابھی گذر چکا ہے اس مقصد کو نظر انداز کر دینا۔ یعنی نماز کے ساتھ ساتھ بُرے اور بے حیائی کے کاموں میں بھی غرق رہنا اور یتامیٰ کے حقوق کا غصب اور مساکین کی طرف سے بے پروائی۔ گویا نماز تو پڑھتے ہیں لیکن دراصل اس کی حقیقت سے غافل ہیں اور یہ غفلت یہاں تک ترقی کرتی جاتی ہے کہ نماز محض دینداری کا دکھاوا یعنی ریاکاری بن کر

رہ جاتی ہے اور جو خدا کا حق ہے وہ مخلوق کو دیتے ہیں یعنی مخلوق کو دکھانے کے لئے نماز پڑھتے ہیں۔ اور محض خدا کے لئے نہیں پڑھتے۔ یاد رہے کہ غفلت تب پیدا ہوتی ہے جب دل پر نفسانی خواہشات اور دنیوی خیالات کا ہجوم ہو تو انسان ان باتوں میں پڑ کر خدا اور اس کی عبادت اور فرمانبرداری سے غافل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں نماز پڑھنا ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے یا پڑھی تو بے دلی سے پڑھی یا قاعدہ نہ پڑھی۔ کان ٹھیک ادا نہ کئے گھاس کی طرح کاٹ کر رکھدی یا نماز میں خیال کہیں ہے دل کہیں ہے محض دکھاوے کے لئے نماز پڑھ دی۔ ایسی نماز کا کیا نیک اثر قلب پر پڑ سکتا ہے اور اس کا نتیجہ تقویٰ اور مخلوق سے شفقت اور ہمدردی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے پس ایسی نماز پڑھنے والوں پر افسوس ہے جن کے قلب میں خدا کی بجائے نفس کی حکومت ہے اور نہ صرف نفس کی حکومت ہے بلکہ غیر اللہ یعنی مخلوق کی بھی حکومت ہے اور وہ ریاکاری کا ذریعہ ہو کہ اس کے دل میں نماز کے وقت بجائے خدا کے مخلوق بسی ہوئی ہے پس جب قلب میں خدا کے سوا نفس اور مخلوق بسے ہوئے ہیں اور غیر اللہ کی حکومت قائم ہے اس کے دل میں خدائے واحد رب کعبہ کا تخت بچھ نہیں سکتا کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہوا سر بسجدہ جو میں کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا ۔ تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں۔

پھر تیسری شرط رب السموات والارض کے نزول کی بھی قلب میں وسعت یعنی فیاضی ہو ایک تنگدل میں رب کعبہ کا تخت نہیں بچھ سکتا جو دل یمنعون الماعون کا مصداق ہو۔ اور پڑوسیوں کو، عزیزوں کو لوگوں کو چھوٹی چھوٹی استعمال کی چیزوں کے دینے سے مضائقہ کرتا ہے اور اس کا دل تنگی کرتا ہے یہانتک کہ مخلوق کی ہمدردی کیلئے خدا نے جو زکوٰۃ مقرر کی ہے جو امرا کے لئے ایک حقیر رقم ہے اسکے دینے سے بھی دریغ کرتا اور روکتا ہے تو ایسے قلب میں وہ خدا جو آسمان و زمین میں نہیں سماتا اور جسکی ربوبیت اور فیاضی تمام عالم پر محیط ہے کیسے سما جائے اسلام کو بخل اور مساجرات اخلاق بہت ناپسند ہیں وہ انسان کے دل میں ہمدردی کے جذبات اور فیاضی کو پیدا کرنا چاہتا ہے عام طور پر انسان میں حرص اور بخل کا جذبہ حیوانیت کا جزو ہوتا ہے اس جذبہ پر غالب آنے اور فیاضی و ہمدردی کے اخلاق کو نشو و نما دینے کیلئے ضروری ہے کہ انسان پہلے ایکدوسرے کی مدد چھوٹی چھوٹی چیزوں سے کرے کسی کو کسی برتن کی ضرورت پڑی وہ عاریتاً دیدیا کسی کو کسی دوا کی ضرورت پڑی وہ دیدی وعلیٰ ہذا القیاس چھوٹی چھوٹی فیاضیوں کی عادت ڈالنے سے دل کا بخل کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور دل میں کشادگی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمدردی اور فیاضی کے اخلاق نشو و نما پا کر آخر انسان کو اس اعلیٰ مقام پر لے آتے ہیں جہاں پہنچ کر انسان سراپا ہمدردی و فیاضی کا مجسمہ بن جاتا ہے ادائیگی زکوٰۃ بھی انسان کی فیاضی و سخاوت اور ہمدردی و ایثار کے لئے ابتدائی مدرسہ ہے اس تھوڑی سی خیرات اور صدقہ کو اپنے اوپر لازم کر لینے سے اور چھوٹے چھوٹے ہمدردی کے کاموں کی عادت ڈالنے سے انسان پھر مخلوق کی شفقت کے بڑے بڑے کام کرنے لگتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ انسانیت کاملہ کا مظہر بن جاتا ہے اور اس کے دل کی وسعت اس قابل ہو جاتی ہے کہ وہ خدا جو زمین و آسمان میں نہیں سماتا اس میں سما جاوے یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس تیسری شق کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کے اندر ہی رکھا۔ گویا زکوٰۃ کا ادا کرنا یا لوگوں کے ساتھ روزمرہ کی زندگی میں ہمدردی کے سلوک درحقیقت حق اللہ ہی میں داخل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ جناب الٰہی کے حضور میں مالی عبادت ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ بندوں سے فرمائے گا۔ کہ میں تمہارے پاس بھوکا ہو کر آیا تم نے مجھے کھانا نہ دیا۔ پیاسا ہو کر آیا تم نے

مجھے پانی نہ دیا۔ برہنہ ہو کر آیا تم نے مجھے کپڑا نہ دیا۔ بندے عرض کریں گے کہ بار خدایا کہ یہ کس طرح ممکن ہے تیری ذات تو ان باتوں سے پاک ہے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے بندے بھوکے ہو کر آئے تم نے انہیں کھانا نہ دیا پیاسے آئے تم نے انہیں پانی نہ دیا۔ ننگے آئے تم نے انہیں کپڑا نہ دیا ان کا آنا میرا ہی آنا تھا۔ ان کو دینا میرا ہی حق ادا کرنا تھا پس یہ تمام حق اللہ ہیں اور بارگاہ ربانی میں مالی عبادات ہیں۔

پس وہ شخص دین کا مدعی کیسے ہو سکتا ہے (۱) جو حق العباد ادا نہیں کرتا جس کے دل میں خدا کی مخلوق سے شفقت نہیں بلکہ اس کے قلب میں اتنی سختی اور درندگی ہے کہ یتامیٰ کے حقوق کو دھکے دیتا اور مساکین کی پروا تک نہیں کرتا (۲) وہ شخص دین کا مدعی کیسے ہو سکتا ہے جو حق اللہ کو ادا نہیں کرتا جس کا دل توحید اور تعظیم لامر اللہ سے اس قدر خالی ہے کہ اس کے قلب میں نفس اور مخلوق کی حکومت ہے جس کی وجہ سے وہ نماز کی طرف سے بے پروا اس کی حقیقت سے غافل اور اس کے مقصد کے خلاف اس کا عمل ہے وہی شخص جو مخلوق کے حقوق کی طرف سے اتنا بخیل ہے کہ خدا کے مقرر کردہ حق زکوٰۃ اور چھوٹے چھوٹے ہمدردی کے سلوک سے بھی مضائقہ کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اس سے روکتا ہے وہ شخص بڑی فراخ دلی سے خدا کا حق مخلوق کو دیتا ہے یعنی نمازوں میں ریا کرتا ہے۔ درحقیقت وہ اپنے نفس کا پرستار ہے جس کو خوش کرنے اور اس کے کبر اور جھوٹے تقدس کو شہرت دینے کی خاطر وہ خدا کا حق تو مخلوق کو دیتا ہے یعنی جو عبادت محض خدا کے لئے ہونی چاہیئے تھی اور اسی کے حضور میں پیش کرنا چاہیئے تھی۔ اُسے تو وہ بجائے خدا کے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور جو مخلوق کا حق تھا وہ انہیں نہیں دیتا بلکہ اپنے نفس کی خاطر ایسی دناءت اور بخل کا اظہار کرتا ہے کہ ادنیٰ سی ہمدردی سے بھی مضائقہ کرتا ہے۔

پس ایسے شخص کی دینداری کا دعویٰ جھوٹا ہے وہ (۱) اپنے عمل سے دین کی تکذیب کر رہا ہے کیونکہ خدا کے دین کے خلاف اس کا عمل ہے اس شخص کے قلب میں خدا کا تخت نہیں بچھایا جا سکتا۔ اگر وہ نمازی بھی ہے تو اس کی نمازوں سے دھوکا نہ کھاؤ۔ وہ شکل نماز کی ہے مگر نماز نہیں کیونکہ اس کا سجدہ خدا کو نہیں بلکہ اس کے نفس کو ہے اسی لئے یہاں المصلّین فرمایا۔ المقیمین الصّلوٰۃ نہیں فرمایا۔ یعنی نمازی تو کہا مگر نماز کو قائم کرنے والا نہیں کہا۔ وجہ یہ کہ نماز کو قائم کرنے کے یہ معنے ہیں کہ نہ اس میں غفلت ہو نہ ریا ہو۔ یعنی نماز باقاعدہ ہو وقت پر ہو ارکان درست ہوں۔ نماز کو سمجھ سمجھ کر اور سنوار سنوار کر پڑھا جائے اور مخلوق کو دکھانے کے لئے نہیں بلکہ محض خدا کے لئے نماز پڑھی جائے۔ اور نماز کے مقصد کو نہ بھلایا جائے یعنی فحشا اور منکر سے بچے اور خدا کی مخلوق سے شفقت و ہمدردی کے کام کرے اور زکوٰۃ دے اور حق اللہ کے ساتھ حق العباد کو نہ بھولے۔ تب وہ نماز اصلی نماز ہے جو قائم ہو گئی اور ایسے شخص کا دین سچا ہے کیونکہ اس کے قلب میں خدا کا تخت بچھایا جاتا ہے۔ اور وہ ایک بندہ ہے جو اپنے رب کی ربوبیت سے مستفیض ہے جو مقصد پیدائش انسانی ہے اور عبد کے مقام عالی کو اس نے پا لیا جس کی طرف آیت ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون اشارہ کر رہی ہے۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ توحید کامل اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک بندہ اپنے نفس اور مخلوق دونوں کو

اللہ تعالیٰ کے لئے قربان کر دیتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری کے بالمقابل نہ اُسے مخلوق کی پروا ہوتی ہے اور نہ اپنے نفس کی۔ ایسا بندہ غفلت اور کبر و ہوائے نفس اور ریاکاری سے بکلی آزاد ہو کر توحید کامل پر قائم ہو جاتا ہے اور اس کی قربانی جناب الٰہی میں مقبول ہوتی ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے کل ما سوی اللہ یعنی نفس اور مخلوق کو قربان کر چکا ہوتا ہے توحید کامل کے اس مقام پر اس کی مخلوق سے شفقت و ہمدردی بھی محض اللہ کیلئے ہوتی ہے اور نفس کا کوئی حصہ درمیان میں نہیں ہوتا اور اسکی اللہ کی عبادت بھی محض اللہ کیلئے ہوتی ہے اور نفس اور مخلوق کا کوئی حصہ درمیان میں نہیں ہوتا

سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ وَهِيَ ثَلٰثُ اٰيَاتٍ

سورۃ الکوثر کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ ہے تو قرآن کی سب سے چھوٹی سورت۔ مگر قرآن نے جو فصاحت و بلاغت میں بینظیر ہونے کا چیلنج تمام دنیا کو دیا تھا جس پر عمائد مکہ کو از حد غیرت اور حمیت آئی تھی اس موقعہ پر کعبہ میں اسی سورت کو آویزاں کیا گیا تھا۔ کعبہ میں لٹکانا اس ملک میں چیلنج کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ عرب جن کو اپنی فصاحت بلاغت پر بڑا ناز تھا اس پر بہت تاؤ میں آئے اور سارے ملک میں سے تلاش کر کے ایک شاعر کو لائے جو فصاحت و بلاغت میں تمام عرب میں بینظیر تھا تاکہ وہ اس سورت کا جواب لکھے وہ آیا۔ پڑھا اور یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ ما ھذا اقول البشر یہ انسان کا کلام نہیں سورۃ الماعون میں یہ بتایا تھا کہ جو شخص شفقت علی خلق اللہ کا حق ادا نہیں کرتا اور تعظیم لامر اللہ میں توحید اور اخلاص کو عمل سے ثابت نہیں کرتا وہ درحقیقت اپنے عمل سے دین کو جھٹلاتا ہے اس سورت میں یہ کمال کیا ہے کہ دین کی حقیقت ایک آیت میں بیان کر دی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے کل ذرائع اور ان کے کمالات کو ایک چھوٹی سی آیت کے اندر اس خوبصورتی اور نزاکت و لطافت اور جامعیت سے بیان کر دیا ہے کہ کم سے کم میرے پاس تو الفاظ نہیں جن کے ذریعہ میں اس کیفیت کا اظہار کر سکوں جو اس کے معارف و حقائق سے قلب پر وارد ہوتے ہیں وما اللہ التوفیق۔ فرماتے ہیں:

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ○ بے شک ہم نے تجھے کوثر عطا کی ہے

کوثر ہر شے کی کثرت کو کہا جاتا ہے الکوثر کے معنے یہاں ہیں خیر کثیر جس زمانہ میں اس سورت کا نزول ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کی حالت نہایت بیکسی اور بے بسی کی تھی۔ چاروں طرف مخالفت کا طوفان بپا تھا اور طرح طرح کی ایذائیں اور تکلیفیں دی جا رہی تھیں کامیابی کی بظاہر کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ بلکہ اسباب دنیوی پر نظر کرتے ہوئے ناکامی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس وقت آسمان سے یہ خدائی آواز آتی ہے۔ کہ ہم نے تجھے خیر کثیر دیا۔ یہاں ماضی بمعنے استقبال اس لئے استعمال ہوئی ہے کہ تا وہ اس یقین کو ظاہر کرے جس کا اس عطیہ کے متعلق جناب الٰہی کو اعلان کرنا منظور تھا یعنی یہ بتانا مقصود تھا کہ یہ ایک امر ہے جو آسمان پر مقرر ہو چکا ہے غرضکہ اس آیت میں بڑی زور اور تحدی سے خیر کثیر کے ملنے کی بشارت دی جاتی ہے اور واقعات عالم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ جاؤ بیشک تاریخ عالم پر نظر ڈالو اور وہ خیر کثیر جو آپ کو دیا گیا اس

کے متعلق غور کرکے دیکھو کہ کونسی دینی و دنیوی زمینی و آسمانی نعمت اور برکت ہے جو آپ کو نہیں دی گئی اور بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ رنگ میں اور بہت سی بہت مقدار میں نہیں دی گئی - طاقت اور سلطنت، امت اور جماعت، عزت اور نیکنامی شرافت اور تہذیب، اخلاق فاضلہ اور معرفت کاملہ، علم اور حکمت، نور قلب اور نور ایمان، عقل اور فراست، اولاد روحانی مثل علمائے ربانی و اولیائے امت، قرآن جیسی عظیم الشان کتاب اور قیامت تک آپ کی نبوت کا فیضان روحانی، وغیرہ وغیرہ ان میں سے کونسی نعمت ہے جو انسان کو مل سکتی ہے - اور محمد رسول اللہ صلعم کو بہتر سے بہتر شکل میں اور کثیر سے کثیر مقدار میں نہیں ملی یہ پیشگوئی جو نہایت بیکسی اور عجز وضعف کے وقت میں قرآن نے کی تھی جس شان وشوکت کے ساتھ پوری ہوئی اس کا اعتراف دشمنوں کو بھی کرنا پڑا ہے چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے کہ "مذہبی شخصیتوں میں سب سے بڑھ کر کامیاب شخصیت محمد عربی (صلعم) کی ہے" تاریخ اس پر گواہ ہے واقعات کا انکار نہیں ہوسکتا - اور جو کچھ دنیا میں آپ کو ملا ہے یہ اس کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتا ہے جو آخرت میں آپ کے لئے مقدر ہے اس دنیا میں آپ کے فیض باطنی اور شفاعت روحانی کے کمالات کا ظہور اگر آخرت میں شفاعت کبریٰ اور نہر کوثر کی شکل میں ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہو تو کیا محل تعجب ہے جیسا کہ حضرت سعید بن جبیر سے کوثر کی نسبت دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے ہر قسم کی خیر سے کثرت عطا فرمائی پوچھنے والے نے کہا وہ جنت میں نہر ہے؟ آپ نے فرمایا نہر بھی اور اس کے سوائے اور بھی یعنی وہ نہر بھی اس خیر کثیر میں سے ایک ہے حضرت مسیح موعودؑ بھی فرماتے ہیں ؎

این چشمۂ رواں کہ بخلق خدا دہم　　یک قطرۂ ز بحر کمال محمد است

اس کوثر کا انعام جن اعمال پر آپ صلعم کیلئے مقدر تھا وہ بھی سن لو - فرماتے ہیں :-

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھ اور قربانی کر -

اس آیت میں سارا دین جمع کرکے رکھدیا ہے گویا جو اس آیت پر عمل کرتا ہے وہ اپنے عمل سے دین کی تصدیق کرتا ہے فرماتے ہیں تو اپنے رب کے لئے نماز پڑھ اور اپنے رب کے لئے قربانی کر - دین پر عمل کرنے یعنی خدا سے تعلق پکڑنے اور اس کی رضا کو حاصل کرنے کے لئے دو ہی طریق ہیں ایک عبادت دوسرے عمل (۱) عبادت کا مغز دعا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے اور دعا کی بہترین شکل نماز ہے جس کے ذریعہ انسان اللہ تعالیٰ کے حضور میں اعتراف عبودیت کرتا اور اعمال صالحہ یعنی کامل فرمانبرداری کے لئے امداد طلب کرتا ہے (۲) عمل کا انتہائی کمال قربانی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کو اس کمال پر پہنچا دینا کہ اس کے لئے مخلوق اور اس کی تمام دلچسپیوں اور نفس اور اس کی تمام خواہشات وجذبات کو قربان کردینا - نماز اور قربانی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہیں کہ نہ تو کوئی نماز اپنے کمال کو پہنچتی ہے جب تک قربانی نہ ہو اور نہ کوئی قربانی اپنے کمال کو پہنچتی ہے جب تک نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب نہ کی جائے - (۱) نماز کا کمال تو یہ ہے کہ نماز کی نیت کے ساتھ ہی انسان تمام ماسوی اللہ سے منقطع

ہو جائے اور مخلوق اور اس کی تمام دلچسپیوں اور توقعات اور نفس اور اس کی تمام خواہشات اور جذبات کی گردن پر چھری پھر جائے ۔ گویا نماز کی پہلی تکبیر تحریمہ اس تکبیر کی قائم مقام ہو جائے جو کسی جانور کے گلے پر چھری پھیرتے وقت پڑھی جاتی ہے۔ تب اس قربانی کے ساتھ وہ انقطاع الی اللہ پیدا ہوتا ہے جو نماز کو اپنے کمال تک پہنچا دیتا ہے اور اُسے الصلوٰۃ معراج المومنین کا مصداق بنا دیتا ہے یعنی نماز مومن کی معراج بن جاتی ہے۔ پس نماز پڑھنے کے حکم کے ساتھ ہی قربانی کا حکم اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نماز اپنے کمال کو تب حاصل کرتی ہے جب انسان اسے اس مرتبہ پر پہنچا دے کہ نماز کی نیت اور تکبیر تحریمہ کے ساتھ تمام ماسوی اللہ کو قربان کر دے یعنی مخلوق اور اس کی تمام دلچسپیوں اور توقعات اور نفس اور اس کی تمام خواہشات اور جذبات پر چھری پھیر دے (۲) اسی طرح قربانی کا جو حکم ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے لئے مخلوق اور اس کی تمام دلچسپیوں اور نفس اور اس کی تمام خواہشات اور جذبات کو قربان کر دینا یہ اپنے کمال کو نہیں پہنچتا جب تک اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہو اور اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان نماز کے ذریعہ سے اللہ سے دعا اور استمداد کرے تب انسان اپنے اعمال کو اس اعلیٰ مقام پر پہنچا دیتا ہے جو کامل قربانی کا مقام ہے۔ پس قربانی کے حکم سے قبل جو نماز کا حکم ہے اس میں یہی اشارہ ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کو اس کمال تک پہنچا دو جسے قربانی کہتے ہیں جس کے معنے ہیں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے مقابلہ میں مخلوق اور اس کی تمام دلچسپیوں اور توقعات اور نفس اور اس کی تمام خواہشات و جذبات کو قربان کر دینا تو اس کے لئے ضروری ہے کہ نماز کو قائم کرو۔ اور دعا کے ذریعہ اپنے رب سے مدد چاہو تب قربانی اپنے کمال کو پہنچ جائے گی اور تمہاری فرمانبرداری مکمل ہو جائیگی۔ گویا کامل قربانی کامل فرمانبرداری کا دوسرا نام ہے اور یہ عمل کا انتہائی کمال ہے

اب عمل کے دو حصے ہیں ایک تعظیم لامر اللہ اور دوسرا شفقت علی خلق اللہ۔ دونو اپنے کمال کو نہیں پہنچتے جب تک قربانی نہ ہو خدا کی مخلوق پر شفقت اپنے کمال پر نہیں پہنچ سکتی جب تک انسان دوسروں کے لئے اپنے نفس اور اس کی تمام خواہشات اور جذبات کو قربان نہ کر سکے۔ اور تعظیم لامر اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کامل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے لئے انسان اپنے نفس اور اس کی تمام خواہشات و جذبات کے علاوہ کل ماسوی اللہ یعنی تمام مخلوق اور اس سے توقعات کو بھی قربان نہ کر سکے اور ضروری ہے کہ یہ قربانیاں محض رضائے الٰہی کے لئے ہوں۔ اگر کسی انسان کے ساتھ شفقت اور ہمدردی کی جائے تو اس پر احسان رکھنے کی نیت نہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے عمل ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری جب بھی ہو محض رب کی رضا کے لئے ہو ریاکاری کے لئے یا شہرت کے لئے یا کسی اور نفسانی غرض کے لئے نہ ہو۔ اسی لئے نماز اور قربانی کے احکام کو لربک کے لفظ کے ساتھ مخصوص کیا۔ کہ نماز اگر پڑھی جائے تو اپنے رب کے لئے پڑھی جائے اور قربانی جو کی جائے وہ اپنے رب کی رضا کے لئے کی جائے یعنی شفقت علی خلق اللہ کے وقت پر کسی احسان رکھنے کی نیت نہ ہو اور تعظیم لامر اللہ کے وقت کسی قسم کی ریاکاری کی غرض پنہاں نہ ہو۔ جب انسان قربانی کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا انتہائی کمال ہے تو وہ توحید کاملہ کو پا لیتا ہے اور انسانی اعمال کے کمالات کا یہ انتہائی مقام ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئے

خدا سے استعانت و استمداد یعنی نماز ضروری ہے اس لئے حکم دیا کہ اگر کوثر کا انعام مانگتے ہو اور خیر کثیر کے وارث بننا چاہتے ہو تو نماز پڑھو۔ اور قربانی کرو۔ یعنی اپنی عبادت اور قربانی سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کو اپنے کمال تک پہنچا دو بس یہی وہ کامل دین ہے جس کے لئے انسان متکلف ہے اور جس سے خدا راضی ہوتا ہے اور انسان کو کوثر کا انعام عطا فرماتا ہے

ع ۳ ۳۳ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ بیشک تیرا دشمن ہی وہ ہے جس کا ذکر باقی نہ رہے گا۔

ابتر اُسے کہتے ہیں جس کا کوئی نام لیوا نہ ہو۔ اور اس کا ذکر دنیا میں باقی نہ رہے کفار سمجھتے تھے کہ چونکہ آنحضرتؐ کی کوئی اولاد نرینہ موجود نہیں اس لئے آپ کی زندگی کے ساتھ ہی آپ کا ذکر بھی منقطع ہو جائے گا فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ تیرے بعد تیرا ذکر باقی نہ رہے گا وہ سن رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کو کوثر عطا فرمایا ہے آپ خیر کثیر کے وارث ہیں آپ کے نام لیوا اور آپ کے غلام اس قدر دنیا میں ہوں گے اور اس قدر ظاہری و باطنی شوکت و نعمت کے وارث ہوں گے کہ دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکے گی۔ آپ کی روحانی اولاد کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا البتہ آپ کے دشمنوں کا ذکر دنیا میں باقی نہ رہے گا۔ اور بات بھی صحیح ہے جب ایک بندہ اپنے رب کے لئے تمام ماسوی اللہ یعنی نفس اور اس کی تمام خواہشات و جذبات کو اور مخلوق اور اس سے تمام توقعات کو محض خدا کی رضا اور فرمانبرداری کے لئے قربان کر دیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اس کی دستگیری فرماتا ہے اور جو شخص بھی اس کے ایسے بندہ کے مقاصد اور ترقیات میں روک بنتا اور مزاحم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کو مٹا دیتا اور اس کی شرارت کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ جس طرح بندہ نے اپنے رب کے لئے ہر ایک چیز کو جو اس کے رب کی رضا اور فرمانبرداری میں روک بنتی تھی قربان کر دیا اور ذبح کر ڈالا اسی طرح اس کا رب بھی اپنے اس بندہ کی خاطر ہر ایک اس چیز کو جو اس بندہ کی ترقی اور مقاصد میں روک بنتی ہے قربان کر دیتا اور ذبح کر ڈالتا ہے گویا خدا کا فعل بھی بندہ کے فعل کے عین بالمقابل ہوتا ہے چنانچہ دیکھ لو محمد رسول اللہ صلعم جو ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین کا صحیح مصداق تھے اور جن کی نماز اور قربانیاں اپنے کمال کو پہنچ چکی تھیں کس طرح کوثر یعنی خیر کثیر کے وارث ہوئے۔ اور آپ کے دشمن کس طرح ابتر ثابت ہوئے کیا آج اُن کا کوئی نام لیوا باقی ہے؟ بالمقابل محمد رسول اللہ صلعم کے نام پر جان قربان کرنے والوں کی تعداد آج کروڑوں تک پہنچی ہوئی ہے اور جس قدر روحانی اولاد اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخشی ہے دنیا کی کسی قوم میں نہیں پائی جاتی۔ یعنی جس قدر صلحاء اولیاء اقطاب و ابدال مجددین و علمائے ربانی وارثانِ نبوت آپ کی امت اور غلاموں میں ہوئے دنیا کی قوموں کی تاریخ اس کا عشر عشیر بھی پیش کرنے سے عاری ہے ابھی کوثر ختم نہیں ہوا بلکہ اس کا دامن ابد تک دراز ہے اس کا ظہور انشاء اللہ ہمیشہ پیش از پیش ہوتا رہے گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور آپ کے دین کے دشمن اور اس کی ترقی میں روک ڈالنے والے خواہ وہ عیسائی ہوں یا آریہ، مادہ پرست ہوں یا دہریہ۔ مشرقی ہوں یا مغربی۔ انشاء اللہ تعالیٰ سب اسی طرح ابتر اور ناکام و نامراد ثابت ہوں جس طرح پہلے دشمن ہوئے

اور آپ پر نعماء و برکات ظاہری و باطنی، دینوی و اُخروی کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ اور یہ کوثر کبھی ختم نہ ہوگا اور آپ کی امّت کا ہر ایک وہ فرد جو نماز اور قربانی کو مذکورہ بالا طریق پر ادا کرتا ہے وہ اپنی استعداد اور اپنی عبادت و قربانی کے اندازہ کے مطابق اس کوثر سے حصہ لیتا ہے اور آئندہ لے گا۔ اور اس کے دشمن بھی اسی نسبت سے ہلاکت کا منہ دیکھتے ہیں اور دیکھیں گے۔ پس مبارک ہے وہ جو اس کوثر سے حصہ لے جو خدا کی طرف سے محمد رسول اللہ صلعم کو دیا گیا ہے اور جس سے آپ کی اتباع کی طفیل آپ کا ہر ایک اُمتی علیٰ قدر استعداد و عمل مستفیض ہو سکتا اور ہوتا ہے ۔

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ مَكِّيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ | وَهِيَ سِتُّ اٰيَاتٍ

اس سورت کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا۔ سورۃ الکوثر میں بتایا تھا کہ عبادت اور عمل دونو اپنے کمال کو نہیں پہنچتے جب تک مخلوق اور اس کی تمام دلچسپیوں اور توقعات اور نفس اور اس کی تمام خواہشات و جذبات کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور فرمانبرداری کے لئے قربان نہ کر دیا جائے۔ اور یہی توحید کامل ہے اور سورت الکٰفرون میں اس توحید کامل کو عملی رنگ میں پیش کیا ہے کہ مومن فقط اعتقاداً ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی کو عملاً اس توحید کامل کا مرقع بنا کر اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرتا اور کوثر کا وارث ہوتا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ○ کہہ دے اے کافرو یا میرے پیغام توحید کے انکار کرنے والو۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ○ میں اس کی عبادت نہیں کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ○ اور نہ تم اسکی عبادت کرنیوالے ہو جسکی میں عبادت کرتا ہوں۔

لا اعبد کے معنے ہیں میں عبادت نہیں کروں گا۔ جیسا کہ زمخشری نے لکھا ہے کہ لا مضارع پر داخل ہو کر اس کو استقبال کے معنے کر دیتا ہے جس طرح ما مضارع پر داخل ہو کر اسے حال کے معنے میں کر دیتا ہے قبل اس کے کہ میں اس آیت کی تشریح کروں توحید کامل کو سمجھنے کے لئے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کسی چیز کی عبادت تب کرتا ہے یعنی اسے معبود تب بناتا ہے جب اس سے یا تو نفع کی امید ہو یا نقصان کا خوف۔ دنیا نے جس قدر چیزوں کی پرستش کی ہے خواہ عناصر کی کی ہے یا اجرام فلکی کی۔ شجر کی کی ہے یا حجر کی۔ انسان کی کی ہے یا حیوان کی۔ گذشتہ ولیوں، نبیوں اور مزاروں کی کی ہے یا کسی طاقت کی۔ ہمیشہ انہی دو امور کے ماتحت پرستش کی ہے یا تو انسان کو ان سے کچھ نفع کی توقع تھی یا نقصان کا خطرہ۔ چنانچہ معبودانِ باطلہ کی خدائی کی نفی قرآن کریم نے انسان کی فطرت

کو مدنظر رکھتے ہوئے اس طرح فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے کہ قل اندعو من دون اللّٰہ ما لا ینفعنا ولا یضرنا (الانعام) کہدے کہ کیا ہم پکاریں اللہ کے سوا ان کو جو ہم کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں یعنی جنہیں تم نفع حاصل کرنے یا نقصان سے بچنے کے لئے پوجتے ہو ان میں نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت ہی نہیں کہ انہیں پوجنے کی ضرورت ہو۔ لیکن ان تمام معبودوں کی عبادت کے اندر ایک اور بھی حقیقت پنہاں ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تمام غیر اللہ کی پرستش درحقیقت انسان اپنے نفس کے لئے کرتا ہے۔ یعنی یا تو اُسے اپنے نفس کے لئے نفع حاصل کرنا منظور ہوتا ہے یا اُسے کسی نقصان سے بچانا منظور ہوتا ہے گویا ان تمام عبادتوں اور قربانیوں میں درحقیقت پس پردہ اس کا اپنا نفس ہوتا ہے۔ اور یہ تمام عبادتیں اور قربانیاں درحقیقت سب نفس کی خاطر ہوتی ہیں۔ پس سب سے بڑا معبود و مطلوب پس پردہ خود انسان کا اپنا نفس ہے۔ جس بت کی حقیقت کو طشت از بام کرنا قرآن کا ہی کام تھا جو فرماتا ہے افرءیت من اتخذ الٰہہٗ ھواہ (الجاثیہ) کیا تو نے غور نہیں کیا اس شخص پر جس نے اپنے خواہشات نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے پس قرآن کی نظر میں توحید کامل وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ صرف تمام ماسوی اللہ سے نفع و نقصان کی توقعات کو برطرف اور قربان کردے بلکہ اپنے نفس کی تمام لذات اور خواہشات کو بھی قربان کردے جس کے نفع و نقصان کی خاطر اسے عبادت کی تحریک ہوتی ہے توحید کا پہلا تقاضہ تو یہ ہے کہ انسان کو اگر نفع کی توقع ہو تو صرف جناب الٰہی سے اور اگر نقصان کا خطرہ ہو تو صرف جناب الٰہی سے۔ اور وہ حضور دل سے یہ یقین رکھے کہ بغیر منشائے الٰہی کے کوئی مخلوق کسی فرد بشر کو نہ نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مخلوق اس کی نظر میں ہیچ ہو۔ یہ اعلیٰ درجہ کی توحید بیشک ہے لیکن یہ ابھی کامل نہیں ہوئی۔ کیونکہ ماسوی اللہ میں سے ابھی صرف مخلوق ذبح اور قربان ہوئی۔ نفس قربان نہیں ہوا جس کی خاطر نفع و نقصان کا خیال ابھی باقی ہے توحید کا کمال یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ نفس بھی ذبح ہو جائے۔ یعنی نفس کی خاطر نفع کی خواہش اور نقصان وہی کا خطرہ ہی دل سے نکل جائے۔ یہاں تک کہ بندہ کو اپنے رب کی رضا کی خاطر اپنا ذاتی نفع بھی قربان کر دینے میں قطعاً تامل نہ ہو۔ اور اس کی رضا کو حاصل کرنے کے لئے اگرچہ اسے اپنے نفس کو سخت سے سخت خطرہ میں بھی ڈالنا پڑ جائے تب بھی مضائقہ نہ کرے تب وہ توحید اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ اسی کو حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ فتوح الغیب مقالہ ۱۷ میں فرماتے ہیں کہ توحید کامل تب ہوتی ہے جب انسان مخلوق اور نفس دونو کو اپنے رب کے لئے قربان کر دے۔ مخلوق کو اس طرح کہ خدا کے سوا مخلوق سے نفع کی توقع اور نقصان کا خطرہ نہ رہے اور نفس کو اس طرح کہ نفس کا نفع اور نقصان خدا کی رضا کے لئے قربان کر دے یعنی خدا کی عبادت محض محبت خالص سے ہو اپنے نفس کا نفع و نقصان اس میں مدنظر نہ ہو۔ بلکہ اس کی رضا اور فرمانبرداری کے لئے اگر اپنے نفس کے نفع کو قربان بھی کرنا پڑے اور سخت سے سخت نقصان بھی اٹھانا پڑے تو بھی ایک لمحہ کے لئے اسے تامل نہ ہو۔ یہ وہ توحید کامل ہے جو قرآن نے سکھائی ہے اور اس سورۃ الکٰفرون میں اُسے آنحضرت صلعم کی زندگی میں عملی رنگ میں پیش کر کے دکھایا ہے حکم ہوتا ہے کہ

ان کافروں کو کہدے جو تیرے پیغام توحید کے انکاری ہیں اور جو تیرے معبود کی پرستش سے منکر ہیں کہ لا اعبد ما تعبدون میں اس کی عبادت نہیں کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اس آیت کی اعلیٰ شان کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ حضرت نبی کریم صلعم کی مؤحدانہ زندگی پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔ آپ کے وعظ توحید نے جو مکہ میں کھلبلی ڈال دی تھی اس ہنگامہ میں کفار مکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور باہمی سمجھوتے کے لئے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ آؤ ہم باری باری سے ایک دوسرے کے معبود کی پرستش کر لیا کریں ایک سال تم ہمارے معبودوں کی پرستش کر لیا کرو۔ اور ایک سال ہم تمہارے معبود کی پرستش کر لیا کریں گے۔ یہ وہ طریق تھا جس سے ان تمام جسمانی تکالیف کا خاتمہ ہوتا تھا جس میں آپ کو کفار نے ڈال رکھا تھا۔ لیکن آپ نے توحید کی ایک ہی تلوار سے مخلوق اور نفس کے تمام معبودوں کو ذبح کر کے رکھ دیا اور وہی آیت تھی کہ لا اعبد ما تعبدون کہ میں نہیں عبادت کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اس میں آپؐ نے نہ صرف تمام معبودانِ باطلہ کی عبادت کی نفی کر دی جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ خواہ وہ شجر تھے یا حجر۔ سورج چاند تھے یا کوئی اور اجرام فلکی تھے بت تھے یا کوئی اور معبود تھے۔ گویا تمام ماسوی اللہ کے معبود ہونے کی نفی کر دی بلکہ ان کے پیش کردہ شرائط پر جو آپ کے نفس کو راحت اور نفع کی توقع ہو سکتی تھی اسے محض اپنے رب کی توحید اور رضا کے لئے قربان کر دیا لیکن فقط اسی قدر نہیں نفس کی تمام خواہشات اور لذات کو جس کمال کے ساتھ آپ نے محض رضائے الٰہی کے لئے قربان کر دیا وہ تاریخ عالم میں بے نظیر ہے۔ کفار مکہ نے دوسری تجویز یہ پیش کی کہ آپ صرف ہمارے معبودانِ باطلہ کی تردید کرنا چھوڑ دیں اس کے بدلہ میں اگر آپ عرب کی حکومت چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ اگر آپ دولت چاہتے ہیں تو جس قدر مال و دولت آپ چاہیں ہم جمع کر دینے کو تیار ہیں اگر آپ کسی حسین عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو جس عورت سے فرمائیں ہم نکاح کر دینے کو تیار ہیں۔ گویا نفس کی تین بڑی تمنائیں جو دنیا میں ہو سکتی ہیں (یعنی عزت و حکومت، مال و دولت، حسین عورت) تینوں کے پورا کرنے کے سامان پیش کر دیئے) لیکن آپ کی توحید کی تلوار نے نہ صرف ان کے معبودانِ باطلہ کو ذبح کر دیا بلکہ نفس کی تمام تمناؤں اور لذات کو بھی ذبح کر کے توحید کامل کا اعلیٰ ترین نمونہ دنیا کو دکھا دیا۔ آپ کی وہی ایک آواز تھی کہ لا اعبد ما تعبدون کہ میں نہیں عبادت کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو یعنی عزت و حکومت، مال و دولت، حسین عورت کی پرستش تم کرو تو کرو۔ یہ چیزیں تمہاری معبود ہوں تو ہوں میری معبود نہیں ہیں اور نہ کبھی ہوں گی۔ میں اپنے رب کی رضا کے لئے نفس کی ان تمام خواہشات کو قربان کر چکا ہوں لہٰذا اگر میرے دائیں ہاتھ پر آفتاب اور بائیں پر ماہتاب بھی دھر دو تب بھی معبودانِ باطلہ کی تردید ترک نہیں کر سکتا خواہ اس میں میرے نفس کو جس قدر بھی خطرات کا سامنا کرنا پڑے اور میری جان بھی چلی جائے اس کے بعد ان خطرات کا دور شروع ہوتا ہے جو اس انکار کا لازمی نتیجہ تھا۔ کفار نے آپ کو طرح طرح کی ایذائیں دیں تکلیفیں سخت سے سخت دیں آپ کو ایک وادی میں محصور کیا۔ آپ کا بائیکاٹ کیا۔ آپ کو بھوکا مار دینا چاہا قتل کر دینا چاہا آپ کے صحابہ کو طرح طرح کے دکھ دیئے، ایذا دی، قتل کیا، جلاوطن کرنے پر مجبور کیا لیکن ان تمام خطرات کی جن سے آپ کے نفس کو سابقہ پڑا آپ نے ذرا بھی پروانہ کی اور ہر مصیبت اور خطرہ میں۔ ہر ایک محاصرہ اور بائیکاٹ میں۔ ہر ایک جنگ اور ہلاچلی کی حالت میں

غرضکہ نازک سے نازک خطرہ اور جان جوکھوں کی حالت میں ایک ہی آواز آپ کی زبان سے نکلی اور وہ تھا لا اعبد ما تعبدون۔ میں نہیں عبادت کروں گا اس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ کیا اس سے بڑھ کر توحید ذہن میں آسکتی ہے کس طرح خدا کے لئے مخلوق اور اس کی تمام دلچسپیوں اور توقعات اور نفس کی تمام لذات اور خواہشات کو قربان کیا ہے اور ہر ایک قسم کے خطرہ میں پڑنے سے ذرا بھی تامل نہ کیا۔ پھر ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے وہ یہ کہ انسان کی طبیعت اور خیالات۔ حالات زمانہ کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ ایک شخص دیانتدار تھا لیکن خانگی حالات نے بڑھاپے میں مجبور کیا اور وہ بددیانت بن گیا۔ ایک شخص راستباز تھا لیکن کسی مقدمہ کی الجھن میں گرفتار ہو کر جھوٹ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا ایک شخص قبر پرستی کا دشمن تھا لیکن کسی عزیز کی بیماری میں گھبرا کر قبر پرستی کا مرتکب بن گیا۔ غرضکہ احتیاج بڑے بڑے ہیکڑ بازوں کی ہیکڑی کو توڑ دیتی ہے اور نیچا دکھا دیتی ہے اور بڑے بڑے موحد نفس کی خواہشات اور جذبات کے نیچے کسی نفع کے حصول یا نقصان کے ڈر سے مخلوق یا نفس کے بت کے سامنے سجدہ کر دیتے ہیں جیسا کہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج ٭ احتیاج است احتیاج است احتیاج

اب محمد رسول اللہ صلعم کی توحید کا کمال دیکھو کہ دنیا میں کوئی ابتلا نہیں جو آپ کو پیش نہ آیا ہو۔ طرح طرح کی تکلیفیں اور مصیبتیں آپ کو پیش آتی ہیں بھوک اور محاصرہ کی حالت، تنہائی اور بیکسی، پتھروں کی بارش، تیروں کی بوچھاڑ تلواروں کی یورش، جنگوں کی ہلاچلی) غرضکہ کسی حالت میں بھی آپ کی توحید میں ایک ذرہ کے برابر بھی فرق نہیں آتا۔ اور وہی لا اعبد ما تعبدون کی آواز آپ کے سینہ سے ہمیشہ اور ہمہ وقت بلند ہوتی ہے۔ کہ کچھ بھی ہو میں اس کی عبادت نہیں کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو جنگ اُحد میں بڑی سخت تکلیف آپ کو پہنچتی ہے مٹھی بھر صحابہ آپ کے گرد ہیں۔ سامنے کفار کی فوج کثیر تعداد میں تمام اطراف کو گھیرے کھڑی ہے تیروں کی بوچھاڑ اور دشمنوں کے حملوں سے بظاہر کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی۔ کہ دفعتاً ابوسفیان نے جو کفار کی فوج کا سردار تھا پکارا کہ کیا تم میں محمدؐ ہیں؟ پھر پوچھا کیا تم میں ابوبکر ہیں؟ پھر پوچھا کیا تم میں عمر ہیں؟ لیکن ہر دفعہ آپؐ نے یہی فرمایا کہ جواب نہ دو کیونکہ اقتضائے وقت یہی تھا۔ خاموشی میں ہی فائدہ تھا لیکن جب ابوسفیان نے یہ سمجھ کر کہ سب مارے گئے خوشی اور مسرت کے جذبہ سے بے اختیار ہو کر نعرہ مارا اور بڑے زور سے کہا۔ کہ اعل ا لھبل یعنی ہبل کی جے (ہبل عرب کا سب سے بڑا بُت تھا گویا اُن کا مہادیو تھا) اس آواز پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توحید کی غیرت نے خاموش رہنا پسند نہیں کیا اور ساری جان جوکھوں کے خیال اور تمام خطرات کو پس پشت پھینک کر ارشاد فرمایا کہ جواب دو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ کیا جواب دیں۔ فرمایا کہو۔ اللہ عزّ وجلّ اللہ ہی غالب اور عظمت و جلال والا ہے۔ پھر ابوسفیان چلایا کہ عزّیٰ لنا ولا عزّیٰ لکم کہ ہمارے لئے عزّیٰ ہے اور تمہارے لئے کوئی عزّیٰ نہیں (عزّیٰ عرب کی بڑی محبوب دیوی تھی) آپؐ نے صحابہ کو فرمایا جواب دو۔ کہ اللہ مولٰنا ولا مولیٰ لکم کہ اللہ ہمارا مولا ہے۔ اور تمہارا کوئی مولا نہیں۔ کیا لا اعبد ما تعبدون کی اس سے بہتر تفسیر مذہب کی تاریخ پیش کر سکتی ہے؟ یہ تو عُسر اور تکلیف کے ابتلا تھے جن میں مصائب و ابتلا کی زیادتی کے ساتھ ساتھ آپ کی توحید کا رنگ بیش

از پیش نکھرتا چلا گیا۔ اب یُسر یعنی آرام اور خوشحالی کے ابتلا کا رنگ ملاحظہ ہو۔ آپ چند سالوں کے اندر مکہ فتح کر لیتے ہیں تمام عرب آپ کے زیر نگین ہو جاتا ہے آپ بادشاہ بن جاتے ہیں۔ لیکن نفس کی خواہشات پر ہمیشہ چھری ہی پھیری (وہی سادگی تھی وہی دنیا کی زیب و زینت اور عیش و راحت سے نفرت تھی، جفاکشی، محنت، عبادت، سخاوت، غربا و مساکین سے ہمدردی و شفقت فروتنی و انکسار تواضع اور رضا کا رنگ جو غربت میں تھا وہی بادشاہت کی حالت میں تھا) وہی ایثار کا رنگ ہر حال میں نمایاں تھا۔ بیبیاں جن کی عزت اور محبت آپ کے قلب مبارک میں سب سے بڑھ کر تھی۔ جب دیکھتی ہیں کہ فتوحات کے ساتھ ایک ایک مسلمان مال و متاع سے متمتع ہو رہا ہے۔ آپ سے دنیا کی زیب و زینت کے لئے کچھ مال و متاع کی طلبگار ہوتی ہیں تو آپ انہیں مال و متاع دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس شرط پر کہ پھر آپ سے کوئی تعلق نہ رہے گا اور طلاق دے کر انہیں رخصت کر دیا جائے گا کیونکہ یہ مال و متاع پبلک کا حق ہے غربا و مساکین کو اس کی ضرورت ہے آپ کی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چکی پیس پیس کر پانی بھر بھر کر تکان اور کوفت سے درماندہ ہو کر آپ سے ایک لونڈی یا غلام مانگتی ہیں لیکن آپ فرماتے ہیں کہ غربا اور مساکین کی ضروریات ابھی پوری نہیں ہوئیں تم ہر نماز کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو تکان نہ ہو گی" کیا اس آرام اور دولت و حکومت کے ذریعہ آپ نے کبھی اپنے نفس کی خواہشات کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جو اگر آپ کرتے بھی تو آپ کا جائز حق تھا مگر ہرگز نہیں فائدہ اٹھایا کیونکہ آپ کی توحید کا اعلیٰ مقام ان چیزوں کو کبھی کا ذبح کر چکا تھا۔ یہ تھی عملی تفسیر اس توحید کی جو لا اعبد ما تعبدون کے ذریعہ دنیا کو سنائی گئی تھی کہ جیسی حالت بھی آئے مصیبت یا راحت، عسر یا یسر، غربت یا دولت عجز و ضعف یا حکومت ہر حال میں خدا ہی میرا معبود ہو گا) اے منکرو جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ کبھی بھی اور کسی حالت میں بھی میرے معبود نہیں بن سکتے ولا انتم عٰبدون ما اعبد میں مخاطب وہ کافر اور منکر ہیں جنہیں اپنے معبودوں کی عبادت پر اور محمد رسول اللہ صلعم کے معبود کی پرستش کرنے سے انکار پر اصرار تھا اسی لئے فرمایا کہ نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ اور میں کبھی اس کی عبادت کرنیوالا ہوا جس کی تم عبادت کرتے تھے۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ اور نہ تم اسکی عبادت کرنیوالے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

ولا انا عابد مّا عبد تم میں عبد تم ماضی کا صیغہ لانے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ نفی استقبال کی نہیں بلکہ ماضی کی نفی ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ میں نے اپنی تمام زندگی میں پہلے بھی کبھی ان معبودوں کی عبادت نہیں کی جن کی تم عبادت کرتے رہے ہو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بچپن سے ہی آپ توحید پر قائم تھے۔ اور بتوں سے آپ کو نفرت تھی بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماضی یعنی گذشتہ کی نفی پہلے کرنی چاہیئے تھی اور استقبال کی اس کے بعد مگر ترتیب کے بدلنے کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ استقبال کے متعلق تو کفار اپنا پورا زور لگا رہے تھے اور آپ کو اور آپ کے صحابہ کو ہر قسم کی ایذا

پہنچا رہے تھے اور قتل کے منصوبے کر رہے تھے اس لئے اس کی وقعت اور اہمیت کے لحاظ سے اسی معاملہ کو سب سے پہلے لیا اور فرما دیا کہ تم جتنا چاہو زور لگا لو میں کبھی اس کی عبادت نہیں کروں گا جسکی تم عبادت کرتے ہو اس کے بعد ماضی یعنی گذشتہ زندگی کو پیش کیا کہ مجھے تو شروع سے ہی تمہارے معبودوں سے نفرت ہے میں نے تو پہلے بھی کبھی ان کی پرستش نہیں کی تو اب اپنے رب کو پا کر اور اس کے حضور سے منصب نبوت پر مامور ہو کر ان کی پرستش کیسے کر سکتا ہوں" اور کفار کے متعلق دونو دفعہ ایک ہی قسم کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں ولا انتم عابدون ما اعبد یعنی تم اس کی عبادت کرنے والے نہیں جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور یہ تاکید کے لئے ہے اور یہ ظاہر کرنے کو کہ تمہیں اپنی بات پر اصرار ہے۔

ع ١ / ٢٢ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ تمہارے لئے تمہارا بدلہ اور میرے لئے میرا بدلہ ہے۔

یہاں دین کے معنے ہیں جزا جس طرح مالك یوم الدین میں دین کے معنے جزا ہیں یعنی جزا کے دن کا مالک۔ اب محمد رسول اللہ صلعم اور کفار کو جو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے معبودوں کی عبادت پر اصرار تھا اور فریق مقابل کے معبود کی عبادت سے انکار تھا اس کا انجام بتلاتے ہیں فرماتے ہیں کہ کہ دو کہ اے کافرو میں ان کی عبادت ہرگز کسی حالت میں بھی نہیں کروں گا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس خدا کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور اس سے قبل بھی میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرنے والا نہ تھا اور نہ تم اس خدا کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمہیں اصرار ہے تو مجھے بھی اصرار تھا اور ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ پس اپنا انجام بھی دیکھ لینا اور میرا انجام بھی دیکھ لینا، کیونکہ ضروری ہے کہ ان دونو فریق کا جو ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں نتیجہ بھی ایک دوسرے سے مختلف بلکہ اضداد کی شکل میں نکلے۔ اور جب یہ دونو فریق آپس میں ٹکرائیں تو جس کا معبود سچا اور قوی عزیز یعنی صاحب غلبہ و طاقت ہے، اور جس کی سلطنت واقعی کائنات عالم پر ہے اس کا پرستار غالب اور برسر اقتدار فاتح اور کامیاب ہو اور جھوٹے معبودوں اور ان کے پرستاروں کو ناکامی اور نامرادی کا سامنا ہو۔ چنانچہ معبودانِ باطلہ کے پرستاروں کا مقابلہ جب حق کے پرستار محمد رسول اللہ صلعم سے ہوا تو دنیا نے دونو کے نتائج ایسے واضح طور پر دیکھے کہ باطل اور حق جھوٹے اور سچے معبودوں میں فرقان اور امتیاز قائم ہو گیا یہاں تک کہ حق کے دشمنوں اور باطل کے پرستاروں کا سردار ابوسفیان جب فتح مکہ کے موقعہ پر اسلام لایا تو آنحضرت صلعم نے ابوسفیان سے دریافت کیا کہ آپ کے اب اسلام لانے کے کیا وجوہات ہیں اور کونسے دلائل ہیں جنہوں نے اسلام کی طرف اب آپ کے دل کو مائل کیا۔ اس نے کہا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہم نے اپنے معبودوں کے بچانے کے لئے آپ کی اس قدر مخالفت کی کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں اور آپ کو مٹا ڈالنے کے لئے کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا ہم بہت سے تھے اور آپ تنہا تھے لیکن بایں ہمہ آپ کامیاب اور ہم ناکام ہوئے۔ اگر ہمارے معبودوں میں کچھ بھی ست اور طاقت ہوتی اور ان کے اندر کچھ بھی اصلیت ہوتی تو یہ کچھ تو ہماری مدد کرتے نہ یہ کہ الٹا ہم اُن کی مدد کرتے رہے اور پھر بھی یہ اپنے آپ کو بچا نہ سکے پس ان کی کیا حقیقت ہو سکتی

ہے اس خدا کے سامنے جس نے اپنے واحد پرستار کو ایک ملک پر چند سالوں کے اندر وہ غلبہ دیا جس کی نظیر نہیں اسی کو حضرت مسیح موعودؑ آنحضرت صلعم کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

پہلوانِ حضرتِ ربِّ جلیل   بر میاں بستہ زشوکت خنجرے

بر جہاں ثابت نمودہ عجز بتاں   وانمودہ زور آں یک قادرے

اوپر کی مثال سے جو ہمیں آنحضرت صلعم کی زندگی میں عملی توحید نظر آتی ہے اس سے یہ ضروری نظر آتا ہے کہ مسلمانوں میں جب تک توحید عملی رنگ میں پیدا نہ ہو تب تک اُن میں اور دوسروں میں اسی طرح کا امتیاز اور فرقان قائم نہیں ہو سکتا جو لوگ منہ سے تو توحید کے مدعی ہوں اور قبر پرستی اور پیر پرستی اور تعزیہ پرستی، تقلید پرستی وغیرہ کی لعنت میں گرفتار ہوں یا ان کے لئے مال و دولت یا حکومت اور عزت و شہرت عورت اور اولاد کی محبت، خدا کی رضا اور فرمانبرداری پر مقدم ہوں یا رسم و رواج اور انسان سے ڈر کر نفس کو خطرہ میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے خواہ اس میں تلبیس حق اور رضا کی نافرمانی ہی ہوتی ہو۔ یا واقعات زمانہ اور حالات عسر و یسر اور ابتلاؤں میں پڑ کر خدا پر بھروسہ اور توکل اور استقامت میں فرق آجائے وہ اپنے عمل سے توحید کو جھٹلاتے ہیں اسی لئے مجدد وقت نے عملی توحید کے لئے اپنی بیعت میں یہ اقرار لینا ضروری سمجھا کہ میں دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا ؁

سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ | وَهِيَ ثَلٰثُ اٰيٰتٍ

اس سورۃ کا نزول بلحاظ زمانہ مدنی ہے مگر بلحاظ مقام مکی ہے کیونکہ اس کا نزول حجۃ الوداع میں ایام تشریق کے وسط میں ہُوا۔ سورۃ الکٰفرون میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کی زبان مبارک سے لکم دینکم ولی دین کا اعلان کرکے آپ کی جزا اور کفار کی جزا کو ایک دوسرے سے مختلف اور ایک دوسرے کی ضد بتلایا تھا اور سنا دیا تھا کہ دونو فریق کے انجام سے پتہ لگ جائیگا کہ کون سچے معبود کا پرستار ہے اور کون جھوٹے معبودوں کا۔ اس سورۃ النصر میں تو انجام دکھایا ہے آپ صلعم کا۔ اور سورۃ تبت یدا ابی لھب میں انجام دکھایا ہے کفار کا۔ اس سورۃ النصر میں دکھایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ کے خدا نے اپنے بندہ کی کیسی نصرت فرمائی کہ باوجود کفار کی ساری مخالفتوں کے اللہ تعالیٰ نے ایسی شاندار فتوحات عطا فرمائیں کہ آپ کی زندگی میں ہی تمام کفار مغلوب ہو گئے۔ اور شرک و کفر سارے ملک سے مٹ گیا فرماتے ہیں:۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح۔

وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ اور تو نے لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔

ع ۱ / ۳ / ۳۵
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ؏ پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس کی حفاظت مانگ بیشک وہ رجوع برحمت کرنیوالا ہے

فتح سے مراد بعض نے مکہ کی فتح مراد لی ہے وہ بھی صحیح ہے اور خدا کی نصرت کا ایک نظارہ ہے لیکن جب اس فتح کی تشریح اسی جگہ خود جناب الٰہی فرما رہے ہیں کہ رایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا یعنی لوگوں کا اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونا تو پھر کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں رہتی تسبیح کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی صفات کو ہر ایک نقص اور عیب سے پاک سمجھنا اور بیان کرنا۔ تقدیس کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے افعال کو ہر ایک نقص اور عیب سے پاک سمجھنا اور بیان کرنا گویا تسبیح و تقدیس قریباً قریباً ہم معنی ہیں۔ صرف صفت اور فعل کا فرق ہے دونوں مفہوم نقص اور عیب سے بریت کا ہے ایک میں بریت صفت کی ہے دوسرے میں بریت فعل کی ہے تحمید کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی صفات اور افعال کو ہر ایک اعلیٰ اور عمدہ خوبیوں سے موصوف سمجھنا اور بیان کرنا۔ فسبح بحمد ربک کے معنے ہوئے پس اپنے رب کی تسبیح کر حمد کے ساتھ یعنی اس کی صفات کو ہر ایک نقص اور عیب سے پاک اور ہر ایک عمدہ اور اعلیٰ خوبی سے موصوف سمجھ اور بیان کر۔

استغفار کہتے ہیں حفاظت طلب کرنے کو۔ یہ حفاظت تین رنگ میں طلب کی جاتی ہے (۱) ایک تو گناہ کے بدنتیجہ سے حفاظت طلب کرنا۔ (۲) دوسرے ایسی کسی کمزوری سے حفاظت طلب کرنا جس کی وجہ سے انسان گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے اسی لئے جو شخص جتنا زیادہ استغفار کرتا ہے اتنا ہی وہ گناہوں سے بچا رہتا ہے مثلاً جس شخص کو جھوٹ سے نفرت ہوتی ہے اور وہ اسے ایسی کمزوری سمجھتا ہے جس سے بچنا چاہیئے تو پھر وہ اس سے بچنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور خدا سے بھی حفاظت طلب کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جھوٹ میں پڑنے سے اپنی حفاظت میں رکھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہی شخص جھوٹ سے بچ بھی سکتا ہے کیونکہ وہ اس سے بچنے کے کل سامان جمع کرتا ہے جس طرح کسی جنگل میں اگر شیر پڑتا ہو تو وہی شخص شیر سے بچے گا۔ جو اس سے بچنے کے کل سامان مہیا کریگا اسی طرح دنیا میں گناہوں سے وہی بچے گا جو ان میں پڑنے سے ڈرتا اور ان سے بچنے کے کل سامان مہیا کرتا ہے اور اس حفاظت کا بڑا ذریعہ اللہ تعالیٰ سے حفاظت طلب کرنا ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں استغفار کہتے ہیں پس جو شخص جتنی زیادہ استغفار پڑھتا ہے۔ اتنا ہی وہ گناہوں سے بچا رہتا ہے گویا کسی کی عصمت اور معصوم ہونے پر استغفار بطور دلیل کے ہے۔ ہمارے نبی کریم صلعم جب کسی صحبت میں بیٹھتے تھے تو ستر دفعہ استغفار پڑھ کر اٹھتے تھے۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ کسی مجلس کا بُرا اثر جو ہوتا ہے اس سے آپ کا قلب متاثر نہ ہو جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو گناہوں سے کس قدر نفرت تھی اور آپ ان سے کس قدر ڈرتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ ہر آن خدا سے حفاظت طلب کرتے رہتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ آپ معصومیت اور اخلاق کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر تھے جس سے بڑھ کر انسان کے لئے ممکن نہیں (۳) تیسرے نیکی میں ترقی کرنے میں بعض دفعہ انسان جو اپنے اندر کمزوری محسوس کرتا ہے اس سے حفاظت طلب کرنا .... مثلاً ایک شخص زکوٰۃ مال کا چالیسواں حصہ تو دیدیتا

ہے لیکن اس سے زیادہ ایثار اور قربانی کرنے سے اس کا دل بخل کرتا ہے یا پانچ وقت نماز تو پڑھ لیتا ہے لیکن تہجد پڑھنے میں طبیعت سستی کرتی ہے وغیرہ وغیرہ تو ایسی صورت میں بھی استغفار کی ضرورت ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے اس قسم کی کمزوری سے حفاظت طلب کرنا جس سے انسان نیکی میں بیش از پیش ترقی کرنے سے رہ جاتا ہے۔ گویا کمال کے حصول کے لئے بھی استغفار کی ضرورت ہوتی ہے پس جو نیک شخص جس قدر استغفار پڑھتا ہے۔ اتنا ہی وہ نیکی میں اعلیٰ سے اعلیٰ کمال حاصل کرتا چلا جاتا ہے کیونکہ جو شخص نیکی کی ترقی میں ذرا سی بھی کمزوری کا احساس رکھتا ہے اور اس کے لئے خدا سے حفاظت طلب کرتا رہتا ہے ضرور ہے کہ وہ نیکی میں ترقی کرے اور کمال کو حاصل کرے اسی لئے جنتیوں کی دعا قرآن میں مذکور ہے یقولون ربنا اتمم لنا نورنا واغفر لنا (التحریم) وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہمارے نور کو کامل کر دیجئے۔ اور ہماری کمزوریوں سے ہماری حفاظت کیجئے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ جنت میں کوئی گناہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے لا یسمعون فیھا لغوا ولا تاثیما یعنی گناہ کا ارتکاب تو دور رہا جنت میں گناہ کی بات یا کوئی لغو بات سنیں گے بھی نہیں۔ پس جنت میں جنتی جو استغفار کریں گے تو اس سے گناہوں کے نتائج سے حفاظت یا گناہوں کے ارتکاب سے حفاظت طلب کرنا تو بالکل بے معنی امر ہے۔ کیونکہ گناہوں کا وجود ہی وہاں ناممکن ہے پس یہاں حفاظت کی یہی تیسری قسم مراد ہے کہ جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کا مقام پانے کے لئے اور اس کے حصول میں اپنی کمزوریوں سے بچنے کے لئے جناب الٰہی کی حفاظت طلب کریں گے۔ چنانچہ اتمم لنا نورنا صاف اس کی تشریح کر رہا ہے یعنی نور تو ان کے پاس موجود ہے البتہ اس کی تکمیل کی تمنا ہے الغرض استغفار کا لفظ مذکورہ بالا تین اقسام کی حفاظت میں سے کسی ایک پر بھی بولا جاتا ہے اور ان میں سے دو پر بھی اور تینوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا موقعہ ہوگا ویسے معنے لئے جائیں گے۔ ایک گنہگار کے لئے گناہوں کے بدنتائج سے بچنے اور آئندہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے کسی گناہ میں ملوث ہو جانے سے بچنے کے لئے بولا جائے گا۔ لیکن ایک نیک اور پاکیزہ اور معصوم انسان کے لئے محض کسی کمزوری کی وجہ سے کسی گناہ میں ملوث ہو جانے سے بچنے کے لئے یا صرف نیکی کے کمال کے حصول کی راہ میں انسانی کمزوری سے حفاظت طلب کرنے کے معنوں میں بولا جائے گا۔ پس استغفار کے معنوں میں یہ ضروری نہیں کہ استغفار پڑھنے والا کسی گناہ کا بھی مرتکب ہوا ہے البتہ اس قدر صاف نظر آتا ہے کہ استغفار کرنے والا گناہ سے بہت متنفر ہے اور اسی لئے اس میں ملوث ہونے سے بچنے کے لئے وہ خدا سے حفاظت طلب کرتا رہتا ہے اور ضروری ہے کہ استغفار سے کام لینے والا نیکیوں کے اس کمال کو حاصل کرے جسے معصومیت اور قرب الٰہی کے مقام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو جتنا زیادہ استغفار کرے گا وہ اسی قدر ترقیات اور کمالات روحانی کا وارث ہوگا

تواب۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جس کے معنے ہیں رجوع برحمت کرنیوالا۔ اگر ایک گنہگار گناہ سے باز آتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس پر رجوع برحمت کرتا ہے لیکن یہ غلط ہے کہ تواب ہمیشہ گنہگار کے گناہ سے باز آنے پر ہی رجوع

برحمت کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ بلکہ جب بھی اور جیسے جیسے بندہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتا ہے تب ہی اور ویسے ویسے اس کا رب بھی اپنے بندہ کی طرف رجوع برحمت کرتا رہتا ہے اسی کو حدیث شریف میں اس طرح فرمایا ہے کہ بندہ اگر ایک گز خدا کی طرف چل کر آتا ہے تو اس کا خدا سینکڑوں گز اس کی طرف چل کر آتا ہے۔ بندہ خدا کی طرف اگر چل کر آتا ہے تو خدا اس کی طرف دوڑ کر آتا ہے۔ خواہ وہ گناہ کو چھوڑ کر رب کی طرف رجوع کرے خواہ وہ ایک نیکی سے دوسری اعلیٰ نیکی کی طرف ترقی کرتے ہوئے پیش از پیش رجوع کرے۔ مثلاً ایک شخص پانچ وقت نماز پڑھتا ہے یہ بھی خدا کی طرف رجوع ہے لیکن اب وہ اس رجوع میں زیادہ ترقی کرتا ہے وہ اب تہجد اور نوافل شروع کر دیتا ہے تو خدا بھی اب اس کی طرف زیادہ رجوع کرے گا۔ تو ایسے موقعہ پر کہا جائیگا کہ وہ خدا کو توّاب پائے گا۔ یعنی جیسے جیسے خدا کی طرف زیادہ رجوع کرے گا وہ خدا کو بھی اپنی طرف بیش از پیش رجوع برحمت کرنے والا پائے گا۔ پس توّاب گنہگار پر رجوع برحمت کرنے کے لئے مخصوص نہیں بلکہ ہر ایک نیکوکار کے نیکی اور توجہ الی اللہ میں ترقی کرنے پر جو جناب الٰہی بیش از پیش رجوع برحمت فرمایا کرتے ہیں وہ سب صفت توّاب کا ہی ظہور ہوا کرتا ہے۔

ان تمام امور پر روشنی ڈالنے کے بعد اب میں اس سورت کے اصل مضمون کو لیتا ہوں سورۃ الکٰفرون میں لکم دینکم ولی دین کے اعلان کے بعد لی دین کا نظارہ اس نصرت الٰہی اور فتوحات میں دکھایا ہے جو آخر کار محمد رسول اللہ صلعم کے شامل حال ہوئی۔ بڑے بڑے ابتلاؤں اور جھونکوں کے بعد آخر مکہ فتح ہوتا ہے اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ اور وہ دن آتا ہے کہ تمام ملک عرب نور اسلام سے چمک اٹھتا ہے اور ایک وحشی اور جاہل مطلق قوم جو طرح طرح کے شرک اور اوہام کی غلام تھی اور ہر ایک قسم کی جہالت اور گندگی میں مبتلا تھی۔ ایک مہذب اور با اخلاق بلکہ باخدا قوم بن جاتی ہے اسی کو فرماتے ہیں کہ جب خدا کی نصرت اور فتح آگئی اور وہ یہ تھی کہ آخر کار جس مشن کو محمد رسول اللہ صلعم اپنی زندگی کا مقصد بنا کر کھڑے ہوئے تھے اس میں خدا کی نصرت شامل حال ہو کر کامیابی کا سہرا آپ کے سر مبارک پر باندھا جاتا ہے اور لوگ فوج در فوج اس دین میں داخل ہوتے ہیں جس کی خاطر آپ نے اس قدر تکلیفیں اٹھائی تھیں لہذا ارشاد ہوتا ہے کہ جب تو نے دیکھ لیا کہ خدا کی نصرت اور فتح کس طرح آئی اور لوگ خدا کے دین میں کس طرح داخل ہوئے۔ تو اب تو خدا کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور حفاظت طلب کر۔ بیشک وہ رجوع برحمت کرنے والا ہے یہاں مخاطب کون ہے؟ آنحضرت صلعم بھی ہو سکتے ہیں اور ہر ایک مومن بھی ہو سکتا ہے انفرادی رنگ میں بھی اور جماعتی رنگ میں بھی اس لئے میں تینوں قسم سے اس کے معنے عرض کئے دیتا ہوں (۱) حضرت نبی کریم صلعم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ خدا کی نصرت سے یہ فتوحات نصیب ہوئیں کہ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے ہیں تو اب ضروری ہے کہ تو خدا کی حمد اور تسبیح کرے یعنی ان لوگوں کو جو خدا کے متعلق طرح طرح کے اوہام اور شرک میں مبتلا ہیں۔ خدا تعالیٰ کی صفات عالیہ و کاملہ کی صحیح تعلیم دے اور انہیں شرک اور جاہلیت سے نکال کر توحید اور معرفت کی صحیح اور کامل تعلیم پر قائم کر دے کسی کے دین میں داخل ہونے کے

موقعہ پر خدا کی تسبیح اور حمد کے حکم دینے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ نو مسلموں کو خدا کی توحید اور معرفت کی ٹھیک ٹھیک تعلیم دی جائے۔ کیونکہ شرک دراصل خدا کی سبحانیت کا ضد واقع ہُوا ہے وجہ یہ کہ شریک کا ہونا کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً عیسائی جو خدا کا بیٹا مانتے ہیں تو اس لئے کہ خدا باپ میں صرف انصاف ہی انصاف ہے رحم مطلق نہیں۔ اس لئے اس نقص کو رفع کرنے کے لئے بیٹا تجویز کیا گیا جو مجسم رحم ہے۔ گویا دو نو باپ بیٹوں میں نقص موجود ہے باپ میں رحم نہیں بیٹے میں انصاف نہیں اسی طرح جس قدر چیزیں غیر اللہ کے تصرف میں مانی جاتی ہیں اتنا ہی وہ جناب الٰہی میں نقص اور کمزوری کا اعتراف ہے ایک کامل اور ہر ایک نقص و عیب سے پاک ہستی کو کسی شریک کی ضرورت نہیں اس لئے توحید کی تعلیم سے بڑھ کر تسبیح کوئی اور نہیں ہو سکتی اسی طرح کسی ہستی کی تسبیح کے ساتھ تحمید نہ ہو تو وہ جامع جمیع صفات کاملہ ہستی نہیں ہو سکتی۔ یعنی اس کی جو صفت بھی ہو علیٰ وجہ الکمال ہونی چاہیئے۔ فیاضی و رحم ہو تو علیٰ وجہ الکمال ہو۔ قدرت ہو تو کامل ہو علم ہو تو کامل ہو غرضکہ نہ صرف وہ ہر ایک نقص و عیب سے پاک ہو بلکہ ہر ایک اچھی سے اچھی اور اعلیٰ سے اعلیٰ صفت کے ساتھ علیٰ وجہ الکمال متصف ہو۔ یہ توحید اور معرفت وہ تھی جس سے قرآن سے قبل دنیا محروم تھی اور عرب کے جنگلیوں کو تو اس کی خبر ہی کچھ نہ تھی۔ پس فرمایا کہ جو لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں ان کو خدا کی توحید کامل اور صحیح معرفت کی تعلیم دو اور اُن کے لئے خدا کے حضور مغفرت اور حفاظت طلب کرو۔ یعنی جو کچھ وہ بدعملیاں کر چکے ہیں اُن کے بد نتائج سے اور آئندہ بداعمالیوں میں گرفتار ہونے سے اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کے جناب میں حفاظت طلب کرو تا کہ اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت میں لے کر انہیں ایک نیک اور پاک قوم بنا دے اور نیکیوں میں ترقی دے فرمایا اگر تم اللہ تعالیٰ کی توحید اور معرفت انہیں سکھاؤ گے اور ان کے اعمال کے لئے جناب الٰہی سے دعا کرو گے اور حفاظت طلب کرو گے تو خدا تو بڑا تواب یعنی رجوع برحمت کرنے والا ہے۔ وہ ان پر رجوع برحمت کرے گا اور انہیں اپنی حفاظت میں لے لے گا۔ جو غلطیاں ہو چکیں ان کے بد نتائج سے انہیں بچا لے گا۔ اور آئندہ ان کمزوریوں میں پڑنے سے انہیں محفوظ کرے گا۔ اور انہیں ایک پاکیزہ اور نیکیوں میں ترقی کرنے والی قوم بنا دے گا۔ وہ تواب ہے۔ جیسے جیسے یہ خدا کی طرف رجوع کرتے جائیں گے ویسے ویسے خدا بھی نئی سے نئی رحمتوں کے ساتھ ان پر رجوع کرے گا۔ اور انہیں ترقی و کمال عطا فرماتا جاوے گا۔ اور ایسا ہی ہُوا۔ (۲) ہر ایک مومن کو انفرادی طور پر اس میں مخاطب کر کے یہ فرمایا کہ اے انسان جب تو نے دیکھ لیا کہ محمد رسول اللہ صلعم کے توحید کامل پر عامل ہونے سے خدا کی نصرت فتوحات کس طرح آپ کے شامل حال ہوئیں اور آپ کی تسبیح و تحمید یعنی خدا کی توحید و معرفت کی تبلیغ و تعلیم سے اور اس پر عمل کرنے سے کس طرح ایک مُردہ قوم زندہ ہو گئی۔ اور خدا کے دین میں داخل ہو کر جاہل و مشرک قوم سے ایک مہذب و با اخلاق قوم بن گئی تو تُو بھی یہی راہ اختیار کر اور خدا کی توحید کو اعتقادی اور عملی طور پر اپنی زندگی میں داخل کرے اور اس کی اعلیٰ صفات اور خوبیوں کو سامنے رکھ کر اخلاق الٰہیہ کو اپنے اندر لینے کی کوشش کر۔ منہ سے تسبیح و حمد کرنے کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی توحید اور معرفت کا صحیح تخیل انسان کے دماغ میں قائم ہوتا رہتا ہے دوم ان اخلاق الٰہیہ کو ہر وقت سامنے رکھنے سے انسان اپنی کمزوریوں کی اصلاح کرتا رہتا ہے سوم یہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ایک قسم کی دعا کا رنگ

رکھتا اور اس کے فضل کو جذب کرتا ہے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح و حمد کرتا اور دنیا میں اس کی تبلیغ کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی کمزوریوں کو دور کرتا اور اُسے اعلیٰ خوبیوں سے متصف کرتا ہے پھر فرمایا کہ استغفار بھی کر یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنے گذشتہ اعمال کے بدنتائج سے اور آئندہ کسی بداعمالی کے ارتکاب سے نیکی میں ترقی کرنے میں کمزوری وکسل سے حفاظت طلب کر۔ تاکہ گذشتہ بدعادتیں اور بداعمالیاں رنگ نہ لائیں اور آئندہ پھر ان غلطیوں کا اعادہ نہ ہو اور نیکی میں ترقی کرنے میں کوئی کمزوری روک نہ ہو تو اس طرح انسانی کمال اور ترقی کو حاصل کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ توّاب ہے۔ جیسے جیسے تو اپنے رب کی طرف توجہ کرتا جائے گا اللہ تعالیٰ بھی تجھ پر اپنے نئے سے نئے فضل اور نئی سے نئی رحمتوں کے ساتھ رجوع کرتا جائے گا۔ گویا مومن کو عرب کی مردہ قوم کی زندگی اور محمد رسول اللہ صلعم کی تسبیح و تحمید وعملی توحید کا کارنامہ دکھا کر ترغیب دی ہے کہ تو بھی اس نمونہ کے مطابق عمل کر تاکہ تیری زندگی بھی ایک کامیاب زندگی ہو اور اگر تجھے خیال ہو کہ وہ تو ایک کامل انسان تھے اور میں ایک کمزور انسان ہوں تو تُو اپنے رب کے حضور میں مغفرت مانگ یعنی اپنی کمزوریوں سے حفاظت طلب کر۔ وہ تیری کمزوریوں کی حفاظت کرے گا اور تجھ پر رجوع برحمت کرے گا تو جیسے جیسے اس کی طرف رجوع کرے گا اور اس کی تسبیح و تحمید اور استغفار میں ترقی کرے گا ویسے ویسے وہ اپنی بیش از بیش رحمتوں کے ساتھ تیری طرف رجوع کرے گا۔ اور تو بھی نصرت الٰہیہ اور فتوحات ربانی سے حصہ لینے والا ٹھیرے گا (۳) ہر ایک مومن کو مذکورہ بالا انفرادی رنگ کے علاوہ اجتماعی رنگ میں بھی یعنی بحیثیت جماعت بھی اس میں مخاطب فرمایا ہے کہ اے مسلم جب تو دیکھ چکا ہے کہ کس طرح محمد رسول اللہ صلعم کے ساتھ نصرت الٰہی شاملِ حال ہوئی اور وہ فتوحات نصیب ہوئیں کہ لوگ فوج در فوج آپ کے دین میں داخل ہوئے تو تُو بھی اگر چاہتا ہے کہ خدا کی نصرت تیرے شاملِ حال ہو اور پھر وہی فتوحات کا زمانہ آجائے کہ لوگ خدا کے دین میں فوج در فوج داخل ہوں تو تُو بھی وہی کام کر جو محمد رسول اللہ صلعم نے کیا تھا یعنی خدا کی تسبیح اور حمد کو دنیا میں پھیلانے کے لئے جدوجہد کر اور استغفار کر یعنی اپنی کمزوریوں کے لئے جناب الٰہی سے حفاظت طلب کر کیونکہ دراصل یہ مسلم قوم کی کمزوریوں کا نتیجہ تھا جو خدا کی نصرت و فتوحات بند ہو گئیں اور دین اسلام کا بڑھتا ہوا سیلاب رک گیا۔ مسلمانوں کی تاریخ پڑھ کر دیکھ لو تم پاؤ گے کہ جب تک مسلمانوں میں دین کا عشق تھا اور اس کی خدمت اور تبلیغ کا شوق تھا دین کے اندر قوموں کی قومیں داخل ہوتی چلی گئیں جب یہ رنگ نہ رہا اور دنیا مقدم ہو گئی اور دین مؤخر ہو گیا تو خدا کی نصرتیں بھی رک گئیں اور اسلام کا قدم بھی آگے بڑھنے سے رک گیا۔ فرمایا اے مسلم تو خدا کی نصرت اور فتوحات کا نظارہ دیکھ چکا ہے اٹھ اور تو بھی وہی کام کر جو اس وقت کی جماعت نے کیا تھا یعنی خدا کی تسبیح و حمد کر کے دنیا میں کھڑا ہو جا۔ اس کی تبلیغ و اشاعت کر اور جناب الٰہی سے ان کمزوریوں سے استغفار کر یعنی حفاظت طلب کر جن کی وجہ سے نصرت الٰہی اور فتوحات رک گئیں اور وہ کمزوری تھی دنیا کو دین پر مقدم کر لینے کی"۔ پس اگر تو خدا کی توحید اور اس کی تسبیح و تحمید کے لئے اٹھ کھڑا ہو گا۔ اور دنیا میں خدا کا نام بلند کرے گا اور اپنی کمزوریوں کو چھوڑ دے گا۔ اور خدا سے حفاظت کا طلب گار ہو گا تو تُو خدا کو توّاب

یعنی رجوع برحمت کرنے والا پائے گا یعنی وہ اپنی نصرت و فتوحات سے پھر تیری مدد کرے گا اور وہ دن دوبارہ آجائیں گے کہ خدا کے دین میں لوگ فوج در فوج داخل ہوں چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی طرف رجوع برحمت فرمایا اور پھر چاہا کہ لوگ دین اسلام میں داخل ہوں تو حضرت مسیح موعودؑ مجدد صدی چہاردہم کو کھڑا کیا آپ نے مسلمانوں کے تنزل پر جو مرثیہ لکھا ہے اس کا ایک شعر اس حقیقت کو خوب ظاہر کرتا ہے فرماتے ہیں ؎

ہر دین پروری آمد خروج اندر نخست ؛ باز چوں آید بیاید ہم از یں رہ بالیقیں

آپ نے مسلمانوں کی اس کمزوری کو خوب سمجھا کہ انہیں آجکل دنیا ہر چیز پر مقدم ہے اس لئے آپ نے جب دوبارہ خدا کے نام کی حمد اور تسبیح کو دنیا میں پھیلانا چاہا اور اشاعت اسلام کرنی چاہی تو جو جماعت بنائی اس سے علاوہ زبان سے استغفار کروانے کے یہ اقرار بھی لیا کہ "میں دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا" اور تحریر فرمایا کہ ہر ایک شخص جو سجدہ میں سر رکھتا ہے جناب الٰہی کی تسبیح پڑھنے کے وقت اگر اس کے دل میں یہ تڑپ نہیں کہ میرے رب کی تسبیح و حمد سے دنیا بھر جائے تو وہ دل ایک لعنتی دل ہے حدیث شریف میں سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ کے علاوہ سبحانك اللّٰھم ربنا وبحمدك اللّٰھم اغفرلی پڑھنا بھی مستحسن سمجھا گیا ہے تاکہ تسبیح و تحمید اور استغفار تینوں آجائیں لیکن منہ سے تسبیح پڑھنے کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب اعمال بھی اس کے مطابق سدھر جائیں اور انسان جس رب کی تسبیح و تحمید کرتا ہے اس کے نام کو دنیا میں بھی پھیلانے کی جدوجہد میں مصروف ہو جائے تاکہ خدا پھر رجوع برحمت فرمائے اور اسلام میں فوج در فوج لوگوں کے داخل ہونے کا نظارہ پھر خود دکھائے۔ آمین یا رب العالمین حضرت مجدد وقت کس دلی تڑپ سے یہ دعا فرماتے ہیں کہ ؎

اس دیں کی شان و شوکت یا رب مجھے دکھا دے ؛ سب جھوٹے دین مٹا دے میری دعا یہی ہے

سُوْرَةُ اللَّهَبِ مَكِّيَّةٌ	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	وَهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

سورۃ اللھب کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا یہ ابتدائی زمانہ کی سورۃ ہے سورۃ الکٰفرون میں جو حق کے پرستار اور باطل کے پرستاروں کی جزا کو لکم دینکم ولی دین فرما کر ایک دوسرے کی ضد بتلایا تھا تو سورۃ النصر میں انجام دکھایا حق کے پرستار کا۔ اور اب سورۃ اللھب میں انجام دکھاتے ہیں باطل کے پرستاروں کا جو حق کے پرستار کو طرح طرح سے دکھ دے رہے تھے۔ اور عداوتِ حق میں غضب سے بھر رہے تھے اور شعلے کی طرح بھڑک رہے تھے اس سورت میں بتایا ہے کہ یہ شعلے کی طرح بھڑکنے والے خود شعلوں کی نذر ہو جائینگے دنیا میں جنگ اور ہلاکت کے شعلوں کے اور آخرت میں جہنم کے شعلوں کے فرماتے ہیں:-

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ○ ابولہب یا شعلہ والے کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ہلاک ہو گیا۔

مَآ اَغۡنٰی عَنۡهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ اس کا مال اور جو اس نے کمایا تھا اس کے کسی کام نہ آیا۔

سَيَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وہ جلد شعلہ والی آگ میں داخل ہوگا۔

وَّامۡرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ ۝ اور اس کی عورت ہیزم کش یا چغلخور۔

فِیۡ جِيۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ۝ ع اس کے گلے میں کھجور کی چھال کا بٹا ہوا رسہ ہے۔

(جید وہ گردن جس میں ہار پہنا ہوا ہو مسد کھجور کی چھال سے بٹا ہوا) ابولہب کے معنے ہیں شعلوں کا باپ۔ یہ عربی کا محاورہ ہے ابو سے مطلب ہوتا ہے والا۔ جو صفت خاص طور پر کسی میں موجود ہو اسے ظاہر کرنے کے لئے اس صفت پر ابو کا لفظ لگا دیتے ہیں۔ مثلاً ابوالخیر کے معنے ہونگے نیکی والا۔ ابوالشر کے معنے ہونگے بدی والا۔ ابوجہل کے معنے ہوں گے جہالت والا اسی طرح ابولہب کے معنے ہوئے شعلوں والا یعنی ایسا آدمی جس کے اندر غضب اور حسد کے شعلے بھڑکتے ہوں۔ پس ہر ایک وہ شخص جس کے اندر حق کی مخالفت اور دشمنی بغض اور غضب کے شعلے بھڑکا دے وہ ابولہب کہلائے گا۔ کچھ شک نہیں کہ یہ کنیت آنحضرت صلعم کے چچا عبدالعزیٰ کی بھی تھی۔ اور وہ اس وجہ سے تھی کہ اس کے رخسار سرخ تھے۔ گویا اس کے چہرہ سے شعلے نکل رہے تھے لیکن اُس کے اندر حق کی دشمنی اور محمد رسول اللہ صلعم کی رسالت سے اس قدر عداوت تھی کہ غیظ و غضب کے شعلے ہر آن اس کے اندر بھڑکتے رہتے تھے۔ اس لحاظ سے بھی ابولہب کا لقب اس کے لئے نہایت موزونِ حال تھا۔ اُس کی دشمنی کا یہ حال تھا کہ جب رسول اللہ صلعم حاجیوں میں وعظ کے لئے نکلتے اور توحید کی تبلیغ کرتے تو یہ بھی پیچھے نکلتا اور کہتا کہ یہ کذاب ہے اور ساتھ ہی پتھر اٹھا اٹھا کر آپ کے پاؤں اور پنڈلیوں پر مارتا اور انہیں زخمی کر دیتا تا آپ چلنے سے رک جائیں۔ آنحضرت صلعم پر جب یہ آیت نازل ہوئی انذر عشیرتک الاقربین تو رسول اللہ صلعم نکلے یہاں تک کہ وہ صفا پر چڑھ گئے تب آپ نے مختلف قبیلوں کو نام لے لیکر پکارنا شروع کیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ ایک رسالہ اس پہاڑ کے پیچھے سے نکل کر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ تو تم میری بات کو سچ مانو گے سب نے کہا ہم نے کبھی تجھ سے جھوٹ نہ سنا نہ دیکھا بچپن سے تو صادق اور امین ہے تو آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں ایک خدا کی طرف بلاتا ہوں اور اس کی نافرمانی پر عذاب شدید سے ڈراتا ہوں ابولہب اس پر چیں اٹھا۔ اور پتھر مارے اور کہا۔ تبالک ما جمعتنا الا لھذا۔ تو ہلاک ہو تو نے کیا ہمیں صرف اس لئے جمع کیا تھا؟ پھر صرف زبان سے ہی ہلاکت کی بددعا نہیں کی بلکہ دن رات اسی کوشش میں رہتا کہ آنحضرتؐ کو ایذا اور تکلیف پہنچے یہاں تک کہ کئی مرتبہ اس نے آپ کو شہید کرنے کا بھی قصد کیا اسکی بیوی کی بھی دشمنی حد سے گذر چکی تھی اس کا

کام یہ تھا کہ جھوٹی باتیں آنحضرتؐ کے خلاف مشہور کرتی اور چغلخوریاں کرتی اور رات کو آنحضرت صلعم خانہ کعبہ میں عبادت کے لئے تشریف لے جاتے تو یہ رستے میں کانٹے بچھا آتی تا اندھیرے میں آپ کے پاؤں میں چبھیں اور آپ زخمی ہوں غرضکہ میاں بیوی دونوں کی شرارتیں، ایذادہی، غصہ اور غضب کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ دونوں کے اندر ایک ایسی آگ جل رہی تھی جو کسی طرح سرد ہونے میں نہیں آتی تھی۔ جب کوہ صفا پر آنحضرت صلعم کی دعوت حق پر ابولہب نے آپ پر اپنے دونوں ہاتھوں سے پتھر پھینکے اور چلا کر کہا تھا کہ تیرے ٹوٹیں دونوں ہاتھ اور تو ہلاک ہو کیا تو نے ہمیں اسی بات کے لئے جمع کیا تھا تو یہ سورت جواب میں اتری۔ جناب الٰہی نے فرمایا کہ محمد رسول اللہ صلعم کے خلاف جو کچھ اس نے کہا یہ اسی پر پلٹ کر پڑا۔ اس شخص کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور یہ خود ہلاک ہو گیا۔ یہاں ماضی کا صیغہ بجائے استقبال اس لئے استعمال کیا تا اس پیشگوئی کا یقینی رنگ میں اعلان کیا جائے یعنے لوگوں کو یہ ذہن نشین کیا جائے کہ اگرچہ آئندہ کی خبر ہے لیکن اس قدر یقینی ہے کہ یوں سمجھو کہ یہ واقعہ ہو چکا کیونکہ خدا کی یہ اب تقدیر جاری ہو چکی ہے اور ٹل نہیں سکتی اور یقیناً ہو کر رہے گی

یہ یاد رہے کہ عبدالعزیٰ جس کی کنیت ابولہب تھی اس سورت کا پہلا مصداق تھا لیکن یہ سورت اس کے لئے مخصوص نہیں بلکہ ہر ایک ابولہب کے لئے ہے جس کے اندر بھی حق کی مخالفت اور محمد رسول اللہ صلعم کی دشمنی کی آگ بھڑک رہی ہو وہی شعلے والا ابولہب کہلائے گا جیسے ہائی کورٹ کسی مقدمہ میں کوئی فیصلہ دیتی ہے تو وہ فیصلہ پھر ہر ایک اس مقدمہ پر عاید ہوتا ہے جو اس سے مشابہ ہوتا ہے اسی طرح ایک شخص نے حق کی دشمنی میں ابولہب کا خطاب پایا اور اپنی ابولہبی میں کمال کر دکھایا اس کے متعلق جناب الٰہی سے جو فیصلہ ہوا اور اس کے لئے جو سزا مقرر ہوئی وہ اب ہر ایک ابولہب پر عائد ہو گی۔ یعنی ہر اس شخص پر جو اپنے اندر حق کی دشمنی اور محمد رسول اللہ صلعم کی عداوت کی آگ بھڑکاتا ہے فرماتے ہیں ابولہب کے اپنے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور ہلاک ہو گیا۔ دونوں ہاتھ ٹوٹنے کا استعارہ اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے دین کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ کیونکہ انسان کے دو ہاتھ ہی ہوتے ہیں۔ اگر ایک ٹوٹ جاتا ہے تو وہ دوسرا استعمال کر لیتا ہے لیکن اگر وہ دونوں ٹوٹ جائیں تو اس کے پاس اب نقصان پہنچانے کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔ لہذا ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جانے سے یہ مراد ہوا کہ وہ آپ کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ بیشک زور لگائے لیکن محمد رسول اللہ صلعم کا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا اور دو ہاتھوں میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی رسول کی رسالت کو مٹانے کے لئے دو ہی ذریعے اختیار کر سکتا ہے یا تو ابتدائے رسالت میں رسول اور اس کی جماعت کو ہی ہلاک کر دے اور مٹا دے تا کہ رسول اور اس کی جماعت مٹنے سے اس کا مشن ہی مٹ جائے۔ جیسا کہ اس زمانہ کے کفار عرب نے شیوہ اختیار کیا تھا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ اس تعلیم کی تذلیل و تحقیر کی جائے جو وہ رسول لایا ہے اور طرح طرح کے وساوس اور بہتانوں اور غلط پروپاگنڈے سے لوگوں کو اس سے بدظن کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور لوگوں کے ایمان کو اس طرح سلب کر کے دین حق کو مٹایا جائے جیسا کہ آجکل آریوں اور مسیحی

پادریوں نے طریق اختیار کر رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابولہب کے دونو ہاتھ کٹ چکے۔ یعنی نہ تو ابتدائی زمانۂ اسلام میں کفارِ عرب جن میں سے ہر ایک بوجہ حق کی دشمنی اور محمد رسول اللہ صلعم کی عداوت کے ابولہب تھا۔ محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے دین کو تلوار اور جنگ سے کوئی نقصان پہنچا سکیں گے اور مٹا سکیں گے اور نہ بعد میں آنے والے حق کے دشمن خواہ پادری ہوں یا آریہ یا کوئی اور جو ابولہب کے سچے جانشین اور روپ ہوں گے محمد رسول اللہ صلعم کی رسالت اور دین کو اپنے غلط پروپاگنڈے اور نامعقول اعتراضات سے کچھ نقصان پہنچا سکیں گے بلکہ تبّت فرما کر اعلان کیا کہ ایسے لوگ خود ہلاک ہو جائیں گے۔ خواہ وہ ظاہری طور پر ہلاک ہو جائیں خواہ اُن کی کوششوں پر ہلاکت وارد ہو اور وہ ناکام اور نامراد اور خدا کی لعنت کے مورد ہو کر روحانی موت مرجائیں چنانچہ اس پیش گوئی کا پہلا مصداق عبدالعزّیٰ جسے ابولہب کے لئے بطور ماڈل یعنی نمونہ قرآن نے اختیار کیا ہے۔ اس پیشگوئی کے ٹھیک مطابق باوجود اپنی ساری کوششوں کے آنحضرت صلعم اور آپ کے دین کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکا بلکہ خود ہلاک ہو گیا۔ جنگ بدر کے ایام میں سُرخ باد سے بیمار ہؤا۔ اور جنگِ بدر کی شکست کی ناکامی و نامرادی کی آگ سے جلتا ہؤا سات دن کے بعد مرگیا۔ چونکہ سُرخ باد سے مرا تھا اس لئے اس کے گھر کے لوگ بھی اس کے پاس نہ گئے۔ اور حبشیوں سے اس کی لاش اٹھوا کر گڑھے میں پھینکوا دی گئی۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ اور وہیں دفن کر دی گئی۔ اس کے آگے قرآن نے فرمایا کہ مآ اغنٰی عنہ مالہ وما کسب کہ اس کا مال اور جو اس نے کمایا تھا وہ کام نہ آیا۔ یہ شخص اور اس کی بی بی نہایت خسیس اور بخیل تھے یہانتک کہ اس کی بیوی باوجود تموّل کے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر خود اپنے سر پر اٹھا کر لایا کرتی تھی مال و دولت بہت جمع کی تھی لیکن نہ وہ مال اس کے کام آیا اور نہ ہی اس کی کوششیں کام آئیں جو وہ حق کی مخالفت اور محمد رسول اللہ صلعم کی عداوت میں تمام عمر کرتا رہا پس ہر ایک ابولہب سن رکھے کہ اگر بہت سی دنیا اور اس کا مال اس نے جمع کر رکھا ہے اور اپنے تموّل کا گھمنڈ ہے تو یاد رہے کہ وہ اس کے کام نہ آئے گا اور محمد رسول اللہ صلعم کی عداوت اور اسلام کو مٹانے کے لئے اس کی کوششیں کبھی کوئی نتیجہ نہ پیدا کریں گی۔ جیسا کہ ابتدائے اسلام میں ابولہب کا مال اور اس کی کوششیں اس کے کچھ کام نہ آئیں اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بلکہ وہ خود ایک ناکامی اور نامرادی کی موت مرگیا۔ بلکہ عرب کا ہر ایک ابولہب جو محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے دین کے مٹانے کے لئے اٹھا اور تلوار تک لیکر آپ پر اور آپ کے دین پر حملہ آور ہؤا۔ آخر کار ناکام و نامراد مرگیا اسی طرح آج ہر ایک مسیحی پادری اور آریہ یا اور کوئی ابولہب اپنی کوششوں کا یہ انجام سن رکھے اور محمد رسول اللہ صلعم پر تعصب اور غضب کی آگ سے برافروختہ ہو کر حملہ کرنے کا یہ ناکام اور نامراد لعنتی انجام یاد رکھے اس کا مال اور اس کی کوششیں کچھ کام نہ آئیں گی بلکہ اس کا نتیجہ وہ آگ ہے جس کا اعلان اس طرح کیا گیا ہے کہ سیصلٰی نارًا ذات لہب وہ جلد شعلوں والی آگ میں داخل ہو گا یہ وہی حسد اور غضب کی آگ تھی جس میں پہلا ابولہب جل رہا تھا بلکہ اس زمانہ کا ہر ایک ابولہب جل رہا تھا اور آخر ناکامی اور نامرادی نے اسے خوب بھڑکایا۔ اور نتیجہ یہ ہؤا کہ اس آگ میں خود ہی جل مرے

اور مرنے کے بعد بھی اس آگ نے انہیں گھیرے رکھا۔ کیونکہ اسلام کی کامیابی اور اپنی نامرادی پر جلتی ہوئی اور ماتم کرتی ہوئی ان کی روحیں اس دنیا سے رخصت ہوئیں یہی انجام آجکل کے ابولہبوں کا ہوگا۔ اسلام کا آخر بول بالا ہوگا اور یہ ناکامی و نامرادی کی آگ میں جلتے ہوئے مرجائینگے اور یہ روحانی ناکامی و نامرادی کی آگ اگلے جہان میں بھی پیچھا نہ چھوڑے گی اس کے بعد ابولہب کی بی بی کی حالت اور انجام کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں وامراته حمالة الحطب فی جیدھا حبل من مسد ۵ عبدالعزیٰ یعنے ابولہب کے پہلے مصداق کی بی بی ام جمیل اپنے شوہر کی طرح محمد رسول اللہ صلعم کی دشمنی میں حد سے گذری ہوئی تھی لیکن اس کی دشمنی کھلم کھلا اپنا مظاہرہ نہ کرتی تھی بلکہ وہ مخفی کارروائیاں کرنے کی عادی تھی۔ مثلاً رات کو آنحضرت صلعم عبادت کے لئے خانۂ کعبہ جایا کرتے تھے تو آپ کے راستے میں کانٹے بچھا دیا کرتی تھی۔ اور ادھر ادھر لگائی بجھائی کرتی پھرتی تھی۔ اور ناحق کی چغلخوریاں کرتی پھرتی تھی اسکے اس فعل کیلئے قرآن نے حمالة الحطب کا لقب استعمال فرمایا ہے جو فصاحت بلاغت کی جان ہے میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ وہ بوجہ بخل و خست طبع کے لکڑی خود جنگل سے کاٹ کر اور اپنے سر پر اٹھا کر لایا کرتی تھی حالانکہ بہت امیر تھی اور گلے میں جو اہرات کا ہار پہنا کرتی تھی اسلئے حمالة الحطب کے ایک تو وہی لغوی معنے ہوئے کہ لکڑیاں ڈھونیوالی دوسرے اسکے معنے استعارہ کے ہیں اور وہ چغلخوریاں کرنیوالی ہیں یہ استعارہ اسطرح لیا گیا ہے کہ وہ دو فریق میں خفیہ و نفرت اور جنگ و جدل کی آگ جو شخص چغلخوری سے بڑھاتا ہے وہ درحقیقت اس آگ میں ایندھن ڈالتا ہے جس سے وہ اور بھڑکتی ہے جیسا کہ شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎ میان دو کس جنگ چوں آتش است ۞ سخن چین بدبخت ہیزم کش است۔

ہر ایک جگہ جہاں دو فریق میں باہم جنگ و جدل ہو خواہ دونو فریق ایک دوسرے کے دشمن ہوں یا ایک فریق حق پر ہو، جیسا کہ محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کی جماعت تھی اور دوسرا فریق محض شرارت اور تعصب سے ناحق دشمنی کر رہا اور جل رہا ہو تو دشمنی کرنے والوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ ہوتے ہیں جو کھلم کھلا مخالفت کرتے اور اظہار عداوت کرتے ہیں اور دوسری قسم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو کھلم کھلا اظہار عداوت نہیں کرتے لیکن مخفی طور پر بیخ کنی کی فکر میں رہتے ہیں اور بہتان طرازی اور چغلخوری سے عداوت کی آگ میں ایندھن ڈالتے رہتے ہیں اور اس آگ کو بھڑکاتے رہتے ہیں پس استعارہ کے رنگ میں دراصل یہ لوگ اس آگ کے لئے ایندھن ڈھونے والے ہوتے ہیں اسی لئے ان لوگوں کو قرآن نے حمالة الحطب فرمایا ہے۔ یہاں مؤنث کا صیغہ ابولہب کی بی بی کی وجہ سے استعمال فرمایا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہر ایک جگہ جہاں دشمنی اور عداوت کی آگ بھڑکتی ہوتی ہے وہاں دشمنی اور غصہ کی آگ والے ابولہبوں کے ساتھ بطور لازم و ملزوم کے ایسے لوگ بھی ضرور ہوتے ہیں جو بوجہ اپنی بزدلی اور نامردی اور زنانہ پن کے اس جنگ میں سامنے آنے کی جرأت تو نہیں رکھتے لیکن درپردہ اپنی چغلخوری اور بہتان طرازیوں سے اس آگ میں ایندھن ڈالنے کا کام کرتے رہتے اور اسے بھڑکاتے رہتے ہیں وہ بوجہ اپنی خفیہ اور پس پردہ بزدلانہ کارروائیوں کے قرآن کی نگاہ میں مرد کہلانے کے مستحق نہیں بلکہ ایسی عورت کے لقب کے زیادہ مستحق ہیں جو ابولہب کی زوجہ کی عادات و خصلت رکھتی ہو۔ اس لئے بطور استعارہ کے ابولہب کی زوجہ سے انہیں تعبیر کیا گیا اور زوجہ اس لئے کہا کہ ایسے نامرد و بزدل اور فتنہ پرداز لوگ

جورو کی طرح کسی شوہر کے پیچھے چلنے کے محتاج ہوتے ہیں یعنی خود تو کوئی قوتِ فیصلہ نہیں رکھتے۔ لہٰذا حق کے دشمن اور غیظ و غضب سے بھرے ہوئے مخالف جو مردانہ وار حق کی مخالفت برملا کرتے ہیں جس طرح چاہتے ہیں انہیں اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں اور ایک جورو کی طرح یہ اُن کے خیالات سے متاثر ہو کر مخفی اور پسِ پردہ کارروائیاں کرنے میں اُن کی نہ صرف مدد کرتے ہیں بلکہ انہیں خوش کرنے کے خیال سے طرح طرح کی چغلخوریوں اور ناحق کی بہتان طرازیوں سے عداوت کی اس آگ میں ایندھن ڈالتے اور اسے بھڑکاتے رہتے ہیں پس یہ منافق لوگ دراصل ایک فتنہ پرداز عورت کا حکم رکھتے ہیں اور عورت بھی ابو لہب کی زوجہ جس کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے پس پردہ کارروائیوں اور ناحق کی چغلخوریوں اور بہتان طرازیوں سے اپنے کافر شوہر کے غیظ و غضب اور عداوت کی آگ کو بھڑکاتی ہے۔ فرمایا یہ ابو لہب کی عورت یا دوسرے لفظوں میں یہ منافقوں کا گروہ بھی اسی طرح اسی ناکامی و نامرادی کی آگ میں جا داخل ہوگا جس طرح اُن کے خصم ابو لہب یعنی حق کے کھلم کھلا دشمن کفار آگ میں داخل ہوں گے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی یہ آگ ان منافقوں کے لئے تیار ہے اور یہ لوگ اپنی پُر پیچ چالاکیوں اور فتنہ پردازیوں اور چغلخوریوں اور افترا پردازیوں سے جو رسّہ کسی بے گناہ اور خیر خواہ خلائق یعنے محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے دین کی ہلاکت کے لئے بٹ رہے ہیں وہ خود ان کے گلے میں پڑ کر ان کو ہلاک کر دے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ پیشگوئی بڑی صفائی سے اپنے ابتدائی دنوں میں پوری ہوئی اور انشاء اللہ آج بھی پوری ہو کر رہے گی۔ لفظاً بھی پوری ہوتی رہے گی اور معناً بھی پوری ہوتی رہے گی۔ لفظاً اس طرح کہ ابو لہب کی جورو جنگل سے لکڑی کا گٹھا پشت پر لاد کر لئے آ رہی تھی گٹھے کی رسّی پیشانی کے گرد ڈالی ہوئی تھی۔ رستہ میں ایک پتھر کے ساتھ سہارا لگا کر دم لینے لگی پتھر اونچا تھا اور لکڑی کا گٹھا اس پر ٹکایا ہوا تھا۔ دفعتہً وہ گٹھا اپنی جگہ سے سرکا اور پتھر کے پیچھے کی طرف گرا اور پیشانی کی رسّی گلے میں آ پڑی۔ گٹھے کے بوجھ کی وجہ سے پھانسی لگ گئی اور وہ وہیں گلا گھٹ کر مر گئی۔ اور وہی گلا جس میں کبھی جواہرات کا ہار ہوا کرتا تھا اس کی اپنے ہاتھ کی بٹی ہوئی رسی سے ہی گھوٹا گیا جس نے اُسے ہلاک کر دیا اور معناً اس طرح کہ اس واقعہ سے صرف یہ بتانا منظور ہے کہ ہر ایک ابو لہب کی جورو یا حق کا دشمن منافق طبع انسان سن رکھے کہ جو مخفی کارروائیاں اور منصوبہ بازیاں کر کر کے وہ محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے دین کی ہلاکت کے لئے رسہ بٹ رہا ہے وہی رسہ اس کے گلے میں پڑ کر خود اسے ہلاک کر دے گا جیسا کہ ابتدائے اسلام میں ہوا جن منافق طبع لوگوں نے مخفی طور پر کفار مکہ کو جنگ کے لئے ابھارا۔ بلکہ کل ملک عرب میں فتنہ اور جنگ کی آگ بھڑکائی اور وہ ان خفیہ کارروائیوں اور فتنہ پردازیوں کے ذریعہ محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے مشن کو ہلاک کر دینے کیلئے رسہ بٹتے رہے آخر وہ خود اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں ناکامی و نامرادی کے شعلوں سے جل گئے اور ان کا اپنا بٹا ہوا فتنہ و فساد کا رسہ خود ان کے اپنے گلوں میں پڑ کر انہیں ہلاک کر گیا آج بھی جو لوگ اسلام کو تباہ کرنے اور محمد رسول اللہ صلعم کے دین کو ہلاک کرنے کیلئے خفیہ منصوبے کرتے اور بظاہر میٹھے بنکر اس کا گلا گھوٹنا چاہتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ یہ خفیہ کارروائیاں خود ان کے لئے مضر پڑیں گی۔ اور یہ رسّہ خود ان کے گلے میں پڑ کر انہیں ناکامی اور نامرادی کی موت مارے گا اور حق کا غلبہ اور اسلام کا بول بالا ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

سُوْرَۃُ الْاِخْلَاصِ مَکِّیَّۃٌ | بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ | وَھِیَ اَرْبَعُ اٰیَاتٍ

سورہ اخلاص کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا اس کا نام اخلاص اس لئے ہے کہ اس میں توحید باری کو ہر قسم کے شرک سے خالص کر کے بیان کیا گیا ہے اور اس میں توحید باری پر جامع تعلیم ہے۔ سورۃ الکفرون میں عملی توحید کا ذکر تھا، اور جب توحید الٰہی انسان کے اعمال میں رچ جاتی ہے تو اس کا جو نتیجہ احسن اور اعلیٰ نکلتا ہے اس کا ذکر سورۃ النصر میں کیا اور اس کی دشمنی اور مخالفت سے جو نتیجۂ بد نکلتا ہے اُسے سورۃ اللہب میں ذکر کیا عملی توحید اور اس کے نتائج کا ذکر کرنے کے بعد اب اس سورۂ اخلاص میں توحیدِ اعتقادی کا ذکر فرما کے توحید کی تعلیم کو مکمل کرتے ہیں فرماتے ہیں:۔

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ○ کہہ دے وہ اللہ ایک ہے۔

اَللّٰہُ الصَّمَدُ ○ اللہ بے نیاز ہے۔

لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ○ نہ اس نے کسی کو جنا نہ وہ کسی سے جنا گیا۔

ع ۲۷ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ○ اور نہ اُس کا کوئی ہمسر ہے۔

کفوا کفؤ سے ہے۔ کفؤ کہتے ہیں کسی چیز کی نظیر کو یا اس کے مساوی کو۔

اس سورت میں توحید کو ہر پہلو سے مکمل کر دیا ہے فرماتے ہیں کہہ دے وہ اللہ ایک ہے۔ ھُوَ میں جو اشارہ فرمایا ہے وہ فطرت کا اشارہ ہے یعنی انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار موجود ہے جسے دنیا کی چہل پہل اور سرمستیاں ایک وقت کے لئے ممکن ہے دبا دیں لیکن اسے مٹا نہیں سکتیں۔ جب کبھی مصیبت یا غم یا اپنی بیکسی و بے بسی کا احساس انسان میں ہوگا۔ بے اختیار اس کی فطرت اس عظیم الشان ہستی کی طرف پناہ ڈھونڈتی نظر آئے گی وہ سمجھتی ہے کہ وہ میری دستگیری کر سکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح ایک ناسمجھ بچہ کی فطرت دکھ یا تکلیف یا تنہائی میں بے اختیار ماں کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے ایک دہریہ خدا کو نہ پاسکے یہ جدا امر ہے لیکن تلاش اس کی بھی طبیعت میں ہوتی ہے غرضکہ خدا کی ہستی کی طرف انسانی فطرت بے اختیار اشارہ کر رہی ہے اور یہ ھُوَ یہاں اسی اشارہ فطرت کی طرف توجہ دلاتا ہے بعض صوفیا نے تو ھُوَ کو بھی خدا کا ایک نام قرار دیا ہے اور اس کا ورد اُن کی زبان پر ہوتا ہے۔ غرضکہ فرماتے ہیں اے محمد رسول اللہ صلعم دنیا کو خدا کی نسبت صحیح علم معرفت سکھلاتے ہوئے بتا دو کہ وہ ہستی جس کی طرف تمہاری فطرت اشارہ کر رہی ہے یعنی اللہ جو مستجمع جمیع صفات کاملہ ہے اور

حسن اور احسان میں کامل ہے وہ اللہ ایک ہے یہاں احد کے لفظ کو اس لئے استعمال کیا گیا ہے تاکہ خدا کی توحید کو بدرجۂ کمال ظاہر کیا جائے۔ یعنی وہ اپنی ذات میں بھی اکیلا ہے صفات کے لحاظ سے بھی اکیلا ہے اور افعال کے لحاظ سے بھی اکیلا ہے دوئی کا احتمال اس میں کسی رنگ میں بھی نہیں ہو سکتا۔ آج سائنس نے پوری تحقیق کے ساتھ اس امر کو ثابت کر دیا ہے کہ تمام قوانین عالم اور خواص اشیاء اور ساری فطری قوتوں وغیرہ کا باہم مل کر ایک مقصد وحید کے نیچے کام کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ طاقت جو ان سب پر حاوی ہے اور ان کی مقنن اور ان کی تنظیم کرنے والی اور اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے انہیں چلانے والی ہے صرف ایک واحد ہستی ہے دنیا کی بظاہر متضاد قوتیں دراصل ایک ہی مقصد کے لئے کام کر رہی ہیں اور وہ صرف اکیلی طاقتور ہستی ہے جو ان سب کو اس لئے مختلف راہوں پر چلا رہی ہے تاکہ اپنے مقصد کی تکمیل کرے۔ غرضکہ تمام اہل سائنس کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس دنیا کو چلانے والی صرف ایک ہی ہستی ہو سکتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس تحقیقات علمی نے عیسائیوں کے گھر میں ماتم بپا کر دیا اور عیسائیت کو خاک میں ملا دیا جو تثلیث کی قائل ہے ایک مرتد مولوی جو آجکل عیسائی پادری ہے بڑے فخر سے پرانی منطق لئے پھرتا ہے جس کی لغویت پر بے اختیار ہنسی آتی ہے کہ جب ایک کہیں گے تو دو لازم آئیگا اس لئے خدا کو جب ایک کہا تو دو ہونا لازم آیا۔ اس احمق سے کوئی نہیں پوچھتا کہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر تین کہنے سے چار لازم آئیگا جب ایک کہنے سے وہ ایک نہیں رہ سکتا تو تین کہنے سے تین کیسے رہ سکتا ہے اسکی لغویت کا اس مثال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مثلاً اگر کسی شخص سے پوچھیں کہ کمرہ میں کتنے آدمی بیٹھے ہیں اور وہ کہے کہ ایک بیٹھا ہے تو اب ہم کہیں کہ چونکہ ایک آدمی بیٹھا ہے اس لئے ثابت ہوا کہ دو بیٹھے ہیں ایسے آدمی کا دماغ درست نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ اس احمق پادری کو یہ خبر نہیں کہ اسم عدد جب خبر کے طور پر استعمال ہوگا تو اس کا مفہوم ہمیشہ اس عدد میں محدود ہو جائیگا۔ مثلاً جب ہم کہیں کہ "ہمارے نظام فلکی کا ایک سورج" تو اس سے یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ ایک سورج اور یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ کئی سورج ہوں گے جن میں سے ایک سورج کا ذکر کر رہے ہیں لیکن جب یوں کہیں گے کہ ہمارے نظام فلکی کا سورج ایک ہے" تو پھر اب ایک کا مفہوم جو خبر کے طور پر واقع ہوا ایک کے عدد میں محدود ہو گیا۔ اسی طرح اگر ہم کہیں کہ "مشتری کے چار چاند" تو اس میں دو نو امکان ہو سکتے ہیں یہ بھی کہ اس کے چاند چار ہوں اور یہ بھی کہ اس سے زیادہ ہوں لیکن جب یہی چار چاند بطور خبر کے بولے جائیں گے تو چار کا مفہوم چار کے عدد میں محدود ہو جائیگا مثلاً ہم اگر کہیں کہ "مشتری کے چاند چار ہیں" تو اب ضروری ہو گیا کہ چار کا مفہوم چار کے عدد میں محدود ہو جائے۔ اب چار سے کم زیادہ کا امکان نہ رہا اسی طرح اگر ہم یہ کہیں کہ "ایک خدا نے یہ دنیا پیدا کی ہے" تو دو نو مفہوم ہو سکتے ہیں کہ ممکن ہے خدا ایک ہو اور ممکن ہے ایک سے زیادہ ہوں جن میں سے ایک کا ذکر کیا ہے لیکن جب ہم یوں کہیں گے کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا خدا ایک ہے" تو اب ایک کا مفہوم ایک کے عدد میں محدود ہو گیا۔ کیونکہ ایک بطور خبر کے آیا ہے اب دوئی کا امکان باقی نہ رہا غرضکہ یہ ایک ایسا عام قاعدہ ہے جسے ہر ایک عقلمند جانتا ہے لیکن وہ شخص جو ارتداد کے تعصب کی وجہ سے اندھا ہو وہ یا تو جاہل ہے کہ ایسے عام قاعدہ کو نہیں جانتا یا پھر شرارت سے اعتراض کرتا ہے قصہ کوتاہ یہ کہ قرآن کا یہ

اعلان بطور خبر کے ہے کہ وہ خدا جس کی ہستی کی طرف انسان کی فطرت اشارہ کر رہی ہے مستجمع جمیع صفات کاملہ خدا ایک ہے اور احد کا صیغہ استعمال کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کی توحید اپنے اس کمال پر ہے کہ نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے نہ صفات میں اور نہ افعال میں اب ظاہر ہے کہ شرکت تین وجوہ سے ہوتی ہے (۱) ایک تو احتیاج (۲) نسل کی شرکت (۳) یا مقابل نظیر کا موجود ہونا۔ اس سورت میں ان تینوں کے متعلق خبر دی ہے کہ وہ اللہ جو احد ہے ان تینوں امور سے بے نیاز اور پاک ہے پہلے احتیاج کو لیجئے۔ اگر خدا اپنی صفات یا اپنے افعال میں ہماری طرح دوسری چیزوں کا محتاج ہو تو ظاہر ہے کہ اس کی صفات کے ظہور یا افعال کے صدور کے لئے وہ چیزیں اسکے ساتھ ساتھ بلکہ پہلے سے موجود ہونی چاہئیں اور یہ شرک ہے مثلاً ہم دیکھنے کے لئے آنکھ اور روشنی کے محتاج ہیں سننے کیلئے کان اور ہوا کے محتاج ہیں کسی چیز کے بنانے کیلئے ہاتھ اور مادہ کے محتاج ہیں اگر خدا بھی اسی طرح محتاج ہوتا تو ضروری ہے کہ یہ سب چیزیں اس کے ساتھ ساتھ پہلے سے موجود ہوں اور پھر ان کے بغیر نہ اسکی صفات کام کر سکتی ہیں نہ اس کی خدائی چل سکتی ہے اس لئے اس سے بڑھ کر شرک ممکن نہیں یہ شرک بتوں کے شرک سے بھی بڑھ کر ہے بت پرست تو پھر اپنے بتوں کو خدا کے ماتحت سمجھتے ہیں مگر جو لوگ خدا کو مادہ اور روح کا محتاج بتاتے ہیں یعنے آریہ وہ تو خدا کے لئے نعوذ باللہ اس قدر ذلت تجویز کرتے ہیں کہ اس کو ان چیزوں کا محتاج سمجھتے ہیں ان سے بڑھ کر مشرک کوئی نہیں۔ انہوں نے پرانے باپ دادوں کے ۳۳ کروڑ بت چھوڑے مگر مادہ اور اس کے تمام خواص اور روحوں کو خدا کا شریک بنا کر لاتعداد بت بنا لئے اسی طرح ہم اپنے افعال میں قوانین قدرت کے محتاج ہیں چنانچہ اسی لئے اپنے افعال کے وقت ہم قوانین قدرت کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ ہم اُن کے محتاج ہیں ہم ان سے الگ ہو کر کچھ نہیں کر سکتے اگر خدا بھی اسی طرح قوانین کا محتاج ہو اور اپنے افعال کے لئے ان کی طرف رجوع کئے بغیر اسے چارہ نہ ہو۔ تو پھر ضرور ہوا کہ وہ قوانین پہلے سے موجود ہوں جن سے خدا کی خدائی چلتی ہے اور اگر وہ قوانین نہ ہوتے تو خدا نعوذ باللہ کچھ بھی نہ کر سکتا۔ پس جو فلسفی لوگ خدا کو قوانین کا محتاج اور ان میں محدود سمجھتے ہیں وہ شرک کرتے ہیں ان تمام قسم کے شرک سے بچنے کیلئے ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ الصمد اللہ صمد ہے کہ صمد وہ ہوتا ہے جو خود تو ہر ایک قسم کے احتیاج سے بے نیاز ہو لیکن دوسرے اپنی حاجات کے لئے اسکی طرف رجوع کریں گویا سب کا مالک اور خالق اور رب سب کے سب اپنی پیدائش زندگی اور ہر ایک قسم کی حاجتوں کے لئے جس کے محتاج ہیں اور وہ سب سے بے نیاز ہے یہاں تک کہ وہ تمام قوانین اور اسباب جن کے ہم محتاج ہیں ان سب سے بھی وہ بے نیاز ہے بلکہ وہ قوانین اور اسباب خود اپنی ہستی کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے محتاج اور اسی کے پیدا کردہ ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ قوانین و اسباب افعال الٰہیہ ہی کا دوسرا نام ہے جو کے ماتحت تمام مخلوق کا نظام چل رہا ہے اور جن سے مخلوق ایک ذرہ کے برابر بھی ادھر اُدھر نہیں ہو سکتی۔ پس اللہ تعالیٰ غالب علیٰ امرہ کی شان رکھتا ہے یعنے وہ اپنے قوانین و اسباب پر بھی غالب ہے کیونکہ وہ مالک الملک ہے اور قوانین و اسباب خود اس سے نکلے ہیں جن کے اندر تمام مخلوق جکڑی ہوئی ہے ان سب باتوں کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات و صفات و افعال میں کامل اور غیر محدود ہے جن میں اس کا کوئی شریک نہیں الغرض احتیاج جو شرک کی اصل جڑ ہے جب کٹ گئی تو توحید مکمل ہو گئی۔

(۲) اب نسل انسانی کی شرکت کو لیجئے نسل بھی احتیاج کو ظاہر کرتی ہے اور اس لئے صمد صفت کے خلاف ہے۔ نسل کی

شرکت یہی ہوا کرتی ہے کہ انسان کسی کا باپ ہوتا ہے اور کسی کا بیٹا ہوتا ہے کوئی اس سے پیدا ہوتا ہے تو وہ کسی سے پیدا ہوتا ہے اسی طرح نسل چلتی ہے اور جب نسل کا سلسلہ چل پڑے تو پھر ظاہر ہے توحید غارت ہوگئی کیونکہ خداؤں کا تو ایک خاندان چل پڑا۔ اسی لئے فرمایا لم یلد ولم یولد نہ اس نے کسی کو جنا یعنی اس کے کوئی بیٹا نہیں اور نہ وہ کسی سے جنا گیا۔ یعنی وہ کسی کا بیٹا نہیں نہ کوئی اس کی ماں ہے نہ کوئی اس کا باپ ہے۔ اس میں ان تمام عقائد باطلہ کا رد ہو گیا۔ جو عیسائیوں اور مشرکوں نے بنا رکھے ہیں۔ بعض مشرکین عرب خدا کی بیٹیاں مانتے تھے اور انہیں دیویاں بنا کر پوجتے تھے آفتاب پرستوں اور مشرکین نے بہت سے اوتار مان رکھے تھے جنہیں وہ کنواری کے پیٹ سے پیدا شدہ مانتے تھے اور خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ اسی طرح ان آفتاب پرستوں کا مذہب جب عیسائیت میں مل جل گیا اور عیسائیت بھی آفتاب پرستوں کے مذہب پر ڈھل گئی تو انہوں نے بھی حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دیدیا اور بعض نے مسیح کو خدا مان کر حضرت مریم کو خدا کی ماں بنا دیا۔ گویا کہیں خدا کو بیٹا بنایا۔ کہیں باپ اور کہیں ماں۔ ایک عجیب لغو گورکھ دھندا بنایا ہوا ہے کہ عقل انسانی اسے سمجھ ہی نہیں سکتی۔ قرآن کریم نے ودکلموں میں ان تمام لغویات سے نجات دیدی فرمایا لم یلد ولم یولد خدا میں توالد تناسل کوئی نہیں وہ اپنی ذات میں قائم چلا آتا ہے نہ اس کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا ہے کئی سال ہوئے ایک امریکن پادری سے میری ملاقات ہوئی وہ اٹھارہ سال سے پنجاب میں کام کر رہا تھا بہت خوبصورت امریکن تھا اردو بولنا جانتا تھا ریل میں ملاقات ہوگئی اس نے میری شکل دیکھ کر خیال کیا کہ یہ شخص انگریزی نہیں جانتا۔ اس لئے اردو میں گفتگو شروع کر دی کہنے لگا "آپ مسیح کو جانتے ہیں؟" میں نے کہا "جانتا ہوں" کہنے لگا "پھر آپ اُسے مانتے ہیں" میں نے کہا "ہاں مانتا ہوں کہنے لگا "کیا مانتے ہیں" میں نے کہا "خدا کا نبی" کہنے لگا "پھر آپ نے کچھ نہ مانا" میں نے کہا "کیا مانوں" کہنے لگا۔ "خدا کا بیٹا" میں نے کہا "اچھا۔ خدا کا بیٹا بھی ہوا کرتا ہے؟ اگر اس کا کوئی بیٹا ہو تو پھر اسکا کوئی باپ بھی ہوگا دادا بھی ہوگا کیونکہ بیٹا ہونے نے تو ثابت کر دیا کہ خدا میں بھی توالد تناسل کا سلسلہ ہے لہذا اگر آج کو بیٹا ہے تو کل کو پوتا ہوگا اور پھر خدا باپ بھی کسی خدا کا بیٹا اور پوتا ہوگا اور جب توالد و تناسل کا سلسلہ خدا میں بھی ہے تو معلوم ہوا کہ خدا پیدا بھی ہوتا ہے اور خدا مرتا بھی ہے وجہ یہ کہ توالد تناسل اسی نوع میں ہوتا ہے جس میں موت وارد ہوتی ہو چونکہ موت کے ذریعہ نوع کے فنا ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے ولادت کا سلسلہ قدرت نے چلایا ہے تاکہ نوع فنا ہونے سے بچ جاوے۔ نباتات حیوانات، انسان سب میں چونکہ موت وارد ہوتی ہے اس لئے ان میں ولادت کے ذریعہ سے نوع قائم رکھنے کا سامان کیا گیا ہے سورج مرتا نہیں اس لئے اس کی نسل قائم رکھنے کے لئے کوئی بیٹا نہیں پہاڑ کا کوئی بیٹا اس لئے نہیں کہ اس پر کوئی موت وارد نہیں ہوتی۔ پس اگر خدا میں توالد و تناسل کا سلسلہ ہے تو ضرور ہے کہ اس پر موت بھی وارد ہوتی ہو پس مسیح کا بیٹا ہونا بتلاتا ہے کہ خدا باپ ایک دن مر جائیگا اور یہ بیٹا اس کا وارث ہوگا۔ اور کیا عجب ہے کہ خدا باپ مر چکا ہو اور آجکل بیٹا تخت پر بیٹھا ہوا ہو اور اسی لئے اس نے اپنے پرستاروں کو دنیا میں بڑی دولت اور سلطنت دے رکھی ہے پس اگر خدا کا بیٹا مانا جائیگا تو خدا کیلئے موت بھی تجویز کرنی پڑیگی اور اس کا باپ دادا بھی ماننا پڑیگا اسی لئے قرآن نے جب یہ بتایا کہ لم یلد اس کا کوئی بیٹا نہیں تو ساتھ ہی اس پر دلیل دی کہ لم یولد وہ بھی کسی کا بیٹا نہیں یعنے اگر بیٹا ہوگا

تو اس کا کوئی باپ بھی ہونا چاہیئے تو الد و تناسل کا تو پھر یہی تقاضا ہے اگر اس کا کوئی باپ نہیں اور وہ ہمیشہ سے ہے تو پھر اسکے کوئی بیٹا بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کی کوئی انتہا نہیں اگر وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا تو پھر اسے بیٹے کی بھی ضرورت نہیں" میری اس گفتگو کو سن کر وہ پادری چکرا گیا کہنے لگا "نہیں نہیں خدا کا باپ کوئی نہیں اس پر موت بھی نہیں خدا باپ بھی ازلی اور خدا بیٹا بھی ازلی" میں نے کہا تو پھر یہ بھائی ہوئے یا برابر کے ساجھی دار اور پتی دار ہوئے انہیں باپ بیٹا کیوں کہتے ہو "فادر اینڈ سن" نہ کہو بلکہ "گاڈ اینڈ برادرس" یا "گاڈ اینڈ کمپنی" کہو" آخر ایک کو باپ دوسرے کو بیٹا کہنے کی کوئی وجہ ہونی چاہیئے اس پر وہ مبہوت ہو گیا کہنے لگا "ٹھیرو ٹھیرو میں تمہیں سمجھاؤں گا" اب کے اور ہی چال اختیار کی کہنے لگا "باپ انصاف ہے اور بیٹا رحم ہے اگر میں اور آپ کوئی جرم کریں اور سزایاب ہو جائیں اور بادشاہ جارج رحم کرنا چاہے تو وہ ہمیں چھوڑ تو نہیں سکتا۔ کیونکہ پھر یہ انصاف کے خلاف ہو گا۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے کو اگر ہمارے بدلہ سزا بھگتنے کو بھیجدے تو اس طرح انصاف بھی قائم رہے گا اور ہم پر رحم بھی ہو جائیگا" میں نے کہا "انصاف کی تعریف تو یہ ہے کہ مجرم کو اپنے جرم کی سزا ملے اور رحم کی تعریف یہ ہے کہ مجرم کے جرم کو معاف کر دیا جائے اور ظلم و بے انصافی کی تعریف یہ ہے کہ اصل مجرم کو تو چھوڑ دیا جائے اور ایک بیگناہ کو اسکے جرم کے عوض میں سزا دیدی جائے پس خدا باپ نے نہ رحم کیا نہ انصاف کیا بلکہ ظلم کیا کہ مجرموں کے جرائم کے بدلہ میں اپنے بیگناہ بیٹے کو صلیب پر چڑھا دیا اس پر وہ پادری مبہوت رہ گیا الغرض مجھے بتانا فقط اس قدر تھا۔ کہ قرآن نے لم یلد کے ساتھ لم یولد کا ارشاد فرما کر خدا کا بیٹا نہ ہونے پر دلیل قائم کر دی بتایا کہ خدا کا بیٹا مانتے ہو تو باپ بھی مانو تا کہ تو الد و تناسل کا سلسلہ ٹھیک بیٹھے اور اگر خدا کا باپ دادا نہیں تو پھر بیٹا بھی نہیں یعنی وہ تو الد و تناسل سے پاک احد ذات ہے

(۳) اب بالمقابل نظیر اور ہمسری کی شرکت کو لیجئے قرآن نے لم یکن لہ کفوا احد فرما کر بتا دیا کہ اس کا کوئی ہمسر اور نظیر نہیں یعنی جب اس کا کوئی نظیر ہی نہیں نہ صفات میں اور نہ افعال میں تو شرکت کہاں سے ہو گی نظیر ہونیکی دو ہی شکلیں تھیں یا تو خدا میں احتیاج ہوتی تب کسی دوسرے کی ضرورت ہوتی اور پھر ممکن تھا کہ وہ خدا کا ہمسر یا اسکا نظیر ہوتا لیکن جب احتیاج ہی نہیں بلکہ سب اسکے محتاج ہیں تو پھر نظیر کس طرح ممکن ہو سکتی ہے؟ دوسرا طریق نظیر کا یہ تھا کہ تو الد و تناسل کا سلسلہ ہوتا تب ایک خاندان ہونیکی وجہ سے کوئی نظیر ہوتی لیکن جب وہ بھی نہیں تو نظیر کا امکان ہی نہ رہا اور جب نظیر کا امکان ہی نہیں تو پھر خدا کی توحید میں دوئی کا امکان بھی نہ رہا۔ اس سے خدا کی جورو ماننے والوں اور نیز آتش پرستوں کا بھی رد ہو گیا جو دو خدا کے قائل ہیں۔ یعنی ایک خالق خیر جسے یزدان کہتے ہیں اور ایک خالق شر جسے اہرمن کہتے ہیں۔ قرآن نے بتا دیا کہ یہ سب لغویات ہیں جب خدا حسن اور احسان میں کامل اور تمام صفات حسنہ اور کاملہ سے موصوف ہے اور اپنی صفات اور افعال میں سب پر غالب اور غیر محدود ہے اور سب اس کے محتاج اور وہ سب سے بے نیاز ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور تو الد و تناسل سے پاک ہے تو پھر اس کا نظیر بھی کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس کی خدائی میں شرکت ایک ناممکن امر ہے قرآن نے بدی کے محرک کو شیطان کہا ہے بدی کو خدا سے کیا تعلق؟ شیطان کو خدائی صفات سے کیا نسبت؟ یہ جہالت کی باتیں ہیں۔

الغرض اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کو اپنے کامل رنگ میں پیش کیا ہے اور اس کی ذات اور صفات اور افعال میں شرک کا امکان تک باقی نہیں رہنے دیا اور جو جو وجوہات شرک کے ہو سکتے تھے سب کی معقول اور مدلل

نفی کر کے خدا کی معرفت اور توحید کو ایسے خالص اور کامل رنگ میں پیش کیا کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں اسی لئے اس سورت پر قرآن کی تعلیم کو ختم کیا ہے اس کے بعد جو دو سورتیں ہیں۔ وہ معوذتین ہیں یعنی دعائیں ہیں جن میں ظاہری اور باطنی شر سے پناہ مانگنا سکھایا ہے آنحضرت صلعم نے اس سورت کو قرآن کا ثلث یعنے ۱/۳ فرمایا ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ قرآن کا ایک ثلث حصّہ توحید الٰہی ہے جس کا عطر کھینچ کر اس سورت میں رکھدیا ہے ؛

سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

اس سورۃ کا نزول مدینہ منورہ میں ہُوا۔ سورۃ الاخلاص میں جس خدائے واحد کو ماننے اور اسکی عبادت اور فرمانبرداری کا حکم دیا تھا اسی خدا کے حضور میں انسان کو تمام قسم کے شر سے پناہ مانگنے کی دعا ان دونو سورتوں الفلق اور الناس میں جو معوذتین کہلاتی ہیں سکھائی ہے سورۃ الفلق میں ان تمام قسم کے شر سے پناہ مانگی ہے جو دوسروں سے ہمیں نقصان پہنچنے کا باعث ہوتے ہیں اور سورۃ الناس میں اُن تمام قسم کے شر سے پناہ مانگی ہے جن کی تحریک سے متاثر ہو کر ہم دوسروں کو نقصان پہنچانے کا موجب ہو جاتے ہیں غرضکہ ان دونو سورتوں میں ایسی جامعیت ہے کہ کوئی شر باقی نہیں رہ جاتا جن سے ان میں پناہ نہ مانگی گئی ہو۔ احادیث میں لکھا ہے کہ ان دونو سورتوں کے نزول پر آنحضرت صلعم کو نہایت خوشی ہوئی اور آپ نے ان کے نزول کے بعد اپنی دیگر دعائیں جو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنے پر مشتمل تھیں ترک کر دیں اور ان کو اختیار کیا۔ جناب باری ارشاد فرماتے ہیں :-

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ کہہ میں صبح کے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ ہر چیز کی شر سے جو اُس نے پیدا کی۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ اور تاریکی والے یا تاریک رات کی شر سے جب وہ چھا جائے۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۙ اور عزیمتوں میں پھونکنے والوں کی شر سے۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ع اور حسد کرنیوالے کی شر سے جب وہ حسد کرے۔

رب الفلق میں فلق کے معنے ہیں پھاڑنا۔ قرآن کریم میں دو جگہ اللہ تعالیٰ کے اس پھاڑنے کے فعل کا ذکر آتا ہے ایک تو ہے فالق الاصباح اندھیرے کو پھاڑ کر صبح کی روشنی نکالنے والا اور دوسری جگہ ہے فالق الحبّ والنوٰی

دانہ اور گٹھلی کو پھاڑ کر درخت نکالنے والا۔ لہٰذا رب الفلق کے معنے ہوئے وہ رب جو اندھیرے کو پھاڑ کر صبح کی روشنی نکالتا ہے اور دانہ اور گٹھلی کو پھاڑ کر درخت نکالتا اور اسے پروان چڑھاتا ہے

نفث کے معنے ہیں پھونکنا یا دل میں خیال یا وسوسہ ڈالنا۔ عُقَد جمع ہے عقدۃ کی جس کے معنے ہیں عزیمت یعنے کسی امر کے لئے پختہ ارادہ کر لینا۔ نفاثات فی العقد کے معنے ہوئے عزیمتوں میں پھونکنے والے یا پھونکنے والیاں مونث کا صیغہ دراصل جماعت کے لئے ہے یعنی عزیمتوں میں پھونکنے والی جماعتیں۔ یعنے ایسے لوگ جو عزیمتوں میں پھونک مارتے اور وسوسہ اندازیاں اور فتنہ انگیزیاں کر کے اعلیٰ اور اہم کاموں سے روک دیتے ہیں اور ممکن ہے کہ مونث کے صیغہ میں اشارہ اس امر کی طرف بھی ہو کہ ایک کمزور عورت جب کسی امر میں مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی تو وہ نرمی سے وسوسہ اندازی کر کے اپنا مطلب نکال لیتی ہے اسی طرح وہ لوگ جو جرأت سے کسی امر کی مخالفت نہیں کر سکتے اور کمزور عورتوں کی طرح وسوسہ اندازیوں اور فتنہ انگیزیوں سے کسی کی عزیمت کو توڑنے اور اس کے ارادوں میں روک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ درحقیقت اپنے اس فعل میں ایک کمزور عورت سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ اسلئے مجازاً اگر مونث کے صیغہ میں ان کا ذکر کیا جائے تو عین مطابق فصاحت زبان ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض دفعہ کسی اہم کام میں روک ڈالنے کیلئے دشمن عورتوں سے زیادہ کام لیتا ہے مثلاً ترکی سلطنت کو برباد کرنے اور طرابلس کی بربادی اور بلقان کی شکست میں ان یوروپین عورتوں کا بہت کچھ حصہ ہے جو ترکی بادشاہوں کے حرم میں تھیں یورپ کی عالمگیر جنگ میں جو کارہائے نمایاں جاسوسیوں کے کام میں یوروپین عورتوں نے کر دکھایا وہ مرد نہیں دکھا سکے یوروپین سیاسی چالوں میں عورتیں اپنی نرمی اور وسوسہ اندازیوں سے وہ کام کر جاتی ہیں جو جرمنی کے توپ و تفنگ نہیں کر سکتے۔ پادریوں کی مسیحیت کی تبلیغ میں عورتوں کا بڑا حصہ ہے وہ گھر گھر پھر کر عجب عجب قسم سے وسوسہ اندازیاں کرتی پھرتی ہیں اور بھولی بھالی عورتوں کو ایسا سبز باغ دکھاتی ہیں کہ خاندانوں کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں قصہ کوتاہ یہ کہ وسوسہ اندازی کے ذریعہ کسی عزیمت کو توڑ دینے اور چلتے کام میں روڑا اٹکانے کا کام جس خوش اسلوبی سے عورت بوجہ اپنی فطری نرمی اور دلکشی کے کر سکتی ہے مرد نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ مونث کے صیغہ میں عورتوں کا ذکر محض بطور تغلیب ہو یعنی عورتیں چونکہ یہ کام بوجہ احسن کر سکتی اور اس میں کامیابی حاصل کر سکتی ہیں اسلئے تغلیب کے رنگ میں ذکر اگرچہ عورتوں کا کیا لیکن اس میں وہ تمام مرد بھی شامل سمجھے جائیں گے جو وسوسہ اندازیاں کرتے اور عزیمتوں کو توڑنے میں مشغول رہتے ہیں آخر وہ مفسرین جو نفاثات کے معنے جادوگرنیاں کرتے ہیں کیا کہہ سکتے ہیں کہ جادو ہمیشہ عورتیں ہی کیا کرتی ہیں اور مرد نہیں کرتے۔ جب مرد و عورت دونو جادوگر ہوتے ہیں تو پھر مونث کے صیغہ کی خصوصیت کیا ہے؟ سوائے اسکے کہ وہ کہیں کہ جادوگر تو دونو ہوتے ہیں لیکن سحر کاری جو عورت سے بن آتی ہے وہ مرد سے نہیں بن آتی۔ اسلئے مونث کا صیغہ بطور تغلیب کے ہے ورنہ مرد یقیناً اس میں شامل ہیں علیٰ ہذا القیاس نفاثات میں مونث کا صیغہ جماعت کیلئے بھی ہو سکتا ہے اور بطور تغلیب اور مجاز کے بھی ہو سکتا ہے یعنی وسوسہ اندازیوں کا کام جس خوبی سے عورتیں کر سکتی ہیں وہ مرد نہیں کر سکتے اسلئے عورت کا ذکر کر کے اس میں مرد کو بھی شامل کر لیا گویا وسوسہ انداز مرد مجازاً ان عورتوں ہی کے زمرہ میں شامل ہیں جو وسوسہ اندازیوں سے کام نکالا کرتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے مفسرین نے نفاثات فی العقد کے

معنے کئے ہیں گرہ میں پھونک مارنے والیاں اور پھر ناحق کے قصے گھڑے ہیں کہ ان جادو ٹونے ٹوٹکے کرنیوالیوں نے ہمارے نبی کریم صلعم پر جادو کر دیا تھا یہانتک کہ آپ جو کچھ کہتے یا کرتے تھے بھول جاتے تھے یہ سب لغو اور بیہودہ واہیات ہیں جنکی کوئی اصل نہیں خواہ وہ تفسیر یا حدیث کی کتابوں میں ہی کیوں نہ ہوں قرآن کریم ان سب روایات کو رد کرتا ہے بلکہ قرآن کریم تو کفار کو الزام دیتا ہے کہ تم کیسے احمق ہو کہ نبی اللہ کو رجلاً مسحوراً یعنی سحر زدہ شخص کہتے ہو تو پھر جائیکہ خود مسلمان نعوذ باللہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت تسلیم کریں کہ آپ سحر سے متاثر ہو گئے تھے وہ محمد رسول اللہ صلعم جو جادو ٹونے ٹوٹکے اور اس قسم کی تمام باتوں کو بیہودہ اور رفضول قرار دیکر ان کے ارتکاب کو معصیت قرار دیتے ہیں اس عظیم الشان انسان ہر گزیدۂ الٰہی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ خود ساختہ جادو کا شکار ہو گئے تھے نہایت درجہ کی گستاخی اور بغاوت ہے قرآن تو صریح طور پر نبیوں کی نسبت کہہ رہا ہے کہ لا یفلح الساحر حیث اتی کہ نبی کے مقابلہ میں ساحر کہیں بھی اور کسی رنگ میں بھی آئے ہرگز کامیاب نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں چار ہزار ساحر ناکام ہوئے تو ہمارے نبی کریم صلعم کی نسبت جو تمام نبیوں کے سردار ہیں یہ کہنا کہ آپ پر نعوذ باللہ سحر کا اثر ہو گیا تھا پرلے درجے کی جہالت اور گستاخی ہے اور قرآن کریم کی صریح آیات کے خلاف ہے اور یہاں جس قسم کی جامعیت کے ساتھ تمام قسم کی شر سے ربّ الفلق کے حضور میں پناہ مانگی گئی ہے وہاں اس لغو تفسیر کو قدم رکھنے کی بھی جگہ نہیں قبل اس کے کہ میں ربّ الفلق کی تشریح کروں ان چار قسم کی شر کی تشریح کر دینا چاہتا ہوں جن سے یہاں پناہ مانگی گئی ہے۔

واضح ہو کہ انسان کی زندگی اور اس کی ساری علمی جدوجہد بغیر چار چیزوں کے نہ قائم رہ سکتی ہے نہ کامیابی کا منہ دیکھ سکتی ہے

(۱) سب سے پہلے دنیا میں جس چیز سے انسان کا واسطہ پڑتا ہے وہ ہے اس کا ماحول جس طرح اسکی زندگی اپنے ماحول کا نتیجہ ہوتی ہے اسی طرح اسکی زندگی کا قیام بھی اپنے ماحول پر ہی منحصر ہے سورج، چاند، زمین، ہوا، پانی، نباتات حیوانات انسان غرضکہ ہر چیز کا اثر اسکی زندگی پر پڑتا ہے اور جب تک ماحول کے شر سے انسان محفوظ نہ ہو زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔

(۲) زندگی کے قیام کے بعد جس چیز کی انسان کو ضرورت ہے وہ ہے صحیح علم بغیر صحیح علم کی روشنی کے انسان عمل کیلئے صراط مستقیم کو نہیں پا سکتا پس لاعلمی کی تاریکی سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ انسان کی زندگی کو بیکار کر دیتا ہے اور بے عملی سے یا غلط رستہ پر پڑ کر انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔

(۳) صحیح علم کے بعد جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے عمل کیلئے عزیمت یعنی مستحکم ارادہ ورنہ عمل معرضِ وجود میں نہیں آسکتا ایک مذبذب اور ڈانواڈول قلب کسی عمل کیلئے قدم نہیں اٹھا سکتا اور نہ ہی عزیمت کے بغیر کسی شروع کئے ہوئے عمل کو انسان قائم رکھ سکتا ہے پس عزیمت کے نہ ہونے سے جو نقصان پیدا ہوتا ہے وہ علم اور عمل دونو کو ناکارہ کر دیتا ہے جن سے انسان کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اور اپنی زندگی کو ضائع کر دیتا ہے

(۴) صحیح علم اور عزیمت سے جو عمل پیدا ہوتا اور جاری رہتا ہے وہ انسان کو کامیابی کی منزل مقصود پر پہنچا دیتا ہے لیکن کامیابی کو پا کر اسے قائم رکھنا بڑی ضروری چیز ہے کامیابی پر پہنچ کر بہت لوگ دشمنوں کی شرارت سے اُسے قائم نہیں رکھ سکتے، بالکل جس طرح ایک بادشاہ قلعہ فتح کرلے اور پھر دشمن کے شر سے وہ قلعہ ہاتھ سے نکل جائے اور حاصل شدہ کامیابی فاقد ہو جائے اس لئے کامیابی کے قیام کیلئے ضروری ہے کہ دشمنوں سے حفاظت کیلئے انسان نہ صرف سعی کرے بلکہ دعا بھی کرے

کیونکہ سارے فضلوں کی کنجی رب العالمین کے ہاتھوں میں ہی ہے اسکے فضل کے بغیر ساری کوششیں بیکار ہیں پس اسی نسبت اور ترتیب سے اس سورت میں چاروں قسم کے شر سے پناہ مانگنے کی دعا سکھائی ہے

(۱) سب سے پہلے ماحول کے شر سے پناہ مانگنے کی دعا سکھائی ہے فرماتے ہیں اعوذ من شر ما خلق یعنی جو چیز بھی پیدا ہوئی ہے اسکے شر سے پناہ مانگتا ہوں یہ ماحول کے نقصانات سے بچنے کی دعا ہے ماحول میں ایک تو واقعی وہ چیزیں ہیں جو ظاہر طور پر برملا انسان کو تکلیف دیتی اور نقصان پہنچاتی ہیں۔ مثلاً سانپ، بچھو، درندے چور، ڈاکو بدمعاش لوگ وغیرہ وغیرہ۔ ان کے شر سے پناہ مانگنے کی وجہ تو نہایت صاف اور ظاہر ہے مگر ماسوا ان کے انسان کے ماحول میں ہزارہا چیزیں ایسی بھی ہیں جو انسان کیلئے نفع ہی نفع ہیں بلکہ ان کے بغیر انسان کی زندگی ہی قائم نہیں رہ سکتی مثلاً ہوا۔ پانی۔ سورج۔ غلہ۔ میوہ ماں باپ وغیرہ وغیرہ جو ما خلق میں یقیناً شامل ہیں تو ان کے شر سے بھی پناہ مانگنے کی جو ہدایت کی تو اسکی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں مفید سے مفید چیز بھی اگر خدا کا فضل شامل حال نہ ہو تو انسان کیلئے نقصان کا موجب ہو جاتی ہے آگ کس قدر مفید چیز ہے لیکن یہی گھروں کو اور انسانوں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے بارش اور پانی سے انسان کی زندگی ہے لیکن یہی سیلاب بن کر ہزارہا انسانوں کو اور بستیوں کو غرق کر دیتا ہے ہوا سے انسان زندہ ہے لیکن یہی ہوا طوفان بن کر انسان کی ہلاکت کا موجب ہو جاتی ہے موٹر اور ریل کس قدر خدا کی نعمت ہیں لیکن ان سے ہلاکت بھی کس قدر ہوتی ہے ماں باپ سے بڑھ کر انسان کا خیر خواہ کون ہو سکتا ہے لیکن بعض دفعہ انکی بیوقوفی سے تباہی کا موجب ہو جاتے ہیں ایک ڈاکٹر نہایت نیک نیتی سے دوا دیتا ہے مگر وہ الٹی پڑ جاتی اور نقصان دے جاتی ہے انسان بعض دفعہ ایک مرغوب غذا بڑے شوق سے پکواتا اور کھاتا ہے وہ درد قولنج پیدا کر کے موت کا باعث بن جاتی ہے لہذا انسان کو زندہ رہنے کیلئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ جس ماحول میں وہ رہتا ہے اسکے شر سے وہ محفوظ رہے جب تک یہ نہ ہو اسکی زندگی قائم نہیں رہ سکتی پس سب سے پہلے انسان کی زندگی کے قیام کیلئے من شر ما خلق سے بچنے کی دعا کی ضرورت تھی اس لئے سب سے پہلے یہی دعا سکھائی۔

(۲) زندگی کے قیام کے بعد انسان کیلئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ صحیح علم ہے صحیح علم کی روشنی سے ہی انسان اپنی زندگی کیلئے لائحہ عمل تلاش کرنے میں صراطِ مستقیم پا سکتا ہے اسلئے دوسری چیز جس سے پناہ مانگنی سکھائی وہ ہے تاریکی۔ جس کی موجودگی میں انسان عمل کیلئے صحیح راستہ نہیں پا سکتا چنانچہ فرماتے ہیں اعوذ . . . . من شر غاسق اذا وقب یعنی پناہ مانگتا ہوں تاریکی والے کی شر سے۔ جب وہ چھا جائے کچھ شک نہیں رات بھی تاریکی والی ہوتی ہے اور وہ بھی اس میں شامل ہے کونسی شرارت اور خباثت ہے جو رات کی تاریکی میں نہیں ہوتی۔ تمام عیش پرستیوں اور سیہ مستیوں کے کارنامے شراب خوری۔ چوری۔ زنا کاری۔ ڈکیتی۔ قتل وغیرہ زیادہ تر رات ہی کو ہوتے ہیں۔ درندے سانپ بچھو اس کے بھی نکلنے اور نقصانات پہنچانے کا وقت بھی زیادہ تر رات ہی ہے بلکہ بعض دفعہ مفید چیزیں بھی رات کی تاریکی میں مضر بن جاتی ہیں مثلاً سیڑھی اندھیرے میں نظر نہ آئی اور پاؤں پھسل گیا اور گردن ٹوٹ گئی حالانکہ سیڑھی بجائے خود ایک کارآمد اور مفید چیز ہے۔ چوکھٹ سے ٹھوکر لگی اور منہ کے بل آدمی گر پڑا گویا وہی چیز جو روشنی میں مفید تھی تاریکی میں مضر بن گئی پس تاریکی اپنے اندر بہت سے نقصانات کو لئے ہوئے ہوتی ہے اور مفید چیزوں کو بھی بعض حالتوں میں مضر بنا دیتی ہے لیکن غور کر کے دیکھا جائے

توان سارے نقصانات میں ایک ہی اصول کام کرتا نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریکی میں انسان کو صحیح علم نہیں حاصل ہوتا اسلئے وہ ان چیزوں تک سے نقصان اٹھالیتا ہے جن سے وہ روشنی میں نقصان اٹھا نہیں سکتا تھا اسکی وجہ یہی ہے کہ روشنی میں انسان کو صحیح علم آسانی سے مل جاتا ہے اور تاریکی میں انسان کا علم زائل ہو جاتا ہے یا علم ہی نہیں حاصل ہوتا۔ اور لاعلمی میں نقصان اٹھالیتا ہے چور رات کے اندھیرے میں چوری کرتا ہے شرابخور اور زانی کی رات کے اندھیرے میں سیہ کاریاں محض اسی وجہ سے ہوتی ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ رات کی تاریکی کی وجہ سے لوگوں کو علم نہ ہوگا۔ تمام بدیاں جو رات کی تاریکی میں کی جاتی ہیں ان سب کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ کرنیوالے یہ سمجھتے ہیں کہ رات کی تاریکی میں لوگوں کو علم نہ ہوگا۔ اسی طرح روشنی ہو تو انسان چوکھٹ سے ٹھوکر نہ کھائیگا زینہ سے نہیں پھسلے گا گڑھے میں نہیں گرے گا کیونکہ روشنی میں ان چیزوں کا علم آسانی سے ہو جاتا ہے جو تاریکی میں نہیں ہوتا۔ گویا روشنی مترادف ہے علم کے اور تاریکی مترادف ہے لاعلمی کے بلکہ حقیقی روشنی دراصل علم ہی کی ہوتی ہے دیکھ لو دن کی روشنی میں اگر زینہ کا صحیح علم نہ ہو تو پاؤں پھسل جائیگا۔ دھیان کسی اور طرف ہو تو باوجود روشنی اور دھوپ ہونیکے انسان چوکھٹ سے ٹھوکر کھا جائیگا گڑھے میں گر پڑیگا اسکی وجہ یہی ہے کہ چونکہ علم کی روشنی اسکے پاس اسوقت نہیں تھی اسلئے دن کی روشنی نے اُسے کچھ کام نہیں دیا اور لاعلمی کی تاریکی کی وجہ سے اس نے نقصان اٹھا لیا اسی طرح دیکھ لو رات کی تاریکی میں اگر انسان کو علم ہو کہ فلاں جگہ گڑھا ہے یا زینہ کی سیڑھی اتنے اتنے فاصلہ پر ہے فلاں جگہ چوکھٹ ہے تو انسان بچکر نکل جائیگا پس معلوم ہوا کہ اصل روشنی علم کی روشنی ہے جو انسان کو بچاتی ہے اور اصل تاریکی لاعلمی کی تاریکی ہے۔ جو انسان کو نقصان پہنچاتی ہے رات کی تاریکی اگر نقصان دیتی ہے تو صرف اسوجہ سے کہ وہ لاعلمی کی تاریکی کو پیدا کرنیکا موجب بنجاتی ہے رات کو لیمپ جلاکر ساتھ لینے کا مقصد بھی فقط اسی قدر ہوتا ہے کہ رات کی تاریکی نے جو لاعلمی کی تاریکی کو پیدا کر دیا ہے، وہ اس روشنی سے دور ہو جائے جس وقت لیمپ روشن ہوتا ہے تو رات کی تاریکی کے دور ہونیکے ساتھ ہی لاعلمی کی تاریکی بھی دور ہو جاتی ہے اور علم کی روشنی آجاتی ہے پس تاریکی میں اگر علم ہو تو انسان کا کسی چیز کے نقصان سے بچ جانا اور روشنی میں اگر علم نہ ہو تو اسی چیز سے نقصان اٹھالینا بتاتا ہے کہ وہ تاریکی جو نقصان اور شر کو پیدا کرتی ہے وہ دراصل لاعلمی کی تاریکی ہے اور رات کی تاریکی اسکے پیدا ہونیکے موجبات میں سے فقط ایک ہے پس اس سورت میں جو غاسق یعنی تاریکی والے سے پناہ مانگی ہے سو وہ تاریکی لاعلمی کی ہی ہو جو دراصل شر پیدا کرتی اور نقصان پہنچاتی ہے اور رات کی تاریکی محض اسکے موجبات میں سے ایک ہے اور اس سے بچنے اور پناہ لینے کی راہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صحیح علم عطا فرمائے گویا کہ وہ روشنی ہے جس سے لاعلمی کی تاریکی دور ہو کر انسان نقصان سے بچ جاتا ہے اور صحیح علم کی وجہ سے اپنے ہر ایک کام میں صراط مستقیم کو پالیتا ہے پس یہ دعا سکھائی کہ دن کی روشنی ہو یا رات کی تاریکی دینی امور ہوں یا دنیوی امور جب بھی لاعلمی کی تاریکی انسان پر چھا جائے تو اللہ تعالیٰ اس بندہ کو اپنی پناہ میں لے لے اور صحیح علم کی روشنی سے اسکے دل کی آنکھوں کو روشن کر دے چونکہ رات کی تاریکی بھی لاعلمی کی تاریکی کے موجبات میں سے ہے اسلئے وہ بھی اسمیں آجائیگی لیکن رات کی تاریکی کے علاوہ انسان کی لاعلمی کی تاریکیوں کی کوئی انتہا نہیں انسان کی زندگی میں ہر ہر قدم پر اسکو لاعلمی کی تاریکی درپیش ہوتی رہتی اور علم کی روشنی کی ضرورت پڑتی رہتی ہے میرے خیال میں تو انسان لاعلمی کیوجہ سے جسقدر نقصان اٹھاتا ہے کسی اور وجہ سے اتنا نقصان نہیں اٹھاتا ملازمت کرنی ہو تجارت کرنی ہو مکان بنانا ہو کہیں سفر کرنا ہو کسی سے معاملہ کرنا ہو وغیرہ وغیرہ جب نقصان پہنچے گا لاعلمی کی تاریکی کیوجہ سے پہنچے گا۔ پس ضروری تھا کہ جناب الٰہی میں اس تاریکی سے بچنے کیلئے ضرور دعا کیجاتی اسلئے زندگی کے قیام کی دعا کے بعد لاعلمی کی تاریکی سے بچنے یعنے

صحیح علم کے حصول کیلئے دعا مانگنی سکھائی۔

(۳) صحیح علم کے بعد کسی لائحہ عمل پر چلکر کامیابی حاصل کرنے کیلئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہی عزیمت یعنی مستحکم ارادہ۔ بغیر عزیمت کے نہ انسان کوئی کام شروع کرسکتا ہے اور نہ شروع کئے ہوئے کام کو استقامت کیساتھ چلاسکتا ہے اسی لیے فرمایا کہ اعوذ ... من شر النفّٰثٰت فی العقد عزیمتوں میں پھونک مارنے والوں یا والیوں سے پناہ مانگتا ہوں اب پھونک مارنیوالے خواہ اسکے دل کے اندر شیاطین ہوں جو انسان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اسے کسی فیصلہ اور عزیمت پر نہیں پہنچنے دیتے اور خواہ لوگ ہوں جو بظاہر نرم اور خیر خواہ بنکر انسان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے ڈالکر یا اپنی فتنہ انگیزیوں سے اسکو اچھے اور اعلیٰ کارناموں سے روک دیتے ہیں میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ مؤنث کا صیغہ یہاں یا تو جماعت کے لحاظ سے یا بطور تغلیب مجاز کے استعمال ہوا ہے کہ انسان کو بلند کاموں اور رجحان جوکھوں کے معرکوں سے روکنے کا کام جس خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے عورت کرسکتی ہے وہ مرد نہیں کرسکتا صیغہ اگرچہ مؤنث کا استعمال ہوا ہے مگر عورت کے ذکر میں مرد شامل ہے کیونکہ یہ کام کچھ عورت پر ہی موقوف نہیں مرد بھی اسمیں شامل ہیں جو بجائے خود اپنی اس قسم کی وسوسہ اندازیوں اور در پردہ بدخواہیوں کے ایک مکار عورت سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں لہذا مؤنث کے صیغہ میں بطور مجاز ان کا ذکر کرنا تقاضۂ فصاحت و بلاغت ہے یہ لوگ چلتے ہوئے کام میں روڑا اٹکانے کے عادی ہوتے ہیں کوئی شخص اگر مفید تجارت کرنے لگے تو کہدیا میاں کیوں بیٹھے بٹھائے شامت آئی ہے لوگوں کو گھاٹا پڑ رہا ہے تباہ ہو جاؤ گے کوئی شخص روپیہ کمانے کیلئے اگر کہیں دور کا سفر کرنے لگے تو کہدیا میاں گھر کی آدھی نہ باہر کی ساری پردیس میں مرگئے تو کوا ہڈی بھی نہ لائیگا۔ کوئی شخص اگر ملکی یا قومی خدمت کرنے لگے تو کہدیا کہ میاں شامت آئی ہے جیلخانہ میں پڑے سڑ جاؤگے یہ شور و غوغہ پانی کا بلبلہ ہے کل کو بیٹھ گیا تو تم کو کسی نے پوچھنا بھی نہیں" اشاعت اسلام کا کام کرنے لگے تو کہدیا کہ میاں اللہ اللہ کرو آجکل مذہب کو کون پوچھتا ہے بہت مذہب کی لگن ہے تو گھر میں بیٹھ کر تسبیح پھیر لیا کرو یونہی پیسے کا اجاڑا مفت کی بدنامی، بننا بنانا کچھ بھی نہیں اس جنون کو سر سے نکالو" غرضکہ اچھے سے اچھا مفید سے مفید کام شروع کرکے دیکھ لو تمہیں ایسے آدمی بیشمار ملینگے جو تمہاری عزیمتوں میں اپنی رخنہ اندازیوں اور وسوسہ اندازیوں اور فتنہ انگیزیوں سے تمہیں اس کام سے اکھیڑ دیں گے بلکہ چلتے ہوئے کاموں میں روڑا اٹکا دینگے اور کبھی بیل منڈھے نہیں چڑھنے دینگے ایک صاحب عزیمت کا کام یہ ہے کہ جب وہ لاعلمی کی تاریکی سے بچا ہوا ہے اور ایک کام کے متعلق اسے صحیح علم کی روشنی حاصل ہے تو پھر کسی کی وسوسہ اندازیوں اور مخالفتوں کی پروا نہ کرے ہاں اگر کسی امر کے متعلق علم نہیں ہے تو صاحب علم لوگوں سے مشورہ لینا از بس ضروری ہے وہ گویا صحیح علم کی روشنی کی تلاش ہے لیکن جب کسی امر کے متعلق صحیح علم کی روشنی حاصل ہو جائے اسکے بعد کسی کی وسوسہ اندازی اور فتنہ انگیزی کی پروا کرنا اپنے آپ کو سخت نقصان پہنچانا ہے اسلئے لاعلمی کی تاریکی سے بچنے کے بعد جس چیز کے شر سے پناہ مانگنے کی ضرورت تھی وہ عزیمتوں میں وسوسہ اندازیوں اور فتنہ انگیزی کرنیوالوں کی منہ کی پھونکیں یعنی وسوسہ اندازانہ اور فتنہ انگیز باتیں تھیں اسلئے انسے بچنے کی دعا سکھائی۔

(۴) عمل کو استقامت کیساتھ اسکے اخیر تک پہنچا دینے کے بغیر کامیابی نہیں ہوتی مثلاً کوئی کنواں کھودنے لگے اور چند فیٹ کھود کر اسے چھوڑ دے تو وہ کبھی پانی کا منہ نہ دیکھے گا کوئی مکان مکمل نہ ہوگا اگر چند فیٹ دیواریں اٹھا کر اسے چھوڑ دیا جائے پس عزیمتوں میں وسوسہ اندازیوں اور فتنہ انگیز مخالفتوں سے جو بچکر نکل گیا وہ آخر کار اپنے اختیار کردہ کام کو انجام تک پہنچانے میں کامیاب ہوگا اور اسکے عمدہ نتائج سے بہرہ اندوز ہوگا میں ایک مثال عرض کئے دیتا ہوں فرض کرو اگر ہمیں کنواں کھودنا ہو تو سب سے پہلے ہمیں صحیح علم کی ضرورت ہے کہ آیا اس جگہ شیریں پانی نکل سکتا ہے یا نہیں اگر ہمیں صحیح علم ملجائے کہ یہاں پانی شیریں نکل سکتا ہے تو پھر ہمیں پوری عزیمت کیساتھ اپنا کام شروع کر دینا چاہئے اور ایسے وسوسہ اندازوں کی ذرا پروا

نہیں کرنی چاہئیے جو کام شروع کرنے سے پہلے یا کام کے دوران میں آ کر ہماری ہمت کو توڑنے کیلئے باتیں بناتے اور فتنے اٹھایا کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح ہم اپنے کام سے رک جائیں اس صحیح علم اور عزیمت اور استقامت کے بعد آخر ایک دن آئیگا کہ پانی نکلے گا اور ہم کامیابی کا منہ دیکھیں گے لیکن بدخواہ اور بدکن لوگ محض وسوسہ اندازی اور فتنہ انگیزی ہی پر بس نہیں کر سکتے وہ کسی کی کامیابی نہیں دیکھ سکتے وہ لوگوں کی کامیابی کو دیکھ کر حسد سے جل مرتے ہیں اور کوشش کرنے لگتے ہیں کہ وہ شخص جس نے کامیابی حاصل کی ہے اپنی کامیابی سے فائدہ نہ اٹھا سکے اسی وجہ سے ان حاسدوں سے بچنے کیلئے دعا سکھائی کہ اعوذ... من شر حاسدٍ اذا حسد کہ میں پناہ مانگتا ہوں حاسد کی شر سے جب وہ حسد کرے حاسد کے دل میں جو جلن ہوتی ہے اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا حضرت نبی کریم صلعم فرماتے ہیں کہ حاسد کیلئے یہی سزا کافی ہے کہ وہ خود بخود اپنے دل کی آگ سے جلتا رہتا ہے" لیکن جب اس کا حسد قول یا فعل کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے اُسوقت اُس سے نقصان کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک کامیاب انسان کی کامیابی کو تباہ کرنے کیلئے حاسد پہلے تو اپنی منصوبہ بازیوں اور شرارتوں سے کام لیتا ہے اور اسے اسکی کامیابی سے محروم کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے اور اگر اسمیں اسے کامیابی نہ ہو تو ہزار طرح کے جھوٹ بنا کر اسے بدنام کرنیکی کوشش کرتا ہے مثلاً جب ہماری جماعت نے یورپ میں اشاعتِ اسلام کرنی چاہی تو سینکڑوں لوگوں نے وسوسہ اندازی شروع کر دی کہ یورپ کی توجہ مذہب کی طرف ہے ہی نہیں یہ خام خیالیاں ہیں غرضکہ بڑی کوشش کی کہ وہاں یہ کام شروع نہ کیا جائے مگر جب وہاں کام شروع ہو گیا اور اس کا نتیجہ بہت اچھا نکلا اور لوگ مسلمان ہونے لگے تو اب دن رات اُسے تباہ کرنے اور بدنام کرنیکا مشغلہ جاری ہے پس حاسد سے پناہ مانگنے کی دعا ازبس ضروری ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھلائی ہے — اب آپنے ملاحظہ فرما لیا کہ دنیا میں انسان کی پیدائش سے شروع کر کے اسکے اخیر تک چار حالتیں ہیں (۱) زندگی اور اس کا قیام (۲) علم صحیح (۳) عمل کیلئے عزیمت و استقامت (۴) کامیابی اور اسکا قیام انکے بغیر نہ انسان کی زندگی قائم رہ سکتی ہے نہ وہ زندگی ایک کامیاب زندگی کہلا سکتی ہے اور ہر منزل پر اسکے حسب حال شر ہیں جو انسان کی زندگی اور اسکی کامیاب زندگی کے مقاصد میں حارج ہوتے رہتے ہیں جو شخص ان سے بچ گیا وہ ایک کامیاب انسان ہے پس اس سورۃ میں نہایت جامعیت کیساتھ ان تمام منازل کے شر سے بچنے کی دعا سکھائی ہے اور دعا بھی اسکے حضور کرنی سکھائی ہے جو رب الفلق ہے میں عرض کر چکا ہوں رب الفلق کے دو معنے ہیں ایک تاریکی کو پھاڑ کر صبح کی روشنی نکالنے والا اور دوسرے دانہ اور گٹھلی کی سختی کو پھاڑ کر اس میں سے درخت نکالنے والا اور اسے نشو و نما دینے والا پس رب الفلق سے جو پناہ مانگی ہے تو اسمیں بھی ایک لطیف نکتہ ہے اور میری سمجھ کے مطابق وہ یہ ہے کہ ہر ایک انسان کو زندگی اور اسکی علمی اور عملی جدوجہد میں دو قسم کی مشکلات سے سابقہ پڑتا ہے ایک وہ مشکلات جو خارج سے آتی ہیں اور انسان ایک تاریکی میں اپنے آپ کو پاتا ہے اور اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور دوسرے وہ مشکلات ہوتی ہیں جو اندر سے ہی پیدا ہوتی ہیں اور اسکے کام کے نشو و نما میں گٹھلی کی سختی کی طرح حارج ہو جاتی ہیں مثلاً اگر ہم کسی ملک میں اسلام کی تبلیغ شروع کریں تو ایک قسم کی مشکلات تو یہ ہوں گی کہ اس ملک کے لوگ مخالفت کرنے لگیں وہاں کے غیر مسلم لوگ طرح طرح کے نقصان پہنچانا چاہیں وہاں کی حکومت ناحق جاسوس قرار دیکر ہماری بیخکنی کی فکر میں لگ جائے اور دوسری قسم کی مشکلات یہ ہونگی کہ خود مسلمان اس مشن کی ترقی میں حارج ہو جائیں نہ تو مالی امداد کریں اور نہ کسی اور کو مالی امداد کرنے دیں بلکہ طرح طرح سے بدنام کرنے کی کوشش کریں غرضکہ یہ دو قسم کی مشکلات ہیں جن سے ہر ایک انسان اور قوم کو سابقہ پڑتا ہے پس بندہ کو سکھایا کہ ہر قسم کے شر سے بچنے کے لئے اپنے رب کے حضور میں دعا کر جو تیری ربوبیت کرتا ہے اور خارجی مشکلات کی تاریکی آ پڑے تو اسے روشنی سے مبدل کرنیکی طاقت رکھتا ہے اور اگر اندرونی مشکلات کی سختیاں

درپیش ہوں توانہیں دور کرکے اپنے بندہ کے کاموں کی بیل کو منڈھے چڑھانا اور اس کے لگائے ہوئے بیج کو نشوونما دینے کی قدرت رکھتا ہے
اسی رب الفلق کی تشریح حضرت مسیح موعودؑ نے اپنی مناجات میں کس خوبصورتی سے کی ہے فرماتے ہیں ؎

عاجزے را ظلمتے گیرد براہ ناگہاں آرد برو صد مہر و ماہ
بندۂ درماندہ باشد دل طپاں ناگہاں درماں بر آرد از میاں

پس اس رب الفلق کے حضور میں پناہ مانگنی سکھائی ہے جسکی ربوبیت اپنے بندہ کی خارجی اور اندرونی ہر دو قسم کی مشکلات کو رفع کر دینے کی قدرت رکھتی ہے اور پناہ مانگی ہے ان تمام شر سے جو انسان کی زندگی کو تباہ اور اسکی عملی جدوجہد کو برباد کر دیتے ہیں اور کامیابی کو غارت کر دیتے ہیں یعنی (۱) اوّل ماحول کے شر سے جو اسکی زندگی کے قیام میں حارج ہوتے ہیں (۲) دوم لاعلمی کی تاریکی کے شر سے جس سے وہ عمل کیلئے صحیح علم کو نہیں پاسکتا (۳) سوم عزیمتوں میں وسوسہ اندازوں اور فتنہ انگیزوں کے شر سے جنکی وجہ سے وہ اپنے صحیح علم کے مطابق اپنے عمل کو نہ شروع کر سکتا ہے نہ انجام تک پہنچا سکتا ہے (۴) حاسدوں کے شر سے جن کے حسد کی وجہ سے اس کامیابی کے زائل ہو جانیکا خطرہ ہے جو اس نے اپنے صحیح علم اور اسکے مطابق استقامت عمل سے حاصل کی ہے۔
کیا اس سے بڑھ کر جامع دعا انسان کو زندہ رہنے اور اپنی زندگی کو ایک کامیاب زندگی بنانے کے لئے سمجھ میں آسکتی ہے۔

سُوْرَۃُ النَّاسِ مَدَنِیَّۃٌ	بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○	وَھِیَ سِتُّ اٰیَاتٍ

اس سورۃ کا نزول مدینہ منورہ میں ہوا اور یہ سورۃ پچھلی سورۃ الفلق کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے سورۃ الفلق میں ان تمام قسم کے شر سے پناہ مانگی تھی جو دوسروں سے ہم کو پہنچتے ہیں اور اس سورۃ میں اس وسوسہ سے پناہ مانگی ہے جو ہمارے قلب میں پیدا ہو کر دوسروں کو ہمارے ہاتھوں سے نقصان پہنچانے کا موجب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ○ کہ میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے رب کی۔

مَلِكِ النَّاسِ ○ اِلٰهِ النَّاسِ ○ لوگوں کے بادشاہ کی۔ لوگوں کے معبود کی۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۵ الْخَنَّاسِ ○ پیچھے ہٹ جانے والے (خناس) کے وسوسہ کے شر سے۔

الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ○ وہ جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ○ع جنوں اور انسانوں میں سے۔ ع ۱ ۳۹

یہاں پناہ مانگی ہے لوگوں کے رَبّ سے لوگوں کے مَلِک سے لوگوں کے اِلٰہ سے رب کہتے ہیں جو انسان کو پیدا کرکے اسے پرورش کرتا اور ادنیٰ سے اعلیٰ حالت کی طرف ترقی دیتا ہے مَلِک کہتے ہیں بادشاہ کو جس کی حکومت اور قوانین کی فرمانبرداری ضروری ہو۔ اللہ کہتے ہیں معبود اور

محبوب اور مقصود و مطلوب کو غور کر کے دیکھ لو کہ انسان پناہ مانگا کرتا ہے تین ہستیوں سے (۱) یا تو اپنے پرورش کرنیوالے مربی سے پناہ مانگتا ہے۔ مثلاً ایک بچہ کو دیکھو ذرا کوئی تکلیف ہو تو فوراً ماں یا باپ کی طرف دوڑتا ہے وجہ یہ کہ وہ مظہر ربوبیت ہوتے ہیں اور بچہ جانتا ہے کہ وہ میرے بہترین جائے پناہ ہیں (۲) یا پھر انسان بادشاہ اور حاکم سے جو حکومت کرتا ہے پناہ مانگتا ہے ذرا چور یا کسی بدمعاش کا ڈر ہو تو فوراً پولیس کو بلوایا جاتا ہے یعنی انسان حکومت کی پناہ ڈھونڈتا ہے (۳) یا پھر اپنے معبود سے پناہ ڈھونڈتا ہے اور یہ آخری جائے پناہ ہے۔ جب نہ ماں باپ اور مربی بچا سکتے ہوں نہ حکومت بچا سکتی ہو تو پھر ایک ہی دروازہ ہوا کرتا ہے اور وہ ہوتا ہے اپنے معبود کا جس کی انسان پرستش کرتا ہے اس سے انسانی فطرت پناہ ڈھونڈا کرتی ہے اور جانتی ہے کہ جب سب دنیوی اسباب منقطع ہوں تو وہی ایک ذات ہے جو پناہ دے سکتی ہے۔ یہاں انسان کے پناہ لینے کے تینوں ذرائع کو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ واحد میں دکھایا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات کامل ہے جو تینوں رنگ اپنے اندر رکھتی ہے (۱) لوگوں کا رب حقیقی بھی وہی ہے دنیا میں ایک شخص جو کسی کی ربوبیت اور پرورش کرتا ہے وہ دراصل ربوبیت الٰہی کا ہی مظہر ہے کیونکہ خدا ہی کی ربوبیت ہے جو لوگوں کے دلوں میں محبت اور ہمدردی پیدا کر دیتی ہے۔ ماں باپ کی محبت بھی اسی ربوبیت کا اظہار ہے۔ ایک دفعہ ایک عورت حضرت نبی کریم صلعم کے مکان پر آئی فاقہ سے تھی اس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں تھیں وہ بھی فاقہ سے تھیں حضرت عائشہؓ نے اسے ایک کھجور کھانے کو دی۔ کیونکہ آنحضرت صلعم کے گھر میں بھی اس وقت سوائے ایک کھجور کے کچھ کھانے کو نہ تھا۔ اس عورت نے اس کھجور کو نصف نصف کر کے دونو لڑکیوں کو دے دیا۔ اور خود کچھ نہ کھایا۔ حضرت عائشہؓ نے اس مادرانہ محبت کا ذکر آنحضرت صلعم سے کیا آپ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھوں میں محمد (صلعم) کی جان ہے اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے بندوں سے اس عورت کی محبت سے بہت بڑھ چڑھ کر ہے جو اسے اپنی بیٹیوں سے ہے۔

ماں کی محبت کو جس ذات نے پیدا کیا ظاہر ہے کہ وہ ذات کس قدر محبت رکھتی ہوگی جو اپنے بندہ کو اس قدر محبت سے پلواتی ہے۔ پس لوگوں کا رب حقیقی معنوں میں اگر ہے تو خدا ہے (۲) اسی طرح سچی بادشاہت اگر ہے تو خدا کی ہے یہ دنیا کے بادشاہ سب اسی کے بنائے ہوئے ہیں جب چاہتا ہے کسی کو سلطنت دیتا ہے اور جب چاہتا ہے لے لیتا ہے (۳) اسی طرح لوگوں کا معبود مطلوب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ خدا ہے اور کیوں نہ ہو جب رب بھی وہی ہے پیدا کرنا اور پرورش کرنا اور ترقیات عطا کرنا اسی کا کام ہے اور حکومت بھی ہر چیز پر اور ذرہ ذرہ پر قدرت تامہ کاملہ کے ساتھ اسی کی ہے تو پھر معبود ہونے کا بھی وہی حق رکھتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے جو رب حقیقی بھی ہے بادشاہ حقیقی بھی ہے اور معبود حقیقی بھی ہے تو پھر اس سے بڑھ کر اور بہتر کون ہستی ہے جسکی پناہ تلاش کی جائے پس اس سورت میں ایسے مکمل پناہ دینے والے کی پناہ ڈھونڈی ہے کس چیز سے؟ خناس کے شر سے خناس کہتے ہیں شیطان کو جو وسوسہ اندازی کر کے پیچھے ہٹ جائے چنانچہ آگے خود ہی فرمایا یوسوس فی صدور الناس جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے پھر خناس کی جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے دو قسمیں بیان فرمائیں من الجنۃ والناس جنوں اور انسانوں سے

جن کہتے ہیں مخفی مخلوق کو اسلئے ہر ایک اس ہستی کو جو نظروں سے مخفی ہے عربی میں جن کہتے ہیں۔ امر کو بھی جن کہتے ہیں اسلئے کہ وہ عام طور پر لوگوں میں کم نظر آتے ہیں اور اکثر مخفی رہتے ہیں پہاڑ اور جنگل کے رہنے والوں کو بھی جن کہتے ہیں کہ وہ اکثر نظروں سے غائب رہتے ہیں بیماری کے جراثیم کو بھی جن کہتے ہیں کیونکہ وہ نظروں سے مخفی ہوتے ہیں اور سوائے خوردبین کے نظر نہیں آتے۔ اسی طرح اس مخلوق کو بھی جن کہتے ہیں جو انسان کے قلب میں اس کے جذبات کو تحریک دیتی ہے۔ اور یہاں وہی جن مراد ہے۔ واضح ہو کہ انسان مجموعہ ہے جبروتیت اور ملکوتیت

کا یعنی ایک طرف تو اس میں جذبات حیوانی ہیں مثلاً محبت اور غضب اور ان کی تمام شاخیں۔ یہ تو وہ حصہ ہے جس کے ماتحت انسان کے سارے عمل ظہور پذیر ہوتے ہیں اور دوسری طرف عقل اور ضمیر اور اخلاق فاضلہ ہیں جو انسان میں فہم و ادراک اور نیک و بد کی تمیز اور اعمال کی ذمہ واری کو پیدا کرتے ہیں۔ جذبات حیوانی انسان کے اعمال کے انجن کو حرکت دیتے رہتے ہیں اور عقل و ضمیر اور اخلاق فاضلہ اسے ریگولیٹ کرتے رہتے اور جا بجا بریک باندھتے رہتے ہیں۔ جذبات حیوانی کے انجن کو حرکت دینے کے لئے جو پرزہ یعنی جو مخفی مخلوق ہے اسے اصطلاح قرآنی میں جن کہتے ہیں اس کی پیدائش آگ سے ہے اور یہ جذبات کو گرم کرتا اور ابھارتا اور حرکت دیتا ہے جس سے انسان عمل کرنے لگتا ہے لیکن اس انجن کو ریگولیٹ اور بریک باندھنے کیلئے جو پرزہ یعنی مخفی مخلوق ہے اسے اصطلاح قرآنی میں مَلَک یعنی فرشتہ کہتے ہیں۔ جو اخلاق فاضلہ ضمیر اور عقل کو تحریک دے کر جذبات کے انجن کو قابو میں رکھتا اور وقتاً فوقتاً ریگولیٹ کرتا اور اس کی بریک باندھتا رہتا ہے اور اس کے رخ کو صراط مستقیم پر رکھتا ہے تاکہ انجن غلط رستہ پر پڑ کر یا حد سے زیادہ تیزی اختیار کر کے انسان کو ہلاک نہ کر دے۔ جب انجن کو حرکت دینے والا پرزہ یعنی جن اس قدر جذبات کو ابھارے کہ وہ قابو سے باہر نکل جائیں تو پھر اسی جن کو شیطان کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے انسان کو ہلاک کر دیا۔ اور خدا سے دور کر دیا۔ کیونکہ لفظ شیطان کے دو ماخذ ہیں۔ ایک شیط جس کے معنی ہیں ہلاکت اور دوسرا شطن جس کے معنے ہیں دوری۔ پس جب وہی جن جو جذبات کا محرک ہے انسان کے جذبات کو اس قدر زبردست یا غلط تحریک دے کہ انسان کی ضمیر اور عقل اور اخلاق فاضلہ کے قابو سے باہر نکل جائے تو وہ گویا بجائے انسانی ترقی کے حصول کے ہلاکت اور خدا سے دوری کا موجب ہو گیا وہ شیطان کہلائے گا۔ اور جب یہ جن بکلی ضمیر اور عقل اور اخلاق فاضلہ کے قابو آجائے تو پھر کہا جائیگا کہ یہ جن مسلمان ہو گیا۔ جیسا کہ حضرت نبی کریم صلعم نے اپنے جن کی نسبت فرمایا ہے۔

پس یہاں اس سورت میں بتایا ہے کہ خناس جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو جن کی قسم میں سے ہوتے ہیں جو انسان کے دل کے اندر بدی کی تحریکیں کرتے ہیں۔ مثلاً بیٹھے بیٹھے کوئی شرارت سوجھی یا دل میں کوئی بدمعاشی اور بدکاری کی تحریک اٹھی اور ایسا اکثر ہوتا ہے اس صورت میں اس جن کو خناس کہیں گے شیطان بھی اسی کو کہا جائیگا۔ دوسرے انسان کی قسم سے ہوتے ہیں اور ان میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو دوسروں کو بدی کی تحریکیں کریں۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو خناس بلکہ دوسری جگہ شیاطین بھی فرمایا ہے مثلاً کسی کے دوست ہوئے کہ سن کر ناچ تماشے میں لے گئے شرابخانے میں لے گئے۔ بدکاری کے مقامات پر لے گئے۔ کسی بددیانتی کیلئے ابھارا رشوت کا لالچ دیا۔ قمار بازی کی عادت ڈلوادی۔ شرابیوں کو تو دیکھا ہے کہ منتیں کر کر کے شراب پلاتے ہیں بعض لوگ یہ کہہ کہہ کے جھوٹ بلواتے ہیں کہ میاں کہیں جھوٹ کے بغیر کام چلتا ہے غرضکہ ہر ایک وہ شخص جو کسی کو بدی کے لئے ابھارتا ہے خناس ہے۔ ایسے ناول لکھنے والے جو مخرب اخلاق ہوں فحش تصاویر اور گندے مضامین شائع کرنے والے لوگ سب خناس ہیں۔ جن اور انسان بجائے خود بُرے نہیں لیکن جب وہ بدی کے محرک ہو جائیں تو پھر خناس کہلائیں گے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ خناس کے معنے ہیں وسوسہ اندازی کر کے پیچھے ہٹ جانیوالا۔ اور یہ بالکل سچ ہے جس قدر بھی بدی کے محرک ہوتے ہیں وہ وسوسے ڈال کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں بعض تو وہ ہوتے ہیں جو نتیجہ نکلنے کے وقت پیچھے ہٹ جاتے ہیں مثلاً کسی چوری یا بددیانتی کیلئے کسی کو ابھارا لیکن ایسی چالاکی سے کہ اگر وہ پکڑا گیا تو خود صاف نکلوہ بچ گئے بلکہ بظاہر بڑی شرافت اور وقار سے الٹا اسے ملامت کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بعض حالتوں میں سلطانی گواہ بن جاتے ہیں میں نے اسکولوں میں دیکھا ہے کہ بعض لڑکے کسی دوسرے لڑکے کو ابھارا ابھار کر شرارتیں کرتے اور کرواتے رہتے ہیں اور جہاں استاد نے اسے

پکڑا تو خود بھی کہنے لگ جاتے ہیں کہ ہاں جناب یہ لڑکا بڑا شریر ہے۔ شرارتیں کر کر کے ہمارا بھی ناک میں دم کر رکھا ہے اور اس غریب کو مفت میں سزا دلوا دیتے ہیں اور خود صاف بچ جاتے ہیں۔ قرآن کریم کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں خدا کے آگے شیطان بھی اسی رنگ میں صفائیاں کرتا نظر آئیگا لیکن بعض لوگ ایسے چالاک ہوتے ہیں کہ شروع سے ہی وسوسے ڈال کر خود الگ ہو رہتے ہیں مثلاً اس قسم کے عیسائی مشنری مردوں اور عورتوں کا طائفہ جو قسم قسم سے مسلمانوں کے قلوب میں اسلام کی طرف سے وسوسے ڈالتے رہتے ہیں اور خود نہایت معصومانہ انداز سے ایک شوشہ چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ بات بات میں ایسا خطرناک وسوسہ مسلمان نوجوانوں کے کانوں میں ڈال دیتے ہیں کہ ان کا ایمان زائل ہو جاتا ہے۔ پادری عماد الدین کی کمادت کہ "اگر ہم مسلمان طلبا کو عیسائی نہ بنا سکے تو مسلمان بھی نہ رہنے دیں گے"۔ عیسائی مشنری عورتیں گھروں میں گھستی پھرتی اور مسلمان عورتوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتی پھرتی ہیں کہیں کہدیا "ہاں ہاں تمہاری حالت ناگفتہ بہ ہے۔ تم بھیڑ بکریوں کی طرح ہو۔ ہمارے ہاں خوشی سے جس سے چاہو شادی کرو کامل آزادی ہے" کہیں کہدیا "ہاں ہاں تمہارے اوپر تو تمہارا شوہر جب چاہے سوکن لا سکتا ہے"۔ غرضکہ طرح طرح سے انہیں بہکاتی اور بعض دفعہ اغوا کر کے لے جاتی ہیں اور اگر کہیں ان کے عزیزوں کو پتہ لگ جائے اور پکڑی جائیں تو صاف کہدیں گی کہ ہم کیا کریں۔ یہ عورت خود بہت تنگ تھی ہم سے درخواست کی کہ ہمیں اس ظلم اور مصیبت سے نکالو ہم نے ازراہ ہمدردی اسکی مدد کی"۔ پس خناس وہ ہے جو خواہ جن میں سے ہو اور کسی کے قلب میں اس کے ذریعہ کوئی بدی کی تحریک اٹھے۔ اور خواہ وہ انسان ہو اور اپنی وسوسہ اندازیوں سے کسی کو بدی کے لئے ابھارے دونو صورتوں میں وہ اس قابل ہے کہ اس سے بچنے کے لئے ایک نیکی کا طالب انسان یعنی مسلمان اپنے رب اور بادشاہ اور معبود یعنی خدا سے پناہ مانگے اس لئے کہ اس خناس کی تحریک سے انسان بدی کا مرتکب ہو جاتا ہے اور دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ وہ ان کے حقوق ادا نہیں کرتا بلکہ ان کے حقوق کو غصب کر لیتا ہے حالانکہ مسلمان کی تعریف جو آنحضرت صلعم نے فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھوں سے دوسرے محفوظ رہیں۔ پس ضروری ہے کہ ایک مسلمان لوگوں کے حقوق کو نقصان پہنچانے سے بچنے کیلئے ہر ایک بدی کی تحریک سے پناہ مانگے جس کی وسوسہ اندازی خناس کی طرف سے یعنی شیطان کی طرف سے قلب کے اندر سے ہوتی ہے یا کسی انسان کی طرف سے اور پناہ بھی مانگے اس خدا سے جو رب الناس بھی ہے ملک الناس بھی ہے الٰہ الناس بھی ہے۔

خدا کی ان تین صفات کو اس تفصیل کے ساتھ بیان کرنے میں لطیفہ یہ ہے کہ خناس کی وسوسہ اندازی ہمیشہ تین رنگوں میں ہوتی ہے (۱) کبھی ربوبیت کے رنگ میں کہ انسان خدا کے سوائے کسی دوسرے کو اپنا پرورش کرنیوالا سمجھ لیتا ہے (۲) کبھی حکومت کے رنگ میں کہ انسان اپنے اوپر دوسرے کی حکومت کو اس درجہ قبول کرتا اور اس قدر اس کے آگے جھک جاتا ہے کہ خدا کی حکومت کو بھول جاتا ہے (۳) اور کبھی محبوبیت کے رنگ میں کہ انسان مخلوق اور اپنے نفس کی محبت کو خدا کی محبت پر مقدم کر لیتا ہے یعنی اپنی نفسانی خواہش اور اولاد اور شہرت اور دنیا طلبی کو اس قدر محبوب و مطلوب بنا لیتا ہے کہ خدا کو بھول جاتا ہے پس انہی تین راہوں سے خناس خواہ وہ شیطان ہو یا انسان وسوسہ اندازیاں کیا کرتے ہیں اور انسان سے وہ بدیاں کروا دیتے ہیں جن سے دوسروں کے حقوق زائل ہو جاتے ہیں اور انہیں نقصان پہنچ جاتا ہے۔ پس رب الناس۔ ملک الناس۔ الٰہ الناس سے پناہ مانگنے میں یہی اشارہ فرمایا ہے۔ کہ ان تینوں راہوں سے جن سے شیطان اور انسان وسوسہ اندازی کیا کرتے ہیں تم خدا کی پناہ مانگو

تاکہ تم اس مقام کو پالو کہ (۱) خدا کے سوا تم کسی کو رب یا پرورش کرنیوالا نہ سمجھو اور کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت تم سے منقطع ہو جائے (۲) اور خدا کی بادشاہی کو اس طرح اپنے اوپر قبول کرو کہ اس کے احکام کے مقابلہ میں کسی دنیوی حکمران کی حکومت تمہیں اتنا مرعوب نہ کرے کہ تم دنیوی حکمرانوں کی خاطر خدا کی نافرمانی کرنے لگو۔ (۳) خدا کو اپنا ایسا معبود، محبوب، مطلوب اور مقصود بناؤ کہ تمہارا نفس ہو یا مخلوق یعنی خواہشات نفسانی ہوں یا مال و اولاد شہرت اور دنیا طلبی غرضکہ کسی چیز کی بھی محبت اور طلب، خدا کی محبت اور رضا جوئی پر مقدم نہ ہو۔ تب تم ہر ایک خناس کی وسوسہ اندازی سے بچ جاؤ گے۔ اور تمہارے ہاتھوں سے ہر ایک کے حقوق محفوظ ہو جائیں گے۔ اور تمہارے ہاتھوں کسی کو نقصان نہ پہنچے گا۔ اور نہ ان کے حقوق زائل ہوں گے اور تم پکے اور سچے مسلمان بن جاؤ گے۔

دنیا میں جن چیزوں کے حقوق انسان کے ذمہ ہیں اور خناس کی تحریک سے جن کے زائل ہو جانے کا اندیشہ ہے انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) ایک اس کے اپنے نفس کے حقوق (۲) مخلوق کے حقوق یہ دونوں حق العباد کہلاتے ہیں (۳) اللہ تعالیٰ کے حقوق یہ حق اللہ کہلاتا ہے (۱) خدا کو اپنا حقیقی رب مان لیا اور کوئی ایسا کام نہ کیا جس سے اس کی ربوبیت منقطع ہو جائے تو نفس کے حقوق محفوظ ہو گئے کیونکہ نفس ترتیب الٰہی میں ترقی کرتا ہے اگر ربوبیت الٰہی منقطع ہو جائے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ نفس ترقی کرنے سے رہ گیا اس طرح خود انسان کے اپنے نفس کا حق زائل ہو گیا۔ پس خدا کو اپنا رب حقیقی مان کر نفس کا حق محفوظ ہو جاتا ہے (۲) خدا کو جب اپنا ملک یعنی حقیقی بادشاہ مان لیا اور اسکی حکومت کو بکلی قبول کر لیا تو مخلوق کے حقوق محفوظ ہو گئے کیونکہ خدا کی ہی بادشاہت ہے جس میں مخلوق کے تمام حقوق محفوظ ہیں (۳) خدا کو جب اپنا الٰہ یعنی معبود، محبوب مطلوب و مقصود مان لیا تو خدا کا حق محفوظ ہو گیا پس جو شخص اللہ تعالیٰ کو اپنا رب حقیقی۔ بادشاہ حقیقی اور معبود حقیقی بنا لیتا ہے اور اسکی ان تینوں صفات کو سامنے رکھ کر اسکی پناہ کو تلاش کرتا ہے تو وہ خناس کی تمام وسوسہ اندازیوں سے پناہ میں آجاتا ہے۔ اور اسکے ہاتھوں اسکے نفس، مخلوق اور خدا تینوں کے حقوق محفوظ ہو جاتے ہیں اور کسی کا حق اسکے ہاتھوں زائل نہیں ہوتا اور وہ حقیقی معنوں میں مسلمان بن جاتا ہے۔

نکتہ۔ یہاں یہ بھی ایک نکتہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سورت میں پانچ جگہ الناس کا لفظ آیا ہے اور ہر جگہ الناس کا مفہوم ایک جداہی رنگ رکھتا ہے۔ رب الناس میں تو انسان کے بچپن کی طرف اشارہ ہے جس میں ربوبیت کا مظاہرہ بہت نمایاں ہوتا ہے ملک الناس میں انسان کی بلوغت اور جوانی کی طرف اشارہ ہے جس زمانہ میں حکومت کے قوانین کی پابندی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور الٰہ الناس میں بڑھاپے کی طرف اشارہ ہے جس زمانہ میں عام طور پر انسان کا معبود و مطلوب سوائے خدا کے کچھ نہیں رہتا۔ اور صدور الناس میں الناس سے اشارہ نیک لوگوں کی طرف ہے جنکے سینہ میں خناس وسوسہ ڈالتے ہیں اور من الجنۃ والناس میں الناس سے بد اور شریر لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو وسوسے ڈالتے ہیں گویا انسان کی پانچوں حالتوں کا ذکر پانچ جگہ الناس کا لفظ لا کر کر دیا۔ اب غور فرمایئے کہ اس سورت میں جس قسم کی پناہ رب الناس اور ملک الناس اور الٰہ الناس کے حضور میں خناس سے مانگی ہے کیا اس کے بعد وہ انسان اس قابل رہ جاتا ہے کہ اس سے کسی کا بھی حق زائل ہو اور کسی کو اس سے نقصان پہنچ سکے۔ پس جو سورۃ الفلق اور سورۃ الناس جیسی معوذتین کی دعاؤں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی پناہ ڈھونڈتا ہے اس کے گرد سلام ہی سلام ہے نہ اس کو کہیں سے نقصان پہنچ سکتا ہے نہ وہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے وہ دار السلام میں ہے اور سچا مسلمان ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مجدد صد چہاردہم کی گرانمایہ تصنیفات

سلسلہ تصنیفات احمدیہ حصہ دوم

اس میں ذیل کی کتب شامل ہیں :-

(۱) سرمہ چشم آریہ - آریوں کے اعتراضات کے مدلل جوابات (۲) شحنۂ حق - اس کتاب میں بھی آریوں کے اعتراضات کا ردّ لاجواب پیرایہ میں کیا گیا ہے - (۳) ایک عیسائی کے تین سوالوں کا جواب عیسائیوں کے اہم اعتراضات در بارہ نبوت و معجزات حضرت نبی کریم صلعم کے مدلل جوابات - قیمت .. - دو روپیہ

سلسلہ تصنیفات احمدیہ حصہ چہارم

اس میں ذیل کی کتب شامل ہیں :-

(۱) الحق مباحثہ لدھیانہ (۲) الحق مباحثہ دہلی - حضرت مسیح موعود اور مولوی محمد بشیر بھوپالی کی مفصل اور قابل دید بحث (۳) آسمانی فیصلہ - ہندوستان کے سربرآوردہ علماء اور پیروں کو آسمانی فیصلہ کی دعوت دی گئی ہے - (۴) نشان آسمانی - اولیاء اُمت کی پیش گوئیاں دربارہ صداقت دعویٰ خود قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

سلسلہ تصنیفات احمدیہ جلد ہفتم

اس میں حسب ذیل کتب شامل ہیں :-

(۱) ضیاء الحق - دعویٰ مسیحیت کی صداقت پر مخالفین کو جوابات (۲) شہادت القرآن (۳) انوار الاسلام (۴) نور القرآن حصّہ اول (۵) نور القرآن حصّہ دوم - (۶) ست بچن (۷) آریہ دھرم

قیمت دو روپیہ ۹ آنہ

سلسلہ تصنیفات احمدیہ جلد ہشتم

اس میں حسب ذیل کتب شامل ہیں :-

(۱) تعلیم الاسلام یا اسلامی اصول کی فلاسفی (۲) انجام آتھم (۳) سراج منیر (۴) تحفہ قیصریہ - (۵) حجۃ اللہ (۶) سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب - قیمت دو روپیہ بارہ آنہ

ملنے کا پتہ - دار الکتب اسلامیہ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور

مصنّف کی دیگر کتابیں

مجدّدِ اعظم ہر سہ جلد مجلّد	قیمت:-	روپے ۱۲ / آنے ۲
انوار القرآن حصہ دوم مجلّد	"	۳/۸
قرآن کریم کا عالمگیر پیغام حریت (جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام نے ہر قسم کی غلامی سے آزادی عطا کی ہے ۔ ۔ ۔)		۴/
ولادت مسیح ۔ ولادت مسیح پر قرآن کریم اور بائبل سے عالمانہ استدلال	"	۶/
برتھ آف جیزس ۔ ولادت مسیح بزبان انگریزی .. - - - -	"	۱۲/

(محصول ڈاک بذمہ خریدار)

ملنے کا پتہ

منیجر دار الکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگس لاہور